ماہنامہ
نقیبِ ختمِ نبوت
ملتان
۱،۲،۳ محرم،صفر،ربیع الاول ۱۴۳۱ھ جنوری،فروری،مارچ ۲۰۱۰ء

اشاعتِ خاص

اُس بخاری نوجواں نے کس خوشی سے جان دی
موت کے زہراب میں پائی ہے اُس نے زندگی
(اقبال)

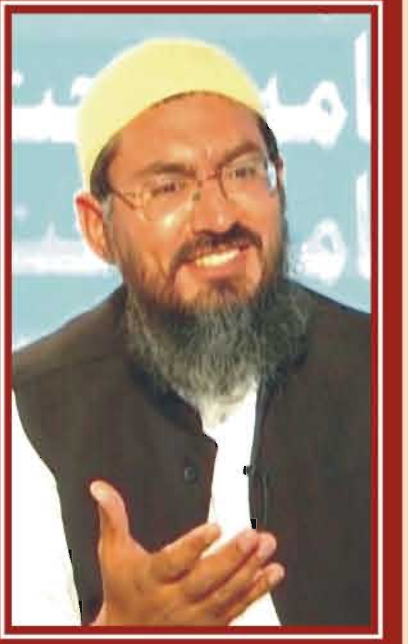

بیادِ

شہید سیّد محمدؐ ذوالکفل بُخاری رحمۃ اللہ علیہ

(سابق استاذ جامعہ ام القریٰ، مکہ مکرمہ)

۲؍رمضان المبارک ۱۳۸۹ھ/۱۳؍نومبر ۱۹۶۹ء
۲۷؍ذیعقد ۱۴۳۱ھ/۱۵؍نومبر ۲۰۰۹ء

مدیر سیّد محمد کفیل بُخاری

کس قدر بے باک دل اس ناتواں پیکر میں تھا
شعلۂ گردوں نوردا اک مشتِ خاکستر میں تھا

کس قدر بے باک دل اس ناتواں پیکر میں تھا
شعلۂ گردوں نورد اک مشتِ خاکستر میں تھا

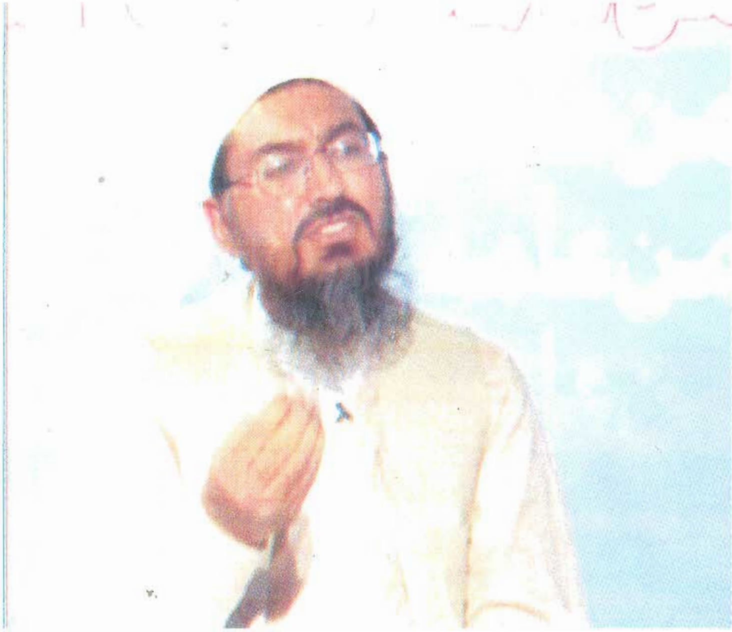

پاکستان ٹیلی ویژن ملتان کے ایک پروگرام میں گفتگو کرتے ہوئے

شہادت سے چند روز قبل مجلس اقبال، عالمی اردو مرکز جدہ میں
ڈاکٹر خورشید رضوی، رؤف طاہر، محمد مختار علی اور دیگر کے ساتھ

شہادت سے چندروز قبل مجلس اقبال، عالمی اردو مرکز جدہ میں
ڈاکٹر خورشید رضوی، رؤف طاہر، محمد مختار علی اور دیگر کے ساتھ

بسم الله الرحمن الرحيم

تشکیل

دل کی بات:

- بیاد: شہید سید محمد ذوالکفل بخاری — مدیر — ۱۳
- سوانحی خاکہ/ادبی مشاغل — ۱۴

عکسِ تحریر:

ڈاکٹر حافظ صفوان محمد چوہان اور الیاس میراں پوری کو دیئے گئے آٹوگراف — ۱۶

یادوں کے چراغ: (اہلِ خاندان کے مضامین)

- چشم بد دور — سید ابو معاویہ ابوذر بخاری — ۱۹
- بنو ہاشم کی انگشتری کا نگینہ — سید عطاء المحسن بخاریؒ — ۲۰
- انٹرویو — پروفیسر سید محمد وکیل شاہ — ۲۱
- ’’میرا مُنّا......! — سیدہ اُم ذوالکفل مدظلہا — ۲۹
- گوہرِ یکتا — سید عطاء المہیمن بخاری — ۳۱
- اُس بخاری نوجواں نے کس خوشی سے جان دی! — سید محمد کفیل بخاری — ۳۲
- ایک بھائی، ایک دوست — سید محمد معاویہ بخاری — ۳۷
- وہ سیلانی پریتم......! — سیدہ اُم مزملہ بتول — ۴۴
- ایک تھا شاہزادہ — سیدہ س بخاری — ۴۹
- واہ مُنّے شاہ — سید مصطفیٰ بخاری — ۵۴
- عارفِ اسرارِ حیات — سید صبیح الحسن ہمدانی — ۵۶
- دی تھی دعا کسی نے کہ جنت میں گھر ملے — سید عطاء المنان بخاری — ۶۰
- میرے مُنے ماموں — بنت سید محمد وقار الحسن ہمدانی — ۶۳
- کچھ نہ کہا اس نے جاتے جاتے — بنت سید عطاء المہیمن بخاری — ۶۶

بچوں کی نظر میں:

- اب ہم بابا کسے کہیں گے؟ — سید عطاء المکرم بخاری — ۶۸
- بابا جان بہت یاد آتے ہیں — سید عطاء المنعم بخاری — ۷۰
- چچا جان ہم بہت اداس ہیں — سید عطاء المحسن بخاری — ۷۲
- میرے خوش نصیب چچا جان — سیدہ رُغینہ بنت کفیل بخاری — ۷۳
- مُنے چچا جان — سیدہ فُلیحہ بنت کفیل بخاری — ۷۵

بزرگ دوست:

بہار آخر شد	ڈاکٹر اسلم انصاری	۷۶
ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم	پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان	۸۰
مانوس اجنبی	ڈاکٹر خورشید رضوی	۸۲
ایک عالی دماغ تھا نہ رہا	عبداللطیف الفت	۸۵
ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق	پروفیسر خالد شبیر احمد	۸۷
مرجھا گیا بہار میں کیوں گلشنِ خیال	ڈاکٹر مختار ظفر	۹۰
ذوالکفل بخاری کی نظمیں: فکر و جذبہ کا امتزاج	پروفیسر انور جمال	۹۱
تابوت!	محمد اظہار الحق	۹۳
سید محمد ذوالکفل بخاری	امجد اسلام امجد	۹۶
اُس پھول کے بغیر بہت جی اداس ہے	شیخ حبیب الرحمٰن بٹالوی	۹۸
خانوادۂ بخاری کا گلِ سرسبد	ابوسفیان تائب	۱۰۲
سید ذوالکفل بخاری	ڈاکٹر سعید عنایت اللہ	۱۰۳

حلقۂ یاراں:

کل من علیہا فان	خالد مسعود خان	۱۰۵
انا للہ وانا الیہ راجعون	سجاد جہانیہ	۱۰۷
یادِ یارِ مہرباں	ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان	۱۰۹
فاران اکادمی کا آخری اجلاس	مختار پارس	۱۱۲
آہ! ذوالکفل بخاری	رؤف طاہر	۱۱۴
دوپہر کی دھوپ سی اُجلی جوانی لے گیا	جاوید اختر بھٹی	۱۱۷
کس دیس جا بسے ہو......!	محمد حامد سراج	۱۲۰
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا	ڈاکٹر امتیاز حسین بلوچ	۱۲۵
پروفیسر سید ذوالکفل بخاری کی رحلت	ممتاز احمد بڈانی	۱۲۷
شب کی سنگین سیاہی کو مبارک ہو	وقار نسیم وامق	۱۲۸
ایک دوست کی موت پر!	رؤف کلاسرا	۱۲۹
ذوالکفل بخاری اور میں	افتخار شفیع	۱۳۱
قسمت کا دھنی	ڈاکٹر عبدالرازق	۱۳۵
روحوں کی شناسائی	سید عزیز الرحمٰن	۱۳۸

● عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا	سعود عثمانی	۱۴۰
● ’’علامہ‘‘ ذوالکفل بخاری	ڈاکٹر محمد عمر فاروق	۱۴۲
● ایک چھکتی ذہانت	ڈاکٹر معین نظامی	۱۴۵
● وہ ایک پھول جسے خوشبوؤں نے پالا ہے	منیر عباس ملک	۱۴۷
● الوَداع یا سیدِی	ڈاکٹر حافظ صفوان محمد چوہان	۱۴۹
● آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے	قاسم محی الدین بنگیال	۱۶۱
● دل نواز دوست	محمد جاوید اختر	۱۶۲
● یہ شاہ جی یہ تیرے پراسرار بندے	شعیب ودود	۱۶۴
● پروفیسر ذوالکفل بخاری: ایک تاثر	ڈاکٹر عبدالماجد ندیم	۱۶۷
● ہمارا میزبان، اللہ کا مہمان	ڈاکٹر شاہد کاشمیری	۱۶۹
● ایک آدمی تھا بے مثال	محمد عابد مسعود ڈوگر	۱۷۱
● مفکر و دانش ور	عبدالوہاب نیازی	۱۷۳
● گلوں کی خوشبو والے اٹھتے جاتے ہیں	حبیب اللہ چیمہ	۱۷۵
● خلاصۂ معدنِ علم	مولانا محمد ازہر	۱۷۷
● خانوادۂ بخاری کا تابندہ گوہر	مولانا حبیب الرحمٰن ہاشمی	۱۷۹
● دارِ بنی ہاشم سے احاطۂ بنی ہاشم تک	محمد احمد حافظ	۱۸۱
● گلستانِ علم و ادب	اورنگ زیب اعوان	۱۸۵
● وہ ذی قدر میرا بھی ہم نشیں رہا	عرفان احمد عمرانی	۱۸۸
● تھوڑی عمر، بڑی کمائی	عامر شہزاد	۱۸۹
● احسانِ محسن	محمد یاسین شاد	۱۹۱
● شمعِ محفل	حفیظ خان	۱۹۲
● ذوالکفل بخاری کی نظم نگاری	ڈاکٹر مزمل حسین	۱۹۴
● گلاب لمحوں کا ساتھی	منیر احمد ابنِ رزمی	۱۹۷
● معلمِ ذی وقار	مولانا مشتاق احمد چنیوٹی	۱۹۸
● وضعدار انسان	میاں محمد حیات سرگانہ	۲۰۰

حلقۂ علما:

● پروفیسر سید ذوالکفل بخاری	مولانا سعید احمد جلالپوری	۲۰۱
● رجل صالح	قاضی طاہر علی الہاشمی	۲۰۳
● منفرد اور برگزیدہ آدمی	مولانا مجاہد الحسینی	۲۰۹

احبابِ جامعہ اُم القریٰ:

• تعزیتی مکتوب	سامی عطرجی	۲۱۰
• تعزیتی مکتوب	عبداللہ المطرفی	۲۱۲
• بخاری کی شام	پروفیسر محمد سلیم	۲۱۳
• ایسی ہی جیسے خواب کی باتیں	پروفیسر محمد سلیم	۲۱۵
• بخاری کی شخصیت	پروفیسر محمد سلیم	۲۲۰
• بخاری بھائی	اہلیہ پروفیسر محمد سلیم	۲۲۲
• یادوں کے دریچے	پروفیسر سجاد حسین	۲۲۴
• سید ذوالکفل بخاری میری نظر میں	پروفیسر سجاد حسین	۲۲۶
• بارات	پروفیسر نوید احمد قریشی	۲۲۸

عقیدت کے پھول:

• میرے استاد۔ میرے رہبر	الیاس میراں پوری	۲۳۰
• چارۂ دل سوائے صبر نہیں......!	نعمان احمد سنجرانی	۲۳۸
• کئی دماغوں کا ایک انساں......!	حافظ اخلاق احمد	۲۴۱
• زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے	حمود الرحمٰن	۲۴۳
• نابغۂ عصر سید ذوالکفل بخاری	فیصل متین سرگانہ	۲۴۶
• جناب عینک فریبی	حافظ طاہر محمود	۲۴۹
• دنیا والوں میں ایک اللہ والا	شہزاد حنیف	۲۵۰
• ایک پیارا آدمی	قاسم منصور جلالی	۲۵۲
• رہنمائی کے خوگر	ڈاکٹر ظہیر احمد	۲۵۳
• صبر و رضا کے پیکر	اخت رائد رانا (بستانِ عائشہ)	۲۵۴
• ''اک روشن دماغ تھا نہ رہا''	عابدہ بتول	۲۵۶

ارادت کے موتی: (منظوم خراجِ تحسین)

• آہ، از محفلِ ما یارِ طرحدار برفت (فارسی مرثیہ)	ڈاکٹر اسلم انصاری	۲۵۸
• ذوالکفلِ ہوشیار کا مرثیہ	پروفیسر اصغر علی شاہ	۲۵۹
• ذوالکفل بخاری کی یاد میں	ممتاز اطہر	۲۶۱
• مرحبا	ڈاکٹر عاصی کرنالی	۲۶۲
• کہاں گئے ہو؟	مستحسن خیال	۲۶۳
• امکان کی حد سے میں گزر جاؤں تو کہہ دوں	ڈاکٹر عتبان محمد چوہان	۲۶۶

● سید ذوالکفل بخاری شہید	مولانا مجاہد الحسینی	۲۶۸
● ارتحالِ ذوالکفل بخاری	میجر (ر) سعید اختر	۲۶۹
● سانحہ	میجر (ر) سعید اختر	۲۷۰
● ذوالکفل بخاریؒ کے سانحۂ ارتحال پر	پروفیسر خالد شبیر احمد	۲۷۱
● آہ! سیّد ذوالکفل بخاریؒ	پروفیسر خالد شبیر احمد	۲۷۲
● ذوالکفل بخاری۔ خورشیدِ جہاں تاب	خورشید بیگ میلسوی	۲۷۳
● آہ! ذوالکفل بخاریؒ	پروفیسر عادل یزدانی	۲۷۴
● جو بچھڑ کے منظروں کو عکس ثانی دے گیا	یونس عدیم	۲۷۵
● عزیزم ذوالکفل کی مرگِ ناگہانی پر	پروفیسر محمد اکرام تائبؔ	۲۷۶
● وہ ابد ستارہ......	الیاس میراں پوری	۲۷۷
● تھا نابغہ اِس دور کا ذوالکفل بخاری	انجینئر توحید الرحمٰن	۲۷۸
● ارتحالِ پُر ملال	قیوم واثق	۲۷۹
● سید ذوالکفل بخاری کی یاد میں	لقمان ناصر	۲۸۰
● بیادِ ذوالکفل بخاریؒ	اکرام الحق سرشار	۲۸۱
● میرا دوست، میرا ہمدم	شیخ حبیب الرحمٰن بٹالوی	۲۸۲
نگارشات:		۲۸۳
● تہذیبوں کا تصادم	(لیکچر)	۲۸۴
● سوال ''امریکی'' جواب ''مکّی''	(مضمون)	۲۹۵
● جبر کی سائنس سے صبر کی سائنس تک	(مضمون)	۲۹۶
● چودھری افضل حق کی ''زندگی''	(تنقید)	۳۰۱
● فکاہاتِ جلیس-ایک مطالعہ	(تبصرہ)	۳۰۲
● کعبے کا امام	(شخصیت)	۳۰۶
● طاہر جمیل: ابھی کل کی بات ہے	(شخصیت)	۳۰۹
● چند منتشر باتیں زبان کے بارے میں	(زبانِ اردو)	۳۱۱
● برہنہ مسکراہٹیں اور عریاں شوخیاں	(سیاسی کالم)	۳۱۳
● مسلم کُشی کے آئندہ پچیس سال	(سیاسی کالم)	۳۱۶
● مراسلت بنام: مشفق خواجہ، ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی، صبیح ہمدانی، الیاس میراں پوری		۳۱۹
● مرے مولا محمد، میرے سچے محمد!	(نعت)	۳۳۰

● معلوم، نامعلوم (نظم) ۳۳۱
● حکایت جو درمیاں سے سنی (نظم) ۳۳۲
● شام جھانکتی ہوئی (نظم) ۳۳۳
● پرانی خبروں پہ نئی سرخی جمانا کیا (نظم) ۳۳۴
● ہمارے نام کی چٹھی ہمیں کو لینا ہے (نظم) ۳۳۵
● حبیاں ہم کدھر جائیں (نظم) ۳۳۶
● اب تو یوں ہے کہ مجھے صلح کا یارا بھی نہیں (غزل) ۳۳۷

رفتید ولے نہ از دلِ ما: (تعزیتی خطوط، پیغامات اور تاثرات)

علماء وزعماء: ۳۳۸

● حضرت مولانا خواجہ خان محمد ● مولانا محمد مکی حجازی ● مولانا عبدالحفیظ مکی ● مولانا فضل الرحمٰن ● مولانا سمیع الحق ● سید منور حسن ● مولانا عبدالرشید ربانی ● مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی ● علامہ خالد محمود ● قاری محمد حنیف جالندھری ● مولانا زاہد الراشدی ● محمد عمار خان ناصر ● ڈاکٹر سید وسیم اختر ● عمران ظہور غازی ● مولانا عبداللطیف مدنی ● مولانا عبدالقیوم حقانی ● مفتی ہارون مطیع اللہ ● مولانا عرفان الحق اظہار حقانی ● قاری عبدالجلیل ● قاضی محمد اسرائیل گڑنگی ● صاحبزادہ ابرار احمد بگوی ● مولانا عبدالرؤف چشتی ● مولانا حبیب الرحمٰن نقشبندی ● جناب حاکم علی، محمد شکیل ● شیخ حبیب الرحمٰن بٹالوی ● چودھری محمد اکرام احرار ● میاں محمد اویس

عمائد واحباب: ۳۴۸

● محمد رفیق تارڑ (سابق صدرِ پاکستان) ● مختار مسعود ● مشتاق احمد یوسفی ● فتح محمد ملک ● ڈاکٹر اسلم انصاری ● ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ● ڈاکٹر انور سدید ● پروفیسر ظفر احمد چودھری ● ڈاکٹر عاصی کرنالی ● ڈاکٹر شفیق احمد ● پروفیسر محمد اقبال جاوید ● عبداللطیف الفت ● خواجہ غلام ربانی مجال ● ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر ● ڈاکٹر سہیل عباس خان ● پروفیسر انور جمال ● ڈاکٹر مزمل حسین ● ڈاکٹر وحیدالرحمٰن خان ● انجینئر ذکاءاللہ خان گنڈاپور ● عبدالجواد صدیقی ● پروفیسر شمیم عارف قریشی ● پروفیسر عبدالخالق سہریانی بلوچ ● محمد اکرم راہی ● میاں محمد الیاس ● پروفیسر محمد حمزہ نعیم ● پروفیسر عطاء اللہ اعوان ● محمد عبداللہ صدیقی ● اظہر محمود ظفر ● محبوب عالم بھٹہ

تعزیتی ای میل: ۳۶۱

پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (انڈیا) ● ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی (انڈیا) ● ڈاکٹر الٰہی بخش اختر اعوان (برطانیہ) ● ڈاکٹر ظہیر احمد (برطانیہ) ● ڈاکٹر ناصر محمود راجپوت (برطانیہ) ● ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (لاہور) ● شیخ خالد احمد (اسلام آباد) ● مرزا اشتیاق احمد (ابوظہبی) ● پروفیسر طارق حبیب (سرگودھا)

اظہارِ تعزیت ۳۶۳

انتساب

اُم المومنین سیّدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا

کے نام

جن کے قدموں میں

سیّد محمد ذوالکفل بخاری شہید کو

آسودۂ خاک ہونے کی سعادت نصیب ہوئی

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

میرا مُنّا کہاں ہے؟

عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ خَرَجْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِیْ طَائِفَةٍ مِّنَ النَّهَارِ حَتّٰى اَتٰى خِبَآءَ فَاطِمَةَ فَقَالَ اَثَمَّ لُكَعُ اَثَمَّ لُكَعُ يَعْنِیْ حَسَنًا فَلَمْ يَلْبَثْ اَنْ جَاءَ يَسْعٰى حَتّٰى اعْتَنَقَ كُلُّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا صَاحِبَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اُحِبُّهٗ فَاَحِبَّهٗ وَاَحِبَّ مَنْ يُّحِبُّهٗ.

سیدنا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دن کے ایک حصہ میں باہر نکلا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں پہنچے تو پوچھا:

کیا یہاں مُنّا ہے؟ ......کیا یہاں مُنّا ہے؟......آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد حضرت حسن رضی اللہ عنہ تھے۔ (جن کو ڈھونڈتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم آئے تھے)۔ابھی آپ نے چند ہی لمحے گزارے تھے کہ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ دوڑتے ہوئے آئے۔ پھر حضرت حسن رضی اللہ عنہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گلے سے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے گلے سے لپٹ گئے۔ اور پھر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اے اللہ! میں اس سے محبت رکھتا ہوں تو بھی اس سے محبت رکھ اور اُس شخص سے بھی محبت رکھ جو اس سے محبت رکھے۔

(متفق علیہ، مظاہر حق، جدید، جلد پنجم، ص۶۸۷)

دل کی بات مدیر

بیاد: شہید سید محمد ذوالکفل بخاری رحمتہ اللہ علیہ

حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے چھوٹے نواسے اور جامعہ اُم القریٰ مکہ مکرمہ میں انگریزی زبان وادب کے استاد پروفیسر سید محمد ذوالکفل بخاری ۲۷/ ذیقعدہ ۱۴۳۰ھ مطابق ۱۵/ نومبر ۲۰۰۹ء بروز اتوار مکہ مکرمہ میں سڑک کے ایک حادثے میں شہید ہوگئے۔ وہ تدریسی فرائض انجام دینے کے بعد ظہر کی نماز ادا کر کے عزیزیہ میں واقع اپنے گھر جارہے تھے کہ حادثے کا شکار ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

دسمبر ۲۰۰۹ء کا شمارہ عجلت میں شائع ہوا۔ جس میں اس حادثے کی ابتدائی معلومات اور چند مضامین شائع ہوئے۔ یہ اعلان بھی کیا گیا کہ جنوری، فروری ۲۰۱۰ء کا مشترکہ شمارہ ذوالکفل بخاری کی یاد میں خصوصی اشاعت پر مشتمل ہوگا۔ احباب ومخلصین کے مضامین تاخیر سے موصول ہوئے اور اب تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ جو مزید ایک ماہ کی تاخیر کا باعث بنا۔ تاہم اب جنوری، فروری، مارچ تین ماہ کا مشترکہ شمارہ پیش خدمت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ہمارے کرم فرماؤں نے شہید سید ذوالکفل بخاری سے بے پناہ محبت کا اظہار کیا اور اپنی نگارشات کے ذریعے انھیں خراجِ تحسین پیش کیا جسے ہم قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ تمام مضامین کی اشاعت صفحات میں، دوگنا اور اخراجات میں چار گنا اضافے کا باعث بنتی جس کا ادارہ متحمل نہیں۔ اس لیے بعض مضامین اس اشاعت سے نکالنے پڑے۔ جس پر تمام اراکینِ ادارہ اُن دوستوں سے شکریے کے ساتھ معذرت خواہ ہیں۔ اُن کی یہ تحریریں آئندہ کسی اشاعت میں شامل کردی جائیں گی۔

خصوصی اشاعت کی تیاری میں جناب حافظ صفوان محمد چوہان سب سے زیادہ شکریے کے مستحق ہیں جو اپنے مرحوم دوست ذوالکفل کی محبت میں بے قرار ہوکر دو دفعہ فیصل آباد سے ملتان تشریف لائے اور پورا ہفتہ بیس بیس گھنٹے ترتیب وتدوین، تصحیح اور کمپوزنگ کے کام پر صرف کیے۔ برادرِ عزیز سید محمد معاویہ بخاری اور عزیزانِ گرامی پروفیسر محمد الیاس میراں پوری، سید صبیح الحسن ہمدانی، سید عطاء المنان بخاری، حافظ محمد نعمان سنجرانی اور حافظ اخلاق احمد کا بہت بہت شکریہ، جنھوں نے ٹیم ورک کر کے خصوصی اشاعت کو آپ تک پہنچانے میں دن رات ایک کیا۔ جام ریاض احمد نے بھی حسب استطاعت ہاتھ بٹایا۔ برادرِ محترم جاوید اختر بھٹی نے ہمیشہ کی طرح بہت مفید اور قابل عمل مشوروں سے نواز کر میری رہنمائی کی۔ اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین)

پہلے ہی بہت تاخیر ہوچکی، اب آپ کے مطالعہ میں حائل ہوکر تاخیرِ مزید کا سبب نہیں بننا چاہتا۔ بسم اللہ کیجیے۔

طالبِ دعائے خیر ومغفرت

سید محمد کفیل بخاری

۳/ ربیع الاوّل ۱۴۳۱ھ مطابق ۱۸/ فروری ۲۰۱۰ء

مختصر سوانحی خاکہ

ذاتیات:

نام: سید محمد ذوالکفل بخاری رحمتہ اللہ علیہ

ولدیت: پروفیسر حافظ سید محمد وکیل شاہ صاحب مدظلہ

تاریخ پیدائش: ۱۰/ دسمبر ۱۹۷۰ء

خاندانی روایت کے مطابق: ۲/ رمضان المبارک ۱۳۸۹ھ مطابق ۱۳/ نومبر ۱۹۶۹ء بروز جمعرات، ملتان

زبان دانی: انگریزی، اردو، عربی، فارسی

تعلیم: تکمیل ناظرہ قرآن کریم (جامعہ خیر المدارس، ملتان) (۱۹۷۸ء)

- o ایم اے انگریزی　بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان　(۱۹۹۴ء)
- o ایم اے اردو　〃　〃　〃　(۱۹۹۹ء)
- o ایل ایل بی　〃　〃　〃　(۱۹۹۶ء)
- o بی ایڈ　〃　〃　〃　(۱۹۹۵ء)
- o ٹیفل　(Teaching of English as Foreign Language)
  علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد　(۱۹۹۸ء)
- o انگلش لینگویج ڈپلوما کورس نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد　(۲۰۰۰ء)
- o گریجویشن　بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان　(۱۹۹۱ء)
- o ایف ایس سی　گورنمنٹ کالج، ملتان　(۱۹۸۹ء)
- o میٹرک　گورنمنٹ اسلامیہ ہائی سکول عام خاص باغ، ملتان　(۱۹۸۶ء)

تدریس (بارہ سال):

- o بطور لیکچرر انگریزی گورنمنٹ ٹیکنالوجی کالج لیہ/ گورنمنٹ ٹیکنالوجی کالج ملتان　(۱۹۹۶ء۔۲۰۰۲ء)
- o بطور استاد اردو (اعزازی)---- پنجاب کالج آف انفارمیشن ٹیکنالوجی ملتان　(۲۰۰۱ء۔۲۰۰۲ء)
- o بطور استاد انگریزی (ڈیپوٹیشن پر سعودی عرب میں)　(۲۰۰۲ء۔۲۰۰۹ء)
  مدرسہ نورالدین زنگی، مدرسہ ابی سعید الخدری املج (تبوک)
- o بطور استاد انگریزی (اعزازی) رائز کالج ملتان　(۲۰۰۹ء)
- o بطور استاد انگریزی۔ جامعہ اُم القریٰ مکہ مکرمہ　(۲۰۰۹ء)

تاریخ شہادت: ۲۷/ ذوالقعدہ ۱۴۳۰ھ مطابق ۱۵/ نومبر ۲۰۰۹ء بروز اتوار، مکہ مکرمہ

نمازِ جنازہ: ۲۸/ ذوالقعدہ ۱۴۳۰ھ مطابق ۱۶/ نومبر ۲۰۰۹ء بروز سوموار، بعد نمازِ فجر، حرم شریف مکہ مکرمہ

تدفین: احاطۂ بنی ہاشم، جنت المعلیٰ، مکہ مکرمہ

ادَبی، صحافتی اور دیگر تحریری مشاغل کی ایک جھلک

(صحافت و ادارت، تنقید و تبصرہ، ترجمہ، شاعری، کالم نگاری)

مطبوعہ:

۱۔ شریک مرتب: اردو-انگریزی لغت (چودھری غلام رسول اینڈ سنز لاہور) (۲۰۰۹ء)
۲۔ ادَبی و سیاسی کالم: حرفِ بے آمیز۔ روزنامہ خبریں ملتان۔ (۲۰۰۸ء)
۳۔ یک سالہ جلد۔ صفحۂ ادب، روزنامہ خبریں ملتان (انچارج ادَبی صفحہ) (۱۹۹۸ء۔۱۹۹۹ء)
۴۔ حسنِ انتقاد (تبصرۂ کتب کا کالم) ماہنامہ نقیبِ ختمِ نبوت ملتان (۱۹۸۷ء۔۱۹۹۹ء)
۵۔ ادَبی کالم: مناسبات۔ روزنامہ خبریں ملتان۔ (۱۹۹۸ء)
۶۔ ادَبی کالم: رپورتاژ۔ روزنامہ نوائے وقت ملتان (۱۹۹۲ء۔۱۹۹۸ء)
۷۔ سٹاف ایڈیٹر: مجلّہ صنّاع (گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی ملتان) (۱۹۹۶ء۔۱۹۹۷ء)
۸۔ آپریشن خلافت (تراجم/ تدوین و ترتیب) (۱۹۹۶ء)
۹۔ رکنِ ادارت: ورلڈ نیوز (سلسلۂ اشاعت) (۱۹۹۵ء۔۱۹۹۶ء)
۱۰۔ سیاسی و ادَبی تبصرے/ مکتوبات ہفت روزہ چٹان لاہور (۱۹۹۵ء۔۱۹۹۶ء)
۱۱۔ شریک مدیر و مرتب: امیرِ شریعتؒ نمبر، خصوصی اشاعت ماہنامہ نقیبِ ختم نبوت ملتان۔ جلد اوّل و دوم (۱۹۹۲ء۔۱۹۹۵ء)
۱۲۔ شریک مدیر: پندرہ روزہ الاحرار لاہور (۱۹۸۳ء۔۱۹۸۸ء)
۱۳۔ متفرق مضامین و مقالات: ماہنامہ نقیبِ ختمِ نبوت ملتان؛ ہفت روزہ زندگی لاہور؛ سہ ماہی شبیبہ خوشاب/ لاہور؛ سہ ماہی الزبیر بہاول پور؛ ماہنامہ الحمراء لاہور؛ ششماہی مخزن لاہور؛ مجلّہ نخلستان (گورنمنٹ کالج ملتان)؛ مجلّہ دلیلِ سحر (گورنمنٹ کالج سول لائنز ملتان)؛ اِن کے علاوہ پاکستان کی مختلف جامعات کے تحقیقی جرائد میں مقالات شائع ہوئے: جرنل آف ریسرچ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان؛ مجلّہ الماس، شاہ عبداللطیف یونیورسٹی خیر پور؛ مجلّہ تحقیق، سندھ یونیورسٹی جامشورو؛ مجلّہ خیابان، جامعۂ پشاور۔
۱۴۔ غزلیں، نظمیں (مختلف ادبی جرائد، بشمول ماہِ نو (لاہور)؛ اشارت (ملتان)

غیر مطبوعہ:

۱۔ شریک مرتب: اردو-اردو لغت (چودھری غلام رسول اینڈ سنز لاہور) (زیرِ ترتیب)
۲۔ مناسبات: مجموعۂ تحریرات (مکالمات، رپورتاژ، خاکے، تبصرے، تنقیدی جائزے)
۳۔ حدیثِ خواب: ترجمہ/ انسائیکلو پیڈیا آف ڈریمز (شریک مترجم)
۴۔ اسماعیلی دائرۃ المعارف: ترجمہ/ اسماعیلی ڈاکٹرائن اینڈ ہسٹری (شریک مترجم)
۵۔ شام جھانکتی ہوئی: شعری مجموعہ
۶۔ Beyond the Dunes "An Anthlolgy of Modern Saudi Literature" (شریک مترجم)

عکسِ تحریر

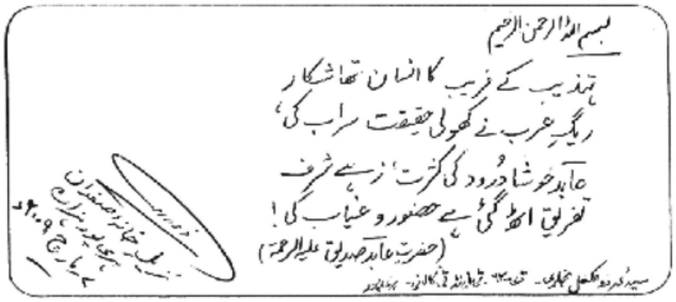

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تہذیب کے فریب کا انسان تھا شکار
ریگِ عرب نے کھولی حقیقت سراب کی
عابدؔ خوشا درود کی کثرت، زہے شرف
توفیق اٹھ گئی ہے حضور و غیاب کی!
(حضرت عابد صدیق علیہ الرحمۃ)

ڈاکٹر حافظ صفوان محمد چوہان کو دیا گیا آٹوگراف، ۷/ مارچ ۲۰۰۹ء

عکسِ تحریر

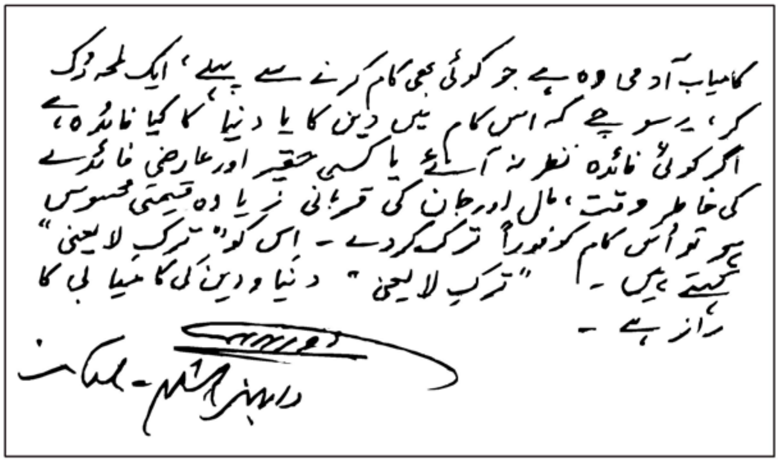

کامیاب آدمی وہ ہے جو کوئی بھی کام کرنے سے پہلے، ایک لمحہ رُک
کر، یہ سوچے کہ اس کام میں دین کا یا دنیا کا کیا فائدہ ہے،
اگر کوئی فائدہ نظر نہ آئے یا کسی حقیر اور عارضی فائدے
کی خاطر وقت، مال اور جان کی قربانی زیادہ قیمتی محسوس
ہو تو اس کام کو فوراً ترک کردے۔ اس کو "ترکِ لایعنی"
کہتے ہیں۔ "ترکِ لایعنی" دنیا و دین کی کامیابی کا
راز ہے۔

الیاس میراں پوری کو دیا گیا آٹوگراف، ۱۳/ اپریل ۱۹۹۹ء

عکسِ تحریر

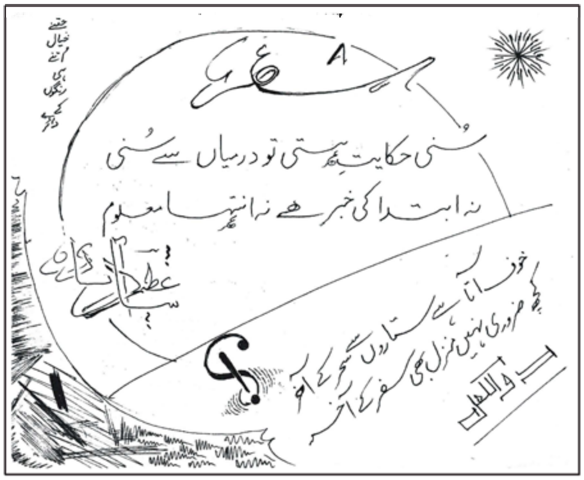

زمانۂ طالب علمی کی خوش خطی کا عکس
اوپر شاد عظیم آبادی کا شعر ہے اور نیچے اپنا شعر

چشمِ بد دور

جانشینِ امیرِ شریعت سید ابوذر بخاریؒ

......سید محمد ذوالکفل حسینی بخاری سلمہٗ الباری تمام بھائی بہنوں کے مقابلہ میں اپنی سادہ شکل وصورت اور باوجود بالکل غیر ذہانت آمیز وضع قطع کے ابتدائی چند سالہ زندگی کے سوا چشمِ بد دور بالکل غیر متوقع اور حیرت انگیز طور پر بے حد ذہین وفطین، بیدار دل ودماغ اور غور وفکر کی خوگر طبیعت کے ساتھ بڑے ہی حوصلہ افزا اور مستقبل میں بہت سی علمی اور دینی ترقیات کے ضامن اندازِ تعلیم وتقریر وتحریر کے ساتھ اُبھرا ہے۔ خود میں تین چار سال کی عمر سے اُس کا بہ طورِ خاص مشاہدہ کرتا رہا ہوں کہ وہ بچپن کی معصوم گھڑیوں میں بھی گھر میں آنے جانے والے تمام افراد کی ہر گفتگو غیر معمولی طور سے ماتھے پر بل ڈال کر اور آنکھیں کھول کر مکمل جائزہ لینے کے انداز میں توجہ ویکسوئی کے ساتھ سماعت کیا کرتا تھا، اور ہر نقل وحرکت کا بڑی ہی گہری نظر کے ساتھ مطالعہ ومشاہدہ کیا کرتا تھا جس پر بعض اوقات تو مجھے یہ شبہ ہونے لگتا تھا کہ شاید خدانخواستہ ہمارے گھرانے میں یہ پہلا ''ضعیف الدماغ'' اور ''قلیل العقل'' بچہ ہے۔ لیکن جب اُس کے ''خفیہ جوہر'' کھلنے لگے تو اُس کے سر میں اُس کے وجود وجسامت اور قد وقامت کے مقابلہ میں ایک بہت بڑا مضبوط ومتحرک اور ایجاد واختراع انگیز دماغ موجود ہونے کا حیرت وفرحت آمیز علم ہوا، اور نقل وحرکت کا مشاہدہ کرنے میں اُس کی گہری توجہ ودلچسپی کی صحیح ترین یہ توجیہہ سمجھ میں آئی کہ دراصل اُس کو اللہ تعالیٰ نے بڑی متجسس اور اخّاذ فطرت وطبیعت سے نوازا ہے۔ چنانچہ پھر مجھے اُس کے بچپن میں اُس کی یہ حالت وکیفیت مسلسل دیکھ دیکھ کر اپنے تاثر کے مطابق اُس کے متعلق سیکڑوں بار کہے ہوئے یہ الفاظ یاد آنے لگے کہ: ''یہ باتیں سننے سمجھنے اور اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں بالکل ''ٹیپ ریکارڈر مشین'' ہے۔'' تو ہمشیر اور اُس کے سب بھائی بہن میری بھرپور تائید کیا کرتے تھے کہ آپ بالکل ٹھیک کہتے رہتے ہیں۔ واقعۃً یہ ''ٹیپ ریکارڈر'' ہی ہے۔ ایسے ہی ہمشیر کوئی بات کرتی اور میں پوچھتا کہ ''یہ لفظ کس نے کہا ہے؟'' تو وہ بھی بے اختیار مسکرا کر جواب دیتی کہ گھر میں ایسی بات اور کون کہے گا؟ یہ جس کو آپ ٹیپ ریکارڈر کہتے ہیں اُسی نے کہا ہے۔ تو میں فوراً کہہ دیتا کہ پھر اُس کے متعلق میرا تجزیہ ٹھیک ہے نا؟ کیونکہ تمھارے سب بچوں میں اُس کے سوا اور کسی کی بھی یہ دماغی حالت اور کیفیت نہیں ہے۔ اور میں اِسے ذہانت اور قوتِ اخذ واقتباس کی علامت سمجھتا ہوں؟ تو وہ جواب میں کہتی کہ بالکل ٹھیک، آپ کا یہ تجزیہ وتبصرہ اور یہ تمثیل بالکل مطابقِ حال ہے۔ اللہ نظرِ بد سے بچائے، واقعی وہ دوسرں سے زیادہ ذہین اور حساس ہے۔ بس دعا کرتے رہیں۔......

(اخذ وتلخیص از دیباچہ مشاہداتِ قادیان، ص: ۱۷۔۱۲ فروری ۱۹۸۷ء)

بنو ہاشم کی انگشتری کا نگینہ

ابنِ امیر شریعت سید عطاء المحسن بخاریؒ

اللہ تعالیٰ نے ہمارے خاندان کو منّے (ذوالکفل) کی صورت میں ایک بڑی نعمت سے نوازا ہے۔ ''منّا'' بنو ہاشم کی انگشتری کا وہ نگینہ ہے جس کی چمک کبھی ماند نہیں پڑے گی۔ اس کے چُبھتے ہوئے سوالات چونکا دیتے ہیں اور بعض اوقات وہ مجھے امتحان میں ڈال دیتا ہے۔ وسعتِ مطالعہ، علمی و ادبی ذوق، دینی وضع قطع اور شرم و حیا سے مرصّع و مزیّن پیکرِ صدق و صفا ذوالکفل ہمارے خاندان کے ماتھے کا جھومر ہے۔ وہ صالح بھی ہے اور باصلاحیت بھی۔

جماعتی زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے۔ قحط الرّجال کا احساس ہمیشہ دامن گیر رہا مگر منّے کو علمی و دینی میدان میں آگے بڑھتا ہوا دیکھ کر مطمئن ہوں کہ ہمارے خاندان میں علم و عمل کے چراغ جلتے رہیں گے اور اِن کی روشنی مدّھم نہ ہوگی۔ ذوالکفل میری مراد ہے۔

ماہنامہ نقیبِ ختمِ نبوت میں
ذوالکفل بخاریؒ کی تحریر پڑھ کر مجلسِ احباب میں تاثرات کا اظہار
دارِ بنی ہاشم، جنوری، ۱۹۹۴ء

انٹرویو: پروفیسر سید محمد وکیل شاہ

گفتگو: ڈاکٹر حافظ صفوان محمد چوہان

سید محمد ذوالکفل بخاری کے والدِ ماجد جناب پروفیسر سید محمد وکیل شاہ صاحب سے گفتگو کے ذریعے ذوالکفل بخاری کے بارے میں معلومات اور تاثرات قارئین کی نذر ہیں۔(ادارہ)

صفوان: ذوالکفل کے بچپن اور تعلیمی حوالے سے کچھ بتائیں گے؟

شاہ جی: ذوالکفل کی پیدائش تو نانی اماں کے گھر میں ہوئی تھی، لیکن ہم نے اپنے بچوں کو دینی تعلیم سے آراستہ کرنے کے لیے خیرالمدارس ملتان میں مکان کرایہ پر لیا اور وہاں اپنی رہائش رکھی۔ ذوالکفل پیدائش کے وقت بہت کمزور تھا اس لیے ہم نے اُسے حفظ میں نہیں لگایا۔ صحت اُس کی اتنی اچھی نہ تھی۔ کفیل شاہ کو البتہ حفظ میں لگایا۔ گھر کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا بالکل پھٹیچر پرائمری سکول تھا، وہیں ذوالکفل کو داخل کرادیا گیا۔ اگرچہ وہ معیار کے اعتبار سے کچھ زیادہ اچھا سکول نہیں تھا لیکن چونکہ قریب تھا اور آنا جانا آسان تھا، اور چونکہ میری پوسٹنگ اوکاڑہ تھی اور میں یہاں نہیں ہوتا تھا، اِس لیے ایسا کیا گیا۔ تو یہ روزانہ سکول سے آکر اپنے اساتذہ کے کوئی لطائف بھی سنایا کرتا تھا۔ سکول میں داخلے سے دوسرے روز وہ پڑھ کر آیا تو اُس نے سنایا کہ آج استادِ محترم نے فرمایا کہ برسات کے موسم میں ہوا بند ہوجائے تو ''جَس'' ہوجاتا ہے۔ میں نے سبق کے بعد ہم جماعتوں سے کہا کہ یہ حَبس ہوتا ہے، جَس نہیں، تو وہ کہنے لگے کہ تو زیادہ پڑھا ہوا ہے؟ اُنھوں نے ماسٹر جی سے کہا کہ یہ نیا لڑکا حَبس کو جَبس کہتا ہے۔ فرمانے لگے کہ یہ بھی ٹھیک کہتا ہے۔

والدہ اُس کو گھر سے باہر نہیں جانے دیتی تھیں۔ اِس لیے یہ واحد بچہ تھا جس نے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں حصہ نہیں لیا۔ عبداللطیف صاحب ہمارے پڑوسی اور مولانا خیر محمد صاحب کے داماد تھے، اُن کے بچوں سے اِس کی شناسائی تھی۔ گھریلو ماحول میں والدہ اور بہنوں کی تربیت کی وجہ سے اِس کو بڑا شوق تھا کہانیاں وغیرہ پڑھنے کا اور سننے کا۔ چھوٹی چھوٹی کہانیاں لے کر آتا چار چار آنے کی، اور وہ پڑھتا رہتا۔ جب وہ ختم ہوجاتیں تو پھر اُن کو اکٹھی کر کے بیچ دیا کرتا تھا اور پھر نئی خرید لاتا تھا۔ اِس کی ساری سرگرمیاں گھر تک ہی محدود تھیں۔ گھر سے باہر اِس کا جانا ہوتا ہی نہ تھا۔

میں نے ذوالکفل کو پہلی جماعت میں داخل کرادیا لیکن اُس کی تعلیمی صلاحیت ماشاء اللہ اِتنی اچھی تھی کہ اُس نے پہلی جماعت میں داخل ہونا گوارا ہی نہ کیا اور کہنے لگا میں تو دوسری جماعت میں پڑھوں گا۔ پھر میں نے ایجوکیشن آفس سے منظوری لے کر اُس کو دوسری جماعت میں داخل کروایا۔ اُس کے ہیڈ ماسٹر صاحب بھی یہی کہتے تھے کہ اِس کو دوسری جماعت میں داخل ہونا چاہیے۔ بہرحال وہاں اُس نے پرائمری کی۔ اُس کے بعد پھر وہ عبدالغفور انوری صاحب مرحوم کے نواسے خبیب کے ساتھ پڑھنے جاتا تھا۔ اُس کو اسلامیہ ہائی سکول عام خاص باغ میں داخل کروا دیا۔ وہاں اُس کی تعلیم بالکل ٹھیک جارہی تھی۔ میٹرک میں اُس نے سائنس کے مضامین کا انتخاب کیا۔ دسویں میں ایک نئے ٹیچر علی احمد پائلٹ سکول سے ٹرانسفر ہوکر وہاں پہنچے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ اِس بچے میں ادبی ذوق زیادہ

ہے۔ اُن دنوں اُس نے نظمیں لکھنی شروع کر دی تھیں اور مضامین بھی لکھتا تھا۔ تو اُنھوں نے اِس کو یہ کہا کہ تم اگر سائنس کی بجائے آرٹس میں آتے تو تمھاری بورڈ میں کوئی پوزیشن ہوتی۔ یوں اُس کی دلچسپی سائنس میں کم ہوگئی۔ وہاں سکول میں اُس کی نمایاں پوزیشن ہوتی تھی۔ جب اُس نے میٹرک کا امتحان دیا تو میں نے اُس کے ہیڈ ماسٹر صاحب سے کہا کہ پریکٹیکل میں اِس کا خیال رکھیں۔ ہیڈ ماسٹر صاحب نے کہا کہ ذوالکفل اُن بچوں میں سے ہے جن پر ہمارے سکول کی نیک نامی کا انحصار ہے۔ ایسے بچوں کا تو ہم لوگ خود خیال رکھتے ہیں۔ آپ کو کہنے کی ضرورت نہیں۔ بہرحال میٹرک میں اچھے نمبر آگئے۔ اِس کے بعد اُس کا ذہن سائنس سے اچاٹ ہوگیا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں آرٹس میں چلا جاؤں لیکن اُس کے دوست اور ہم جماعت خبیب کو اُس کی والدہ نے کہا کہ تمھیں ضرور سائنس رکھنی ہے۔ چنانچہ خبیب نے ذوالکفل کو بھی مجبور کیا اور اُس نے سائنس مضامین کے ساتھ گورنمنٹ کالج بوسن روڈ میں داخلہ لے لیا۔ اُس نے ایف ایس سی تو پاس کی لیکن نمبر ایسے نہیں تھے کہ اِس فیلڈ میں آگے جا سکے۔ اِن دنوں میری سروس سول لائنز کالج ملتان میں تھی۔ میں اُس کو وہاں لے آیا۔ یہاں اُس نے بی اے بڑے اچھے نمبروں سے پاس کیا۔ اِس کے بعد وہ ازخود ایک بہتر اور صحیح سمت پر چل نکلا تھا۔

ذوالکفل گورنمنٹ کالج بوسن روڈ میں جتنا عرصہ رہا، مختلف اخبارات اور مجلّات میں مضامین لکھتا رہا۔ اُس کے اساتذہ اُس کی صلاحیتوں سے بہت متاثر تھے اور خصوصی توجہ رکھتے تھے کہ یہ بچہ تھوڑی عمر میں اتنا آگے جا رہا ہے۔ وہ جن دنوں سول لائنز کالج میں پڑھتا تھا تو پروفیسر تاثیر وجدان صاحب یہیں ہوتے تھے، اُنھوں نے بھی اُس کی ہمت بڑھائی۔ یہ اُن کے اندازے سے بھی آگے بڑھتا چلا گیا۔ الحمدللہ ذوالکفل نے تعلیمی میدان میں بڑی کامیابیاں حاصل کیں۔ میٹرک کا امتحان دیا تو میں نے کہا نتیجہ آنے تک تم خطاطی سیکھ لو تاکہ تمھارا خط اچھا ہو جائے۔ چنانچہ اُس نے دو تین ماہ خطاطی سیکھی اور اُس کا خط کافی اچھا ہوگیا۔ جب بھی اُسے فرصت ہوتی تو فارغ نہیں بیٹھتا تھا۔ لکھنے پڑھنے میں مشغول ہو جاتا یا پھر کسی نئے امتحان کے بارے میں سوچتا تھا۔ ایم اے انگلش کیا۔ پھر بی ایڈ کیا۔ پھر ایل ایل بی کیا۔ پھر نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز اسلام آباد سے انگلش لینگوئج میں ڈپلومہ کیا اور علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے TEFL کیا۔ ڈاکٹر اسلم انصاری صاحب نے ذوالکفل سے کہا کہ آپ ایم اے اردو کریں، میں ایم اے انگلش کرتا ہوں۔ ذوالکفل نے کہا ٹھیک ہے۔ پھر اُس نے ایم اے اردو بھی کرلیا، لیکن اسلم انصاری صاحب نے ایم اے انگلش نہ کیا۔ شاید اُنھوں نے ذوالکفل کو مہمیز کرنے کے لیے ایسا کہا ہوگا۔ تعلیمی میدان کی سرگرمیوں میں ایک تو اُسے اساتذہ اچھے ملے، کچھ گھر کا ماحول ملا۔ اور اُس کی کوئی اور مصروفیت تھی ہی نہیں سوائے پڑھنے پڑھانے کے۔ وہ تو سراپا تعلیم کا ہی ہو کر رہ گیا۔ اساتذہ اُس سے مطمئن تھے۔ بچپن میں شرارتوں والا سلسلہ ہی نہیں تھا۔ گھر میں بڑے بزرگوں، تحریکِ پاکستان میں نامور لوگوں اور علما کے کردار کی باتیں سن سن کر اُس کا ذہن بہت پختہ ہوگیا تھا۔ چنانچہ کسی موضوع پر گفتگو شروع ہو جائے تو وہ خوب گفتگو کرتا اور شرکائے مجلس سے بحث کرتا، بلکہ لوگوں بحث میں الجھا کر لطف اندوز ہوتا تھا۔ خیر المدارس کے ماحول میں بھی اُسے کچھ ساتھی ایسے مل گئے جیسے مولانا ازہر صاحب، عبدالمنان صاحب وغیرہ۔ اِن سے اُس کا بڑا گہرا تعلق تھا۔ اسی طرح وہ مدرسہ کے تمام اساتذہ کا بڑا احترام کرتا اور اُن سے ملتا جلتا رہتا۔

صفوان: ذوالکفل کی شاعری ہو یا نثر، دونوں میں مذہبی، سیاسی اور معاشرتی حوالوں کے گہرے مشاہدے کی خوبی نظر آتی ہے۔ یہ باتیں ہمارے عام نصابِ تعلیم میں نہیں ملتیں۔ یہ انفرادیت اُنھوں نے کیسے حاصل کی؟

شاہ جی: میں سمجھتا ہوں کہ بنیادی طور پر تو اُسے یہ خوبی اپنی والدہ کی طرف سے ہی ملی۔ والدہ بچوں کو گزرے دور کے وہ سارے قصے اور واقعات سناتی تھیں جنھیں وہ اپنی آنکھوں دیکھ چکی تھیں، کیونکہ شاہ جی رحمہ اللہ کے گھر میں نامور مذہبی اور سیاسی رہنماؤں کے علاوہ ادیب وشاعر بھی آتے تھے۔ یہ بڑے شوق سے وہ ساری داستانیں سنتا تھا۔ سید ابوذر بخاری رحمہ اللہ، ہمارے بڑے بھائی صاحب، نے اُس کے ذوق کو دیکھ کر اُس کی تربیت میں بڑا رول ادا کیا اور وہ اُس کی بہت حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ اُن سے تو اکثر جا کر ملتا تھا اور وہ اُس کا بڑا استقبال کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ ''آیئے علامہ صاحب تشریف لایئے، کوئی نئی بات سنائیں۔'' پھر وہاں گفتگو کا سلسلہ چل نکلتا۔ بھائی جان سید ابوذر بخاریؒ سے اُس نے بھرپور استفادہ کیا۔ بھائی عطاء المحسن مرحوم نے بھی اُس کی بڑی سرپرستی کی۔

صفوان: ذوالکفل کا شاعری کی طرف رجحان کیسے ہوا؟

شاہ جی: یہ رجحان طبعی تھا۔ جیسے آپ کو بتایا، کہ نویں دسویں کلاس میں پہنچنے سے پہلے ہی وہ لکھتا لکھاتا رہا۔ اُس کے ابتدائی شعر اور اُس کی نظمیں، ایک دو جو ملی ہیں، وہ سکول کے زمانہ کی ہیں۔ لیکن لٹریچر کی طرف اُس کا میلان خاندانی حوالوں سے زیادہ طبعی طور پر تھا۔

صفوان: ذوالکفل کے کمرے میں ہر طرح کی کتابیں ہوا کرتی تھیں۔ آپ بتاسکیں گے کہ خاص طور پر کس قسم کی کتابیں اُن کے زیرِ مطالعہ رہیں؟

شاہ جی: میرے خیال میں تمام موضوع برابر چلتے رہے کیونکہ ہر موضوع پر اُس کے پاس کتابیں تھیں۔ یہ ضروری نہیں ہوتا تھا کہ وہ صرف شاعری کی طرف توجہ دے اور دوسرے موضوعات کو چھوڑ دے۔ ہمہ پہلو اُس کا شوق چل رہا تھا۔

صفوان: تعلیمی سفر میں آپ نے ذوالکفل کی کسی خاص جہت میں سمت نمائی کی یا کرنا چاہی؟ جیسے مقابلے کا امتحان دینا وغیرہ۔

شاہ جی: نہیں، میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا۔ میں چونکہ اوکاڑہ میں رہتا تھا اور کبھی کبھار ملتان آتا تھا۔ ۱۹۸۲ء میں ٹرانسفر ہو کر یہاں (ملتان) آیا۔ اِس سے پہلے تو وہاں تھا۔ جب کہ ذوالکفل کی علمی تربیت بھائی جان مرحوم (سید ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ) کے زیرِ سایہ ہوتی رہی۔ اُس کی والدہ بھی تھیں۔ تیسرے نمبر پر بھائی عطاء المحسن مرحوم تھے۔ بھائی عطاء المحسن بخاری باقاعدہ شاعر نہیں تھے، لیکن طبیعت موزوں ہوتی تو شعر کہہ لیتے۔ کفیل شاہ نے اُن سے کہا کہ آپ کے اشعار کے اوزان میں کہیں جھول محسوس ہوتا ہو تو کسی شاعر سے مشورہ کر لیں، اسلم انصاری صاحب کو دکھالیں۔ تو محسن مرحوم کہتے کہ چھوڑو یار! بس ہمارا علامہ جو ہے، یہ کافی ہے ہمارے لیے۔ ہاں بھائی علامہ بتاؤ......تو ذوالکفل اُن کی شاعری کی نوک پلک بھی درست کر دیتا۔ یہ بھی ایک تربیت تھی۔ مطلب ہے کہ اِس قسم کا ماحول تھا کہ کسی اور طرف اُس کی توجہ گئی ہی نہیں۔ پڑھنے پڑھانے تک ہی محدود رہا۔ ویسے بھی وہ جسمانی طور پر اِتنا پہلوان تو تھا ہی نہیں، کمزور ہی تھا۔

صفوان: ذوالکفل اپنے بہن بھائیوں میں شعر وادب کے ذوق میں ممتاز تھے۔ جب سب بچوں کو ایک جیسا ماحول ملا تو یہ ایک بچہ آگے کیسے بڑھ گیا؟ گھر کی کچھ اور باتیں بھی بتادیں۔

شاہ جی: جی ہاں! سب سے ممتاز یہی رہے۔ بلکہ بہنیں بھی اُس سے رہنمائی لیتی تھیں۔ کبھی کبھار کوئی بات پوچھنی ہوتی کہ یہ فلاں جگہ لکھا ہے، یہ بات کیسی ہے، فلاں لفظ کیسا ہے، فلاں مسئلہ کیسا ہے۔ وغیرہ۔

عموماً یہ فطری بات ہوتی ہے کہ سب سے چھوٹا بچہ لاڈلا ہوتا ہے، لیکن اِس کے باوجود اُس میں سادگی شروع سے لے کر آخر تک رہی۔ جب وہ پروفیسر تھا تب بھی گھر کے کام کاج کے لیے جہاں اُس کو بھیجا جاتا، پیدل جا رہا ہے۔

کوئی چیز اُٹھا کے لا رہا ہے۔ گندم پسوانی ہے، یہ سائیکل یا موٹر سائیکل پر پسوا لاتا۔ ایسے کام میں کبھی اُس نے عار محسوس نہ کی اگر چہ اُس کے بڑے دوست بھی آ کے بیٹھے ہوئے ہوں۔ بعض اوقات اُس کے اساتذہ بھی آ جاتے تھے۔ صبح صبح پیدل جا رہا ہے۔ ڈول ہاتھ میں پکڑا ہوا ہے۔ دودھ لا رہا ہے۔

صفوان: ذوالکفل نے اچھی تعلیم پائی۔ کیا وہ گھر کے بچوں کو تعلیمی حوالے سے رہنمائی بھی دیتے تھے؟

شاہ جی: وہ کسی پر اپنی رائے مسلط نہیں کرتا تھا۔ بات مشورہ تک ہی محدود ہوتی تھی۔ بس اُس کا ذوق یہی تھا کہ دینداری ہونی چاہیے اور جدید تعلیم بھی حاصل کرنی چاہیے۔ اپنے بھانجے، بھانجی، ماموں زاد عطاء المنان اور باقی بھی سب بچوں کو مشورہ دیتا رہتا تھا۔ میں خیر المدارس میں ہوتا تھا تو ایک دفعہ وفاق المدارس العربیہ کا اجلاس تھا جس میں مفتی رفیع عثمانی بھی آئے ہوئے تھے۔ میں اتفاق سے وہاں بیٹھا تھا تو انگریزی تعلیم کی بات چل نکلی۔ مفتی رفیع صاحب نے کہا کہ ہمارے بزرگوں سے یہ غلطی ہوئی ہے۔ اُنھیں انگریزی زبان کی مخالفت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ انگریزی نہ پڑھنے کی وجہ سے آج ہمیں قدم قدم پر پریشانی ہوتی ہے۔ مولوی عابد صاحب وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ کہنے لگے حضرت یہ بات درست نہیں ہے۔ بلکہ درست یوں ہے کہ ہمارے بزرگوں نے کبھی انگریزی زبان سے نفرت کا اظہار نہیں کیا۔ وہ یہ کہتے تھے کہ پہلے دین کی تعلیم کو ایسا مکمل کرلو اور اپنے اندر ایسے سمالو کہ اس پر کوئی دوسرا رنگ نہ چڑھے، ورنہ کچے رنگ کی صورت میں انگریزی غالب آ جاتی تھی اور بچے انگریزی کے ہو کر رہ جاتے تھے۔

تو یہی ذوالکفل کا نقطۂ نظر تھا کہ بچے اور ہمارے گھر کے افراد تعلیم حاصل کریں۔ اور انگریزی تعلیم ضرور ہونی چاہیے اِس لیے کہ اِس دور میں ہر کام انگریزی میں ہو رہا ہے۔ لیکن ساتھ دین بھی اِتنا ہی پختہ ہونا چاہیے۔ ویسے اُس کا اپنا مزاج یہ تھا کہ جب وہ کالج میں داخل ہوا تو ایک دین دشمن پروفیسر نے کہا تمھیں ٹوپی اُتارنی پڑے گی وگرنہ میں تمھیں اپنی جماعت میں بیٹھنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ وہ میرے پاس آیا اور کہا کہ میرا سیکشن تبدیل کروا دیجیے۔ میں نے کوشش کر کے سیکشن تبدیل کروا لیا۔ بعد میں جب اِدارے کے سربراہ کو اِس سارے قصے کا پتہ چلا تو اُس نے مجھ سے کہا آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا، اُس کا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ ذوالکفل تو رات کو سوتے وقت اپنی ٹوپی اتارے تو اتارے، ورنہ اُس کے سر سے ٹوپی نہیں اترتی تھی۔

یہ اُس کا مزاج تھا۔ وہ بچوں کو جدید تعلیم دلوانا چاہتا تھا۔ لیکن اِس کے ساتھ مشروط تھا کہ یہ پہلے دیندار ہوں، اور دینداری ایسی ہو کہ اُس پر کوئی اور رنگ نہ چڑھے۔ بچوں کے لیے ہمدرد کا ایک رسالہ ہے نونہال، وہ اُسے بڑا پسند تھا۔ دو لگوائے ہوئے تھے اُس نے۔ ایک اپنے گھر میں بچوں کے لیے اور دوسرا پیر جی کے گھر میں بچوں کے لیے۔ اِس لیے کہ یہ ایک دیندار مزاج کا اور معلوماتی رسالہ ہے۔ اِسی طرح اردو ٹھیک کرنے کے لیے اردو ڈائجسٹ پڑھنے کو بھی کہتا تھا۔ دیگر بھی کئی رسالے جن سے بچوں کی معلومات میں اضافہ ہو اور پڑھنے کا شوق پیدا ہو، اُن کی ترغیب دیتا۔

صفوان: بچے چیزوں کی فرمائش کیا کرتے ہیں۔ کیا ذوالکفل نے کتابوں کے علاوہ بھی کبھی کوئی چیز مانگی؟

شاہ جی: نہیں، بس ایک دفعہ جب وہ پروفیسر ہو گیا تو گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی جو شہر کے دوسرے حصے پر واقع ہے، وہاں تعیناتی ہوئی۔ تب اُس نے کہا کہ اگر موٹر سائیکل ہوتی تو اچھا تھا۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے، اور موٹر سائیکل اُسے لے دیا۔ بس یہی ایک فرمائش ہے، اور تو مجھے کوئی یاد نہیں ہے۔ بچپن کی بھی۔

صفوان: مزاج کے اعتبار سے اُن کی کوئی انفرادیت؟

شاہ جی: ذوالکفل کے مزاج میں سادگی تھی۔ اُس کا کمرہ دیکھیں، لباس دیکھیں، بالکل سادہ۔ یہ نہیں تھا کہ میرا لباس اِس قسم کا

ہونا چاہیے یا میری چال ڈھال ایسی ہونی چاہیے۔ دوست احباب میں بھی بالکل ایسا سادہ ہی رہتا تھا۔ اُسے کسی قسم کا کوئی کمپلیکس نہیں تھا۔ تعلیم وتعلم اور جدید فکری رجحانات کے حوالے سے اُس کی اپنی ایک مستحکم رائے ضرور تھی۔ اصل میں تو وہ دہریت، لادینیت وغیرہ کے خلاف تھا اور اِس پر کام بھی کرنا چاہتا تھا کہ ہمارے بہت سے علمائے کرام جاہلیتِ جدیدہ کی شرانگیزیوں سے ناواقف ہیں۔ تو اِس سلسلے میں اُس کا خیال تھا کہ تیاری ضرور کرنی چاہیے۔ تو وہ اپنی وضع قطع ویسی ہی رکھ کے آگے آگے بڑھ رہا تھا۔ مشفق خواجہ صاحب یہاں تشریف لائے تو گیٹ پر ہی اُن سے ملاقات ہوئی۔ دورانِ گفتگو ذوالکفل نے حوالے دیے کہ میں نے آپ کی فلاں تحریر پڑھی ہے، فلاں تحریر پڑھی ہے۔ وہ اُس سے بہت متاثر ہوئے، حالانکہ وہ پاکستان کے بہت بڑے ادیب اور نقاد تھے۔ کہنے لگے کہ یار آپ کی شکل وصورت کچھ اور طرح کی ہے، اندر سے آپ کچھ اور ہیں۔ یہ جو آپ نے گلے میں کپڑے کا مفلر جو ڈال رکھا ہے اِسے ہٹا دیں۔ تو ذوالکفل نے کہا کہ نہیں جی، یہ ایسے ہی رہے گا۔ وہ جہاں بھی گیا، اپنی وضع قطع نہیں بدلی۔ وہی رکھی۔ اُس نے جدید دنیا کے لوگوں کو اپنے قریب اکٹھا کرنے کی کوشش کی تا کہ اُن کا ایک مسلمانوں والا ذہن بن جائے۔ یہ تھی اُس کی ایک محنت۔ اِس کو آپ جو نام بھی دینا چاہیں دے سکتے ہیں۔

صفوان: ذوالکفل نے جب حضرت مولانا خواجہ خان محمد صاحب سے بیعت کی اُس کے بعد آپ نے اُس میں کوئی خاص تبدیلی دیکھی؟

شاہ جی: جی ہاں۔ بیعت کے بعد خاصی تبدیلی آئی اُس میں۔ عبادات کے سلسلے میں تو وہ پہلے بھی بڑا سنجیدہ تھا لیکن بیعت کے بعد عبادات میں یکسوئی آ گئی۔ اور واقعی جیسے حدیثِ مبارکہ میں آتا ہے کہ نماز ایسے پڑھنی چاہیے کہ گویا آپ اللہ تبارک وتعالیٰ کو دیکھ رہے ہیں اور اگر یہ کیفیت حاصل نہیں ہوتی تو اِتنا ضرور تصور کریں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو دیکھ رہے ہیں، اُس کی کیفیت ایسی ہی ہوتی تھی۔ وہ بڑے اہتمام کے ساتھ حضرت خواجہ صاحب مدظلہٗ کی خدمت میں جایا کرتا تھا۔ ایک دو اور اصحاب ہیں جیسے ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب، مولانا حبیب الرحمٰن ہاشمی، حاجی جابر علی صاحب وغیرہ، اِن حضرات کا تعلق بھی حضرت خواجہ صاحب سے تھا، کئی بار اِن احباب کے ساتھ خانقاہ حاضری دیتا۔ دین کا جو علم ہے یعنی عربی کا، درسِ نظامی وغیرہ، اُس میں اُس نے کہیں داخلہ لیا نہ پڑھا۔ لیکن اُس نے ترجمۂ قرآن، علم حدیث وفقہ اور تفسیر پر بہت مطالعہ کیا اور جید علماء کی صحبت واستفادہ نے مزید رنگ چڑھایا۔ مولانا حبیب الرحمٰن ہاشمی صاحب سے اِس لیے بھی تعلق رکھا کہ میں اُن کے علم سے فیضیاب ہوتا رہوں۔

صفوان: یہ فرمائیے کہ ذوالکفل اپنی عمر اور علم میں بڑھے ہوئے لوگوں میں بہت اہتمام سے اُٹھتا بیٹھتا تھا۔ اِس بارے میں کچھ فرمائیں۔

شاہ جی: ذوالکفل کی دوستی ہم عمروں سے تو تھی ہی لیکن بڑی عمر کے لوگ بھی تھے اُس کے دوستوں میں۔ ایک بار تو وہ آپ کے ساتھ مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ملا۔ اتفاق یہ ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے قریب گیا تھا جو واقعتاً قابلِ ستائش لوگ تھے۔ جتنے بھی اچھے ذہن والے لوگ تھے اُن کے ساتھ ہمیشہ رابطہ رکھا اُس نے۔ بزرگ اساتذہ جو علم وادب کے شہسوار تھے، اُن سے رابطہ رکھتا تھا۔ جہاں کہیں سے اُسے پتا چلتا تھا وہ ہمہ تن اُن کی مجلس میں موجود رہتا تھا۔ اِسی طرح سے عابد صدیق صاحب جب ملتان تشریف لاتے تو وہ پورا وقت اُن کے ساتھ صرف کرتا تھا۔ اور وہ بھی بڑی شفقت فرماتے تھے اُس پر۔ وہ بھی جب آتے تو پہلے یہی پوچھتے تھے کہ ذوالکفل کہاں ہے؟ اور جب ذوالکفل اُن کو مل جاتا تو وہ بھی خوش ہو جاتے تھے اور یہ بھی خوش ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹر خورشید رضوی سے ذوالکفل کی ایک آدھ ہی ملاقات ہوئی۔ لیکن وہ بھی اُس

کے بڑے مداح ہیں۔ ذوالکفل کا مزاج تھا ہی ایسا کہ جہاں اُسے پتا چلتا کہ فلاں آدمی علم وادب کا رسیا ہے تو وہ وہاں پہنچ جاتا۔ اُس سے استفادہ کرتا اور اپنی طرف سے جو اُس کی خدمت کر سکتا تھا، ہر اعتبار سے اُس میں بھی کوتاہی نہیں کرتا تھا۔

صفوان: ذوالکفل کے سعودیہ جانے کے بارے میں کچھ بتائیں۔

شاہ جی: ۲۰۰۲ء میں اُس نے وہاں ملازمت کے لیے درخواست دی تھی جو منظور ہوگئی۔ اور وہاں سے بلاوا آ گیا تو اُس وقت مجھے بتایا کہ میں نے Apply کیا تھا۔ میں جانا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے جاؤ، انٹرویو دے آؤ۔ انٹرویو دیا تو کامیاب ہوگیا۔ اُس کی والدہ نہیں چاہتی تھیں کہ وہ جائے۔ ویسے بھی گھریلو ماحول کچھ ایسا ہی تھا۔ حضرت امیرِ شریعت رحمۃ اللہ علیہ کا بھی تقریباً یہی مزاج تھا۔ مثلاً ہمارے مولوی یٰسین صاحب اُن کی بہت خدمت گزاری کرتے تھے۔ ایک دفعہ اُنھیں اخبار میں ایک اشتہار دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ بورے والا ٹیکسٹائل ملز کی مسجد میں خطیب کی جگہ فارغ ہے، تو ارادہ کرلیا کہ وہاں جاتا ہوں۔ شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اچھا بھئی، تم یہ سمجھتے ہو کہ یہاں خدا نہیں ہے وہاں خدا ہے۔ ذوالکفل کی والدہ نے بھی یہی کہا کہ دور جا رہے ہو۔ یہاں ملازمت موجود ہے، اللہ اُسی میں برکت دے گا۔ میں نے اُن سے اتفاق نہیں کیا۔ میں نے کہا کہ اُسے ضرور جانا چاہیے۔ کوئی اور شہر ہوتا، کوئی اور ملک ہوتا تو میں اختلاف کرتا لیکن مدینہ طیبہ، مکہ مکرمہ کی سرزمین میں یہ جائے گا تو اِس کے جانے سے ہمارے گناہوں کے اِزالے کی شاید کوئی صورت بن جائے، اِس لیے ضرور جانا چاہیے۔ اللہ نے کرم کیا۔ اُس کا کام بن گیا۔ وہاں جانے کے بعد حکومت نے اُسے تبوک ڈویژن میں بھیج دیا۔ پھر اُنھوں نے پوچھا ہاں جی، اب کون کون اپنی Option دیتا ہے۔ تو اُس نے وہاں مدینہ منورہ میں قاری عبداللطیف صاحب سے رابطہ کیا۔ اُنھوں نے کہا کہ تم اُملج کی آپشن دے دو، کہ اِس ڈویژن میں مدینہ منورہ سے قریب تر وہی علاقہ ہے۔ تو ذوالکفل نے وہی آپشن دیا۔ وہاں پاکستانی لوگ خاصے تھے۔ مانسہرہ کے قاری علی زمان صاحب بڑے مہربان تھے۔ اُنھوں نے رہائش تلاش کرنے میں بھی خاصی سہولت پیدا کردی، اپنے ساتھ ہی بندوبست کرادیا، تو چھے برس اُس نے وہاں گزارے۔ لیکن اُس کا شوق تھا کہ کسی نہ کسی طرح مدینہ منورہ یا مکہ مکرمہ میں کہیں ملازمت مل جائے۔ ۲۰۰۸ء میں اُس نے جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ میں درخواست دی۔ انٹرویو اور ٹیسٹ میں کامیاب ہوگیا۔ اُم القریٰ میں سلیکشن ہوئی تو وہ اُملج کے سکول سے ملازمت چھوڑ کر چھٹیوں میں پاکستان آ گیا۔ اِس دوران کوئی تکنیکی مسئلہ پیدا ہوگیا اور اُم القریٰ سے اُس کا ویزہ نہ آیا۔ اُن دنوں وہ کافی تنگ و دو کرتا رہا۔ ایک موقع پر مایوس بھی ہوگیا۔ تقریباً چھے مہینے وہ گھر پر رہا لیکن فارغ نہیں بیٹھا بلکہ مختلف کالجز میں پارٹ ٹائم پڑھاتا رہا۔ آخر اُس کی محنت بارآور ہوئی اور ام القریٰ سے ویزہ آ گیا۔ تقریباً چھے ماہ یونیورسٹی میں پڑھایا۔ وہ خود بھی بہت خوش تھا اور ہم بھی خوش تھے کہ وہ مکہ مکرمہ میں پہنچ گیا ہے۔ لیکن ایک ہوتی ہیں ہماری تمنائیں، ہماری آرزوئیں، خواہشات۔ اور ایک ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کا اپنا نظام...... وہ مختلف ہے۔

صفوان: ذوالکفل جب آخری بار گئے ہیں اُس وقت کی کوئی خاص بات آپ کے ذہن میں ہو؟

شاہ جی: عیدالاضحیٰ کے بعد جمعہ پڑھ کر اُس نے جانا تھا۔ نماز کے بعد اپنی والدہ، بہنوں اور بچوں اور سب گھر والوں کو مل کر وہ جب بھی جاتا تو میری کوشش ہوتی کہ میں بھی مشایعت کے لیے چلوں۔ گھر سے باہر رخصت کرنے تو عموماً جاتا تھا۔ اِس مرتبہ میں نے بھی ائیرپورٹ تک جانے کی خواہش کی لیکن کفیل شاہ نے کہا کہ ان دنوں سکیورٹی والے آگے نہیں جانے دیتے۔ ہم بھی جلدی آجائیں گے۔ جیسے آپ کی مرضی۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ میں نہیں گیا اور حسبِ معمول باہر سڑک تک اُسے رخصت کرنے آیا۔ لیکن یہ تو معلوم نہ تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے۔ دوسرے تیسرے دن عام طور پر

فون پہ بات ہو جاتی تھی اور وہ اپنی خیریت سے مطلع کرتا رہتا تھا۔ پندرہ بیس دنوں بعد اُس کے بچوں کا بھی ویزہ آ گیا اور وہ بھی مکہ مکرمہ اُس کے پاس چلے گئے۔ تقریباً بیس دن وہ اپنے بچوں کے ساتھ رہا۔ اور بہت خوش تھا۔ وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں سے جن کے بارے میں پتا چلتا کہ وہ اِس مرتبہ حج پہ آ رہے ہیں، کہتا کہ میرے ہاں ٹھہرنا ہوگا۔ یعنی یہ اُس کا مزاج تھا۔ وہ املج میں تھا تو وہاں تبلیغی جماعت کی پوری بس چلی گئی۔ وہ سب کو گھر لے آیا۔ کھانے کا اہتمام کیا۔ دوست احباب کے لیے تو یہاں بھی کبھی نہ کبھی وہ اہتمام کرتا تھا۔ یہ اُس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے خصوصیت عطا کی تھی کہ دل کھول کے خرچ کرتا تھا۔ وہاں بھی ایسے ہی کرتا رہا۔ اتفاق سے جب اُس کی وفات ہوئی ہے اُن دنوں میرا چھوٹا بھائی مصطفیٰ شاہ تبلیغی جماعت کے ساتھ حج کے لیے گیا ہوا تھا۔ اُس سے پہلے ملاقات بھی ہوتی رہی۔ گھر بھی آتا جاتا رہا۔ تو بڑا خوش تھا وہ وہاں پر۔ یہ اُس کی بڑی خواہش ہوتی تھی کہ اگر کوئی دوست یا ملنے والا آئے تو میرے پاس ہی آئے۔ میں ہی اُس کی خدمت کی سعادت حاصل کروں۔ گھر بھی مناسب لیا کہ جس میں لوگ ٹھہر سکیں۔ ۱۵/ نومبر اتوار کو اُس کا یہ حادثہ ہوا ہے۔ دو روز کے بعد منگل کو اُس نے اپنے احباب کو لیگز کی دعوت رکھی ہوئی تھی۔ بلکہ میں نے سنا ہے کہ جب وہ جاتا تو دوسرے پروفیسر دوست اُس کے ساتھ ہوتے تھے، اکیلا نہیں جاتا تھا۔ اکٹھے جاتے تھے اکٹھے ہی واپس آتے تھے۔ اُس روز اُس کا ایک پیریڈ فارغ تھا۔ اللہ جانے کس بنیاد پر۔ اُس نے کہا کہ میں جاتا ہوں۔ گھر سامان وغیرہ لے کر دے دوں گا پرسوں (دعوت) کے لیے جس کی ضرورت ہے۔ احباب کو اکٹھے کرنا اُس کا خاص ذوق اور شوق تھا۔ جیسے یہاں اُس نے علم وادب کے سلسلے میں فاران اکادمی کو جو ختم ہو چکی تھی، نسیًا منسیًا ہو گئی تھی، از سرِ نو اُس نے زندہ کیا۔ تو وہاں بھی جا کے اُس نے عالمی اردو مرکز جدہ کے احباب سے رابطہ کر لیا۔ اردو نیوز یا حلقۂ ادب وغیرہ میں بھی اُس نے جان ڈالی اور بڑا متحرک رہا۔ اُس کی وجہ سے وہاں کے احباب بڑے خوش تھے۔ ظہر کی نماز یونیورسٹی کی مسجد میں ادا کر کے گھر کے لیے نکلا ہی تھا کہ راستے میں حادثہ ہو گیا۔

صفوان: ذوالکفل کے ذاتی کتب خانے میں بہت کتابیں تھیں، وہ کیسے جمع کیں؟ کیا اُس کے لیے مالی معاونت آپ فراہم کرتے تھے؟

شاہ جی: ہم سے اُس نے کبھی پیسے مانگے ہی نہ تھے۔ جیسا میں نے پہلے عرض کیا کہ بھائی عطاء المحسن مرحوم اُس کی خواہشات کی تکمیل کرتے رہتے تھے۔ اماں جی (نانی اماں) بھی اُس کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ میرے خیال میں تو اُس کو مانگنے کی ضرورت پڑتی ہی نہ تھی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ہی اُس کا ایسا سلسلہ بن جاتا تھا اور وہ حسبِ ذوق اپنے لیے کتابیں اکٹھی کر لیا کرتا تھا۔

صفوان: آخری دن حادثے کی اطلاع کے بارے میں کچھ بتائیں گے؟

شاہ جی: میں اُس وقت مغرب سے پہلے اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ مجھے میری بیٹی نے اطلاع دی کہ اِس طرح سے ٹیلی فون پر خبر آئی ہے کہ ذوالکفل کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ میرے ذہن میں یہ نہیں تھا کہ کوئی اِتنا شدید حادثہ ہوا ہوگا۔ میں نے کہا اللہ تبارک وتعالیٰ کرم کریں گے۔ نماز کے بعد میں مدرسے کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد کفیل شاہ کو فون آیا تو یہ رونے لگ گیا، اور بتایا کہ ذوالکفل کا انتقال ہو گیا ہے۔ بس پھر طبعی طور پر انسان پر جو گزرتی ہے وہ تو ہونا ہی ہوتا ہے۔ پھر ذوالکفل کے دوستوں سے مکہ مکرمہ میں مسلسل رابطہ رہا۔ اُنھوں نے کہا کہ ہم آپ کو صورتِ حال سے مطلع کرتے رہیں گے۔ رات کو بھی وہ بتاتے رہے۔ دوستوں نے بڑی جد وجہد کی۔ تہجد کے وقت جب وہ جنازے کے لیے حرم شریف لے کر گئے تو اُس وقت بھی دوستوں نے فون کیا۔ فجر کے بعد بتایا کہ اِس وقت بیس لاکھ افراد حرم میں موجود

ہیں۔ اور اب ہم بخاری بھائی کی نمازِ جنازہ پڑھنے لگے ہیں۔ حج کا سیزن شروع ہو چکا تھا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی کرم نوازی تھی کہ اُس کو اِتنے مقتدی مل گئے۔ پھر وہ جنت المعلیٰ میں دفن کرنا چاہتے تھے۔ وہاں کئی رکاوٹیں تھیں کہ وہ غیر ملکی کو وہاں عموماً دفن نہیں ہونے دیتے۔ ویسے بھی بہت محدود داخلہ ہوتا ہے وہاں۔ اُس روز فجر کی نماز میں ۱۴ جنازے تھے۔ ایک ذوالکفل کا اور ۱۳ دوسرے۔ اللہ تعالیٰ سب کی مغفرت فرمائے۔ جنت المعلیٰ میں دفن کیے جانے کا سلسلہ نہیں بن رہا تھا، لیکن سب دوستوں کی محنت سے یہ مشکل مرحلہ بھی اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے طے ہوگیا۔

صفوان: آپ کے ذہن میں یہ تو نہیں آیا کہ میت پاکستان میں لے آئیں؟

شاہ جی: نہیں نہیں! یہ میرے ذہن میں تھا ہی نہیں۔ بلکہ میری بھی یہی خواہش تھی کہ جب وفات وہاں ہوئی ہے تو اِس سے بڑھ کر اور کیا سعادت ہے...... بے چارے کئی لوگ وہاں بیٹھے رہتے ہیں ساری عمر اس آرزو کے ساتھ کہ اللہ میاں ہمیں یہاں موت دے اور ہم یہاں دفن ہوں۔ ذوالکفل کی بھی یہی آرزو تھی۔ ہمارا ایک عزیز ہے حسنی مبارک۔ وہ وہیں تھا۔ اُس کا ذوالکفل سے دوستانہ تھا۔ اُس نے بتایا کہ جدہ میں ہمارے ایک مشترک شاعر دوست طاہر جمیل تھے۔ اُن کا انتقال ہوگیا تو میں نے کہا کہ شاہ جی! اب تو مجھے موت سے بہت ڈر لگتا ہے۔ شاہ جی یہ بتائیے کہ اگر موت آئے تو کیا یہیں دفن ہونا چاہیے؟ کہنے لگے اگر موت یہاں حرمین کی قربت میں آئے پھر تو یہیں دفن ہونا چاہیے کہ یہی سعادت ہے، البتہ باہر کہیں ہو تو پھر تو اپنا دیس ہی اچھا ہے۔ تو وہاں کے محکمہ نے جب پوچھا ہے اُن کی اہلیہ سے تو اُنھوں نے یہی کہا کہ اُن کی تمنا یہی تھی کہ میرا انتقال یہاں ہو تو میری تدفین بھی یہیں ہو، الحمدللہ اُس کی آرزو پوری ہوگئی...... تو اِن ۱۴ میتوں میں سے صرف ۳ کو اجازت ملی وہاں جنت المعلیٰ میں دفن ہونے کی۔ اُس میں ۲ خواتین تھیں جو عرب نیشنل تھیں۔ یہ اکیلا ہی غیر ملکی تھا۔ پھر اللہ میاں نے یہ بھی مہربانی کی کہ اُس کا چچا وہاں گیا ہوا تھا اور اُس کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح غسل دینے میں شریک ہو جائے۔ وہاں محکمے والے خود ہی تدفین، غسل وغیرہ کا اہتمام کرتے ہیں۔ اِس شعبے کا جو انچارج تھا، اُنھوں نے اُس کا تعارف کرایا۔ ذوالکفل کے ساتھیوں نے کہا کہ یہ اِس کا چچا ہے۔ اِس کی بڑی آرزو ہے۔ اُنھوں نے کہا ٹھیک ہے یہ بھی آجائیں۔ پھر اپنے ساتھیوں نے مل جل کر غسل دیا۔ یہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے خصوصی عنایت تھی۔

صفوان: کوئی اور بات جو آپ بتانا چاہیں ذوالکفل کے حوالے سے، ذاتی حوالے سے، گھر کے حوالے سے؟

شاہ جی: ذوالکفل کے ساتھ ہماری بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ بہت علم وفکر والا شخص تھا۔ بھائی عطاء المحسن مرحوم اُس کے علمی ذوق اور معیار کو دیکھ کر تحسیناً کہا کرتے تھے کہ اگر یہ اباجی (حضرت امیر شریعتؒ) کی زندگی میں ہوتا تو ہمارا مقام تو کہیں نہ ہوتا۔

ذوالکفل کے جانے سے خاندان میں ایک بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے۔ اُس کے بچوں سے سبھی محبت کرتے ہیں اور وہ سب سے مانوس ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں سلامت رکھے اور اپنے والد کی خوبیاں عطا فرمائے۔ میرا نواسہ اور ذوالکفل کا بھانجا عزیزم صبیح الحسن سوجھ بوجھ، پڑھنے والا اور محنتی ہے۔ اُس پر مرحوم نے بہت محنت کی تھی۔ میرا بھانجا عطاء المنان ہے۔ یہ دونوں نوجوان عالم، حافظ اور جدید تعلیم یافتہ ہیں۔ اِن سب بچوں سے اچھی امیدیں وابستہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں صالح بنائے اور اِن کے علم وعمل کو مرحوم ذوالکفل کے لیے صدقۂ جاریہ بنائے۔ وہ اِن بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے بہت فکر مند رہتا تھا۔

میرا مُنّا......!

سیدہ اُمّ ذوالکفل مدظلہا

محمد کفیل کہتا ہے:''امی! مُنّے کی یاد میں کچھ لکھیں۔''میں نے کہا:''بیٹا! میں مُنّے پر کیا لکھوں؟ میرے بس میں ہی نہیں، مجھ سے نہیں لکھا جاتا، حوصلہ ہی نہیں ہوتا، ہمت کرتی ہوں تو آنکھیں بھیگ جاتی ہیں اور اَنگ اَنگ دُکھنے لگتا ہے۔ صبر کرتی ہوں مگر آنسوؤں پر اختیار نہیں۔''

حضور خاتم النبیین، رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے لختِ جگر حضرت ابراہیم کا انتقال ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پُر نور آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہوگئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا میرے بیٹے، میں تیری جدائی میں بہت مغموم ہوں۔

میرے دکھی اور زخمی دل میں اب مُنّے کی یادیں ہی تو باقی رہ گئی ہیں یا پھر اس کی چلتی پھرتی اور جیتی جاگتی دو معصوم یادگاریں۔ عطاء المکرم اور عطاء المنعم، جنھیں دیکھ کر میں اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر لیتی ہوں اور جن کی باتیں سن کر دل کو سکون مل جاتا ہے۔ مُنّے کی یاد رہ رہ کر ستاتی ہے، اک ہُوک دل سے اٹھتی ہے اور مجھے بے چین کر دیتی ہے۔ بھائی جان (مولانا سید ابوذر بخاری رحمتہ اللہ علیہ) کے بچپن کی ایک کاپی میں یہ شعر پڑھا تھا جو سو فیصد میرے مُنّے پر منطبق ہوتا ہے:

مُغاں مجھ مست بِن پھر خندۂ قُلقُل نہ ہووے گا
مئے گلگوں کا شیشہ ہچکیاں لے لے کے رووے گا

سید محمد ذوالکفل بخاری، میرا تو ''مُنّا'' ہی تھا۔ اُس کا بچپن، لڑکپن اور جوانی سب میرے سامنے ہے۔ جامعہ خیر المدارس میں میرا قیام تقریباً پچیس برس رہا۔ ہمارے گھر سے متّصل پرائمری سکول تھا جہاں مُنّے کو داخل کرا دیا۔ وہ صبح سکول جاتا اور ظہر کے بعد جامعہ کے استاذ ماسٹر محمد یوسف صاحب (رحمہ اللہ) کے پاس قرآنِ کریم پڑھنے چلا جاتا۔ نمازِ عصر پڑھ کے گھر آتا۔ میں اُسے کہتی مُنّے کھیلنے کے لیے باہر نہ جاؤ۔ اپنی بہنوں کے ساتھ گھر میں ہی کھیلو۔ اپنے دوستوں کو بھی یہیں بلا لو۔ مُنّا ایسا ہی کرتا۔ ویسے بھی کھیل کی طرف اُس کی طبیعت کا رُجحان زیادہ نہ تھا۔ جو وقت بچتا وہ رسائل اور کتابوں کے مطالعے میں صرف کرتا۔ میری ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ میرے بچے گھر میں رہیں اور باہر کے ماحول کی آلودگیوں سے محفوظ رہیں۔ مُنّے سے کہتی: تمھیں جو چیز چاہیے منگا دیتی ہوں۔ مگر میرے سامنے رہو۔

مُنّے نے میری تمام خواہشوں کا مکمل احترام کیا۔ پابندی سے نماز ادا کرتا، سکول، کالج اور یونیورسٹی تک تعلیم کے دوران بھی ٹوپی سر پر رکھی اور داڑھی کی سنت سے اپنے چہرے کو سجایا۔ بچپن سے شہادت تک اُس نے بڑی پاکیزہ اور فرماں برداری والی زندگی گزاری۔ اس نے تو بچپن میں بھی مجھ سے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی۔ جو کھلایا اُس نے کھا لیا، جو پہنایا اُس نے پہن لیا اور جو کہا اُس نے مان لیا۔ اُس نے شوق سے پڑھا اور خوب پڑھا۔ علم و عمل میں کمال حاصل کیا۔ اپنے بزرگوں کا نام روشن کیا اور لوگوں کی محبتیں سمیٹتا ہوا ربِ رحیم و کریم کے حضور حاضر ہو گیا۔ گزشتہ سات برس سے وہ سعودی عرب میں تھا۔ چھے برس تبوک کے شہر اُملج میں تدریس کے فرائض انجام دیے اور ساتویں سال ارضِ مقدس مکہ مکرمہ میں آ گیا۔ ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ گھر آتا اور دو مہینوں بعد واپس چلا

جاتا۔ جب وہ آتا دل خوشی سے باغ باغ ہو جاتا، لیکن جب واپس جاتا تو دل مٹھی میں آ جاتا۔ مجھ سے اس کی جدائی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ حجازِ مقدس جانے سے پہلے میں نے مُنّے سے کہا کہ تمھارا بھائی محمد کفیل بوڑھا ہو رہا ہے۔ اب واپس آ کر اُس کا سہارا بنو۔ مگر اُس کے دل میں حرم کی محبت رچ بس چکی تھی۔ آخری بار مکہ مکرمہ جانے سے پہلے وہ سارا دن اپنا سامان سمیٹتا رہا۔ بار بار کوئی نہ کوئی چیز اُٹھا کر میرے سامنے سے گزرتا۔ میں اُسے دیکھ کر آنکھیں تو ٹھنڈی کرتی رہی مگر اُس کے جانے کے خیال سے دل بہت اُداس رہا۔ نمازِ جمعہ پڑھ کر گھر آیا اور رخصت ہوتے وقت حسبِ عادت گردن جھکا کر میرے پاس آ کر بیٹھ گیا، اور کہنے لگا کہ:

امی! اب میں سال میں دو مرتبہ آپ کو ملنے آیا کروں گا۔ ایک مرتبہ یونیورسٹی کے خرچ پر اور ایک مرتبہ اپنے خرچ پر۔ اب مجھے بہت اچھی جگہ مل گئی ہے۔

مُنّا اب جامعہ اُم القریٰ مکہ مکرمہ میں مدرّس ہو گیا تھا۔ میں اُس کی جدائی میں اداس ضرور تھی، لیکن اس بات کی خوشی تھی کہ اُسے حرمِ کعبہ کا قرب نصیب ہو گیا ہے۔ کیا خبر تھی کہ مُنّے سے یہ میری آخری ملاقات ہے۔ نہ جانے مُنّا اپنے ربِ کریم سے کیا مانگتا تھا۔ اُس نے کس گھڑی اپنے حسنِ خاتمہ کی دعا مانگی جو قبول ہو گئی۔ میرا مُنّا اب جنت المعلیٰ کے احاطۂ بنی ہاشم میں اُم المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے قدمین شریفین میں اپنے اجداد کے ساتھ ہمیشہ کے لیے سو گیا ہے۔

مُنّے، تمھاری بوڑھی امی تمھاری جدائی میں بہت مغموم ہے۔

شاباش آں صدف کہ چُناں پرورَد گُہر
آبا نواز و مُکرمِ ابنا عزیز تر

آفرین ہے اُس سیپی پر جس کے اندر (ایسے) موتی نے پرورش پائی جو بزرگوں کا خدمت گزار تھا اور اپنے سے چھوٹوں کے نزدیک معزز اور محبوب۔

محمد ذوالکفل ایسا ہی تھا کہ آج اُس سے بڑے اور اس سے چھوٹے سب اس کی یاد میں گریاں اور اُس کے بختِ بلند پر فرحاں ہیں۔

مُنّے نے ہمیں کبھی نہیں ستایا۔ وہ فرماں بردار بیٹا، غم گسار بھائی، اطاعت شعار شاگرد، مخلص استاد، محبت کرنے والا دوست، شفیق باپ اور حُسنِ سلوک کرنے والا خاوند تھا۔ غریب الوطنی میں شہادت کا مرتبہ ملنا اور شُرطی کا انگشتِ شہادت بلند کر کے اُس کے کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے جان، جانِ آفریں کے سپرد کرنے کی گواہی دینا اور موت کے بعد بھی اُس کی انگشتِ شہادت کا بلند رہنا، بیت اللہ میں لاکھوں حجاج کا اُس کی نمازِ جنازہ پڑھنا، جنت المعلیٰ میں دائمی ٹھکانا نصیب ہونا، اگر چہ دل کو بہت ڈھارس بندھاتے ہیں، مگر کیا کروں، صبر آتے ہی آئے گا۔ مُنّا، میرے ربِ کریم کی ملکیت تھا، سو اُس نے اپنی امانت واپس لے لی۔ میں اپنے ربِ رحیم کا شکر ادا کرتی ہوں جس نے اُسے حسنِ خاتمہ کی رفعت اور مجھے صبر کی نعمت سے نوازا۔ مُنّے کے لیے میرے اداس دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ اللہ اُس کی قبر کو نور سے بھر دے، اُس کے مرقد پر بے شمار رحمتیں نازل فرمائے اور رَوْضَةٌ مِّنْ رِيَاضِ الْجَنَّة بنائے۔ آخرت کی اپنی سب نعمتیں عطا فرمائے اور لواءُ الحمد کے نیچے جگہ عطا فرمائے۔ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک سے حوضِ کوثر سے پانی نصیب فرمائے اور شہداء و صالحین کے زمرہ میں اُٹھائے۔ آمین۔

اے اللہ! آپ نے ہی عطاء المکرم اور عطاء المنعم کو یتیمی عطا کی ہے۔ تو آپ ہی اِن کے حافظ و محافظ اور ناصر و حامی بن جائیے اور ماحول کی آلودگیوں سے بچائیے۔ دیندار اور غمزدہ ماں کے فرماں بردار بنائیے۔ قرآنِ پاک، علومِ دین پڑھیں اور عمل کریں۔ آمین ثم آمین۔

گوہرِ یکتا

ابن امیر شریعت سید عطاء المہیمن بخاری

عزیز القدر سید محمد ذوالکفل بخاری کے بچپن پانچ چھے سال کا مشاہدہ یہ ہے کہ وہ سنجیدہ مزاج اور سوچ وفکر والا بچہ تھا اوراس کی باتوں سے ذہانت پھوٹتی تھی۔ان دنوں ہماری ہمشیر صاحبہ جامعہ خیر المدارس میں مقیم تھیں۔مجلسِ احرار اسلام کی تنظیمی اور تبلیغی سرگرمیوں کی وجہ سے میں زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہا۔ میرا کبھی کبھار وہاں جانا ہوتا تھا۔ پھر میں حجازِ مقدس چلا گیا اور بارہ، تیرہ سال مدینہ منورہ میں مقیم رہا۔اس عرصے میں دو، تین مرتبہ پاکستان آیا اور چلا گیا۔۱۹۹۰ء میں آخری بار پاکستان آیا تو یہیں کا ہوکر رہ گیا۔تب ذوالکفل نوجوان تھا۔

۱۹۹۰ء سے اب تک اُس کی زندگی کے اٹھارہ برس میرے سامنے ہیں۔علمی ماحول اُسے گھر میں ملا۔اعلیٰ اخلاق و عادات والدین کی تعلیم وتربیت سے میں حاصل ہوئے۔مطالعے کا ذوق بہت اعلیٰ تھا۔ بڑے شوق سے کتابیں جمع کرتا اور انھیں پڑھتا رہتا۔ میں نے تو گھر میں جب بھی دیکھا کتابوں میں گم دیکھا۔ کتابیں ہی اس کا اوڑھنا بچھونا تھیں۔ اس کے اردگرد کتابوں کے ڈھیر لگے رہتے۔ یہ ذوق اس میں بھائی جان (حضرت مولانا سید ابوذر بخاری رحمہ اللہ) اور بھائی عطاء المحسن بخاری رحمہ اللہ کی صحبتوں سے پیدا ہوا۔ اپنی والدہ ماجدہ سے تو ہمہ وقت فیض اٹھایا۔ وہ میرا بھانجا داماد بھی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے لکھنے پڑھنے کی بے پناہ صلاحیتیں ودیعت فرمائی تھیں۔ والدین کا فرماں بردار اور ہمارے خاندان کا صالح ترین فرد تھا۔ مکہ مکرمہ کی مٹی اُسے اپنی طرف کھینچتی تھی، وہ اس میں جذب ہوگیا۔ اور اللہ کا امر ہوگیا۔ سچی بات ہے کہ اُس کی قابلِ رشک ایمان والی موت نے ہمیں اس کے نامعلوم مقام سے آشنا کردیا۔ ذوالکفل کی موت کے بعد اُس سے محبت کرنے والوں نے جو کچھ اس کے بارے میں لکھا اُسے پڑھ کر اس کی خوبیوں اور تعلقات کا اندازہ ہوا کہ وہ کتنا مقبول انسان تھا۔

ذوالکفل کی شہادت نے ہمارے پورے خاندان کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ خاندان کا ہر ہر فرد شدید صدمے کی کیفیت میں ہے۔ جو بہت جلدی اپنا ایک گوہرِ یکتا تھا۔ وہ سفرِ زیست مکمل کرکے بہت اعلیٰ مقام پر پہنچ گیا۔ اللہ جل شانہ اُس کے حسنات قبول فرمائے اور اُس کی قبر کو بہشت کا باغ بنائے۔ **اللھم اغفر له وارحمه و عافِهِ واعفُ عنهُ** (آمین)

''اُس بخاری نوجواں نے کس خوشی سے جان دی!''

سید محمد کفیل بخاری

میرے مُنّے بھائی، سید محمد ذوالکفل بخاری کو جنت المعلیٰ میں گئے تین ماہ گزر گئے ہیں۔ ۱۵/ نومبر ۲۰۰۹ء کی شام اُس کی شہادت کی خبر بوڑھے والدین، بھائی بہنوں اور خاندان کے تمام افراد پر بجلی بن کر گری۔ ذوالکفل کے بچپن، لڑکپن اور جوانی کے حسین مناظر بڑی تیزی سے نظروں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ ایسے لگا کہ کوئی خواب تھا...... حسین خواب...... جسے ہم سب جاگتے میں دیکھ رہے تھے کہ اچانک ایک دھماکہ ہوا، سب کچھ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا اور خواب ادھورا رہ گیا۔

ہاتھوں میں دے کے ہاتھ ابھی کل کی بات ہے
وہ چل رہے تھے ساتھ ابھی کل کی بات ہے

ذوالکفل کو نانی اماں جیؒ نے گھُٹی دی۔ بڑے ماموں جیؒ (مولانا سید ابوذر بخاری) نے اُس کے کانوں میں اذان و اقامت کہی اور ابا جی نے بڑی چاہت اور محبت سے اس کا نام اللہ تعالیٰ کے ایک پیغمبر حضرت ذوالکفل علیہ السلام کے نام پر رکھا۔ دو بھائیوں اور تین بہنوں پر مشتمل ہمارے خاندان میں ذوالکفل سب سے چھوٹا، سب کا لاڈلا اور سب سے ذہین تھا۔ ہم سب اُسے پیار سے ''مُنّا'' کہہ کر بلاتے تھے۔ لیکن ''مُنّا'' اپنی شخصیت کی شش جہات میں ایک منفرد اور باکمال شخص تھا:

دہر میں انتخاب تھا وہ شخص
آپ اپنا جواب تھا وہ شخص

ذوالکفل نے بڑی برق رفتاری سے اپنا تعلیمی سفر مکمل کیا۔ ڈگریوں کے انبار لگا دیے۔ کالج میں پروفیسر ہو گیا۔ شادی ہوئی، اللہ نے دو بیٹے اور ایک بیٹی دی۔ لیکن ڈیڑھ ماہ بعد فروری ۲۰۰۹ء میں بیٹی کا انتقال ہو گیا۔ اس نے کمال صبر و حوصلہ سے خود ''مزملہ'' کو لحد میں اتارا۔

ذوالکفل، گلشنِ بنی ہاشم کا وہ پھول تھا جو بزرگوں میں مہکا، دوستوں میں چہکا، بچوں میں چٹکا، کامیابیوں کو مسخر کیا، کچھ دیر ستایا، تلووں کو سہلایا اور دوڑ کر منزل کو جا لیا۔ یوں چالیس برس پلک جھپکنے میں گزر گئے۔

بچپن سے اپنی شہادت تک گھر میں اور گھر سے باہر ہر محفل میں چھایا رہا۔ اپنے علم و عمل، تقویٰ و خلوص اور نیک نیتی کی بنیاد پر ہر جگہ منفرد اور ممتاز نظر آیا۔ بزرگ ہوں یا خورد، دوست ہوں یا دشمن، سب کی خواہش یہی ہوتی کہ......

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

اس نے سکول کے ابتدائی زمانۂ تعلیم میں اپنے نانا ابا حضرت امیرِ شریعت رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت پر روشن ستارہ کے عنوان سے ایک تقریر لکھی اور دارِ بنی ہاشم میں منعقدہ ایک تقریب میں پڑھ کر سنائی۔ میں نے اس کی تقریر میں بزرگوں اور عام سامعین کو روتے دیکھا۔ تب میں کالج میں بی اے کا طالب علم تھا۔ مجھے ایک مباحثے میں تقریر کرنا تھی۔ میں نے تقریر کے نوٹس تیار کیے اور ذوالکفل سے کہا: یار اسے دیکھ کر درست کردو، اُس نے بلاتامل اُسے درست کر دیا۔

وہ ایسا بھائی تھا کہ زندگی بھر کبھی اس سے شکوہ نہیں ہوا۔ وہ میرا بازو تھا، میرا دوست تھا، میرا محسن تھا، میرا مصلح تھا۔ عمر کے اعتبار سے میرے اور اُس کے درمیان بارہ برس کا فاصلہ تھا لیکن علم وعمل میں وہ مجھ سے صدیوں آگے تھا۔ اس نے میرا بے پناہ احترام کیا اور مجھ پر مکمل اعتماد کیا۔ اپنے کئی معاملات میرے سپرد کیے ہوئے تھے۔ چھوٹے بھائی، بڑے بھائی سے فرمائشیں کر کے اپنی خواہشات پوری کیا کرتے ہیں، لیکن یہاں معاملہ ہی برعکس تھا۔ اس نے تو والدین سے بھی کبھی کوئی فرمائش نہیں کی۔ کسی سے کوئی لڑائی نہ جھگڑا۔ وہ کہا کرتا کہ:

''اللہ تعالیٰ ایک بار ہی زندگی عطا کرتے ہیں۔ بار بار تو ملتی نہیں۔ ایسے گزارو کہ کسی کو آپ سے شکوہ پیدا نہ ہو۔''

فقیرانہ آئے صدا کر چلے
میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

جب وہ بچہ تھا تو بازار سے متعلق گھر کے اکثر کام مجھے کرنے پڑتے۔ وہ بڑا ہوا تو سارے کام اس نے سنبھال لیے۔ جس خوشی اور وارفتگی سے وہ گھر کے کام کرتا سب اس پر رشک کرتے۔ جولائی ۲۰۰۲ء میں سعودی حکومت کی طرف سے محکمۂ تعلیم میں ''اساتذہ کی ضرورت'' کا ایک اشتہار اخبار میں آیا تو مجھ سے کہنے لگا۔ ابا جی اس بڑھاپے میں بھی مزدوری کر کے ہمیں رزقِ حلال کھلا رہے ہیں۔ مہنگائی منہ زور ہو رہی ہے اور مستقبل میں ملک کے معاشی حالات مزید خراب ہوں گے۔ میں اگر سعودیہ چلا جاؤں تو گھر کے اخراجات میں ابا جی کا ہاتھ بٹ جائے گا۔ تب وہ دن کو گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی میں انگریزی پڑھاتا اور شام کو پنجاب کالج میں اردو۔ کالج انتظامیہ کو ایک باصلاحیت اور دیانت دار ملازم ہاتھ لگ گیا اور اُس نے ذمہ داریوں کا اتنا بوجھ اُس پر ڈال دیا کہ رات گئے گھر واپس لوٹتا۔ امی تو اُس کی واپسی کا انتظار کرتی ہی تھیں میں بھی اس کے انتظار میں بے چین ہو جاتا۔ اس کے واپس لوٹنے تک سو سو وہم دماغ پر مسلط رہتے۔ وہ گھر پہنچتا تو دل کو قرار ملتا۔ میں نے کہا یار تمھیں موقع ملتا ہے تو ضرور جاؤ۔ وہ انٹرویو میں کامیاب ہو گیا۔ امی نے اپنی ڈائری میں لکھا ہوا ہے کہ ۷ رجب المرجب ۱۴۲۳ھ ۱۵ ستمبر ۲۰۰۲ء بروز اتوار تقریباً ساڑھے چار بجے صبح منا سعودی عرب روانہ ہوا۔ مجھے یاد ہے میں اُسے رخصت کرنے کے لیے اسلام آباد اس کے ساتھ گیا۔ ہوائی اڈے پر الوداع ہوتے وقت معانقہ کیا تو میں نے فرطِ جذبات میں اس کی گردن کا بوسہ لیا۔ میں زندگی میں سب سے زیادہ اُداس اس دن ہوا۔ ذوالکفل سعودی عرب چلا گیا اور میں آنسو پونچھتا ہوا لاہور آ گیا۔ اگلے دن اس نے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع فون پر دی لیکن میں ایک ہفتے بعد اس کیفیت سے باہر نکلا۔

سال بعد آنا اور پھر چلے جانا اُس کا معمول بن گیا تھا۔ ہر دفعہ میں اُسے چھوڑنے اور لینے جاتا اور اِسے اپنے لیے

اعزاز سمجھتا۔ آخری بار وہ آیا تو چھ مہینے ہمارے پاس رہا۔ یہ بہت یادگار دن تھے۔ اس نے اپنے جی کی ساری باتیں مجھ سے کہیں۔ گھریلو معاملات، بچوں کی تعلیم و تربیت، مستقبل میں تحریکی اور دعوتی کام، مختلف اشاعتی منصوبے، مدارس کے انتظام میں بہتری اور نہ جانے کتنے معاملات تھے جن پر اُس نے میرے ساتھ گھنٹوں گفتگو کی۔ مکہ اور مدینہ میں قیام اُس کی آرزو تھی۔ حرمین کی محبّت اُسے بے چین کیے ہوئے تھی۔ وہ چھ برس تبوک کے علاقے میں ''اُملج'' کے شہر میں رہا۔ کوئی پوچھتا کہ کیا کرتے ہو؟ کہتا، عربی بچوں کو انگریزی پڑھاتا ہوں۔ اب اُس نے سفید کپڑے پہننا شروع کر دیے تھے۔ وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ حسین لگتا تھا۔ جس دن وہ آخری مرتبہ ہم سے رخصت ہوا اُس دن بھی یہ حسین پیکر سفید کپڑوں میں ملبوس تھا۔ میں نے ایک بے چین کر دینے والا خواب دیکھا تھا، ڈرتا تھا کہ کہیں مجھے منّے کی تعزیت نہ وصول کرنی پڑے۔ لاحول اور استغفار پڑھتا، لیکن دھڑکا سا لگا رہتا۔ دُعا کرتا اللہ منّے کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

۲۰۰۶ء میں اُس نے جناب سید ابوالخیر کشفیؒ کو ایک خط میں لکھا:

''یہاں سرزمینِ حجاز پر اُترے مجھے چار سال گزر گئے۔ اس مدار میں پہنچ تو گیا لیکن ابھی تک ''منزل'' پر نہیں پہنچا۔ ''بس ایک سودا اور ایک سر ہو کسی کے گیسوئے عنبریں کا'' کا سا معاملہ ہے۔ اللہ پاک نصیب فرما دیں۔''

یہ خط میں نے اُس وقت بھی پڑھا لیکن ''منزل'' سمجھ نہ آئی۔ اقبال کو پڑھا تو اُس نے ذوالکفل کی منزل سمجھا دی:

اوروں کو دیں حضور! یہ پیغامِ زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمینِ حجاز میں

ذوالکفل، ایسا بھائی تھا کہ جس کی صلاحیتوں پر میں رشک کرتا۔ اس کی تحریروں کو پڑھنے کا انتظار کرتا۔ اپنی تحریروں کی اُس سے اصلاح لیتا۔ اس کی تمام خوبیوں کا اعتراف اس کی زندگی میں برملا کرتا۔ وہ ہمیشہ دھیمے، نرم اور محبت بھرے لہجے میں بات کرتا۔ میں کبھی کسی بھائی کو بھائی سے لڑتے دیکھتا تو حیران ہو کر خود اپنے آپ سے سوال کرتا کہ بھائی بھی آپس میں لڑتے ہیں؟ کیونکہ میں اس مشقِ ستم سے عمر بھر نا آشنا رہا۔ اس لیے کہ میرا بھائی لڑاکا، جھگڑالو اور ضدی نہیں تھا۔ وہ بہت پیارا اور محبت کرنے والا بھائی تھا۔ میرا بھائی ڈاکٹر فقیر محمد فقیر مرحوم کے شعر کی ہو بہو تصویر تھا۔

لوکاں دے نال رکھ فقیرا ایسا بہن کھلون
کول ہوویں تے ہسن سارے، دور ہوویں تے رون

ذوالکفل کی یادوں کی خوشبو ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے اخلاق و کردار اور خلوص و ایثار کی خوشبو، یقین و ایمان اور فکر و نظر کی خوشبو...... لیکن عطاء المکرم اور عطاء المنعم میں اس کی خوشبو مجھے اکثر تڑپا کے رکھ دیتی ہے۔ ذوالکفل زندہ تھا، یہ بچے تب بھی مجھے تایا ابو کہتے تھے۔ میں خوشی سے لوٹ پوٹ ہو جاتا۔ اب آواز دیتے ہیں...... تایا ابو...... تو میری آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے ہیں۔ میں اپنی چیخوں کو بڑی مشکل سے روکتا ہوں۔ اکثر اوقات ضبط کا بندھن ٹوٹ جاتا ہے۔ کہیں اکیلے میں بیٹھ کر خوب رو لیتا ہوں۔ آنسو پونچھ کر عطاء المکرم اور عطاء المنعم کو پیار کر لیتا ہوں۔ وہ پھر اپنے ''بابا جان'' کی باتیں سنانے لگ

جاتے ہیں اور میں......

ناشتے کے وقت، مسجد میں نماز کے وقت، دوست احباب کی آمد پر، ہر طرف اُس کے نقوش ثبت ہیں۔ سوچتا ہوں:

وہ کب کے آئے بھی اور گئے بھی، نظر میں اب تک سما رہے ہیں
یہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، یہ آرہے ہیں، وہ جا رہے ہیں

دارِ بنی ہاشم کی لائبریری میں اُس نے بہت وقت گزارا۔ یہاں اس کی محفل جمتی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ میں نے یا کسی دوست نے کوئی سوال پوچھا: یہ بات کس کتاب میں ملے گی؟ یہ مسئلہ کس کتاب میں لکھا ہے؟ کتابوں پر ایک اچٹتی نظر ڈالتا اور کہتا وہ سامنے والی کتاب اٹھائیں۔ کتاب کھولی اور حوالہ پڑھ کر سنا دیا۔ لائبریری میں بیٹھے ہوئے اکثر یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ ہنستا مسکراتا دروازے سے داخل ہورہا ہے۔ کتابوں پر نظر ڈالتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے وہ بھی فراقِ ذوالکفل میں غم زدہ ہیں۔

جی چاہتا ہے، ذوالکفل ملے تو اُس سے کہوں، منے!

کبھی تو آؤ، کبھی تو بیٹھو، کبھی تو دیکھو، کبھی تو پوچھو
تمھاری بستی میں ہم فقیروں کا حال کیوں سوگوار سا ہے

پھر سوچتا ہوں کہ وہ یہ کہہ کر ہمیشہ کی طرح ہمیں چپ کرا دے گا:

مرے عزیزو، مرے رفیقو! کوئی نئی داستان چھیڑو
غمِ زمانہ کی بات چھوڑو، یہ غم تو اب سازگار سا ہے

ذوالکفل، اپنی ذات میں ایک مکمل شخص تھا۔ ایسا وسیع المطالعہ کہ جب چاہو، جو چاہو پوچھو اور جواب با حوالہ پاؤ۔ تفسیر و حدیث، فقہ و تاریخ، سیرت و سوانح، شعر و ادب، سیاست و حکومت، معیشت و اقتصاد ہر موضوع پر ہمہ وقت حاضر باش۔ سیرتِ طیبہ سے اُسے خاص انس تھا۔ خود مجھے کئی بار اس طرف متوجہ کیا اور بعض اہم کتابیں تجویز کرتے ہوئے کہا کہ:

''سیرتِ طیبہ اور سیرتِ اصحاب و ازواجِ رسول علیہم الرضوان مستقل مطالعہ میں رکھیں۔ اپنے خطاب و بیان میں سیرت کو اہمیت دیں۔ اس سے گفتگو میں برکت ہوتی ہے اور سامعین پر اثر ہوتا ہے۔ ایک مسلمان بھی راہِ راست پر آجائے اور سچا مسلمان بن جائے تو ہماری دنیا و آخرت سنور جائے گی۔ یہ مشورہ اکثر اپنے دوستوں کو بھی دیتا تھا کہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و سنت سے دوری نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا ہے اور مغربی دنیا کی یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ مسلمان اس وقت تک کفر کو شکست نہیں دے سکتے جب تک ان کے اعمال سنت کے مطابق نہیں ہو جاتے۔''

یہ فیض اُسے اپنے ماموؤں، حضرت مولانا سید ابوذر بخاری اور مولانا سید عطاء المحسن بخاری رحمہما اللہ کی صحبتوں سے ملا۔

ذوالکفل نے عید الفطر ہمارے ساتھ دارِ بنی ہاشم میں ادا کی ۵/شوال ۱۴۳۰ھ، ۱۵/ستمبر ۲۰۰۹ء کو نمازِ جمعہ ادا کر کے وہ احاطۂ بنی ہاشم مکہ مکرمہ جانے کے لیے روانہ ہوا۔ اکتوبر کے اوائل میں طائف میں پاکستانی کمیونٹی نے ایک تقریب میں خطاب

کے لیے اسے مدعو کیا۔ اُن دنوں گورنر پنجاب سلمان تاثیر نے پاکستانی آئین سے قانون توہینِ رسالت ختم کرنے کی ہانکی تھی۔ ذوالکفل یہ پڑھ کر بے چین اور مضطرب تھا۔ ''تہذیبوں کے تصادم'' کے عنوان پر خطاب کرتے ہوئے اس نے کہا:

''المیہ یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی امت کا تعلق توڑا جا رہا ہے۔
ہم سے ہماری تہذیب واخلاق چھینے جا رہے ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ حضور صلی اللہ
علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب علیہم الرضوان کی جوتی کو لگی مٹی ساری دنیا سے افضل
ہے۔ میں کسی کو اس کے برابر نہیں سمجھتا۔''

کس قدر بے باک دل اس ناتواں پیکر میں تھا
شعلۂ گردوں نورد اک مشتِ خاکستر میں تھا

ذوالکفل نے اپنی نعت میں جس خواہش وآرزو کا اظہار کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے شرفِ قبولیت بخشا:

ادادارِ نبوت — میری اتنی سی گزارش ہے
مری اپنے ادافہموں سے نسبت خاص کر دیجیے
مجھے سچوں، بھلوں، پاکیزہ تر لوگوں کے قدموں میں
جگہ دیجیے!
مجھے میری ہی دنیا میں قوی ومعتبر کیجیے
یہ دنیا آپ ہی کی ہے
مرے مولا محمد
مرے سچے محمد
(صلی اللہ علیہ وسلم)

لعلِ بنی ہاشم دارِ بنی ہاشم سے اُٹھا اور دوڑ کر جنت المعلیٰ کے احاطۂ بنی ہاشم میں اپنی نانی اماں ام المؤمنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے قدموں میں ہمیشہ کے لیے سکون واطمینان کی نیند سو گیا۔ ذوالکفل کی دعا قبول ہوئی...... اس کی خوشی بے کراں ہے...... اس کی نسبت خاص ہوگئی...... وہ دنیا میں معتبر ہوا...... اور آخرت میں بھی پاکیزہ تر ہستیوں کے قدموں میں پہنچ گیا...... آلِ نبی اولادِ علی اور خونِ حسین اپنے اجداد سے جا ملا...... حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے پناہ شفقت نصیب ہوگئی...... اور شفاعت کا مستحق بن گیا۔ مکہ کی مٹی اسے کیوں اپنی طرف کھینچتی تھی؟ وہ مکہ کی طرف کشاں کشاں کیوں دوڑ رہا تھا؟ اقبال کی زبان میں پڑھ لیجیے!

اُس بخاری نوجواں نے کس خوشی سے جان دی
موت کے زہراب میں پائی ہے اس نے زندگی

ایک بھائی، ایک دوست

سید محمد معاویہ بخاری

۱۴/ نومبر ۲۰۰۹ء کی شب ڈیڑھ بجے میری والدہ ماجدہ کی طبیعت اچانک انتہائی خراب ہوگئی تھی، بے بسی کے عالم میں اور کچھ سمجھ نہ آیا تو اپنے عزیز ومہربان دوست ڈاکٹر عبدالرزاق صاحب کو فون کیا اور فوری طور پر علاج کی لیے کوئی دوا تجویز کرنے کی درخواست کی، وہ بے چارے نیند میں تھے، پھر بھی مروت ومحبت کے تحت جو کچھ بن پڑا رہنمائی کی جبکہ اگلے دن ۱۵/نومبر کی دوپہر ڈاکٹر صاحب احوال پُرسی کے لیے خود بہاولپور سے تشریف لے آئے، موصوف محض معالج ہی نہیں ایک علم دوست انسان اور محفلوں کی رونق بھی ہیں، شعر و ادب، سیرت و تاریخ اور اکابر شخصیات سے انہیں گہرا لگاؤ ہے چنانچہ ان کی معیت میں بیٹھے باتیں کرتے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ ۱۵/نومبر کے دن بھی کچھ ایسی ہی صورتحال تھی، شخصیات، اشعار، لطائف اور حالات حاضرہ گفتگو کا عنوان بنتے گئے اور دن ڈھل گیا، ہم لوگ نماز مغرب ادا کر کے بیٹھے ہی تھے کہ میرا بڑا بیٹا ''محمد شراحیل'' پیغام لایا کہ جلدی اندر آئیں بہت ضروری بات کرنی ہے۔ میں آنے والے سنگین ومشکل لمحات سے بے خبر گھر کے صحن میں پہنچا تو دیکھا کہ میری اہلیہ اور چھوٹے بھائی عثمان بخاری انتہائی پریشانی کے عالم میں کھڑے تھے، مجھے بطورِ شکوہ وتنبیہ کہا گیا کہ تم تو گپّیں ہانکنے میں مگن ہو کچھ معلوم بھی ہے کیسی قیامت گزر گئی؟ لفظ قیامت سن کر اس کا سیاق وسباق سمجھنے کی کوشش تو بہت کی لیکن سچی بات یہ ہے کہ مجھے اس وقت نہ جملے سمجھ آئے اور نہ ہی صورتحال سمجھ میں آسکی۔ بس فوری طور پر بیمار والدہ کا خیال آیا کہ شاید ان کی طبیعت پھر سے خراب نہ ہوگئی ہو لیکن پھر دیکھا کہ وہ تو سامنے ہی تشریف فرما تھیں، اس لیے تسلی ہوگئی لیکن مجھے تو گھر میں ایک اہم بات کے لیے بلایا گیا تھا اور پھر قیامت گزرنے کا ذکر بھی ہوا، میں ذہنی طور پر اُلجھا ہوا کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا، اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتا، بھائی نے یہ اندوہناک خبر سماعتوں میں انڈیل دی کہ برادر عزیز پروفیسر سید ذوالکفل بخاری کا مکہ مکرمہ میں ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے اور وہ اس حادثہ میں انتقال کر گئے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں انتہائی کمزور اور کم حوصلہ انسان ہوں اور یہ ناگہانی خبر اتنی بھاری بھرکم تھی کہ میں کھڑا نہیں رہ سکا اور **انا للّٰہ وانا الیہ راجعون** پڑھتے ہوئے وہیں زمین پر ہی بیٹھ گیا۔ مجھے یہی محسوس ہوا تھا گویا کوئی بلند وبالا عمارت مجھ پر آن گری ہے اور میں اس کے ملبے تلے دفن ہوگیا ہوں — آہ، کیا کہوں کہ وہ لمحات میں نے کیسے بتائے، حریم دل سے اٹھتی بے آواز چیخوں کو اپنے حلق تلے کس طرح دبانا پڑا یہ ناقابل بیان ہے۔ کیا کہوں؟ اور کس سے کہوں؟ کہ لمحہ بھر میں کیا کچھ تھا جو بکھر گیا، کیسی متاع بے بہا تھی جس سے محرومی اور دائمی جدائی کا مژدۂ غم سننا پڑا تھا، ایک بھائی، ایک دوست، ایک استاد، ایک محسن، پیکرِ اخلاق ووفا، ایک مخلص و ہمدرد، ایک بے لوث مددگار، سراپا ادب، ایک انتہائی نفیس وشریف النفس انسان، میرے ابّ وجد کی علمی وراثت کا امین، پلک جھپکنے میں کہاں سے کہاں چلا گیا؟ میں کئی دنوں سے اس کے بارے میں لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر چند سطروں بعد ہی آنکھوں میں آنسوؤں کی دھند پھیلنے لگتی ہے اور پھر سب کچھ ختم ہو جاتا ہے:

ع　اے آتشِ فراقت دلہا کباب کردہ

اپنے عزیز بھائی کے سانحۂ وفات کی خبر نے خیمۂ جسم وجاں کی طنابیں ہی کاٹ ڈالی تھیں، میں کچھ دیر تو یونہی زمین پر ہی بیٹھا رہا کہ اٹھنے کی سکت ہی نہ تھی۔ ڈاکٹر عبدالرازق صاحب میرا انتظار کر رہے تھے، انہیں واپس بہاولپور جانا تھا اور اسی عرصہ میں عشا کی اذانیں بھی بلند ہونے لگی تھیں، میں بہت ہمت جتا کر لڑکھڑاتے قدموں سے بیٹھک تک پہنچا اور ڈاکٹر عبد الرازق صاحب سے صرف اتنا ہی کہہ سکا تھا

ڈاکٹر صاحب! بھائی سید ذوالکفل بخاری مکہ مکرمہ میں انتقال کر گئے ہیں—

کب، کہاں اور کیسے کی تفصیلات میرے پاس تھیں اور نہ ہی قوت بیان باقی تھی جو کچھ معلوم تھا اور دل ودماغ جس دکھ کی زد میں تھے وہ آنسوؤں کے سیلاب سے واضح تھا— آپ دارِ بنی ہاشم چلیے میں بھی پہنچتا ہوں — میرے اور ڈاکٹر صاحب کے درمیان اس سے زیادہ گفتگو نہیں ہوسکی تھی کیونکہ آنسوؤں کے غبار نے ایک دوسرے کے چہرے پر نمودار ہوتے غم واندوہ کے تأثرات دیکھنے سے بھی عاجز کر دیا تھا۔

کچھ دیر بعد دارِ بنی ہاشم پہنچا تو دیکھا رنج وغم کی کیفیتوں میں ڈوبے کئی جانے انجانے چہرے وہاں عم محترم حضرت پیر جی سید عطاء المہیمن بخاری مدظلہ کے گرد جمع تھے، عم محترم سے گلے ملتے ہوئے ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ گئے تھے، انا للہ وانا الیہ رجعون پڑھ کر ہم نے ایک دوسرے کو تسلی دینے کی ممکن حد تک کوشش کی پھر اپنے پھوپھا جان سید وکیل شاہ صاحب مدظلہ پر نظر پڑی جو صبر وضبط کا پیکر بنے سب تعزیت گزاروں کو تسلی دے رہے تھے۔ مجھے بڑے بھائی سید کفیل شاہ جی کی تلاش تھی وہ دفتر میں تھے اور ٹیلی فون پر کسی سے بات کر رہے تھے، ہم دونوں بنا کچھ کہے بغل گیر ہو گئے تھے۔ ان لمحوں کی داستان سنانا بہت مشکل ہے بس یوں سمجھ لیجیے کہ دو محروم انسان ایک دوسرے سے مل کر دلجوئی کے نام پر جو حرف تسلی بساط بھر کوشش سے کہہ سکتے تھے کہتے رہے۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ ننھے اور منے میاں کی جوڑی ٹوٹ گئی اور ننھے میاں تنہا رہ گئے۔ بھائی کفیل شاہ جی کو اللہ صبر وحوصلہ دے، آمین

مجھے نہیں معلوم اس وقت میری بزرگ وبیمار پھوپھی جان نے اپنے لختِ جگر سے دائمی فراق کی اندوہناک خبر کس تحمل سے سنی ہوگی؟ البتہ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ کوہِ استقامت بنی ہر تعزیت گزار سے تعزیت قبول فرما رہی تھیں۔ ان کے نورانی چہرے پر رنج وغم کے سائے تو ضرور جھلملاتے دکھائی دیے۔ مگر وہ اپنی ساری کیفیات کو کمالِ ضبط سے سنبھالے بیٹھی تھیں، مجھے مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے بس اتنا ہی فرمایا تھا بیٹا چوٹ تو بہت گہری لگی ہے مگر اللہ کی رضا پر راضی ہوں۔ اس کے حکم کے سامنے میری کیا مجال ہے، اولاد اسی کی عطا کردہ نعمت ہے اس کی امانت ہے، سو اب اس کے پاس ہے۔

سید ذوالکفل بخاری ۱۳/ نومبر ۱۹۶۹ء کو ملتان میں پیدا ہوئے تھے، رمضان المبارک کا مہینہ اور غالباً جمعہ کا دن تھا، ان کی پیدائش اسی مکان میں ہوئی تھی جسے حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی رہائش گاہ ہونے کا شرف حاصل رہا، میرے بھائی کا یہ اعزاز کم نہیں کہ وہ میری پھوپھی صاحبہ رابعۂ وقت، بنتِ امیر شریعت مدظلہا کے لختِ جگر اور پھوپھا حضرت حافظ سید وکیل شاہ صاحب کے فرزند ارجمند تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے والد ماجد حضرت ابوذر بخاری رحمہ اللہ نے ان کا نام بڑے بھائی محترم حافظ سید محمد کفیل بخاری کے نام کی مناسبت سے سید محمد نبیل بخاری تجویز کیا تھا جبکہ پھوپھا جی سید وکیل شاہ صاحب نے محمد ذوالکفل — اور پھر یہی نام ان کی پہچان بن گیا۔ سید ذوالکفل بخاری بچپن سے ہی انتہائی ذہین تھے اور انہیں ہر چیز کو گہرے غور وفکر سے دیکھنے پرکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت ودیعت ہوئی تھی۔ چند سال کی ابتدائی گھریلو تربیت کے بعد ۱۹۷۷ء میں انہیں

گورنمنٹ پرائمری سکول خیرالمدارس میں دوسری جماعت میں داخل کرایا گیا۔ اساتذہ کا کہنا تھا کہ ماشاءاللہ بچہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ صلاحیتوں کا مالک ہے اس کے سوالات ایسے مربوط و منظّم ہوتے ہیں کہ بعض اوقات ہم سے جواب بھی نہیں بن پاتا۔ سید ذوالکفل بخاری نے جس پرائمری سکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی، وہاں کی خستہ حال ''کرسی میز'' نام کی چیزیں صرف اساتذہ کے لیے مخصوص یا پھر اُنہی کو میسر تھیں اور طلباء بوریا نشین ہی تھے۔ چنانچہ ۱۹۸۰ء میں بوریا نشینی پر مشتمل پرائمری تک کا تعلیمی دور مکمل ہوا تو سید ذوالکفل بخاری اپنے سکول کے واحد طالب علم تھے جن کے بارے میں اساتذہ کا اعتراف تھا کہ اس بچے کو کسی بہت بڑے اسکول اور بہت زیادہ قابل اساتذہ کی ضرورت تھی کیونکہ فطری استعداد کے اعتبار سے ان کا اپنے ہم عمر ساتھیوں سے کوئی موازنہ نہیں کیا جاسکتا تھا اور وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث بہت آگے تھے۔

سید ذوالکفل بخاری کی تعلیم کا دوسرا مرحلہ اسلامیہ ہائی سکول عام خاص باغ (ملتان) سے شروع ہوا۔ ۱۹۸۱ء میں کلاس ششم میں وہاں داخل ہوئے، یہاں بھی صورتحال مختلف نہ تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ان دنوں سرکاری تعطیل جمعۃ المبارک کو ہوا کرتی تھی اور ہماری پھوپھی جان جمعرات کی شام کو سب بچوں کے ہمراہ ''دادی اماں جی'' سے ملنے کے لیے تشریف لایا کرتی تھیں۔ بہن بھائیوں کے آجانے سے گھر میں خوب رونق ہوجاتی اور پھر شام کو بچوں بڑوں کی مشترکہ محفل سجتی سید ذوالکفل بخاری اپنے سکول کے دلچسپ واقعات بالخصوص اپنے اساتذہ کے مکالمے اور اپنے سوالات پر ان کے فاضلانہ تعجب اور جواب و استدلال کے واقعات باقاعدہ انہی کے لب ولہجہ اور حرکات وسکنات سے مرصع کر کے سناتے تو سب لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوجاتے۔ میرے حافظہ میں ایسی کسی یاد کا ہلکا سا عکس بھی موجود نہیں جو یہ ثابت کرتی ہو کہ سید ذوالکفل بخاری نے عام بچوں کی طرح کرکٹ، ہاکی، فٹبال، گلی ڈنڈا یا اس وقت کے مروج کسی بھی کھیل میں دلچسپی کا اظہار کیا ہو، عظیم الشان ماں کی پاکیزہ روحانی تربیت اور مہربان وشفیق باپ کی تعلیمی توجہات نے میرے بھائی کو اچھی بات سننے، اچھی کتاب پڑھنے اور بہترین عمل کرنے کے اعلیٰ ذوق وشوق کے حصار میں یوں پناہ دی تھی کہ پھر انھوں نے کسی اور طرف پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اپنے بڑے ماموں اور میرے والد ماجد سید ابوذر بخاری رحمہ اللہ سے انہیں اس درجہ انس ہوا کہ وہ ان کے منظورِ نظر بن گئے، میں نے بارہا دیکھا کہ سید ذوالکفل، سید ابوذر بخاریؒ کے چہرے پر نظریں گاڑے انہیں گفتگو کرتے دیکھا کرتے لیکن یہ معاملہ محض دیکھنے تک محدود نہ تھا بلکہ ہمہ تن گوش جو کچھ سنا کرتے وہ سطحِ دل و دماغ پر نقش کرتے چلے جاتے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہنگامِ سیاست بھی عروج پر تھا اور مذہبی وسیاسی مداریوں نے ملک کو تماشہ گاہ بنایا ہوا تھا۔ تحریکیں، جلسے، جلوس، ہنگامے، گولی، لاٹھی اور نہ جانے کیا کیا کچھ قہر وجبر کی زنبیلوں اور مکر وفریب کی پٹاریوں میں سے نکالا اچھالا جارہا تھا۔ ہمارے گھر نامور زعماء تشریف لاتے، گھنٹوں طویل مجالس برپا ہوا کرتیں، مذہب، سیاست، سیرت وتاریخ، شعروادب، معاش ومعاد سمیت تمام موضوعات پر خوب گفتگو ہوتی۔ بالخصوص ایمان وعقیدہ کے بارے میں وہ منفرد ونایاب علمی تشریحات بیان ہوتیں کہ باید وشاید —— اور اب ان کے سننے کو سماعتیں ترستی ہیں۔

سید ذوالکفل بخاری اپنی کمسنی کے باوجود ان نادر ونایاب علمی محفلوں کے سب سے کم عمر سامع وشاہد اور شاید سب سے زیادہ ان سے نفع حاصل کرنے والے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے جو کچھ سنا پھر ان حوالوں کو پوری شعوری کوششوں سے پڑھا بھی۔ سیرت وتاریخ ہو یا مذہب وسیاست، شعروادب کا میدان ہو یا تحریر وتقریر کا سید ذوالکفل بخاری نے ان تمام شعبوں میں اپنی مہارت، قابلیت اور خداداد صلاحیت کا لوہا اپنے ہم عصروں سے ہی نہیں بلکہ اساتذۂ وقت سے بھی منوایا۔ سید ذوالکفل بخاری قابل رشکِ حافظہ، وسعتِ مطالعہ، مشاہداتی قوت، تطبیقِ امثال کے ہنر، اسلوبِ تحریر کی پختگی و جاذبیت، حکیمانہ طرز

استدلال، نکتہ آفرینی کے جوہر، شاندار لفظی انتخاب سے مرتب و مرصع گفتگو، عالمانہ وجاہت، ادیبانہ تفرد، استادانہ وقار اور کریمانہ اخلاق حسنہ جیسی بے بیش بہا خوبیاں رکھنے کے امتیازات کے ساتھ ساتھ ایک شریف النفس اور بے ضرر، مخلص و ہمدرد، ایک باوفا دوست بھی تھے اور اس کی گواہیاں سید ذوالکفل کے ہم عصروں اور ان کے متقدمین کے ہاں سے ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر عالمی سطح پر معروف ادیب و نقاد، جناب مشفق خواجہ مرحوم کو ہی لیجیے کہ سید ذوالکفل اور خواجہ صاحب کے مابین غائبانہ تعارف کا سلسلہ بذریعہ خط و کتابت ایک عرصہ تک قائم رہا۔ لیکن چند برس پہلے جب ان کا ملتان آنا ہوا تو خاص طور پر سید ذوالکفل بخاری سے ملنے ان کے گھر دارِ بنی ہاشم بھی تشریف لائے۔ وہ اپنی مصروفیت کے باعث ملتان میں کئی بڑی شخصیات سے نہیں ملے تھے لیکن کم عمر ذوالکفل بخاری کو یہ اعزاز ملا کہ خواجہ صاحب نہ صرف ملنے چلے آئے بلکہ ان کے ساتھ بھرپور علمی نشست بھی ہوئی اور پھر واپس لوٹتے ہوئے انھوں نے جو الفاظ ادا کیے وہ یہ تھے:

> میرا ملتان کا سفر جس کام کے لیے تھا وہ اپنی جگہ لیکن اگر میں آپ سے نہ ملتا تو مجھے ہمیشہ اس کا افسوس رہتا، میرے ملتان کے سفر کا حاصل آپ سے ملاقات ہے۔

یہ چند جملے اس شخص نے ادا کیے جس کے بارے میں معروف ہے کہ مشفق خواجہ صاحب ایک سفاک قسم کے نقاد تھے جو بتوں کی طرح ایستادہ نامور ادبی شخصیات پر تیشۂ تنقید یوں چلاتے کہ خود انہی کے ہاتھوں سرزد ہونے والی قلمی کوتاہیوں کو ہتھیار بنا کر ان کی خدائی کے بت منہدم کر دیتے تھے۔ سید ذوالکفل بخاری ہمیشہ اعتراف کیا کرتے تھے کہ کتاب سے اُنس اور اس کی رغبت انہیں والد ماجد سید وکیل شاہ صاحب نے کتابیں مہیا کر کے ڈال دی تھی لیکن مطالعے کی رغبت کا عشق جنون میں تبدیل ہونے کا سہرا اپنے بڑے ماموں سید ابوذر بخاری رحمہ اللہ کے سر باندھتے۔ بقول سید ذوالکفل بخاری کہ بڑے ماموں جی سے جو کچھ سنا اس سے پڑھنے کا جذبہ پیدا ہوا تو کتابوں کے نام اور حوالے بھی انہیں سے مل گئے۔ یوں جذبۂ شوق کی تسکین تو جو ہوئی سو ہوئی لیکن مطالعہ کیسے کیا جاتا ہے؟ وہ ہنر اور سلیقہ بھی اُن سے سیکھنے کو ملا۔

میں یہ بات بڑے وثوق سے تحریر کرتا ہوں کہ میں نے اپنی ممدوح شخصیت سید ذوالکفل بخاری رحمہ اللہ کو جب کبھی مطالعہ کرتے ہوئے دیکھا تو ان کے طرزِ ادا اور انہماک میں سید ابوذر بخاریؒ کی جھلک بڑی واضح نظر آتی۔ بڑے بھائی سید کفیل بخاری اور راقم نے متعدد بار اس بات کو دیکھا، موازنہ کیا اور ہمیشہ ہی اعتراف کرتے رہے۔ سید ذوالکفل کو بہت بچپن میں سید ابوذر بخاری رحمہ اللہ انتہائی محبت سے علامہ کہا کرتے تھے اور ہم سب کو یہ بات بہ ظاہر ایک تفنن بھرا جملہ ہی معلوم ہوتی مگر حقیقت یہی تھی کہ سید ذوالکفل بخاری رحمہ اللہ جن شاندار صلاحیتوں کے حامل تھے یہ اس کا برملا اعتراف تھا۔ شاید کچھ لوگوں کیلیے یہ بات ایک انکشاف ہو کہ میرے بھائی سید ذوالکفل بخاری نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کم و بیش ۱۴ برس کی عمر میں الاحرار ہی سے کیا تھا۔ وہ ۱۹۸۳ء سے لے کر ۱۹۸۷ء تک بطور مدیر معاون سید ابوذر بخاری رحمہ اللہ کے زیر نگرانی الاحرار مرتب کرتے رہے۔ متعدد اداریے بھی لکھے اور مضامین ترتیب دینے میں تو اکثر ان کا حصہ ہوتا تھا۔ الاحرار میں کئی اہلِ قلم کی تحریریں شائع ہوا کرتی تھیں جنھیں ترمیم و اصلاح کے مراحل سے بہرحال گزرنا ہی پڑتا تھا جب کہ سید ذوالکفل بخاری کی تحریر الاحرار میں شائع ہونے والی شاید واحد تحریر کہی جاسکتی ہے جیسے مدیر الاحرار سید ابوذر بخاری رحمہ اللہ قلم زد یا اصلاح و ترمیم کے بغیر شائع کر دیتے تھے اور یہ بجائے خود اپنی جگہ بہت اعزاز کی بات تھی۔

سید ذوالکفل بخاری وسعت مطالعہ کے لیے ملک بھر کی قدیم و جدید لائبریریوں کو کھنگالنے نادر و نایاب کتابوں تک رسائی حاصل کر کے زیر مطالعہ لانے کی تگ و دو بھی تاحیات کرتے رہے، انہیں کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ عربی، فارسی، اردو،

انگریزی، پنجابی، سرائیکی یکساں مہارت کے ساتھ لکھنے بولنے پر قادر تھے۔ گزشتہ سطور میں تذکرہ ہو چکا کہ سید ذوالکفل بخاری رحمہ اللہ نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۸۳ء میں پندرہ روزہ الاحرار سے کیا تھا اور یہ سلسلہ ۱۹۸۸ء تک کسی نہ کسی طور جاری رہا۔ یہ ان کا طالب علمی کا دور تھا، اس لیے زیادہ توجہ صرف نصاب پر ہی رہی جبکہ غیر نصابی سرگرمیاں جو عام طور پر تفننِ طبع کے لیے اختیار کی جاتی ہیں سید ذوالکفل بخاری نے ان سرگرمیوں کو بھی اتنا مثبت اور نفع بخش پیرائے میں جاری رکھا کہ ان کی علمی و ادبی حیثیت ایک بہت بڑے حلقے میں مسلم ہوتی چلی گئی، سید ذوالکفل بخاری سی ایس ایس کے امتحان میں طبع آزمائی کے ساتھ ساتھ ایم فل اور پی ایچ ڈی کے لیے بھی تیار تھے۔ ایک دفعہ میں نے یونہی پوچھ لیا تھا کہ بی ایڈ اور ایل ایل بی جیسی ڈگریوں کی کیا خاص ضرورت پیش آ گئی تھی۔ اپنے مخصوص انداز میں مسکرا کر جواب دیا بس یونہی خیال آیا کہ یہ بھی کر لینا چاہئے اور اس میں حرج کوئی نہیں لہٰذا کر لیا۔ پھر مسکراتے ہوئے کہنے لگے: آپ تو جانتے ہی ہیں ہمارے ہاں اصل مسئلہ روزی روٹی کا ہوتا ہے بالخصوص اس نوجوانی کی عمر میں علمی قابلیت کے مظاہرے اور پھر حیثیت تسلیم کرانے میں جو ریاضت درکار ہوتی اور اس کے لیے جتنا وقت خرچ کیا جانا ضروری ہوتا ہے اس عہد کی بے صبر اور فاقوں ماری تیز قدم، جلد باز نسل اس کے لیے تیار نہیں ہے۔ چنانچہ پہلی ترجیح کے طور پر دیکھا یہ جاتا ہے کہ اتنی ڈگریوں کے باوجود گھریلو اخراجات پورے ہوتے ہیں کہ نہیں، یوٹیلٹی بل ادا ہوئے ہیں کہ نہیں۔ ڈگریوں کا یہ معاشی موازنہ ہی دراصل تعلیم اور قابلیت کے انحطاط کا بنیادی سبب ہے۔ اس کسمپرسی کی حالت میں ڈگریاں خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہوں مگر تعلیم کے وہ عمومی فوائد جو پہلے کسی بھی معاشرہ کا حق اور پھر امتیاز بن سکتے ہیں وہ حاصل نہیں کیے جا سکتے۔

ہمارے گھر میں سید کفیل شاہ جی اور سید ذوالکفل شاہ جی دو محبت بھرے عرفی ناموں سے یاد کیے جاتے ہیں۔ کفیل شاہ جی کو حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ ''ننھا'' کہہ کر بلایا کرتے اور ذوالکفل شاہ جی کو گھر کے سب لوگ ''منا'' کہہ کر بلاتے۔ ہمارے ننھے اور منے میاں کی جوڑی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے شاہراہ حیات پر رواں دواں تھی کہ اچانک منے میاں راہ عدم کا موڑ مڑ گئے۔

سید ذوالکفل بخاری کی یاد میں لکھنا ایک قرض تھا اور ہے سو اس لیے یہ چند بے ترتیب سطریں گھسیٹ دی ہیں۔ ۱۵/ نومبر کے بعد سے اب تک نہ جانے کتنی بار کوششیں کر چکا ہوں مگر چند سطور سے زیادہ لکھ نہیں پا رہا، آج بھی لکھنے بیٹھا ہوں تو بہت سی مشکلیں درپیش ہیں۔ یادوں کا ایک گھنا جنگل ہے اور اسی میں بھٹک بھٹک کر مجھے اپنی ممدوح شخصیت سے منسوب واقعات کو تلاش کر کے مربوط و مرتب کرنے کا فریضہ ادا کرنا ہے مگر اس وقت یہ آسان اس لیے نہیں ہے کہ سید ذوالکفل بخاری کی زندگی بارے معلومات کبھی جمع ہی نہیں کی تھیں، مثلاً مجھے یہ تو معلوم تھا کہ وہ ڈیپوٹیشن پر سعودیہ جا رہے تھے لیکن میں یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ مدرسہ نورالدین زنگی المتوسطہ املج منطقہ تبوک میں بطور استاد خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ پھر مدرسہ ابی سعید الخدری میں بھی پڑھاتے رہے۔ اسی طرح ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ میں تعیناتی کی خوشخبری انھوں نے خود سنائی تھی بہت خوش تھے کہ ایک ایسے تعلیمی ادارے سے منسلک ہونے کا موقع ملا ہے جہاں لوگ بہت کوششوں کے باوجود نہیں پہنچ پاتے۔ مجھے ان کی تعلیمی میدان میں ڈگریاں حاصل کرنے کا علم تو کسی حد تک تھا لیکن ان کی غیر نصابی سرگرمیوں بارے بہت کم معلومات تھیں۔ گزشتہ سطور میں لکھ چکا ہوں کہ سید ذوالکفل بخاری نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز الاحرار سے کیا تھا اس کے بعد وہ اپنے بڑے بھائی سید کفیل شاہ جی کی زیر ادارت شائع ہونے والے جریدہ نقیب ختم نبوت سے بھی تاحیات منسلک رہے۔

جبکہ دورانِ تعلیم مختلف جرائد میں بطورِ مدیر و نائب مدیر بھی خدمات سرانجام دیں۔ ۱۹۸۶ء تا ۱۹۹۱ء گورنمنٹ کالج

سول لائنز ملتان اور گورنمنٹ کالج بوسن روڈ ملتان سے شائع ہونے والے مجلّات کے مدیر رہے۔۱۹۹۴ء تا ۱۹۹۵ء ہفت روزہ چٹان لاہور کے بیورو چیف رہے۔۱۹۹۶ء تا ۲۰۰۲ء گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی ملتان کے مجلّہ صناع کے ایڈیٹر انچیف کی ذمہ داریاں نبھائیں۔ اسی دوران ۲۰۰۱ء سے ۲۰۰۲ء تک روزنامہ خبریں ملتان میں ادبی صفحہ کے انچارج رہے۔ اگر تصنیفی خدمات کے حوالہ سے دیکھا جائے تو سید ذوالکفل بخاری نے اس شعبہ میں بھی کمال ہنر دکھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، متعدد کتابیں تصنیف و مرتب کیں، کئی غیر مرتب مسودات بکھرے پڑے ہیں۔ اور یہ سب طباعت کے منتظر ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے انھوں نے اپنے قریبی دوست حافظ محمد صفوان چوہان کے ساتھ مل کر انتہائی شاندار اور وقیع وضخیم اردو انگریزی ڈکشنری مرتب کی تھی جو شائع ہو چکی ہے جبکہ ام القریٰ یونیورسٹی میں تعیناتی سے پہلے جب وہ چند ماہ کے لیے ملتان مقیم تھے تو انھوں نے ایک کتاب کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ جسے بعض مترجمین نے ہاتھ لگا کر رکھ دیا تھا کہ ہمارے بس کی بات نہیں جو مذکورہ دونوں زبانوں پر ان کے عبور و دسترس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

سید ذوالکفل بخاری رحمہ اللہ کو ان کی مثالی صلاحیتوں کے باعث ہم سب پیار سے ''استاد جی'' کہا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ان کے چچا سید مرتضٰی شاہ صاحب نے استاد جی کہہ کر بلایا تو کہنے لگے آج اس کی وضاحت ہونی چاہیے کہ آخر مجھے ''استاد جی'' کیوں کہا جاتا ہے؟ میں کوئی موٹر مکینک تو ہوں نہیں جو مجھے استاد جی کہا جائے۔ بات کیونکہ مذاق میں ہو رہی تھی اس لیے ان کا احتجاج بھی سنجیدگی بھرے مذاق سے پُر تھا۔ سید ذوالکفل بخاری رحمہ اللہ کا غائبانہ تذکرہ تو عموماً استاد جی کے نام سے ہی ہوتا تھا۔ ملتان کی ایک ادبی تنظیم کے تحت فاران اکادمی سے وابستہ تھے، جہاں ان کے نظم ونثر کے جوہر کھلتے۔ نظمیں، ادبی مضامین، انشائیے اور اپنے تنقیدی مضامین کے حوالوں سے ہمیشہ منفرد مقام رکھتے تھے۔ دوستوں کے دوست تھے۔ دشمنی کبھی کسی سے نہیں رکھی بلکہ ان کے بہت قریبی دوستوں کا کہنا تھا کہ ہم سوچتے رہتے ہیں کہ ذوالکفل بخاری رحمہ اللہ کو کسی بات پر غصہ بھی آتا ہے؟ اِلّا یہ کہ معاملہ ایمان وعقیدہ کا درپیش ہو۔ اس باب میں انھوں نے کبھی اور کسی مقام پر بھی مصلحت سے کام نہیں لیا تھا۔ دینی معاملات میں اتنے مستقیم تھے کہ سر سے ٹوپی کبھی نہیں اتارتے تھے۔ انتہائی بچپنے میں دوسری کلاس سے لیکر ام القریٰ یونیورسٹی میں بحیثیت استاد تعیناتی تک سید ذوالکفل بخاری رحمہ اللہ نے اپنے حلیے اور وضع قطع میں کوئی تبدیلی نہ آنے دی۔ دورانِ تعلیم ایک موقع پر انھیں ٹوپی سے سر ڈھانپنے کی پاداش میں ایک استاد نے نامناسب روایتی لب ولہجہ بھی اختیار کیا حتیٰ کہ کلاس میں ٹوپی پہن کر بیٹھنے سے بھی روک دیا لیکن سید ذوالکفل بخاری رحمہ اللہ نے مسنون عمل کو کسی قیمت پر بھی ترک کرنے سے انکار کر دیا۔

میرے عزیز بھائی جنھیں ہم پیار سے ''استاد جی'' کہا کرتے تھے واقعتاً سچ مچ کے استاد تھے۔ یگانہ فطرت کے باعث پوری زندگی ایک شان و وقار سے جیئے۔ کبھی کسی سے الجھتے نہیں تھے، اکثر کہتے کہ مخاطب کی حیثیت کے مطابق بات کر لی جائے تو بات نہیں بگڑتی، اپنی گوناگوں مصروفیات سے وقت نکال کر کبھی کبھار مجھے ای میل کے ذریعے میرے مزاج کے مطابق مختلف چیزیں بھیجتے رہتے۔

میرے پاس سید ذوالکفل بخاری رحمہ اللہ سے وابستہ یادوں کا انبار ہے مگر لکھنے سے عاجز ہو رہا ہوں، سمجھ نہیں آتا بات کہاں سے شروع کروں، کون سی بات چھوڑوں اور کس کو بیان کروں؟ اسی الجھن میں کئی دن بیت گئے ہیں آج اپنی ادھوری تحریر کو اس واقعہ پر ختم کرتا ہوں۔

سید ذوالکفل بخاری رحمہ اللہ مکہ مکرمہ سے تشریف لائے ہوئے تھے، ایک دن صبح کے وقت دارِ بنی ہاشم مہربان کالونی

جانا ہوا تو نقیب ختم نبوت کے دفتر میں بیٹھے تھے، حسب معمول انتہائی گرم جوشی سے مصافحہ و معانقہ کر کے ملے۔ حسن اتفاق ہی کہیے کہ کچھ دیر بعد ڈاکٹر عبدالرازق صاحب بھی تشریف لے آئے اور محفل سج گئی۔ موضوع گفتگو حالات حاضرہ سے جو پلٹا تو شاعری کی طرف آ گیا، اچانک کہنے لگے، مسعود اوکاڑوی کے چند شعر سنیے اور ان اشعار سے پہلے بطور تمہید کہنے لگے میرا خیال ہے مسعود اوکاڑوی کی بخشش شاید اس کے اسی ایک شعر پر ہو جائے گی، اس کے بعد پوری غزل سنائی جس کے چند اشعار حافظہ میں رہ گئے، جو یہ ہیں:

پھر وہی دن وہی شام میرے سامنے ہے　　منطقی طور پہ انجام میرے سامنے ہے
جس کو نمٹاتا ہوں ہر روز نئے عزم کے ساتھ　　روزمرہ کا وہی کام میرے سامنے ہے
چار دن عمر کے حائل ہیں ابھی رستے میں　　ورنہ وہ گوشۂ آرام میرے سامنے ہے

آخری شعر سنا کر کہنے لگے میں سمجھتا ہوں یہ شعر حاصل غزل ہے۔

سید ذوالکفل بخاری رحمہ اللہ نے مختصر سی زندگی بہت بھرپور انداز میں گزاری وہ بہت کچھ کر چکے تھے، بہت کچھ کر رہے تھے اور مزید بہت کچھ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے، انہیں دیکھ کر ہمیشہ یہ شعر ذہن میں تازہ ہو جاتا۔

مخرام بہ ایں صفت مبادا
کز چشم بدت رسد گزندے

مگر آہ — نظر لگ ہی گئی۔ ۱۵/ نومبر ۲۰۰۹ء کے دن پیکِ اجل ایک حادثہ کی صورت آن پیوست ہوا اور ہم سب کے محبوب و محسن، استاد جی عالم فنا سے عالم بقا کو رخصت ہو گئے۔ موت اپنی جگہ برحق ہے اور اپنے پیاروں سے دائمی جدائی کا دکھ بھی مسلّم ہے مگر دل کو خوشی اور اطمینان یہ ہے کہ سید ذوالکفل بخاری رحمہ اللہ ہمیشہ بلند بخت رہے ان کا ستارہ اوجِ ثریا پر جگمگاتا رہا۔ انھوں نے کبھی کسی کو اپنے مدمقابل ٹھہرنے نہیں دیا تھا، وہ ہمیشہ جیت جاتے تھے اور زندگی بھر بلند بخت بنے رہنے کا یہ سلسلہ ان کی وفات کے بعد بھی نہیں ٹوٹا۔ اس کو سوائے بلند بختی و خوش قسمتی کے اور کیا نام دیا جا سکتا ہے کہ ان کی نماز جنازہ بیت اللہ شریف میں ادا کی گئی حج کا موقع تھا اس لیے کم و بیش ۲۲ لاکھ انسانوں نے مغفرت کی دعاؤں سے انہیں نوازا، یاد کیا اور رخصت کیا اور پھر تدفین کے مراحل آئے تو میرا بھائی ایک بار پھر سبقت لے گیا۔ جنت المعلیٰ میں تدفین کی اجازت ملی اور ام المؤمنین حضرت سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے قدمینِ مبارک میں سید ذوالکفل بخاری رحمہ اللہ آسودۂ خاک ہوئے۔ بقول حضرت مولانا محمد مکی صاحب مدظلہ ’’جنت المعلیٰ میں حضرت امیر شریعت نے اپنا نمائندہ بھیج دیا ہے۔‘‘ سید ذوالکفل بخاری ام السادات کے قدموں میں راحت پذیر ہیں۔

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

ایک بیٹا ام المؤمنین کے حصارِ رحمت و شفقت میں قیامت تک کے لیے آرام فرما ہے، واہ استاد جی — میرے خوش بخت استاد جی — آپ ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر جیت گئے ہو، بہت آگے نکل گئے ہو — اس اعزاز و اکرام کے ملنے پر مبارک ہو —

استاد جی — ایک غریب الدیار بھائی کی جانب سے ہدیۂ تبریک پیش ہے۔ قبول کر لیجیے —
استاد جی آپ کے مرقدِ منور پر اللہ کی بے حساب رحمتیں اور برکتیں نازل ہوں، آمین

وہ سیلانی پریتم......!

سیدہ اُم مزملہ بتول

سورج کو ابھی اپنی منزل کی طرف پہنچنے میں چند گھنٹے درکار تھے لیکن......لیکن......میری سلطنت کا سورج ڈوب چکا تھا۔ میرا وقت رک گیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں اُن کو حسبِ عادت **فی امان اللّٰہ** کہا اور اپنے بچوں کا ہاتھ مضبوطی سے تھامتے ہوئے باہر نکل آئی۔ مسز سلیم میرے ساتھ تھیں۔ میرا وقت تھم چکا تھا۔ ہاں......میرا وقت تھم گیا تھا۔ میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہی اپنا سر گاڑی کی نشست کی پشت پر ٹکایا اور آنکھیں موندلیں۔ اور میں نے جو ادھورا خواب دیکھا تھا اس کو اپنی چشمِ تصور میں دوہرانے لگی۔

جب میں پہلی مرتبہ اِسی **شارع الملک عبد العزیز** پر بخاری صاحب کے ہمراہ آئی تھی تو آٹھ ذوالحجہ، جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ بخاری صاحب اپنی نئی زندگی کا آغاز حج جیسے مقدس فریضے کی ادائیگی سے کرنے کے خواہاں تھے۔ تب بھی شام کا وقت تھا۔ سائے گہرے ہو رہے تھے لیکن......سورج ابھی ڈوبا نہیں تھا۔ اس وادی میں یونہی چہل پہل تھی۔ اس کے در و دیوار، راہ و بازار، وسیع و عریض ریتلے میدانوں اور لق و دق پہاڑوں پر یکساں رونق تھی۔ ہر طرف سے خوشیاں پھوٹتی تھیں۔ سال کے نو مہینے جن راستوں پر گہرے مہیب سنّاٹوں نے ڈیرے ڈالے ہوتے ہیں، اِن تین ماہ میں ماحول اُس کے مختلف تھا۔ ہوائیں یہاں کے در و دیوار سے اٹھکیلیاں کرتی، خوشیوں کے گیت گاتی ضیوف الرحمن کا استقبال کر رہی تھیں۔ ہم بھی خوشیوں کے اِس ماحول میں خوشی سے سرشار منٰی سے عرفات، عرفات سے مزدلفہ، رمی جمرات اور طوافِ زیارت جیسے ارکان ادا کر رہے تھے۔ حج کی ادائیگی کے بعد اُنھوں نے یہیں **حیّ العزیزیہ** میں موجود حضرت خواجہ خان محمد صاحب مدظلہ سے مجھے بیعت کرایا، اور ان کی توجہ کی برکات اور ڈھیروں دعائیں لیتے ہوئے ہم اُملج کی طرف روانہ ہوگئے۔

اُملج، ہمارا ابتدائی مسکن تھا۔ یہاں بخاری صاحب کا حلقۂ احباب گو بہت وسیع نہ تھا لیکن یہاں بخاری صاحب کی علمی و ادبی تشنگی کو تنگیٔ داماں کا سامنا تھا۔ صبح کے چھے سات گھنٹے تدریسی مشاغل میں اور باقی ماندہ وقت روح کو بذریعہ ذکر و اذکار تقویت مہیا کرنے میں صرف کرتے، یا پھر فارغ اوقات میں **مسجدِ شاذلی** کے امام اور اُملج کی پاکستانی کمیونٹی کے بزرگ سربراہ، میری عدم موجودگی میں اُن کے میس (Mess) کے انچارج قاری علی زمان (ساکن مانسہرہ) کی صحبت میں گزارتے۔ قاری صاحب سے اُن کی ایک بِنائے دلچسپی یہ بھی تھی کہ اُنھوں نے اپنے وقت کے عظیم قرّاء سے فنِ قرات سیکھا تھا۔ اُنھی میں ایک شیخ عبدالمالک بھی تھے جو کہ بخاری صاحب کے ماموں سید عطاء المحسن بخاریؒ کے استاد تھے۔ اس کے علاوہ قاری صاحب نے بہت چھوٹی عمر سے ہی بزرگوں کی صحبت سے اکتسابِ فیض کیا تھا اور مطالعہ کا بھی ذوق رکھتے تھے۔ ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ قاری صاحب کی کوئی نرینہ اولاد نہیں تھی اور وہ دونوں میاں بیوی اس سید زادے کے آنے سے بہت خوش تھے۔ بلکہ بخاری صاحب بتاتے کہ قاری صاحب کئی دفعہ بھری مجلس میں برملا کہتے ’’اللہ نے سانوں تے ابراہیمؑ وانگراں بڑھاپے وچ پتر دتا اے، پر اُمتیاں نوں سید زادہ دِتا اے۔‘‘ (اللہ نے ہمیں ابراہیم علیہ السلام کی طرح بڑھاپے میں بیٹا دیا ہے لیکن امتیوں کو سید زادہ عطا کیا ہے)

قاری صاحب نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پی رکھا تھا۔ وہ نہایت مردم شناس انسان تھے۔ خاندان و حالات کے ستائے

ہوئے تھے۔ بخاری صاحب کے آنے سے وہ ایک دم پھر سے جوان ہوگئے تھے۔ اُن کو سہارا مل گیا تھا۔ بخاری صاحب بھی قاری صاحب کی اس بے لوث محبت کو محسوس کرتے ہوئے ان کو بھر پور وقت دیتے تھے۔ پہروں ان کی باتیں (کہانیاں، واقعات) سنتے۔ اُن کو سنبھالا دیتے۔ اپنی بذلہ سنج طبیعت سے ان کا جی بہلاتے۔ ہم ایک رات قاری صاحب کے گھر ملنے گئے تو قاری صاحب کہنے لگے: ''بخاری صاحب میں کب سے آپ کا انتظار کررہا تھا'' میں تو اندر چلی گئی۔ میں ان کی اہلیہ سے گپیں لگاتی رہی۔ واپسی پہ میں نے اُن سے پوچھا کہ خیر تھی، اُنھیں آپ سے کوئی خاص کام تھا؟ تو کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بتانے لگے کہ میں قاری صاحب کو جو لطیفے سناتا رہتا ہوں، آج وہ ایک نہایت عمدہ سی ڈائری خرید کر لائے ہیں کہ وہ سارے مجھے اِس میں خوش خط کر کے لکھ دو۔ جب میں وطن واپس چلا جاؤں گا تو تنہائی میں تمہاری یاد میں ان کو پڑھوں گا۔

یہ ایک قاری صاحب کا قصہ ہی نہیں بلکہ بیسیوں وہ پاکستانی، بنگالی، ہندوستانی افراد جو بسلسلۂ روزگار وہاں مقیم تھے، اپنی بپتا کہنے اور مسائل کے بھنور سے نکلنے کا حل پوچھنے کے لیے مناسب موقع وملاقات کے انتظار میں رہتے۔ بخاری صاحب نے ایک مصروفیت یہ نکالی کہ تبلیغی جماعت والوں کی جو یومیہ تعلیم پہلے سرسری سے انداز میں چل رہی تھی، اس میں باقاعدہ سے ساتھیوں کو منظّم کیا اور روایتی زبان و بیان سے ہٹ کر اس سادہ مختصر سی محفل کو نئے قالب میں ڈھالا۔ ان کو چند مخصوص سنن واعمال پر اصرار کرنے کے دائرے سے نکال کر پوری زندگی کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کی نئی راہ سجھائی۔ اِس کا اثر یہ تھا کہ جلد ہی تکبیرِ اُولیٰ سے نماز پڑھنے والے نمازیوں میں اپنے اپنے کفیل سے لین دین میں گاڑھے غبن سے تائب ہونے والوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا۔ اِس سب کے ساتھ ہی اُنھوں نے میری فراغت کا یہ حل نکالا کہ اکثر نماز کے بعد ایک دو دوستوں کو مسجد سے واپسی پر اپنے ساتھ کر لیتے یا رات کے کھانے پر دو چار خاندانوں کو بلا لیتے اور دسترخوان کو ایسے سجاتے جسے دیکھ کر عربوں کی سخاوت کا رنگ پھیکا پڑ جاتا۔ اس کے علاوہ یومیہ تبلیغی تعلیم بھی اکثر ہمارے ہاں ہی ہوا کرتی جس میں چائے کے ساتھ مُکسّرات کا ہونا ضروری سمجھتے تھے۔

بخاری صاحب کو کسی کے ''مسلکِ اتفاق'' سے اختلاف نہ تھا لیکن اپنی حسنی حسینی روش کو چھوڑنے کا یارا بھی نہ تھا۔ اُملج میں آنے والی تبلیغی جماعتوں کے لیے ایک دو افراد نے مل کر ایک کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا۔ اِس کے بجلی اور گیس کے واجبات میں حصے کے علاوہ وہاں آنے والی جماعتوں کی خدمت اکثر اپنے ذمہ لے لیتے۔ ان کے کئی ''ہمدرد یار'' ان سے کہتے یار بخاری! آپ نے کر لی بچت......؟ تو اپنے مخصوص انداز میں دھیما سا مسکرا کے صرف اتنا کہتے ''اللہ خیر کرے گا۔''

بخاری صاحب اپنی ذاتی زندگی میں بھی شاہ خرچ تھے۔ اُنھوں نے مجھے کبھی کوئی کمی نہیں دی۔ کوئی روک ٹوک نہ کرتے تھے۔ وہ میرے شوہر ہی نہیں، میرا اعتماد بھی تھے۔ وہ عورت کو پاؤں کی جوتی نہیں بلکہ انسان سمجھتے تھے۔ گھریلو ذمہ داریوں سے بالکل نہ گھبراتے تھے۔

تحدیثِ نعمت کے طور پر اس بات کا ذکر کرتی ہوں کہ ہماری فیملی پر اللہ کا یہ خاص کرم تھا کہ ہماری مدینہ طیبہ حاضری اکثر ہوجاتی تھی۔ میرے پاس اس کیفیت کو بیان کرنے کے لیے کچھ زیادہ الفاظ نہیں ہیں۔ میرے اور بچوں کے لیے یہ اطلاع کہ کل ہم نے مدینہ طیبہ جانا ہے، ہلالِ عید کی نوید سے بڑھ کر ہوتا۔ اس موقع پر میں اگر الفاظِ نبویؐ کے ذریعے حلف اُٹھا کر کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ **والذی نفسی بیدہٖ** عطاء المکرِم اور عطاء المنعم نے اپنے بابا سے کسی کھلونے یا تفریحی مقام پر جانے کے لیے کبھی ضد نہیں کی تھی لیکن حرمین جانے کے لیے وہ یوں تڑپتے اور مچلتے جیسے ماہیٔ بے آب۔ یہ ہر آٹھ دس دن بعد بڑی بے تابی سے پوچھتے بابا اِتنے دن ہوگئے ہیں، ہم حرم کب جائیں گے؟ تو بخاری صاحب بڑے جذباتی انداز میں اُنھیں اپنے ساتھ چمٹا کر کہتے اچھا بیٹا! ابھی کچھ دن تک چلتے ہیں۔

اس دنیا میں رہتے ہوئے یہاں کے مسائل اور مشکلات سے کسی بشر کو مفر نہیں لیکن یہ اپنی تنگیٔ داماں کا کسی کو احساس

نہ ہونے دیتے۔ حرمین جاتے ہوئے کپڑوں والے بیگ کے ساتھ ایک بیگ تحائف کا ضرور ہوتا۔ اس میں کئی کتابوں کے نسخے، عطر اور ٹوپیاں بڑے اہتمام سے رکھتے اور مکہ و مدینہ میں موجود اپنے رفقا کو حسبِ پسند ہدیہ کرتے۔

ایک اہم بات جو میں نے محسوس کی، کہ اُنھوں نے تقریباً ساڑھے چھے سال املج میں گزار دیے لیکن وہاں ان کے ''مطلب'' کی کوئی چیز نہ تھی، ملازمت نہ افراد، لیکن اُنھوں نے دونوں میں مطلب پیدا کرلیا تھا۔ وہ یوں کہ اپنے سکول میں صرف یہی اکیلے پاکستانی استاد تھے۔ چنانچہ یہ عرب اساتذہ سے خوب گپ شپ لگاتے۔ اُن سے اُن کی تہذیب وتمدن پر خوب گفتگو کرتے۔ ان کے دو ساتھی **ابراھیم الحُمیدی** (شامی استاد، جو ملازمت کے لیے یہاں آئے تھے) اور **فھد بن یاسر العُسیری**، اکثر فیملی سمیت گھر آتے تھے۔ ان کے آنے پر ہمارے ہاں خوب جشن کا سماں ہوتا کیونکہ بخاری صاحب کو عام عربوں کا طرزِ رہائش اور اُن کی بود وباش بہت پسند تھی۔ چنانچہ خصوصی طور سے سعودی قہوہ اور ان کے پسندیدہ مکسرات لاتے، اور پھر گھنٹوں عرب شعراء وشیوخ کے بارے میں باتیں ہوتیں۔ بخاری صاحب اکثر کہا کرتے تھے کہ ''ادب'' پڑھنے سے نہیں، وہاں رہنے اور معاشرتی اطوار کو کُلّی طور پر اپنانے سے آتا ہے۔ لہٰذا یہ کبھی بھی وہاں پاکستانی لباس نہیں پہنتے تھے۔ ہمیشہ ''ثوب'' پہنتے اور باقیوں کو بھی بڑی شدومد سے اِس کی ترغیب دیتے۔

ان کے ایک سعودی شاگرد نادر کو اُن سے بہت تعلق تھا۔ وہ کچھ بننا چاہتا تھا۔ وہ ان کے پاس بیٹھتا اور انگریزی ادب پڑھتا سیکھتا تھا۔ میں بیٹھک سے اُس کی ''یا سبحان'' اور ''للّٰہ درُّ القائل'' کی بے ساختہ صدائیں سنُتی رہتی تھی۔ ایک دن بتایا کہ کسی بات پر اچانک اُن کے بوسے لینے لگا (یہ عربوں کی فریفتگی کا ایک انداز ہے)۔ وجہ پوچھی تو کہنے لگا استاد سید! ہم سعودی پاکستانیوں کو بطور گالی استعمال کرتے ہیں (ان کے اعمال کی وجہ سے)۔ لیکن میں تم سے اللہ کے لیے محبت کرتا ہوں۔ اور زندگی کے جس میدان میں بھی کامیابی حاصل کروں گا، تمہارا نام فخر سے بتاؤں گا تو میں نے اُسے بتایا کہ ہمارا خمیر تو ہے ہی یہیں سے۔

بخاری صاحب اس مٹی کی محبت کو اپنے بچوں کی فطرت کا جزو بنا دینا چاہتے تھے۔ وہ اپنے شہزادوں کو تفریحِ طبع کے لیے ان ریگستانوں، پہاڑوں پر لے کے جاتے اور ساتھ میں بتاتے جاتے کہ بیٹا! یہاں نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جان نثاروں سمیت بدر کا معرکہ لڑا تھا۔ اور اکثر مدینہ سے واپسی پہ جب ہم ابواء، رابغ، ینبع سے گزرتے تو کہتے عطاء المکرِم! دیکھو...... دیکھو اِن راہوں سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنا کارواں لے کر تبوک گئے تھے۔ سنو، سنو میں یہاں اُن کے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازیں سنتا ہوں۔ وہ اکثر ضباء روڈ پر بحرِ احمر کے کنارے بنے تفریحی مقام پر اُنھیں گھماتے۔ سمندر میں لے جاتے۔ پانی میں اُن کو نہلاتے اور کہتے اِس پانی کو اُنھوں نے چھوا ہے۔ اِسی میں اُنھوں نے گھوڑے ڈالے تھے...... اور پھر رات گئے بچوں کے تھک جانے پر وہ گھر واپس آتے۔ میں اُن سے اکثر کہتی کہ آپ کا تو دل ہی نہیں چاہتا یہاں سے جانے کو۔ مجھے لگتا ہے یہ راہیں بھی آپ کے قدم پکڑ لیتی ہیں۔ فاصلے لمبے ہو جاتے ہیں۔ تو ایک ٹھنڈی آہ بھر کے کہنے لگے ہاں! صحیح کہتی ہو۔

مشکلات تو آتے وقت بھی کچھ کم نہیں ہوتی تھیں، لیکن وقتِ واپسی تو دوہری تہری ہو جاتی ہیں۔ اور پھر اکثر ہمارے ساتھ ہوتا بھی یہ تھا کہ جب بھی ہمارے املج سے واپس آنے کے دن قریب آتے تو ایک طرف محکمانہ مسائل منہ کھولے کھڑے ہوتے اور دوسری طرف بخاری صاحب کی طبیعت پر اداسی چھا جاتی۔ بالکل خاموش بیٹھے رہتے یا پھر قاری علی زمان صاحب کے پاس چلے جاتے اور ان سے فرمائش کر کے حجازی لہجے میں قرآن سنتے۔ جب ہم املج سے ''خروجِ نہائی'' پہ آئے تو اللہ شاہد ہے کہ ہمارا ۹ گھنٹے کا سفر اڑھائی دن میں مکمل ہوا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ گاڑی آگے کی بجائے پیچھے کو جا رہی ہے۔ سفر تھا کہ کٹنے میں نہیں آتا تھا۔ آخر خدا خدا کر کے ہم گھر (ملتان) پہنچے تو پروگرام کے مطابق ہم نے نئے ویزے نکلوا کر چھٹیاں ختم ہوتے ہی مکہ چلے جانا تھا۔ لیکن ان کے بقول ''میرا انٹری ٹیسٹ شروع ہو گیا ہے۔'' ابھی قدرت کو ان کی آزمائش مقصود تھی۔ سات ماہ یہ

اپنے اللہ سے حرم کی قربت مانگتے اور جواب میں خاموشی ہوتی تھی۔ آخر مارچ ۲۰۰۹ء کو اُن کے نالوں کا جواب آ ہی گیا۔ میں اُن کی خوشی اور جذبات کو لفظوں کے سانچے میں نہیں ڈھال سکتی۔ ان کی تو کایا ہی پلٹ گئی تھی۔ ایک ہینڈ بیگ اور دو تین کتابوں کے کارٹن کی جگہ ایک بڑے سوٹ کیس نے لے لی۔ لباس، جوتے، پرفیوم، گھڑی کے شاپر لے کر جب رات ڈیڑھ بجے گھر پہنچے، مجھے جگایا۔ کہا کہ ٹھنڈا ٹھار ملک شیک تو بنا دو، آج میں بہت خوش ہوں۔ میرا عیش کو جی چاہ رہا ہے۔ جب میں دودھ بنا کر لائی تو ساری چیزیں سامنے رکھے اُنھیں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے حیرانی سے پوچھا یہ کس کی ہیں؟ قہقہہ لگا کر بولے: ''میری۔'' آخر کو مکّے سے بلاوا آیا ہے۔ اور نہایت استغنا سے بولے: ''سلیم کہتا ہے یہ سب ضروری ہے۔''

مکہ پہنچ کر کچھ دن تو اِنھی دونوں دوستوں سلیم صاحب اور سجاد صاحب کے ہاں ٹھہرے رہے۔ پھر کچھ دن بعد اپنا مکان مل گیا۔ یہ وہاں شفٹ ہو گئے۔ لیکن یہ دونوں اُن کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ یہ ٹرائیکا ایک دوسرے کے سہارے مزے سے جی رہا تھا۔ سانس بھی آپس کے مشورے سے لیتے تھے۔ اس دوران عطاء المکرم فون پر اکثر اُن سے کہتا بابا آپ ہمیں کب بلائیں گے؟ بابا ہم نے بھی عمرہ کرنا ہے۔ ہم نے بھی حرم جانا ہے۔ بابا اللہ کے لیے حرم میں ایک چھوٹا سا گھر لے لو۔ میں اس میں سے نکل کر طواف کروں گا۔ اُس کی پھوپھو نے اُس سے پوچھا مکرم، بڑا گھر کیوں نہیں؟ تو نہایت فلسفیانہ انداز میں کہنے لگا کہ پھوپھو جان پھر رش ہو جاتا ہے اور طواف میں مشکل ہوتی ہے۔ ہم سب ہنس پڑے۔

بخاری صاحب کافی عرصے سے کوشش میں تو تھے ہی لیکن بچوں کے اصرار کی وجہ سے جلد ہی ویزہ نکلوا لیا۔ جس دن ہمارے پاسپورٹ اور ٹکٹیں ملیں، دونوں بچے خوشی سے اچھلنے لگے۔ ہم ۲۰/ اکتوبر ۲۰۰۹ء کو سعودیہ پہنچ گئے۔ مسز سجاد اور مسز سلیم نے بہت پر جوش طریقے سے ہمارا استقبال کیا۔ جب تک ہمارا گھر سیٹ نہیں ہوا، ہمارا قیام و طعام اُن کے ہاں تھا۔ ساڑھے چھے سال بخاری صاحب نے جو خواب دیکھے تھے، وہ اب حقیقت کا روپ دھار چکے تھے۔ بڑا خوبصورت گھر، شاہی مہمانداری اور وہ سب کچھ جسے ہم ماضی میں چشمِ تصور سے دیکھتے تھے۔ صبح شام اُٹھتے بیٹھتے حج کی باتیں ہوتیں۔ ایک رات ہم تینوں خاندان اکٹھے حرم گئے۔ گھڑی والے ٹاور کی نشانی مقرر کر کے تینوں اپنے اپنے بچوں کے ساتھ ہو لیے۔ طواف کے دوران عطاء المکرم نے پوچھا بابا آپ ہمارے لیے اداس نہیں ہوتے تھے؟ جواباً کہا بیٹا میں بہت اداس ہوتا تھا۔ آدھی رات کو یہاں آ جاتا تھا اور وہاں اوپر (اُس کو اوپر اُٹھا کر برآمدوں کی تیسری منزل کی طرف اشارہ کر کے کہا) ٹھنڈی ہوا میں آہستہ آہستہ طواف کر لیتا تھا۔ عطاء المنعم نے کہا بابا ہمیں بھی وہاں طواف کرائیں، تو بولے ابھی نہیں بیٹا، حج کے بعد۔

جذبات کی کوئی زبان نہیں ہوتی۔ کسی بھی کیفیت کی شدت کو الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ بخاری صاحب بہت خوش تھے۔ وہ دنیا کی ہر خوشی اپنے بچوں کے قدموں میں لا ڈھیر کرنا چاہتے تھے۔ ایک مرتبہ رات عشا کی نماز پڑھنے گئے اور بہت دیر سے واپس آئے تو عطاء المنعم نے کہا بابا اتنی دیر سے ہم آپ کا انتظار کر رہے تھے۔ میری طرف دیکھتے ہوئے بولے: میں بہت خوش ہو رہا تھا۔ اِن کو اور تمھیں خوش دیکھا تو مالک کا شکر ادا کر رہا تھا جس نے مجھے اتنی استطاعت دی کہ میں اپنے بچوں کو خوشیاں دینے کے قابل ہوا۔

خوشی سے بچوں کو گود میں اُٹھاتے، چومتے۔ اُن کی بلائیں لیتے نہ تھکتے تھے۔ اُن کی فرمائشیں پوری کرتے خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے۔ وقت بڑی سرعت سے گزر رہا تھا۔ یہ جلد از جلد اپنے تمام کام سمیٹ رہے تھے۔ ۱۴/ نومبر ہفتے کا دن بہت مصروف گزارا۔ میرے ماموں ممانی حج کے سلسلے میں چند ہی دن بعد آنے والے تھے۔ اس سلسلے کے تمام امور کو حتمی شکل دی۔ رات گئے Translation کا کام مکمل کیا۔ کھانا کھایا۔ وتر پڑھے۔ روز کا معمول تھا کہ سوتے وقت لیٹے لیٹے ایک ایک تسبیح استغفار اور درود شریف کی ضرور پڑھتے۔ لیکن اس رات بہت دیر تک کمروں میں ٹہلتے رہے اور ساتھ تسبیح بھی پڑھتے رہے۔ اِس رات سعودیہ کی فٹ

بال ٹیم کوئی میچ جیتی تھی۔ سعودی نوجوان رات ایک بجے فتح کے جھنڈے لہراتے، گاڑیوں کے ہارن خاص سٹائل میں بجاتے سڑکوں پر نکلے ہوئے تھے۔ ایک بے ہنگم شور تھا کہ سو نہیں سکتے تھے۔ دونوں بچے بھی کھڑکی سے منہ باہر نکالے اُن کی اچھل کود سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ یہ بڑی مشکل سے اُنھیں یہ کہہ کر لائے کہ یہ اب تین چار دن یہی کچھ کریں گے۔ صبح باہر جا کر دکھالاؤں گا۔

۱۵/نومبر کا سورج ہمارے لیے عجیب پیغام لیے طلوع ہوا تھا۔ حج کی چھٹیاں شروع ہو رہی تھیں۔ کہنے لگے آج جلدی آؤں گا۔ ہوسکتا ہے صرف حاضری ہی ہو کیونکہ طلبہ کی اکثریت غیر حاضر ہوتی ہے اس لیے پیریڈ فارغ ہوں گے۔ ناشتے کے بعد ٹھیک نو بج کر پچاس منٹ پر گھر سے نکلے۔ بچے حسبِ معمول اوپر کھڑکی سے اُنھیں یونیورسٹی جاتا دیکھ رہے تھے۔ جب تک نظروں سے اوجھل نہ ہو گئے بچے وہیں کھڑے رہے۔ چونکہ یہ جلدی آنے کا کہہ گئے تھے لہٰذا میں عطاء المکرِم کو پڑھانے کے ساتھ ہی دوپہر کے کھانے کی تیاری میں جُت گئی۔ سارے کاموں سے فارغ ہو کر میں ذرا دیر کمر سیدھی کرنے کے لیے لیٹ گئی کہ دوپہر ڈیڑھ بجے مسز سلیم اور مسز سجاد کے گھنٹی بجانے سے میری آنکھ کھل گئی۔

میرا خواب ادھورا رہ گیا تھا...... اُنھیں اُن کے شوہروں نے مجھے سہارا دینے کے لیے بھیجا تھا، اِدھر میرے موبائل کی گھنٹی بج رہی تھی، دفاعِ مدنی کا ایک شرطی مجھ سے میرا اور میرے زوج کا نام پوچھ رہا تھا۔ وہ مجھے میری متاعِ حیات لٹنے کی اطلاع دینا چاہ رہا تھا، کاتبِ تقدیر کی لکھت غالب آچکی تھی، میرے بخاری صاحب نے ندائے الٰہی پر لبیک کہہ دیا تھا، بخاری کی چٹکتی کلیاں ایک دم مرجھا گئی تھیں اور میں صرف ''اچھا مالک'' ہی کہہ پائی تھی۔

میں **شارع ملک عبد العزیز** پر تھی۔ سورج ڈوب چکا تھا۔ میں **مستشفیٰ ملک الفیصل** میں بچوں کو اپنے بابا سے ملوانے لے جا رہی تھی۔ وہ یونیورسٹی سے پڑھا کر آچکے تھے۔ اب اُنھیں اپنے خوابوں کے محل جانے کے لیے تیار ہونا تھا۔ عطاء المکرِم کے بقول بابا نے اپنے گھر کو سیٹ کرنے کے لیے بہت محنت کی تھی نا، اِس لیے وہ تھک گئے تھے۔ ہاں بیٹا! اب اُنھیں تھکاوٹ اتارنے جنت المعلیٰ میں جانا تھا۔

سرد خانے کے انچارج نے جب اُن کے چہرے کو ہمارے لیے کھولا تو وہ اپنے بچوں کی آہوں اور آنسوؤں کی پروا کیے بغیر آرام کر رہے تھے۔ اِتنے شدید ایکسڈنٹ کے باوجود اُن کے چہرے پر کسی قسم کی تکلیف کے کوئی آثار نہ تھے۔ پیشانی کے محراب پر سٹیرنگ کے دو نشانوں کے علاوہ کوئی خراش تک نہ تھی۔ میں رات کو مکہ کے نواحی مقام الرصیف میں **مغسلۃ الاموية الخيرية** میں اُن کو آخری سلام کرنے گئی تو میں نے دیکھا کہ اُن کے دوست سجاد صاحب اور سلیم صاحب اپنے رفقا کے ساتھ مل کر اُن کو تیار کر رہے تھے۔ میں اُن کی وفا و عظمت کو سلام پیش کرتی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد وہ مجھے اُن کے پاس لے گئے۔

بنو ہاشم کا شاہ زادہ...... اماں خدیجہ کا لاڈلا...... سفید براق جیسا لباس پہنے...... خوشبوؤں میں نہائے میٹھی نیند سو رہا تھا...... حوروں کا دولہا مسکرا رہا تھا...... بخاری! ذرا آپ اِن معصوموں کے ننھے ننھے ذہنوں میں کلبلاتے سوالات تو سنتے۔ عطاء المکرِم کہتا ہے امی، بابا نے تو کہا تھا کہ ہم اکٹھے رہیں گے۔ پہلے مزملہ چلی گئی۔ اب بابا بھی اُس کے پاس چلے گئے۔ ہم کس کے پاس رہیں گے؟ امی ہمارا وقت کیوں نہیں آیا؟ عطاء المنعم نے اپنی فوجی جیپ کو اینٹیں مار کر ریزہ ریزہ کر دیا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ شرطی کی گاڑی ہے۔ اِس نے میرے بابا کی گاڑی کو ٹکر ماری تھی۔

بخاری! آپ کے بچے اب Blocks سے مکان اور پُل بنانے کی بجائے حرم اور جنت المعلیٰ کے ڈھانچے بناتے ہیں۔

میں سوچتی ہوں بخاری! آپ تو اپنے بچوں کو کسی چیز کی کمی نہ ہونے دیتے تھے۔ اور اب اپنی کمی دے گئے ہیں۔ آپ تو اِن کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھ سکتے تھے، تمام عمر کے لیے آنکھیں نم کر گئے ہیں۔

ایک تھا شاہزادہ

سیدہ س بخاری ☆

میں دو ماہ سے ایک کہانی لکھنے کی کوشش میں ہوں۔

یہ کہانی بنو ہاشم کے ایک شاہزادے کی ہے۔ جو ناکشودہ منزلوں کا کھوجی، فاران کی چوٹیوں سے طلوع ہونے والی لازوال روشنی کے مسکن کا عاشق وفریفتہ دارِ بنی ہاشم سے نکلا اور سرزمین عرب جا پہنچا۔ حرمین کے قرب کا خواہاں، عرب وعجم میں حائل اجنبیت کو دور کرنے کا متمنی، تعصب سے دور، امت مسلمہ کے اتحاد و اتفاق کے لیے مضطرب و بے چین، ام القریٰ میں اپنے افکار کی روشنی بکھیرتا، اپنے علم سے دماغوں کو منور اور دلوں میں سوز و گداز پیدا کرتا، میدان عمل میں آنے اور کچھ کر گزرنے کی دعوت دیتا، اپنے حسن اخلاق و پختگی کردار سے عربوں کو گرویدہ بناتا، ادا دارنبوت سے ادا فہموں کی نسبت کی بھیک مانگتا، خلد بریں کا مسافر جنت المعلیٰ میں ماں کے قدموں میں جا سویا۔ مجھے ہر بار یوں لگتا ہے کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ یہ کہانی دلدوز بھی ہے اور دلسوز بھی۔ لکھنے لگوں تو آنکھوں میں دھند پھیلنے لگتی ہے اور قلم رک رک جاتا ہے۔ لیکن دل حزین ومضطر ہے کہ چین نہیں لینے دیتا۔ اسی کے تقاضے سے مجبور بیٹھی سوچ رہی ہوں کہ کاش ان آنسوؤں کا کوئی رنگ ہوتا اور میں انھیں اپنے قلم کی روشنائی بناتی تو شاید اس کہانی کا کچھ حق ادا ہوتا۔

میں اس کے بارے میں کیسے لکھوں جو قلم کی حرمت سے آشنا، نثر کا بادشاہ تھا۔ میں اس کے لیے الفاظ کہاں سے لاؤں جسے صبا کے لہجے میں حرف دلنشیں کہنے کا ہنر خدا نے ودیعت کیا تھا۔ جو اپنے مخاطب کو لاجواب اور علم وادب کی بڑی قد آور شخصیات کو انگشت بدنداں کر دیتا تھا۔ جس کی آنکھوں کی چمک، مخصوص مسکراہٹ، پیشانی کے بل، پُروقار و پُراعتماد اندازِ گفتگو، مطالعے کی وسعت، دلائل اور حوالوں کا استحضار موافق کو گرویدہ وشیدائی اور مخالف کو پگھلا دیتا۔ جسے دوستی کی سب ادائیں یاد تھیں تو دشمنی میں بھی ادا نرالی تھی کہ اس کی کسی سے کوئی ذاتی دشمنی نہ تھی۔ وہ سبھا ساجن پر یہی تھا۔

میرا جی چاہتا ہے کہ اُس کا مرثیہ لکھوں تو یوں لگتا ہے کہ فیضؔ مجھ سے پہلے یہ کام کر چکا ہے۔

مجھ کو شکوہ ہے مرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے　　لے گئے ساتھ مری عمرِ گزشتہ کی کتاب
اس میں تو میری بہت قیمتی تصویریں تھیں　　اس میں بچپن تھا مرا، اور مرا عہدِ شباب
اس کے بدلے مجھے تم دے گئے جاتے جاتے　　اپنے غم کا یہ دمکتا ہوا خوں رنگ گلاب
آخری بار ہے، لو مان لو اک یہ بھی سوال　　آج تک تم سے میں لوٹا نہیں مایوسِ جواب
آ کے لے جاؤ تم اپنا یہ دمکتا ہوا پھول　　مجھ کو لوٹا دو مری عمرِ گزشتہ کی کتاب

میں نے جب بھی سوچا کہ کیا کہوں وہ کیسا تھا اور کیا تھا تو ایک مصرعہ میں مجھے اس کی پوری زندگی نظر آئی

جواں بخت و جواں طالع جواں باد

☆ ہمشیر سید ذوالکفل بخاریؒ

ہاں میرے بھائی تم جواں بخت بھی تھے اور جواں طالع بھی اور جواں باد ایسے کہ تمھاری دوپہر کی دھوپ سی اجلی جوانی جسے حرمین کے قرب نے اور بھی اُجال دیا تھا اللہ کو ایسی پسند آئی کہ کہولت اور ضعیفی کو تمہارے قریب بھی نہ آنے دیا۔ یہ جواں بختی ہی تو ہے کہ ماہ صیام و ماہ قرآن میں تم عالم ہست و بود میں آئے۔ والد گرامی کی خواہش پر ذوالکفل سے موسوم ہوئے اور پھر اس نام کے اثرات تمہاری زندگی میں مرتب ہوتے گئے۔ تم نجیب الطرفین بھی تھے اور حسب ونسب میں ممتاز بھی۔ حسینی غیرت کی جھلک بھی تھے اور حسنی حلم وتدبر سے مالا مال بھی۔ والدین ایسے ملے جنھوں نے رزق حلال کھلایا اور صدق مقال، دین وایمان کی حفاظت اس کی خاطر مصائب ومشکلات میں ثابت قدمی، غیرت وحمیت، استغناء وخودداری کا سبق پڑھایا۔ حرم امیر شریعت سیدہ ام العطاءؒ اور بقول تمھارے ''وقت کی ولیہ'' کی گود اور بے پناہ محبت نصیب ہوئی۔ اپنے وقت کے امام تاریخ و نسب سید ابو معاویہ ابوذر بخاری علیہ الرحمۃ نے کم عمری میں علامہ کا لقب دیا اور تم ان کی خاص شفقت ومحبت اور توجہ کا مرکز ٹھہرے۔ منفرد انداز بیاں اور منفرد شخصیت کے مالک خال مکرم سید عطاء المحسن بخاریؒ اپنی نظم ونثر میں تمھارا مشورہ اور رائے معتبر مانتے۔ ننھیال و ددھیال میں ہر دلعزیز تھے۔ ہر ایک نے تمھیں چاہا اور تم پر اپنی محبت نچھاور کی کہ تم اسی قابل تھے۔ تمھارا کردار ایسے موتیوں کی ایک مالا ہے جس کا ہر موتی بڑا آبدار ہے۔ تمھارے چاہنے والوں اور تم سے پیار کرنے والوں نے تمھارے بارے میں بہت کچھ لکھا اور تمھیں خراج تحسین ادا کیا۔ لیکن تمھاری خلوت وجلوت کی بہت سی ادائیں زندگی کے شب و روز تمھارے بچپن، لڑکپن اور جوانی کے بہت سے گوشے ومناظر اور تصویریں جو میرے حافظے کی لوح پر نقش ہیں اور میری اشک بار آنکھیں جن کا طواف کرتی ہیں جی چاہتا ہے کہ تم سے محبت کرنے والوں کو اس میں شریک کروں اور انھیں قطرے سے گہر بننے تک کی داستاں کا لمحہ لمحہ سناؤں۔

بچپن ایسا معصوم کہ معصومیت کو بھی اس پر پیار آئے۔ نہ کوئی ضد نہ ایسی خواہش جو پوری نہ ہو سکے۔ گھر کے ساتھ پرائمری سکول کے باہر آدھی چھٹی کے وقت بکنے والی بیسن کی نمکین پھلکیاں اور جاپانی پھل تمھاری پسند تھے جس کے لیے تمھیں امی سے صرف چار آنے درکار ہوتے۔ گھر پکنے والے کھانوں میں چنے کی دال اور ابلے چاول تمھاری مرغوب غذا تھے۔ خیالات کی شعروں کی صورت میں اظہار کی کوشش یا پھر اکیلے ہی کتنی کتنی دیر خود کلامی کرتے رہنا، یوں...... جیسے کوئی مقرر تقریر کر رہا ہو یہ ایسی باتیں تھی جو تمھیں دوسرے بچوں میں منفرد کرتی تھیں۔ لڑکپن بھی ایسا ہی بے ضرر اور ہم سنوں سے بہت مختلف اور جدا۔ نہ سیر وتفریح کا شوقین اور نہ ہی کھیل کا رسیا۔ ہاں..... دوستوں کی دیکھا دیکھی یا ان کے اصرار پر کچھ عرصہ کرکٹ کھیلی لیکن پھر ایک دم یوں چھوڑی جیسے کسی چیز کے غلط انتخاب پر انسان اس سے الگ ہو جاتا ہے۔ البتہ ایک شوق اور ایک چیز ایسی تھی جو تم سے تیسری جماعت سے لے کر اپنے ابدی سفر سے پہلے تک نہ چھوٹی۔ وہ تھی کتاب اور مطالعہ۔ اس شوق کو مہمیز کرنے اور اوّل اوّل اس کی تسکین کرنے والے والد بزرگوار ہیں۔ تمھاری ذہن سازی اور ماحول کی کثافتوں سے بچانے کے لیے ان کی تربیت کا یہ ایک طریقہ تھا۔ مہینے کے ابتدائی دنوں میں تمھیں ابا جی کی اوکاڑہ سے آمد کا شدت سے انتظار ہوتا، کیونکہ وہ آتے ہوئے تمھارے لیے چار رسالے ہونہار، تعلیم و تربیت، جگنو، نونہال اور اس کے علاوہ فیروز سنز کی دیگر کتب ضرور لاتے اور پھر تم جامعہ خیر المدارس کے احاطے میں اپنے کچے اور پرسکون گھر کی چھوٹی سے بیٹھک میں پلنگ کی ٹیک سے کمر ٹکائے دنیا و مافیہا سے بے خبر ان کے مطالعے میں مگن ہو جاتے۔ رات کو گھر والوں کے اصرار پر سونے اور صبح سکول جا کر واپس آنے کے بعد ایک دو دن تک تمھاری یہی کیفیت رہتی جب تک ان سب کا مطالعہ نہ کر لیتے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی صوفی تبسّم اور خالد بزمی کی نظمیں اور قوالیاں مزے لے لے کر پڑھتے۔ ساغر صدیقی اور اقبال تمھارے پسندیدہ شاعر تھے۔ اس عمر میں جب بچوں کو

اقبال اور اس کی کتابوں کے نام بشکل آتے ہیں تم امی سے اس کی نظموں کو سمجھتے پڑھتے اور کبھی ترنگ میں آ کر ریکارڈ کرواتے سامعین میں ہم بہنیں یا اکثر میں ہوتی۔ اقبال کی مشہور نظم ''میں اور تو'' آج بھی تمھاری آواز میں میرے پاس محفوظ ہے۔ گھر میں ہر فرد کی آنکھ کا تارا ہونے کے باوجود تم نے کبھی کسی سے بدتمیزی نہیں کی اونچی آواز سے نہیں بولے ہماری آپس میں کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ تم چھڑی گھمار ہے تھے وہ اچانک معمولی سے میری ٹانگ کو لگ گئی میں نے دانستہ رونے والی شکل بنائی تو تم ایک دم پریشان ہو گئے اور وضاحت کی کہ میرا مارنے کا ارادہ بالکل نہیں تھا۔

پتہ نہیں کیوں اپنی کم علمی، کم فہمی اور بے بضاعتی کے احساس کے باوجود میں نے جب بھی تمھاری مماثلت و مشابہت کسی سے تلاش کی تو دو شخصیات ہی سامنے آئیں۔ امام الہند مولانا ابوالکلام آزادؒ اور امام تاریخ و نسب سید ابو معاویہ ابوذر بخاریؒ۔ تم وہ نہ سہی لیکن ان کا پرتو اور جھلک ضرور تھے۔ جس عمر میں اکثر چھوٹے بڑوں کے پاس بیٹھنے سے گریز کرتے ہیں، تم بڑوں کی صحبت میں رہنے کی کوشش کرتے، جب بھی موقع ملتا جامعہ خیر المدارس کے دفتر میں جا بیٹھتے۔ وہاں پر موجود مولانا اصغر صاحبؒ اور مولانا محمد سخیؒ صاحب سے اچھی گپ شپ رہتی بلکہ ان سے لطائف اور چٹکلوں کا تبادلہ بھی ہوتا جو تم گھر آ کر سناتے۔ کبھی کبھار شیخ الحدیث علامہ محمد شریف کشمیریؒ کی مجلس میں بھی جا بیٹھتے اور استفادہ کرتے۔ تم ہائی اسکول گئے تو وہاں بھی اساتذہ کو خوش اور متاثر کیا۔ تم نے دسویں جماعت کی الوداعی تقریب میں جب تقریر کی تو تمھارے انگریزی کے استاد صاحب نے گلوگیر لہجے میں کہا تھا کہ شاید میں اپنے نومولود بیٹے کی وفات پر اتنا افسردہ نہیں ہوا جتنا آج اس نے کر دیا ہے۔ نوجوانی اور کالج لڑکوں کی زندگی میں بہت خطرناک موڑ ہے لیکن تم یہ موڑ بھی بڑی کامیابی و کامرانی سے کاٹ گئے کبھی کسی ایسی سرگرمی میں ملوث نہ ہوئے جو تمھارے لیے یا گھر والوں کے لیے خفت کا باعث ہو۔ البتہ تمھاری علمی و ادبی سرگرمیاں عروج پر پہنچیں۔ دوستوں کا حلقہ وسیع ہوا، جن میں ہم عمر بھی تھے اور عمر سے بڑے بھی، زاہد و پارسا بھی تھے اور رند و بادہ خوار بھی۔ لیکن تمھارا دامن شباب یہاں بھی تر نہ ہوا۔ تمھارا مطالعہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور کمرہ کتابوں سے بھر گیا حتیٰ کہ تمھاری چارپائی کے آدھے حصے میں کتابوں کا ایک ڈھیر اور آدھے میں تم سوتے۔ تمھارے بچھونے کی تبدیلی اور کمرے کی صفائی ایک مشکل مرحلہ ہوتی۔ میں کہتی ''منے مجھے اتنا بتا دو کہ میں اس ڈھیر کے نیچے سے چادر کیسے نکالوں؟ اور کمرے کی حالت کیسے درست کروں؟'' تو تم اپنے مخصوص انداز میں مسکرا دیتے یا کبھی ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہتے کسی مشقت کی ضرورت نہیں ایسے ہی رہنے دو۔ تم ادبی و تعلیمی میدان میں آگے بڑھتے گئے اور پھر ایک دن بغیر کسی سفارش کے لیکچرار بن گئے۔ مزید کئی ڈگریاں حاصل کرنے کے باوجود تمھاری سادگی، مستقل مزاجی اور فرض شناسی میں قطعی فرق نہ آیا۔ گھر کے وہ کام جو ایک عرصے سے تمھارے ذمے تھے، صبح دودھ اور ناشتے کا سامان، جمعہ والے دن جمعہ بازار سے سبزی لانا، گندم پسوانا، مہینے بھر کا راشن ہر بیمار کی تیمارداری کرنا اور اپنے انتہائی قریبی و مہربان دوست ڈاکٹر عبدالرب نیاز صاحب سے دوالا کر دینا..... بڑی خوش اسلوبی سے کرتے رہے۔

پھر ایک دن تمھیں روحانی و باطنی ترقی کا خیال آیا اور تم خواجۂ خواجگان حضرت مولانا خان محمد صاحب (متع اللہ المسلمین بفیوضہ الدائمہ) کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گئے، نہ صرف شامل ہوئے بلکہ وہاں بھی معتبر ٹھہرے۔ حدِّ ادب کا حد درجہ خیال رکھتے ہوئے، تمھاری گفتگو بذلہ سنجی، ادبی چٹکلے نہ صرف مرشد کو متبسم کر دیتے بلکہ ان کی نگاہِ شفقت و رأفت تم پر مرتکز ہو جاتی اور برس ہا برس کے حاضر باش رشک کرتے۔ روحانیت کی اس شاہراہ پر تم بڑی کامیابی سے چلے لیکن اخفاء و احتیاط کے ساتھ۔ نماز کی پابندی، انداز کی تبدیلی، قرآن پاک کی تلاوت خانقاہ کے معمولات کا ورد تمھارے نامۂ عمل کو بھرنے لگے۔ بارہا ایسا ہوتا کہ میں نماز فجر کے بعد تمھارے کمرے میں کسی کام کے لیے جاتی اور تم تفسیر عثمانی کے مطالعہ میں مشغول ہوتے۔

بالخصوص رمضان میں۔

تم نے ہمیں ایک سوچ اور ذوق دیا بہت سی باتوں کا شعور اور آگہی تمھاری ذات سے حاصل ہوئی۔ تم قدرت کا ایک ایسا انمول عطیہ تھے کہ جس سے جو جب چاہتا اور جیسا چاہتا استفادہ کرتا۔ ہر موضوع پر تمہاری گفتگو مدلل و مفصل اور تسلی بخش ہوتی تشنگی باقی نہ رہتی۔ تم دوست دار بھی تھے اور دوست نواز بھی۔ دامے درمے سخنے ہر ممکن طریقے سے تم دوستوں کی مدد کرتے اور میں اگر یہ کہوں کہ کتاب اور مطالعے کے بعد دوسرا بڑا شوق دوستی نبھانا تھا تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ تمھارا دسترخوان ان کے لیے وسیع تھا۔ دو تین ماہ گزرنے کے بعد تم کسی بھی ہفتے کی شام کو آہستہ سے کہتے ''صبح کچھ دوستوں کا ناشتہ ہے'' اور میں ہنس کے کہتی تم اپنی سہولت دیکھتے ہو کیونکہ صبح اتوار کی چھٹی ہے مجھے تو مدرسے جانا ہے۔ اس کا جواب تمھارا مخصوص قہقہہ ہوتا اور پھر کچھ دوستوں کے لیے جو ناشتہ بنتا وہ اگلے دو دن ہمارا توشہ ہوتا۔ میں کہتی منے تمھارا بس نہیں چلتا کہ تم دوستوں کو زبردستی ٹھونس ٹھونس کر کھلاؤ۔

پھر ایک دن تمھاری خواہش پوری ہوئی اور تم ہمیں جہاں بھر کی اداسیاں دے کر ڈیپوٹیشن پر اپنے صاحبِ بصیرت مرشد کی اجازت سے سعودی عرب چلے گئے۔ وہاں تمھارا قیام تبوک کے ایک نواحی قصبہ املج میں تھا۔ پھر ہم سال میں تین عیدیں منانے لگے۔ تیسری وہ جب تم چھٹی پر آتے۔ تم نے وہاں بھی وضع داری، محبت اور ملنساری کے بل بوتے پر ہر ایک کو اپنا والہ وشیدا بنالیا۔ لیکن تمھاری تشنگی باقی تھی کیونکہ یہاں تمھارے ذوق کی تسکین اور قابلیت وصلاحیت کے مطابق کام نہ تھا اور پھر حرمین کے ملک میں رہ کر ان سے دوری بھی۔ تم کوشش میں لگے رہے اور ہم سب دعا میں۔ بالآخر تم ام القریٰ پہنچ گئے۔ تمہاری خوشی کی اور اطمینان کی انتہاء نہ تھی۔ شاید زندگی میں کسی اور موقع پر اتنے خوش نہ ہوئے ہو۔ ہمیں بھی تمھاری خوشی ہی عزیز تھی۔ پتہ نہیں کیوں یوں لگتا تھا جیسے اب فاصلے ختم ہو گئے ہوں اور تم بہت قریب آ گئے ہو۔ لیکن یہ قرب لامحدود فاصلوں میں بدلنے والا تھا۔ جدائی کی گھڑی سر پہ کھڑی تھی اور ہم اس سے غافل و بے خبر۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ میں نے تمھارے لیے جتنی بھی دعائیں مانگیں شاید ہی کوئی ایسی ہو جو قبول نہ ہوئی۔ ہاں..... ایک دعا، ایک فریاد، اور فغاں جو قبول واجابت نہ پاسکی اس لیے کہ وہ اس وقت دراجابت تک پہنچی جب ابا جی کا ذوالکفل، امی کا منا، بہنوں کا لاڈلا اور پیارا بھائی، بھائی جان کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر چلنے والا یار، وفا شعار وخدمت گزار بیوی کا بخاری صاحب، من موہنے اور معصوم بچوں کا بابا جان، دوستوں کا نرالا اور انوکھا دوست دار الفناء سے دار البقاء کا رخ کر چکا تھا۔ اتنی جلدی؟ جس نے سنا دم بخود رہ گیا۔ شاداں وفرحاں تمھاری آمد کے منتظر پل بھر میں غم ویاس کی تصویر بن گئے۔ ایک قیامت تھی جو ٹوٹ پڑی۔ بوڑھے ناتواں والدین اور بھی بوڑھے ہو گئے۔ بھائی بہنوں کی ہمت جواب دے گئی۔ عزیز واقارب، دوست احباب دل گرفتہ چلے آئے۔ کون تھا جو تمھاری جدائی میں رویا نہ ہو۔ برس ہا برس کے بچھڑے بے قرار ومضطرب ہو کر آئے۔ یوں...... جیسے وہ دلاسہ دینے نہیں لینے آئے ہوں۔ شیخ سعدی نے تمھی جیسے لوگوں کو ہی تو مخاطب کیا ہے

یاد داری کہ وقتِ زادنِ تو
ہمہ خنداں بدند و تو گریاں
آنچناں زی کہ وقت مردن تو
ہمہ گریاں بوند و تو خنداں

پتہ نہیں تمھارے نامۂ عمل کا کونسا عمل مقبول ہوا تھا؟ اور مناجات کی کون سی گھڑی دراجابت پار کر گئی تھی؟ یا پھر

شہزادے! تم نے کسی محل کا خواب دیکھا تھا جس کی تعبیر کا وقت آ چکا تھا۔ تم نے ادا دارِ نبوّت سے، اپنے مولا سچے محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے جو بھیک مانگی تھی اس سے تمھاری جھولی بھر دی گئی کہ اس در سے کوئی خالی نہیں لوٹا۔ تم جاتے جاتے توحید و رسالت کی گواہی کا اقرار کر کے شرطی کو اس کا گواہ بنا گئے اور قرآن کی یہ آیت **یثبت اللہ الذین آمنوا بالقول الثابت فی الحیوۃ الدنیا و فی الآ خرۃ** اپنی صداقت کو منوا رہی تھی۔ تمھیں سفرِ آخرت پر روانہ کرنے کی تیاری ہونے لگی، ہر شخص حیران تھا کہ خود بخود ہر کام ہوتا چلا جا تا تھا۔ پھر رات کے آخری پہر تمہیں مسلمانوں کے مرکز ومحور حرم کعبہ لایا گیا۔ دنیا کے ہر گوشے سے آنے والے لاکھوں مسلمانوں نے تمھاری نماز جنازہ ادا کی اور تمھیں شاہ دو جہاں کی ملکہ کے مدفن کے قریب سپرد خاک کر دیا گیا۔ ایسی جگہ جس پر ساری دنیا کے محلات قربان، یہ بخت کی فیروزی اور طالع کی ارجمندی نہیں تو اور کیا ہے؟ ہم غم واندوہ اور حزن و ملال کے جس بحرِ بے کراں میں کھڑے ہیں، وہ بے کراں ہی نہیں بے کنار بھی ہے۔ تم جاتے ہوئے ہمارے لیے صبر وعزیمت کا جو راستہ چھوڑ گئے ہو، ہم سب ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے، ہمت و استقامت کے ساتھ اس پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں کہ تمھارے معصوم بچوں کی باتیں ہمارے قدم ڈگمگا دیتی ہیں۔ کاش تم ان کے سوال اور ان کی باتیں سنتے!.... وہ پوچھتے ہیں کہ بابا نے سفر پر جانے کی دعا نہیں پڑھی تھی؟ عطاء المنعم کہتا ہے کہ میں قیامت کا انتظار کر رہا ہوں، مجھے بتائیں وہ کب آئے گی؟ کیونکہ میں نے بابا سے ملنا ہے۔ عطاء المکرّم کہتا ہے کہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم بابا سے صرف فون پر ہی رات کو بات کر لیں؟ وہ کھانا کھاتے کھاتے رک جاتا ہے بابا یاد آتے ہیں تو یہ کھایا نہیں جاتا۔ ہم پاکستان کیوں آ گئے ہیں؟ یہاں حرم کی ٹھنڈک نہیں۔ یوں لگتا ہے کہ تم جاتے ہوئے اپنے ساتھ خوشیوں کے سارے رنگ زندگی کی رونقیں اور جینے کی امنگ بھی لے گئے ہو۔ تمھارے بغیر ہمارا تو یہ حال ہے:

اے چراغِ نظر تیرگی چھا گئی، اے عروسِ سحر روشنی مر گئی
جذبۂ عظمتِ کارواں مٹ گیا، روحِ بیداری و آگہی مر گئی
آرزو اب کہاں جستجو اب کہاں روشنی اب کہاں زندگی اب کہاں
آرزو کی قسم آرزو مٹ گئی، زندگی کی قسم زندگی مٹ گئی

مجھے یقین ہے کہ جب تمھارے دوستوں نے تمھیں مرقد میں سلایا ہوگا تم پر مٹی برابر کی ہوگی اور رب العالمین کی طرف سے مبشر بشیر آئے ہوں گے، سوال و جواب کی کامیابی کے بعد ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم و بشارت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق تمھیں کہا گیا ہوگا **نم کنومۃ العروس الذی لا یوقظہ الا احب اھلہ الیہ حتیٰ یبعثہ اللہ من مضجعہ** اور اب تم میدان حشر میں ادا فہموں اور ادا نثاروں کی معیت میں اٹھو گے یہ سب کچھ یہ سارا اعزاز من جانب اللہ ہے یہ اسی کا کمال ہے جو تمام کمالات کا خالق ہے۔

ع　تری لحد پر خدا کی رحمت تری لحد کو سلام پہنچے

واہ منے شاہ!

سید مصطفیٰ بخاری

ہمارے اکابر میں ایک ''منے شاہ'' گزرے ہیں جن سے حضرت نانوتویؒ نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھوائی تھی۔ اُن کا نام میاں جی سید عبداللہ شاہ تھا۔ اور ایک ہمارے خاندان کا ''منے شاہ'' تھا......سید محمد ذوالکفل بخاری، جو سیرت کے لحاظ سے اِن میاں جی عبداللہ کا جانشین ثابت ہوا۔ اُس نے اپنے جدِّ امجد سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے بارے حضورنبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث **انا مدینة العلم و علی بابها** میں سے کافی حصہ پایا، اور چالیس سال کی عمر میں خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اَسّی نوے سالہ بزرگوں جیسا علم کا وافر حصہ پایا۔ ذوالکفل کی شہادت پر اُس کے ہم عصروں اور بزرگوں نے بہت لکھا اور مدتوں لکھتے رہیں گے۔ میری دانست میں مولا کریم نے اُس کو علم، حلم اور دانائی وحکمت سے جس فراوانی سے نوازا تھا اُس کا احاطہ مشکل ہی سے ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے میں فرض حج ادا کر چکا ہوں لیکن اِس سال تبلیغی جماعت کے ساتھ پھر سے حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ یقیناً منے شاہ سے میری آخری ملاقات اللہ کو منظور تھی۔ مکہ میں باب عمرہ سے لے کر آخری ملاقات مسفلہ کی ایک بلڈنگ جس میں میری رہائش تھی، رات نو بجے تک ہوئی۔ مجھے علم نہ تھا کہ میرا عزیز بھتیجا جو بچپن سے ہی میرے ساتھ بہت مانوس تھا، آج مجھ سے ہمیشہ کے لیے الوداع ہونے کو آیا ہے۔ اُس کے آخری الفاظ تھے: چچا جان، مدینہ طیبہ سے واپسی پر مجھے مطلع کرنا۔ میں آپ کو اپنی رہائش (عزیزیہ، بن داؤد) پر لے جاؤں گا۔ اور ہم اِن شاء اللہ اکٹھے حج کریں گے۔ مجھے بھی بچوں کے ساتھ حج کرنا ہے۔ آپ کی وجہ سے مجھے سہولت ہوگی۔ میں نے جواباً کہا: تمھاری وجہ سے مجھے بھی آسانی ہوگی۔ میں نے منے شاہ کو لفٹ پر سوار کرایا تو اُس نے دوبارہ تاکیداً یہی جملے دوہرائے، اور ایک خلوص بھری دل نواز مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے جدا ہوگیا۔ یہ مسکراہٹ زندگی بھر نہ بھولے گی۔

اگلے روز بعد نمازِ جمعہ ہماری جماعت مدینہ طیبہ روانہ ہوئی۔ اتوار کو بعد نمازِ عصر ریاض الجنۃ سے مغرب کی جانب چھتریوں کے نیچے جماعت اکٹھی تھی۔ فون کی گھنٹی بجی۔ اور دوسری طرف سے منے شاہ کے ایکسیڈنٹ کی خبر سنی۔ پریشانی کے عالم میں جماعت کے ساتھیوں سے دعا کی درخواست کی۔ دعا کے لیے ہاتھ اُٹھے تھے کہ سات منٹ بعد پاکستان سے میرے بڑے بیٹے سید عمر مجتبیٰ کی سسکیوں بھری آواز سے اُس کے بتانے سے پہلے ہی دل ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہوگئے۔ زائرینِ حرم میرے گرد اکٹھے ہوگئے۔ ہماری جماعت کے امیر صاحب نے لوگوں کو میرے بھتیجے کے انتقال کے بارے میں بتایا۔ سب نے مجھے تسلیاں دیں۔ میں نے فوراً مکہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا جس پر امیر صاحب نے مشورہ سے مجھے اجازت دے دی۔ گروپ لیڈر کو اطلاع دے کر بلوایا اور مجھے فوراً مکہ شریف پہنچانے کو کہا۔ اللہ اُن کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔ مجھے ٹیکسی پر بٹھا کر اُسے جلدی پہنچانے کی تاکید کی۔ چار گھنٹے بعد میں عزیزیہ میں منے شاہ کی رہائش پر پہنچ گیا، جہاں

میری بچی اور منے شاہ کے دونوں معصوم بیٹے عطاالمکرِم اور عطاالمنعم موجود تھے۔ تھوڑی دیر بعد عزیزم حسنی مبارک اور پروفیسر سلیم، اللہ اِن کی زندگیوں میں برکت عطا فرمائیں، تشریف لے آئے۔ اہلیہ منے شاہ مرحوم سے کاغذات پر دستخط کرائے اور بتایا کہ ایک گھنٹے بعد ہم منے شاہ کو غسل کے لیے لے آئیں گے۔ الانتظار اشد من الموت کا اندازہ اُس وقت ہوا۔ الحمدللہ ثم الحمدللہ مجھے حسنی مبارک، سلیم صاحب اور سجاد صاحب کے ساتھ منے شاہ کو غسل دینے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اِس سعادت کو میں اللہ کی رحمت سے اپنی بخشش کا سبب سمجھتا ہوں۔ میں اِس بات کا شاہد ہوں کہ جب منے شاہ کو غسل دیا گیا تو اُس کی انگشتِ شہادت اُس وقت بھی بلند تھی، جو اُس نے موت کے وقت کلمۂ شہادت پڑھتے ہوئے بلند کی تھی۔ میں نے ہاتھ سے دبا کر اُسے سیدھا کرنے کی تھوڑی سی کوشش بھی کی، مگر وہ پھر بلند ہوگئی۔ واہ منے شاہ واہ!

ہم لوگ تہجد کے وقت ساڑھے تین بجے حرم شریف میں اُن کا جسدِ خاکی لے کر داخل ہوئے۔ آج حرم میں داخل ہونے والی پہلی چارپائی منے شاہ کی تھی۔ پھر بارہ جنازے اور آئے اور اِس ترتیب میں رکھے گئے کہ امام کے بالکل سامنے منے شاہ کی چارپائی تھی۔ ۵:۴۵ پر امامِ کعبہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ لاکھوں حجاج نے دعائے مغفرت فرمائی۔ اِس جنازے میں شرکت کو بھی میں اپنی مغفرت کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔

لاکھوں کے ہجوم میں سے جنازہ لے کر تقریباً ایک کلومیٹر کا سفر ۶ منٹ میں کیسے طے ہوا، یہ اللہ ہی جانتا ہے۔ فرشتوں کی معیت کا احساس واضح تھا۔ اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت کی بھلائیاں عطا فرمائیں جامعہ ام القریٰ کے اساتذہ عبداللہ المطرفی، سلیم صاحب، سجاد صاحب، اور مدرسہ صولتیہ کے عبدالمالک، اور عزیزم حسنی مبارک صاحبان کو جنھوں نے اپنے خاندان میں نہ ہونے کا احساس تک نہ ہونے دیا۔ عبداللہ المطرفی صاحب کی ساری رات کی کوشش سے جنت المعلیٰ میں امی خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے قدمین شریفین میں قیامت تک رہنے کا موقع منے شاہ کو نصیب ہوا۔

ایں　سعادت　بزورِ　بازو　نیست
تا　نہ　بخشد　خدائے　بخشندہ

منے شاہ کی رہائش پر پورا ہفتہ عرب وعجم اور پاکستانی، ہندوستانی اور دیگر ممالک کے لوگ یہ سن کر کہ مرحوم کا چچا آیا ہوا ہے، بعد نمازِ عصر سے رات بارہ ایک بجے تک تعزیت کے لیے آتے رہے۔ ہر آنے والا یہ اظہار کرتا کہ میرا ذوالکفل بخاری سے دوسروں کی نسبت زیادہ تعلق ہے۔ اگلے ہفتے (۲۱/ نومبر ۲۰۰۹ء) منے شاہ کے غمگسار، غمخوار، ہمدرد اور مخلص دوست سلیم صاحب اور سجاد صاحب نے باہمی مشورے سے قرآن خوانی کا پروگرام بنایا جس میں تقریباً پینتیس پروفیسر صاحبان اور دیگر علماء و زعماء تشریف لائے۔ میں دعاگو ہوں اُن سب حضرات کے لیے جو ہمارے خاندان کے اِس غم میں شریک ہوئے۔ میرے چھوٹے بھائی سید عقیل شاہ بھی اپنی اہلیہ کے ہمراہ فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے مکہ مکرمہ پہنچے تھے۔ ایصالِ ثواب کی اِس مجلس میں وہ بھی شریک ہوئے۔ منے شاہ نے اُن کو بھی پابند کیا تھا کہ وہ بھی اُنھی کے گھر قیام کریں گے اور حج اکٹھے ادا کریں گے۔ مولا کریم ہم سب کا خاتمہ بالایمان فرمائیں اور تمام امت کے جانے والے مسلمانوں کے درجات بلند فرمائیں اور مغفرت فرما کر جنت الفردوس نصیب فرمائیں۔ آمین۔

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

عارفِ اسرارِ حیات

سید صبیح الحسن ہمدانی

(زیرِ نظر تحریر ایک غیر مربوط ذہنی رو کی لفظی صورت ہے۔ کسی مرتّب و مدوّن گفتگو کو تلاشنا عبث ہوگا۔)

میرے لیے زندہ رہنے کے اسباب میں سے ایک، میرے اقرب من حبل الورید ماموں سید محمد ذوالکفل بخاری کی قیمت میرے لیے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ تھی۔ یہ تأثر اُس وقت سے اب تک قائم ہے جب میں ہوش سنبھال رہا تھا، یا (بقولِ یک مردِ دانا) ہوش مجھے سنبھال رہا تھا۔ طالب علمی کے سفر کی مختلف منازل میں ایک حدیث مبارکہ مجھے کبھی نہیں بھولی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ماموں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے بارے میں فرمایا کرتے تھے **هٰذا خالی فلیُرِنی أحدٌ خالهٗ** (یہ ہیں میرے ماموں، کسی اور کے بھی ہیں ایسے؟ ذرا ہم بھی تو دیکھیں)

بے شعوری کے زمانے میں میرے لیے بھلائی، بڑائی اور اچھائی کے معنوں کی پیمائش کے لیے صرف ایک ہی پیمانہ تھا...... میرے ماموؤں کا تسلیم کرنا...... اللہ ہی کا شکر ادا کروں کہ شعور آنے کے بعد بھی میرا یہ معیار میرے ہر طرح آزما لینے کے باوجود آخری معیار ہی ہے۔

''ہمدرد نونہال'' ماموں جان کی مجھ پر ہونے والی نوازشات میں سے ایک ہے۔ ہر سال ایک سالنامہ اور اُس کے ساتھ ایک تحفہ...... میرے بچپن اور لڑکپن کی روشن یادوں میں شامل ہے۔ آٹو گراف بک کا تحفہ دو سے تین بار ملنا یاد ہے۔ ظاہر ہے اُس پر آٹو گراف بھی لیے گئے، اور اظہر ہے کہ ماموؤں سے اور اُن کے دوستوں سے۔

یادوں کے منظر نامے میں اُن کی پہلی ہی تصویر ایک کتاب کا تحفہ ہے۔ اُس وقت میری عمر یقیناً چار سال سے کم ہی تھی کہ میں اُس کتاب کو امی اور پھوپھیوں سے پڑھوا کر سُن ہی سکتا تھا۔ ۷، اگست ۱۹۹۶ء...... جب مجھے اپنی ہمشیر کے ساتھ اپنے آبائی گھر، اپنی امی ابی، چچاؤں اور پھوپھیوں کو چھوڑ کر اپنے ننھیال ملتان ''ہجرت'' کرائی گئی...... سے لے کر الی الآن میرا تعلیمی سفر ایک ہی آدمی کے سر پر چلا ہے۔ میں نے علم کے نام پر جہلِ مرکب سے جو چھٹکارا حاصل کیا وہ ماموں جان کی وجہ سے ہی ہوا۔

☆

منے ماموں نے کسی مدرسے میں علوم کی باقاعدہ تکمیل نہیں کی لیکن وہ عالم تھے۔ بہت بڑے عالم۔ یہی اُن کے ہاں تکریم کی وجہ تھی۔ ہاں اضافی فضیلت اور احترام کے لیے چند ایک اور وجوہات بھی تھیں۔ میں نے جب کبھی اُن کو کسی کا احترام کرتے ہوئے دیکھا، اس کی وجہ ضرور دریافت کی۔ عام طور پر جواب کچھ ایسے ہی ہوتے تھے۔ مثال سے بات واضح ہوتی ہے۔

فرمایا ’’انصاری صاحب اچھے اِنسان ہیں، واقعتاً عالم آدمی ہیں‘‘، ’’عابد صاحب بہت بڑے عالم تھے‘‘، ’’مشفق خواجہ عالم ہیں‘‘، ’’حضرت تھانوی عظیم انسان تھے، بڑے عالم تھے اور کبھی مداہنت نہیں کی، حق اگر اپنے محبوب اُستاد کی رائے کے خلاف نظر آیا تو بھی شخصیت کے بوجھ نے اتباعِ حق کے جذبے کو نہیں دبایا‘‘، ’’مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب محض لیڈر نہیں تھے، عالم تھے بہت بڑے، اُن کے علم کا تو حساب ہی نہیں ہے‘‘، ’’حضرت مدنی کا علم و فضل......سبحان اللہ استقامت و جرأت کا ہی بدل نہیں‘‘، مولانا داود غزنوی نرے عالم ہی نہیں، اہلِ دِل بھی تھے‘‘ تقی صاحب مضبوط عالم ہیں اور خوبی یہ ہے کہ مداہنت نہیں کرتے‘‘۔ وغیرہ

اُن کی علمی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو بے تعصبی تھا۔ علمی اختلاف کرنے والوں کے لیے اُن کے ہاں ہمیشہ معافی تھی۔ میں نے اُن سے مولانا مودودی، فاضل بریلوی اور مولانا اصلاحی کے ناموں کو ایسے لہجے میں سنا ہے جیسا عام طور پر اُن کے حلقوں سے باہر کے لوگ نہیں استعمال کرتے، آخر الذکر کا تذکرہ تو خاصے احترام سے فرماتے تھے۔

عصبیت اور تعصب عمرانیات کی دو مختلف اصطلاحات ہیں، اور اختلافِ وضع، اختلافِ معنی کی نشانی ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ عصبیت تو اُن میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور تعصب اُنھیں چھو کر نہ گزرا تھا تو شاید یہ درست صورتِ حال کی عکاسی کرے۔ میرے خیال میں یہاں ’’تصلب‘‘ کا لفظ مکمل طور پر کارگر نہیں۔

☆

ماموں جان کی زندگی کے دو زاویے زیادہ تر میری توجہ کا مرکز رہے۔ ایک اُن کی داعی اور مربی کی حیثیت، دوسرے اُن کی انفرادی اور گھریلو زندگی۔

مربی اور داعی کی حیثیت میں وہ قال کی پستیوں سے بالاتر تھے۔ اُن کے اُسلوبِ دعوت و تربیت کا مطالعہ مجھے ہمیشہ محقق اور اولوالعزم صوفیاء کے واقعات یاد دلاتا ہے۔ اُنھوں نے کبھی مجھے کوئی نظریہ یا عقیدہ اختیار کرنے کو نہیں کہا۔ اشکالات پیش کرتے وقت جتنا بے خوف میں اُن کے سامنے ہوتا تھا اتنا تو میں اپنے ضابطے کے اساتذہ کے سامنے بھی نہیں ہو سکا۔ آج میں الحمد للہ اُن کے عقیدے کا قدم بہ قدم پیرو اور اُن کے بہت سے نظریات کا قائل و معترف ہوں۔ لیکن اپنی تحقیق اور مطالعے سے۔ کسی کے کہے بغیر۔

تربیت کی لائن میں اُن کی سب سے زیادہ کوشش یہ ہوتی کہ یعنی و لایعنی کا فرق معلوم ہو جائے، اور لایعنی چھوٹ جائے۔ اِس ایک مضمون کو اُنھوں نے میرے لیے ہزار رنگ سے باندھا۔ ادب کا مطالعہ کرتے دیکھا تو ایک عرصے تک حوصلہ افزائی نہیں کی۔ حتّٰی کہ مجھے گمان ہونے لگا کہ یہ اُن کی خاطر پہ بار ہے، پھر ایک روز فرمایا کہ آپ یہ سب کیوں پڑھتے ہیں؟ میں نے حسن عسکری، مشفق خواجہ اور عابد صدیق صاحب جیسے معاشی اور تہذیبی نقادوں کے تازہ تازہ رٹے ہوئے نظریات اگل دیے۔ اس سے اُن کی مکمل تشفی تو نہ ہوئی لیکن محسوس ہوا کہ ناگواری ختم ہوگئی۔

☆

شرحِ صدر، علی وجہ البصیرت عمل ہونا اور معلومات پر عامل ہونا جب مطلق بولے جائیں تو میرے ذہن کے آئینے پر ان کے فردِ کامل کی صورت اُبھرتی ہے۔ یعنی میرے منّے ماموں کی۔

☆

وہ مخالف کو اپنا نکتۂ نظر بدلنے یا کم از کم ایک دوسرے پہلو سے دیکھنے پر مجبور ضرور کر دیا کرتے تھے۔ایک روز مجھے سرکاری اداروں میں موجود دین دار لوگوں کے بارے میں بتاتے ہوئے چند علماء کا ذکر اُنھوں نے بہت احترام سے کیا، میرے اندر کے خام احراری کو اس پر اعتراض ہوا، میں نے کہا ''آپ فلاں اور فلاں کو دیندار کہتے ہیں؟ جبکہ اقبال پر اُس کی تحریرات سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُسے اقبال سے سچی عقیدت تھی، حالانکہ اقبال تو ایسا ہے اور ویسا ہے''۔ باوجود یکہ علامہ محمد اقبالؒ سے اُن کی عقیدت اور احترام انتہائی گہرا اور بچپن کا تھا، وہ میری بات پر برہم نہیں ہوئے۔ رُخ موڑا اور کہا ''اقبال جیسا بھی تھا اُس سے غرض نہیں، ان صاحبان کے لیے ہمارے دِل میں جو نرم گوشہ ہے وہ اِس لیے ہے کہ اقبال کا جو بنیادی مسئلہ ہے......یعنی دین...... وہ اِن کا بھی مسئلہ ہے۔ یہ اپنے دین کے بارے میں ویسے ہی فکر مند ہیں جیسے ہمارے علماء بلکہ بعض صورتوں میں بڑھ کر''۔ بات بے غبار ہوگئی۔

☆

عام مشاہدہ ہے کہ کسی جزئی مسئلے پر اجتماعی فکر سے نظریاتی اور علمی اختلاف کرنے والے، مخالفین کے غیر علمی رویوں کے ردِعمل میں جذبات کی شدت سے مغلوب ہو کر اختلاف کا دائرہ وسیع کرتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ ایک بالکل نیا فرقہ (مسلک، مشرب، حلقہ) وجود میں آ جاتا ہے۔ میں ذاتی طور پر اُن کا احسان مند ہوں کہ اُنھوں نے مجھے علمی اختلاف کی حدود سے آگاہ کیا، بے عقل جذبات کی پیروی سے نجات کا راستہ سکھایا۔ اور طریقہ یہاں بھی وہی تھا، مکالمے کا، سمجھانے کا، دوسرا رخ دکھانے کا، اور وہ اِس میں کامیاب رہے۔

میری کیفیت یہ تھی کہ میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ اور اُن کے سلسلے کے اصاغر کے لیے دل میں کما حقہ احترام نہیں رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک افسوس ناک صورت تھی۔ ماموں جان میرے دل کی اِس کلونس کو غیر محسوس انداز میں دھونے میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ دو سال قبل جب مجھے شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کے رسائل سے نیاز مندانہ استفادہ کرتے ہوئے دیکھا تو میں نے دیکھا اُن کے چہرے پر حقیقی مسرّت کے کئی رنگ تھے۔ بعد میں مجھے فرمایا کہ بات شخصیات کی نہیں رویوں کی ہے۔ اور مجھے خوشی ہے کہ آپ کے رویے مائل بہ اصلاح ہیں۔

اپنے مطالعۂ تاریخ کے آغاز کے دور میں ایک مجلس میں گفتگو کرتے ہوئے میں نے سیّدہ ام ہانی رضی اللہ عنہا کے سسرالی اعزا اور بنو ہاشم کے چند دیگر بزرگوں کے زمانۂ جاہلیت کے واقعات مثلاً اُن کی درشت روئی، اہلِ حق کی مخالفت اور خاص طور پر بنتِ نبی الکبریٰ سیدہ زینب بنت محمد صلی اللہ علیہا پر تشدّد کا واقعہ وغیرہ خاصی تفصیل کے ساتھ سُنائے۔ میں نے کہا کہ فلاں صاحب کے بارے میں آتا ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں بڑے ''گلیر'' تھے، گالیوں کے معاملے میں فصاحت اور بلاغت گویا اُن پر ختم تھی۔ ماموں جان وہاں موجود تھے فوراً فرمانے لگے ''سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی ﷺ کو کیسے کیسے ساتھی عطا فرمائے، جو جاہلیت میں ہوں یا اسلام میں نمایاں ہی نظر آتے ہیں''۔ مجھے ایسے ہی محسوس ہوا جیسے کمزور بینائی والے کو اچانک عینک لگانے سے ہوتا ہے، کہ دور کے مناظر صاف دکھائی دینے لگتے ہیں۔

☆

حوصلہ بڑھانا اُن کے مزاج کا ایک جز تھا، بلکہ بہتر یہ ہے کہ فطرتِ ثانیہ بن چکا تھا۔

جب اُنھیں معلوم ہوا کہ میں نے علمِ عروض کے بنیادی ڈھانچے سے واقفیت حاصل کر لی ہے، تو انتہائی خوشی کا اظہار کیا۔ مختلف مواقع پر تقطیع کرائی۔ ایک بار شورش کاشمیری مرحوم کی عالی شان نظم ''ظفر علی خاں کو ڈھونڈ تا ہوں'' ......جس کے رجز یہ آہنگ نے مجھے بچپن میں بہت متاثر کیا ہے...... پڑھنے کے لیے دی اور کہا کہ اِس میں غلطی ڈھونڈو، میں نے اُسے پڑھا اور غلطی کی نشاندہی کی تو مسرت کا اظہار فرمایا۔ پھر کہا کہ اگر چہ یہ ایسی باتوں کا بہت خیال رکھنے والے لوگ ہیں لیکن غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ مولانا ظفر علی خان کے نورِ خدا...... والے شعر اور اُس میں کی غلطی کے بارے میں بھی بتایا اور اس میں اختلاف کا ذکر بھی کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ عقل وشعور سنبھالنے کے بعد میری اُن سے ملاقاتیں لمبے وقفوں کے ساتھ ہوتی رہیں۔ جب بھی کوئی اعلیٰ خیال کوئی اچھا شعر یا کوئی ادب پارہ، میری نظر سے گذرتا میں اُسے اُنھیں سنانے کے لیے یاد کر لیتا، جب اُن سے ملاقات ہوتی، اپنا کل ذخیرہ پیش کرتا، نئی خرید کردہ کتابیں دکھاتا اور خوب ہاتھ ہلا ہلا کے عقلمندی کی باتیں کرتا اور دانش بگھارتا۔ وہ میری اِن ''بصیرت افروز'' باتوں کی خوب داد دیتے۔ کہیں کہیں یوں ہی معمولی سا اختلاف کرتے، جو ستائش کے نشے میں کبھی یاد نہ رہتا۔ کچھ دن اسی عیش میں گزرتے اور پھر اُن کے کوچ کی گھڑیاں ہمیں دوبارہ جُدا کر دیتیں۔ اُن سے دور رہنے کے ایام میں اُن کے سامنے جھاڑی گئی میری تقریروں کے درمیان اُن کے کہے گئے چھوٹے چھوٹے جملوں کو ذہن میں دہرانے سے مجھ پر یہ کُھلتا کہ اِس بار تو میں نے ماموں جان سے جتنی باتیں بھی کہیں وہ سب نہایت احمقانہ اور بے وقوفی پر مبنی تھیں۔ میں شرمندہ ہوتا اور اُن کی آمد تک نئی تیاریوں میں لگ جاتا۔ انتہا یہ ہے کہ ایسا ایک بار نہیں کئی بار ہوا۔ حتیٰ کہ آخری ملاقات میں بھی ایسا ہی ہوا۔ اب جب مجھے ان سے اِس دنیا میں دوبارہ نہیں ملنا، میری پریشانی یہ ہے کہ اب مجھے اپنی غلطیوں کا احساس کیسے ہوگا۔

☆

ماموں جان کے محترم دوست اور ممدوح شاعر جناب مستحسن خیالؔ نے کہا تھا

چند کتابیں ہیں میری کچھ ہیں رونے والے
پھیر کر سب سے نظر ساتھ میں ہولوں گا خیالؔ
موت ہولے سے مرے در پہ جو دستک دے گی

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ لائنیں ماموں جان کی آواز میں اُن کے مخصوص گھمبیر لہجے میں میرے کانوں میں بج رہی ہوں۔ اُن سے ہمیشہ کی جُدائی کا سانحہ اور وہ بھی اتنا جلد...... میری معمولی سی حدِ برداشت سے بہت زیادہ ہے۔ اے کاش یہ تعویقات نہ ہوتیں، واللہ مجھے جینے کی خواہش نہیں رہی۔

عاقبت منزل ما وادیٔ خاموشان است
حالیا غلغلہ در گنبد افلاک انداز

دی تھی دعا کسی نے کہ جنت میں گھر ملے

سید عطاء المنان بخاری

بچپن میں ہی گھر کے ایک دُبلے پتلے عمودی قد وقامت کے ایک فرد سے ہم کچھ یوں متعارف تھے کہ یہ ہمارے منّے بھائی جان ہیں۔ اور پھر معلوم ہوا کہ یہ صرف ہمارے ہی منے بھائی جان نہیں بلکہ سب کے منے شاہ جی ہیں۔ بھائی جان طویل القامت تھے جس کو ماپنے کے لیے ہم بچوں کے پاس گھر کے دروازے ہی واحد ایسا پیمانہ تھے جن سے وہ سر نیچے کر کے گزرتے تھے۔ ہم روزانہ بعد از فجر ان کے گھر قرآن مجید پڑھنے جاتے اور دیکھتے کہ بھائی جان فجر کے بعد دودھ لینے کے لیے پیدل جاتے تھے۔ انھوں نے اپنا نسواری رنگ کا مفلر چہرے اور کانوں پر لپیٹا ہوتا۔ وہ سردیوں میں موٹر سائیکل پر سفر کرتے ہوئے اپنا علامتی مفلر باندھتے تھے جب کہ گرمیوں میں سفید صافہ ہوتا۔ ہم اس وقت بہت چھوٹے تھے اور بھائی جان ہماری پوری ''بچہ پارٹی'' سے بہت محبت کرتے تھے۔ وہ اپنے خاص انداز میں ہمیں دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر اچھالتے اور ہم بھی اس اُچھل کود کے انتظار میں باری باری تیار ہوتے تھے۔

بھائی جان کی تربیتی فکر کے بارے میرے پاس کوئی الفاظ نہیں ہیں۔ ہاں مگر یہ ہے کہ وہ جو خود تھے ہر ایک کو ویسا ہی بلکہ اُن کے بقول اپنے سے بھی بڑھا ہوا دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ ہر ایک کو مفید مشوروں سے نوازنا اپنا فریضہ سمجھتے تھے۔ بالخصوص معمارانِ مستقبل میں موجود پڑھنے پڑھانے کے فطری شوق کو بیدار کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے تھے۔ ہمارے گھروں میں بچوں کے کئی رسائل مثلاً نونہال، تعلیم وتربیت اور پھول وہ خود لا کر دیتے اور روزناموں میں شائع ہونے والے بچوں کے صفحات بھی پڑھنے کو کہتے، اس سے صرف گھر کے بچوں ہی میں نہیں بلکہ گھر میں پڑھنے کے لیے آنے والے دیگر بچوں میں بھی پڑھنے پڑھانے کا رجحان بنا۔

اسی بات سے یاد آیا۔ گزشتہ رمضان المبارک میں ایک روز منّے بھائی جان اور میں عصر کے بعد دفتر میں بیٹھے تھے۔ میں نے اپنی تعلیم کے حوالے سے مشورے طلب کیے اور اُنھیں ایف اے کی تیاری کے سلسلے میں مطلع کیا۔ انھوں نے میری رہنمائی کے لیے بہت قیمتی مشوروں سے نوازا۔ اسی دوران کتابوں کے مطالعے کے حوالے سے بات ہوئی تو کہنے لگے کہ ایک نشست میں ہی پوری کتاب کا پڑھا جانا ضروری نہیں، میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ میں بھی جب لکھنے بیٹھتا ہوں تو ایک ہی نشست میں نہیں لکھ پاتا بلکہ جب تھک جاتا ہوں تو کچھ دیر لیٹ جاتا ہوں یا پھر کسی اور کام میں مشغول ہو جاتا ہوں۔ آپ بھی جب پڑھنے بیٹھو تو دو تین کتابیں پاس رکھ لیا کرو۔ جب ایک کتاب سے دل بھر جائے تو ذائقہ تبدیل کر لیا اور پھر دوبارہ اسی کتاب کو پڑھنا شروع کر دیا۔ اس سے وہ بوریت ختم ہو جاتی ہے اور کتاب خوانی کا شوق مزید بڑھتا ہے۔

ان کے وجود سے گھر میں ایک خاص قسم کی رونق ہوتی تھی۔ ویسے تو رونق اپنی اپنی جگہ بچوں اور بزرگوں سے ہوتی ہی

ہے لیکن یہ خاص طور سے محفل کی رونق ہوتے تھے۔ وہ اپنی گفتگو میں کہیں نہ کہیں کوئی مثال، لطیفہ، قصہ، کہانی ضرور جڑ دیتے تھے جس سے گفتگو اور محفل دونوں کشتِ زعفران بن جاتی تھیں۔ مجلسی آدمی تھے۔ ان کے بغیر کوئی بھی مجلس (علمی و ادبی ہونا ضروری نہیں) ادھوری ہوتی تھی۔ بلکہ عام مجلس کو بھی علم و ادب کے زیور سے آراستہ کرنا ان کے لیے مشکل نہ تھا۔ باتوں باتوں میں بڑے بڑے عقدوں کو حل کر دیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے خاص خزانوں میں سے وہ وہ صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں جن کا ایک آدمی میں جمع ہونا عموماً ناممکن ہوتا ہے۔

علمی محفلوں کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اس میں تو ان کی ذات کی مشک و عنبر کی سی مہکتی خوشبوؤں نے باغیچۂ علم کے گلوں کو ایسا مسحور کیا ہوتا تھا کہ بڑے بڑے عالم بھی دیدے پھاڑ کر تکے جا رہے ہوتے تھے۔ ان کی علمی و ادبی شخصیت کا ہر ایک معترف تھا لیکن وہ اپنے آپ پر عاجزی کا لبادہ اوڑھے ہوتے تھے۔ کسی اجنبی کا پہلی ملاقات میں ہی ان کا گرویدہ ہو جانا کوئی عجیب نہ تھا بلکہ ان کی ہمہ جہت شخصیت اور علم لوگوں کو ان کی طرف اس طرح کھینچ لاتا تھا جیسے پیاسا کنویں کی طرف خود بخود کھنچا چلا آتا ہے۔ وہ ہر ایک سے محبت کرنے والے انسان تھے۔ ان کے پشتِ زمین سے بطنِ زمین میں چلے جانے کے بعد ان کے دوست احباب، اعزہ و اقارب میں سے ہر ایک اس کیفیت کا اظہار کر رہا تھا کہ وہ مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بہت سے صحابہؓ یہی گمان کیا کرتے تھے کہ وہ مجھ سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں۔

گھریلو زندگی کا اندازہ اس حدیث مبارکہ سے ہو سکتا ہے کہ ''تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو اور میں اپنے گھر والوں کے لیے سب سے بہتر ہوں۔'' بھائی جان کا رہن سہن ایسا ہی تھا کہ نہ ان کو آج تک کسی سے کوئی شکایت ہوئی اور نہ ہی اُن سے کسی کو۔ ظاہر ہے کہ جب شر کی بنیاد (فساد) ہی نہ ہوئی تو شر کہاں سے آئے گا۔ پھر تو خیر ہی خیر ہوگی اور خود بخود سارا گھرانہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی تصویر بن جائے گا۔ اور یہ نرا مبالغہ ہی نہیں، بلکہ حقیقت ہے۔

بھائی جان نے اپنی علمی و عملی زندگی کی تمام راہیں بڑی سُرعت اور آسانی کے ساتھ عبور کیں۔ صرف عبور ہی نہیں بلکہ ان کی نظروں کا یا خود ان کا بھی کسی راہ پر سے گزر جانا درحقیقت اس راہ میں کمال حاصل کرنے کے مترادف تھا۔ مجھے نہیں یاد کہ ہم نے کسی بھی موضوع پر سوال کیا ہو اور آگے سے اس کا سیر حاصل جواب نہ ملا ہو۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ تو اسی تلاش میں ہوتے تھے کہ کوئی بات ہو اور وہ اپنے بڑے ماموں سید ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی طرح اس کی تفاصیل پر ایک پُر مغز اور مدلّل تقریر کر دیں۔ کیوں نہ کرتے؟ تربیت و فیض جو انہی سے ملا تھا۔ اکبر کا شعر ہے:

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں
آدمی آدمی بناتے ہیں

سید ابوذر بخاری اور سید عطاء المحسن بخاری رحمہما اللہ کی صحبت کی برکات ہی تھیں جنھوں نے ان کو اوجِ کمال تک پہنچا دیا تھا۔ بھائی جان اپنے اکابر، حقیقی رجالِ کار، کے رنگوں میں رنگے ہوئے تھے، یعنی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ تو انہوں نے اپنے اندر اُنڈیلا ہوا تھا لیکن جیسے مِسِ خام کو جب زرگر بنا سنوار کر پیش کرتا ہے تو اس کی قیمت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

وقت بڑی تیزی سے گزرتا رہا۔ یوں لگنے لگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی پوری ہو رہی ہے کہ قربِ قیامت میں وقت اتنی سرعت سے گزرے گا کہ سال مہینوں میں، مہینے ہفتوں میں اور ہفتے دنوں میں گزرتے محسوس ہوں گے۔ کچھ ایسا

ہی معاملہ میرے بھائی جان کے ساتھ ہوا۔ ابھی تو انھیں اپنی حیات کی چالیس بہاریں دیکھے دو روز بھی نہ ہوئے تھے کہ حیاتِ دنیوی سے رفاقت کا دورانیہ مکمل ہوگیا۔ ۱۵/نومبر وجاءَ ت سکرۃ الموت بالحق کے حکمِ ربی کی تکمیل کے ساتھ ایک جانکاہ حادثہ دے کر ماضی ہوگیا۔ اب سے دس سال قبل اسی ماہ کی بارہ تاریخ کو ابنِ امیر شریعت سید عطاء المحسن بخاری رحمۃ اللہ علیہ ربِ جل مجدہ سے کیے عہد کو بتوفیقہٖ پوری ایمانی شان وشوکت کے ساتھ ایفا کرتے ہوئے اُن کے حضور حاضر ہوگئے تھے۔ ۱۵/نومبر ۲۰۰۹ء اتوار کے روز نمازِ مغرب مسجد ختم نبوت دارِ بنی ہاشم میں ادا کی۔ نماز سے قبل طے کیا گیا تھا کہ مقامی جماعتِ احرار کے ایک مخلص مقامی کارکن محمد مہربان سے ان کے والد کی وفات پر جو کہ دو روز قبل ہی ہوئی تھی، تعزیت کے لیے جانا ہے۔ اسی ارادے سے مسجد سے باہر آیا تو دیکھا کہ چند وہ چہرے جو ہمیشہ دوسروں کے لیے مسرت اور رونق کا سبب بنتے ہیں، اچانک اِتنی افسردگی کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں کہ دیکھ کر ہول آتا ہے۔ تمام حضرات گھیرا بنائے محوِ گفتگو ہیں اور مکہ مکرمہ سے آئی ہوئی ایک اندوہناک خبر کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ میں نے کان لگائے تو معلوم ہوا کہ برادرِ کبیر پروفیسر سید محمد ذوالکفل بخاری یونیورسٹی سے واپسی پر ٹریفک حادثہ میں شدید زخمی ہوگئے ہیں اور حالت تشویش ناک ہے۔ بس دعا کرو......! بدن پر لرزہ طاری ہوا۔ یوں لگا جیسے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی ہو۔ پھر چند ہی منٹوں بعد بڑے بھائی جان کے فون کی گھنٹی بجی اور وہی اطلاع موصول ہوئی جس کا سب کو دھڑکا تھا، کہ بخاری صاحب اللہ کے حضور حاضر ہوگئے ہیں۔ اِتنا سننا تھا کہ تمام خوشیاں، ارادے، ان کے حوالے سے اپنے مستقبل کی سوچیں، اور ان سے وابستہ ہزاروں امیدیں ہوا ہوگئیں۔ ایک بے یقینی کی کیفیت سبھی پر طاری تھی۔ دماغ میں ایک سناٹا اور دل میں گھمبیر ویرانی چھا گئی۔ آبادؔ لکھنوی کا ایک شعر میرے ذہن میں گونجنے لگا:

آبادؔ مر کے کوچۂ جاناں میں رہ گیا
دی تھی دعا کسی نے کہ جنت میں گھر ملے

ذوالکفل بخاری کیا تھے؟ میں تو صرف اتنا ہی کہہ سکوں گا کہ وہ دوسروں میں محبتیں بانٹنے والے اور دوستوں، عزیزوں، قرابت داروں کی محبتیں سمیٹنے والے تھے۔ وہ ایک باعمل عالم، ادیب، شاعر، محقق، مترجم، دیندار اور وضعدار انسان تھے۔ وہ ہر ایک کے مزاج، طبیعت، سوچ اور فکر کو چند جملوں سے بھانپ جاتے، اور پھر اس سے اس کی سطح کے مطابق گفتگو کیا کرتے۔

بھائی جان تو چلے گئے لیکن اپنی محبت بھری یادیں اور دیر تک زندہ رہنے والی نشانیاں باقی چھوڑ گئے۔ اور ہر جانے والا یہی دو چیزیں چھوڑ جاتا ہے۔

ہستیاں جن کو زمیں نے ہے بہت پیار دیا
آسماں کو بھی محبوب ہوئی جاتی ہیں

میرے منّے ماموں

بنتِ سید محمد وقار الحسن ہمدانی

جس گھڑی تیری یادوں کا سماں ہوتا ہے
پھر میسر ہمیں آرام کہاں ہوتا ہے

ماموں جان کا خیال ذہن میں آتے ہی یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ گفتگو منظّم ہوتی ہی نہیں، تحریر مرتب ہوتی ہی نہیں۔ ذہن کسی ایک یاد کا کوئی سرا بمشکل قابو کرتا ہے کہ اک دم کوئی دوسری سہانی یاد اپنی گرفت میں لے لیتی ہے یعنی

ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ ''تفکر'' کا

اور پھر آنسو ایک جوئے بے کنار کی مانند رواں ہو جاتے ہیں۔ شخصیت کیا ہے ایک بحرِ بے انتہا ہے جو سمیٹے نہیں سمٹتا۔ ایک ایسی ہستی جس کی شخصیت ہمہ جہت ہے اور ہر پہلو اتنا وسیع اور جامع کہ اس کا احاطہ کئی ضخیم کتب شاید ہی کر سکیں۔

میں نے ہوش سنبھالی تو اُن کی آغوش میں اور پرورش پائی تو ان کے سایۂ عاطفت میں۔ آنکھ کھولتے ہی میرے (ذہن پر) دل و دماغ پر ماموں جان کا نقش ایک انسان کا تھا جس کی زندگی دو ہی کاموں سے عبارت تھی علم دوستی اور محبتیں بانٹنا۔ گھر کا وہ گوشہ جو اُن کی قرار گاہ تھا اس کے لیے کمرے سے زیادہ لائبریری کا لفظ موزوں معلوم ہوتا ہے۔ کتابیں آج بھی اسی ترتیب اور قرینے سے رکھی ہیں مگر اتنا ضرور ہے کہ ہر کتاب پر ان کے انمٹ نقوش ثبت ہیں۔ ان کتابوں کو دیکھتے ہوئے آنکھیں چھلک پڑتی ہیں ان کو چھوتے ہوئے ہاتھ لرز اٹھتے ہیں

یقیں ہی نہیں آتا ہمیں بچھڑنے کا
مہک رہا ہے جا بجا کوئی

میں تقریباً پانچ سال کی تھی جب مجھ سے چھوٹی خالہ جان نے استفسار کیا کہ آپ کو ماموں جان کیسے لگتے ہیں تو میں نے چہک کر جواباً کہا:

''میرے منے ماموں تو گلدستہ ہیں''

ہاں! وہ گلہائے صد رنگ کا ایک حسین مجموعہ ہی تو تھے۔ ایک ایسا مجموعہ جس کی نہ صرف خوشبو بے مثال تھی بلکہ وہ رنگینی میں بھی اپنی مثال آپ تھا تو گلدستہ خوشبوئیں بکھیر رہا تھا، ماحول روشن ہی نہیں معطر بھی تھا، گلشن کی رونق قابلِ دید تھی، بہار اپنے جوبن پر تھی۔ زندگی کے سبھی رنگ، سبھی روشن رنگ اس ایک ذات میں منعکس تھے۔ گلدستہ کچھ ایسا جاذبِ نظر تھا کہ ہر ذی بصیرت دیکھتے ہی کھو سا جاتا، ماسوا کو بھول ہی تو جاتا۔ شعبہ ہائے زندگی کا کون سا پہلو ایسا ہے جو ان کی چشمِ رسا سے اوجھل

رہا ہو اور جہاں علم کے اس شناور کی پہنچ نہ ہو۔

میرے حافظے میں ان سے متعلق جتنے نقش ہیں سبھی دمکتے تاروں اور مہکتے گلابوں جیسے ہیں۔ مجھے نہیں یاد کہ کبھی ان کے کسی قول و فعل سے کسی چہرے پر دکھ کی کوئی پرچھائیں نمودار ہوئی ہو۔ جس محفل میں وہ موجود ہوتے، اداسی اور مایوسی اس کی راہ بھول جاتی۔ وہ انجمن مسرتوں کا گہوارہ اور اجالوں کا مسکن بن جاتی۔ گزشتہ برس گرمیوں میں ملتان آئے ہوئے تھے۔ جمعہ کے روز گھر میں محفل جمی تھی۔ ہماری ایک عزیزہ نے اپنی جواں سال بیٹی کی طویل علالت کا ذکر کیا اس پر انھیں مختلف اطباء کی طرف توجہ دلائی۔ دوران گفتگو وہ خاتون آبدیدہ ہو گئیں تو ماموں جان نے اچانک اندازِ گفتگو بدلتے ہوئے ایک واقعہ سنایا۔ کہنے لگے کہ کوئی عقیدت مند ایک بزرگ کے پاس آیا اور نہایت شرح و بسط سے نجی پریشانیوں کا ذکر شروع کر دیا۔ دورانِ گفتگو وہ ضبط کھو بیٹھتا اور بے طرح رونے لگتا۔ بزرگ نہایت خاموشی سے اس کی روداد سنتے رہے۔ جب وہ اپنی تشفی کر چکا تو انھوں نے فرمایا کہ اب بس تم صرف ایک کام کرو اور وہ یہ کہ جس طرح تم نے مجھے اپنی بپتا سنائی ہے اور جیسے میرے سامنے تم پر گریہ طاری ہوا ہے اتنا ہی وقت لگا کر، اسی کیفیت سے اور کم از کم اتنے ہی استحضار سے یہ سب کچھ اپنے رب سے ہر روز کہا کرو۔ پھر دیکھو تمھاری پریشانیاں کیسے عنقا ہوتی ہیں۔

میدانِ علم و ادب کے سب معتبر نام ان کے حلقۂ احباب کے نمایاں ارکان میں سے تھے۔ ہم بچوں کی تعلیمی مراحل میں کامیابی پر بہت زیادہ حوصلہ افزائی کرتے اور ہر ممکن مدد کرتے۔ وہ ہم میں ادبی ذوق پیدا کرنے کے خواہش مند تھے۔ غالباً ۲۰۰۵ء میں، میں نے ان سے ایک ادبی واقعے کی تحقیق کرنے کے لیے فون پر رابطہ کیا۔ ان دنوں املج (سعودی عرب) میں مقیم تھے۔ اس پر وہ بہت خوش ہوئے، مکمل واقعہ بتایا، دعائیں دیں اور بعد ازاں بھائی جان کے نام خط میں میرا خصوصی شکریہ ادا کیا۔ یہ ان کا بچوں میں اعتماد، اور باہمی ربط پیدا کرنے کا ایک انداز تھا۔ آخری بار جب پاکستان آئے ہیں تو رمضان المبارک کی ایک شام اچانک میری امی سے پوچھا ''مینٹی کدھر ہے؟'' میں آواز سن کر گئی تو کہنے لگے کہ اصل میں ایک لطیفہ یاد آیا تھا میں نے کہا آپ کو سنا دوں قبل اس کے کہ حافظے سے محو ہو جائے۔ سرائیکی زبان میں میری دلچسپی کو محسوس کیا تو خبریں کا سرائیکی صفحہ مجھے خصوصیت سے دکھاتے پھر مختلف چیزوں پر میری رائے طلب کرتے اور اپنی رائے کا اظہار کرتے۔ لفظوں سے میری جس قدر شناسائی ہے انھی کی عنایتوں کی مرہون منت ہے۔ میں نے انگریزی ادب پڑھنا شروع کیا تو اپنی انگریزی کی سبھی کتابیں میرے سامنے رکھ دیں۔ کالج سے واپس آ کر سلام کرتے ہیں پہلے The Dawn مجھے تھماتے اور پھر کچھ اور کرتے۔ الغرض ان کے احسانات اور ان کی شفقتیں بے شمار ہیں۔ فیاضی اور رہنمائی کا یہ سلسلہ محدود نہ تھا۔ ہر کس و ناکس ان سے جس قسم کا فائدہ حاصل کرنا چاہتا، بآسانی کر لیتا۔ محبت اور احسان یہ دنوں کام وہ ہمیشہ صلے کی امید اور پروا کے بغیر کرتے۔ یہ بات اس اعلیٰ ظرف اور وسیع النظر انسان کی سرشت میں ہی نہیں تھی کہ بھلا چاہنے اور بھلا کرنے کے لیے دوست اور دشمن کا فرق روا رکھا جائے۔ ماموں جان انتہا درجے کے مہمان نواز تھے۔ ان کا دسترخوان بڑا کشادہ تھا۔ اس پر ہر مکتب فکر کے لوگ جمع ہوتے۔ وہ دوسروں کو کھلا کر، اوروں کو خوش کر کے، بے حد مطمئن اور سرشار ہوتے۔

محبتیں نچھاور کرنے کا یہ سلسلہ رواں دواں تھا، میدان علم و ادب میں چراغ سے چراغ روشن کرنے کا عمل برق رفتاری سے جاری تھا، گلشن میں ہر سو اسی گلاب کی خوبصورتی اور سحر انگیزی کا چرچا تھا کہ یکا یک منظر بدل گیا۔ باغباں گلچیں کی نظر اس گلاب پر جا ٹھہری۔ خوشبو سے لبریز بادِ صبا کا ایک جھونکا آیا اور پھول کو اپنے حصار میں لے لیا۔ اس کے اردگرد نور کا ایک

ہالہ سا بن گیا۔ انگشتِ شہادت آسماں کی جانب اٹھی اور دمِ واپسیں ایک واضح آواز سنائی دی اشہد ان لاالہ الااللہ ......

اور یوں چند ہی لمحوں میں وہ پھول باغِ عدن کی زینت بن گیا۔ مالک کے فیصلے تو کبھی بھی حکمتوں سے خالی نہیں ہوتے۔ تو مالک نے اپنی ان حکمتوں کے مطابق جو انسانی عقل کی دسترس میں نہیں اس کو باغِ بہشت کے لیے منتخب کر لیا۔

اس پھول کی جدائی سے گلشن پہ کیا گزری۔ قیامت ہی تو ٹوٹ پڑی، عین شباب میں گلشن پر زوال آ گیا، نکھرے ہوئے روشن رنگ پھیکے پڑ گئے، مرغانِ خوشنوا اپنے زمزموں کی دھنیں تراشنا بھول گئے، بہاریں روٹھ گئیں، مسرتیں کوچ کر گئیں، خزاں نے ڈیرا ڈال لیا، عین ہنگامِ طرب میں سارے منظر بے ترتیب ہو گئے۔ وہ جگہیں جہاں کبھی محفلیں جما کرتی تھیں آج ان کی ویرانی بیاں سے باہر ہے۔ میرے ماموں جان کا وہ کمرہ جہاں جاتے ہی اداس ترین لمحات میں بھی غم کے سارے بادل چھٹ جایا کرتے تھے، ہمہ قسم کی پریشانیاں غائب ہو جاتی تھیں اب وہاں اداسیوں نے قبضہ جما لیا ہے۔ آج وہاں پر صرف ان کی دو ننھی کلیوں کی کھوجتی نگاہیں ہیں، معصوم سوالات ہیں۔ اگر بابا قیامت والے دن ملیں گے تو قیامت کب آئے گی؟ بابا فون کیوں نہیں کرتے؟ اور اس جیسے ڈھیروں سوالات جن کا جواب دینا دل گردے کا کام ہے۔ وہ کلیاں چٹکنا بھول گئی ہیں۔ ہنستے مسکراتے عطاء المکرّم اور عطاء المنعم کی سبھی شرارتیں ختم اور سبھی مسکراہٹیں غائب ہو گئی ہیں۔ ان کے اجلے چہروں کی چمک ماند پڑ گئی ہے۔ فلسفۂ موت و حیات سے بے خبر، وہ دونوں بھی آپ کا انتظار کرتے ہیں۔

ماموں جان! آپ کے اس طرح چلے جانے پر حواس مختل ہیں۔ صدمات کا دل سوز ہونا سنتے تھے اب دیکھ بھی لیا۔ للہ درّ قائل

لولا مفارقة الاحباب ما وجدت
للمنا یا الی ارواحنا سبلا

لفظ گم ہو گئے ہیں۔ کوئی استعارہ، کوئی کنایہ ساتھ دینے کو تیار نہیں۔ الفاظ تو تعبیر کی ادنیٰ ترین کوشش ہیں۔ کربناک لمحے لفظوں میں بیاں ہوا بھی کب کرتے ہیں۔ بس ان جیسی قد آور شخصیت کے بعد ہم ایسے بونے بالکل ہی بے قیمت ہو کر رہ گئے ہیں۔ ماموں جان نے خود تو کہہ دیا تھا.......

کردار باقی رہ گئے
بے کار باقی رہ گئے

کچھ نہ کہا اُس نے جاتے جاتے

بنتِ سید عطاء المہیمن بخاری

۱۵/ نومبر ۲۰۰۹ء کی شام نمازِ مغرب کے لیے ابھی جائے نماز پر کھڑی ہوئی ہی تھی کہ منے بھائی جان کے حادثے کی خبر سنی۔ سب کہہ رہے تھے کہ اُن کی حالت بہت نازک ہے۔ صحت و عافیت کی دعا کرو۔ یہ خبر سن کر میری حالت یہ تھی کہ ......''کاٹو تو بدن میں لہو نہیں''۔ اسی اضطراب میں نماز ادا کی۔ خیالات کا ایک ہجوم تھا۔ بھائی جان کس کیفیت میں ہوں گے؟ آپی اور دونوں بھانجے کس حال میں ہوں گے؟ اتنے میں اطلاع ملی کہ بھائی جان اپنے ربِ کریم کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اس کے حضور حاضر ہو گئے۔ ایسے لگا جیسے قیامت برپا ہو گئی ہو۔ دل بجھ گیا اور دماغ ماؤف ہو گیا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اچانک یہ سب کچھ کیسے ہو گیا ہے۔ پھر اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ

جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی
تم چلے ہو تو کوئی روکنے والا بھی نہیں

بھائی جان کو بچپن ہی سے سب بچے بڑے ''مُنّا'' کہہ کر بلاتے تھے۔ وہ اپنے گھر والوں کے لیے ''مُنّے'' ہی تھے مگر اپنے علم و تقویٰ کے مرتبے میں بہت آگے تھے۔ پڑھنے لکھنے کا ذوق بچپن سے تھا۔ اُن کے ابّا جی اور میرے بڑے ماموں جان (پروفیسر سید محمد وکیل شاہ صاحب مدظلہ) انھیں کتابیں اور رسائل لا کر دیتے اور وہ انھیں بڑے شوق سے پڑھتے۔ انھوں نے تھوڑی سی عمر میں سارے کام مکمل کر لیے۔ اپنی تعلیم اعلیٰ معیار کے ساتھ مکمل کی اور عملی زندگی میں بھی نام پیدا کیا۔ نصابی مطالعہ تو کرتے ہی تھے لیکن اُن کا غیر نصابی مطالعہ بھی بہت وسیع تھا۔ تفسیر، حدیث اور تاریخ کا گہرا مطالعہ تھا۔ سیرتِ طیبہ اور سیرتِ صحابہ و صحابیات اُن کے مطالعے کے خاص موضوعات تھے۔ خوبی یہ تھی کہ جو کچھ پڑھتے اُسے بیان کرتے ہوئے حوالے ساتھ دیتے۔ اکابر کی زندگی کے واقعات اپنے انداز میں سناتے تو سننے والے دنگ رہ جاتے۔ وہ ایک اچھے استاد اور عالم باعمل تھے۔ دین کے ساتھ بہت لگاؤ تھا۔ جس طرح خود مطالعہ کرتے، دوسروں کو بھی اس کی ترغیب دیتے۔ بھائی جان نہایت حلیم الطبع انسان تھے۔ محبت، شفقت، پیار، ہمدردی اور خلوص جیسی صفات اُن کی شخصیت کے ساتھ لازم و ملزوم تھیں۔ وہ سب بچوں کے ساتھ بہت پیار کرتے اور بڑوں کا بے پناہ ادب و احترام کرتے۔ بچوں کو چیزیں کھلانا، اُن سے دل لگی کے انداز میں مذاق کرنا اور اُن کو لطائف سنانا، اُن میں گھل مل جانا، اُن کا خاص مزاج تھا۔ اسی طرح بڑوں میں بیٹھ کر محفل سجانے اور اپنی گفتگو سے ماحول کو خوشگوار بنانے کا گُر انھیں آتا تھا۔ گفتگو کا انداز بہت دل کش تھا۔ نرم اور دھیمے لہجے میں بات کرتے اور جس محفل میں ہوتے اُسے چار چاند لگا دیتے۔ جس موضوع پر گفتگو کرتے عام فہم انداز میں بات سمجھا دیتے۔ دلائل ایسے دیتے کہ سننے والے

کے ذہن پر اُن کے بارے میں کسی بہت بڑے عالم کا نقش ثبت ہو جاتا۔ جو ایک دفعہ بھی اُن سے گفتگو کر لیتا اُن کا شیدائی ہو جاتا۔ وہ ایک قابل استاد ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب وشاعر اور کالم نگار بھی تھے۔ اردو، انگریزی، فارسی اور عربی کے علاوہ علاقائی زبانوں پر بھی انھیں عبور حاصل تھا۔ بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبول جو ایک دفعہ مل لیتا اُن کے علم واخلاق کا گرویدہ ہو جاتا اور دوسری دفعہ ملنے کی تمنا دل میں گھر کر جاتی۔ گویا......

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سے کہیں جسے
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

بھائی جان، وقت کے بہت قدر دان تھے اور بچوں کی تعلیم وتربیت کے بارے میں فکر مند رہتے تھے۔ اپنی مصروفیات میں سے وقت بچا کر بچوں سے اُن کی تعلیم کے بارے میں پوچھنا، اُن کی رہنمائی کرنا اور اُن کو اچھے اچھے مشورے دینا اُن کا معمول تھا۔ گھر سے باہر بھی بچوں سے اُن کا یہی رویہ تھا۔ بچے اُن سے مانوس تھے، خوف زدہ نہیں تھے۔ اُن کے انتقال پر بڑے تو غم زدہ تھے ہی، میں نے بچوں کو بھی روتے دیکھا ہے۔

بھائی جان، بہت ملنسار، خوش اخلاق اور غصے کے وقت صبر سے کام لینے والے تھے۔ وہ غصے کی بجائے پیار سے سمجھاتے اور معاملہ نمٹاتے۔ اُن کی گھریلو اور باہر کی زندگی دونوں پاک صاف تھی۔ پابندی سے باجماعت نمازوں کا اہتمام کرتے، سر پر ہمیشہ ٹوپی رکھتے۔ اللہ نے اُن کی دعائیں قبول کیں اور جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ میں اُن کی تعیناتی ہوگئی۔ اس وہ بہت خوش تھے اور اللہ تعالیٰ شکر ادا کرتے تھے۔ دوستوں کو کہتے ''ایسا لگتا ہے کہ مکہ کی مٹی مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے۔'' اللہ نے اُن کو ہمیشہ کے لیے مکہ بلا لیا۔ اس دفعہ مکہ جاتے ہوئے وہ خاموش خاموش تھے۔ بس جانے کی تیاری میں لگے رہے۔ کسے خبر تھی کہ وہ کیوں چپ ہیں۔ بس....!

ایسی محبوب ٹھہری لقائے حبیب
کچھ نہ کہا اُس نے جاتے جاتے

اللہ تعالیٰ ہمارے بھائی جان کی مغفرت فرمائے اور درجات بلند فرمائے اور اُن کے بچوں کو اُن جیسا بنا دے۔ (آمین)

اَب ہم بابا کسے کہیں گے؟

سید عطاء المکرِم بخاری بن سید ذوالکفل بخاری

(پانچ سالہ عطاء المکرِم کی باتیں ریکارڈ کر کے کاغذ پر منتقل کی گئی ہیں۔ادارہ)

اس دفعہ ہم حرم گئے تھے۔ایک دفعہ بابا کی گاڑی پر اور ایک دفعہ سلیم چچا کی گاڑی پر۔

جب ہم املج تھے تو ہم مکہ چار پانچ مرتبہ آئے تھے اور حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کئی مرتبہ آئے تھے۔وہاں پر مسجد نبوی کی چھتیں ٹوٹی پھوٹی تھیں (۱) اُملج میں ہمارے مالک مکان کی ایک بیٹی تھی اور وہ ایک مرتبہ ہی ہمارے گھر آئی تھی اس کا نام رزان تھا۔میں نے اس کے ساتھ عربی بولنے کی کوشش کی تھی اور اسے کہا تھا ''یارزان وہ دیکھو کل لائیٹنگ۔'' بابا جان ہمیشہ ''ثوب'' پہنتے تھے اور اسی میں اچھے لگتے تھے۔میں ہمیشہ بابا جان کے ساتھ ہی سوتا تھا۔

اس مرتبہ جب ہم سعودیہ گئے تو بابا جان ہمیں وہاں لینے کے لیے آئے تھے۔سجاد چچا ساتھ تھے۔ہم اداس تھے ہم نے کہا بابا آپ دیر سے کیوں آئے ہیں۔بابا اور سجاد چچا ہمیں اپنی سرخ گاڑی میں بٹھا کر مکہ مکرمہ لے آئے تھے۔بابا کی گاڑی پر ماشاء اللہ تبارک اللہ لکھا ہوا تھا۔ہم اپنے بابا کے پاس جا کر بہت خوش تھے۔ہم نے ان کے ساتھ مل کر گھر کو سجایا تھا۔بابا کمروں میں بچھانے کے لیے کارپٹ لے کر آئے تھے۔ہم نے بابا کے ساتھ مل کر کارپٹ بچھوایا تھا اور پورے گھر کی سیٹنگ کی تھی۔وہ ہمیں اکثر بن داؤد (ایک شاپنگ سنٹر) پر لے جاتے تھے۔اور وہاں سے جوس اور چاکلیٹیں خرید کر دیتے۔

بابا جان ہمیں ہر چیز سے زیادہ اچھے لگتے تھے۔وہ ہمارے ساتھ بہت لاڈیاں کرتے تھے۔بڑے پیار، آرام اور محبت کی بات کرتے تھے اور کبھی انہوں نے لڑائی نہیں کی تھی۔وہ بہت پیار اور محبت سے رہتے تھے۔لوگوں کے ساتھ بھی اور ہمارے ساتھ بھی۔

بابا جب یونیورسٹی جاتے تھے تو دل چاہتا تھا کہ ہم بھی یونیورسٹی دیکھیں اور بابا کے ساتھ جا کر بیٹھیں۔اس لیے کہ ہم نے یونیورسٹی نہیں دیکھی تھی۔ایک بار بابا سعودی عرب گئے اور ہم پاکستان تھے ہم اداس تھے اور میں سوچتا تھا کہ بابا بھی اداس ہوں گے اور ہمیں بابا کے پاس جانا چاہیے۔

بابا جان نے ہمیں کہانیاں لا کر دی تھیں (۱) بادشاہ اور دھوبی (۲) کچھوا اور خرگوش (۳) شہنشاہ کا نیا لباس۔بابا ہمیں کہانیاں سناتے تھے۔انہوں نے ایک لکڑہارے کی کہانی سنائی تھی۔اس نے ایک دن اپنے بیٹوں سے کہا کہ لکڑیوں کا گٹھا لے کر آؤ جب وہ لے آئے تو اس نے کہا کہ اسے توڑ دو ان سے وہ نہ ٹوٹا لکڑہارے نے کہا اب اسے کھول دو اور ایک ایک کر کے توڑو تو وہ سب پٹک پٹک کر کے ٹوٹ گئیں۔بابا نے بتایا کہ مل جل کر رہو گے تو ٹوٹو گے نہیں جب الگ ہو جاؤ گے تو ٹوٹ جاؤ گے۔بابا ہمیں نظمیں سنایا کرتے تھے......یاد بھی کرواتے تھے۔

(۱) حرم نبوی صلی اللہ علیہ کے گنبد جو کھلتے اور بند ہوتے ہیں کو اپنے احساس میں بیان کیا ہے۔

سانجھ سویرے چڑیاں مل کر چوں چوں چوں چوں کرتی ہیں
چوں چوں چوں چوں چوں چوں کیا سب بے چوں بے چوں کرتی ہیں
ققنس، تیتر، چکوا، چکوی بولیں یا منّان! میاں
ہُد ہُد بولے اَحد اَحد کچھ تُو بھی تو کر دھیان، میاں
طائر تو سب تخمِ محبت اُس کا دل میں بوتے ہیں
پنچھی اُس کی یاد کریں ہم پاؤں پسارے سوتے ہیں

بابا ہمیں دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اُچھالتے تھے۔ اپنے ہاتھوں سے ہمارے پاؤں پکڑ کر سائیکل چلواتے تھے۔

بابا جان مجھ سے اکثر سوتے وقت دعائیں اور نماز سنتے تھے۔ میں نے بابا جان کو دو مرتبہ نماز بھی پڑھائی تھی۔ ایک مرتبہ اُملج میں اور ایک مرتبہ مکہ مکرمہ میں۔ اس مرتبہ انھوں نے مجھے انعام کے طور پر گاڑی لے کر دی تھی۔

اب کھانا کھاتے وقت دل کرتا ہے کہ بابا کے ساتھ کھانا کھائیں۔ ہمارا دل چاہتا ہے کہ ہم سعودی عرب چلے جائیں۔ لیکن وہاں ہمیں کون لینے آئے گا؟

وہ پروفیسر تھے، ام القریٰ یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔ باباجان روزانہ جب یونیورسٹی سے آتے تھے ہم کھڑکی سے انھیں دیکھ رہے ہوتے تھے۔ ہم دوڑ کر دروازہ کھولتے اور سیڑھیوں میں جا کر شور ڈال دیتے۔ باباجان...... باباجان...... پھر میں بابا کے لیے پانی بھر کے لاتا کیونکہ میری امی نے کہا تھا کہ پانی پلانا سنت ہے اور اس سے ثواب ملتا ہے اللہ تعالیٰ خوش ہوتے ہیں۔ وہ پانی پی کر مجھے پیار کرتے تھے۔

باباجان ہمیں انبیاء علیہم السلام کے قصے بھی سناتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کہ اللہ نے اُنہیں اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک دنبہ بھیج دیا۔ حضرت ابراھیم علیہ السلام نے دنبے کو ذبح کر دیا۔ فرعون کا قصہ...... جب وہ پانی میں جا رہا تھا تو اس میں ڈوب گیا۔ وہ بہت گندا آدمی تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ جب انہوں نے جادوگروں کو شکست دے دی تھی...... ایک قصہ اور بھی سنایا تھا کہ ایک بستی کو اللہ میاں نے تباہ کر دیا تھا اور ان کے مکان ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔ اللہ میاں نے زمین کو الٹا دیا تھا۔ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ بھی سنایا تھا۔ کہ انہیں کنویں میں ڈال دیا تھا۔

جس دن بابا فوت ہوئے تھے میں کمرے میں کھیل رہا تھا امی نے مجھے کہا باہر جا کے کھیلو مجھے فوراً پتہ چل گیا تھا کہ امی کیوں کہہ رہی ہیں۔ بابا فوت ہو گئے تھے اس وجہ سے امی کہہ رہی تھیں کہ باہر جا کے کھیلو۔ ہم بابا کو ہاسپٹل دیکھنے کے لیے گئے تھے بابا کی آنکھیں تھوڑی تھوڑی کھلی ہوئیں تھیں اور سر پر پٹی باندھی ہوئی تھی۔ میں نے بابا کو پیار نہیں کیا تھا اس وجہ سے کہ بابا کے چہرے پر خون تھا۔ امی نے کہا تھا تمہارے بابا شہید ہو گئے ہیں۔ میں گھر آ کر امی کے ساتھ لگ کر بہت رویا تھا۔ میں نے امی سے کہا کہ ہم اب بابا کسے کہیں گے تو امی نے کہا تھا مجھے کہہ لینا۔ سلیم چچا نے کہا تھا جو چیز لینی ہو مجھے کہنا میں آپ کو لا دوں گا۔

جب بابا یاد آتے ہیں تو کوئی کام کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ ایک ہی دل کرتا ہے کہ ہم بھی بابا کے پاس چلے جائیں۔ وہ ہم سے فون پر ہی بات کر لیا کریں۔ مگر وہ تو اب فوت ہو گئے ہیں۔ وہ اللہ میاں کے پاس چلے گئے ہیں۔ وہ وہاں مزملہ کے ساتھ مزے کر رہے ہیں۔ اب ہم بابا کسے کہیں گے۔

بابا جان بہت یاد آتے ہیں

سید عطاء المنعم بخاری بن سید ذوالکفل بخاری

(چار سالہ عطاء المنعم کی باتیں ریکارڈ کر کے کاغذ پر منتقل کی گئی ہیں۔ادارہ)

بابا جان جب اُملج ہوتے تھے تو ایک روز ان کا فون آیا امی نے کہا بات کرلو میں نے کہا:

''جیہڑا ساڈے کول نئیں رہندا، اسی اودے نال گل وی نئیں کرنی''

ہم جب مکہ مکرمہ گئے تھے تو بابا جان ہمیں چیزیں دلانے کے لیے ''بن داؤد'' پر لے جاتے تھے۔ بابا جوس اور چاکلیٹیں لے کر دیتے تھے۔

بابا کبھی یونیورسٹی جاتے تھے، کبھی کسی اور کام چلے جاتے تھے۔ بابا ہمیں حرم شریف میں لے جاتے تھے۔ ہم طواف کرتے سیر کروانے پارک میں لے جاتے تھے۔ ہم جب بابا کے پاس گئے تھے تو بابا جان سجاد چچا کے ساتھ جدہ اپنی سرخ گاڑی پر لینے کے لیے آئے تھے بابا جان ہمیں مکہ مکرمہ لے آئے تھے۔ ہمارے گھر کے چار کمرے تھے۔

بابا جان نے ہمیں ہاتھی اور چوہے والا لطیفہ بھی سنایا تھا۔

ایک چوہا ہاتھی سے کہتا ہے مجھے اپنا جانگیہ تو دو۔ ہاتھی کہتا تم نے کیا کرنا! چوہا کہتا میرے بھائی کی شادی ہے میں نے ٹینٹ لگانا۔

بابا جان ہمیں اُملج میں چڑیا گھر بھی لے کر گئے تھے۔ وہاں ہم نے ایک بندر دیکھا تھا اس نے پیمپر لگایا ہوا تھا۔

بابا جان ہمیں نظمیں بھی سناتے تھے۔ انہوں نے ایک نظم ہمیں یاد بھی کروائی تھی۔

چڑیا اُڑتی آئی
چونچ میں دو تنکے بھی لائی
تنکے پہ اِک تنکا رکھا
تنکوں کا اِک جال بنایا
جال میں بیٹھی انڈے دیتی
انڈوں سے پھر بچے نکلے
چیں چیں کرتے چوں چوں کرتے

بابا کی وفات کے بعد ہم دو تین دن وہاں رہے تھے تو میں سوچتا تھا کہ قیامت کے دن ہم اللہ میاں کے پاس نہیں جائیں گے کیونکہ ہمارے بابا کی آنکھیں تو نہیں کھلیں گی۔ اور وہ ہمیں دیکھ بھی نہیں سکیں گے۔

ہمیں بابا جان کے فوت ہونے کا نہیں پتا تھا۔ جب ہم ہاسپٹل گئے تھے تو تب ہمیں پتا چلا تھا کہ بابا جان فوت ہو گئے ہیں۔ میں نے وہاں بابا کو دیکھا تھا۔ لیکن بابا اٹھ نہیں رہے تھے۔ اور مجھے ان کے منہ پر خون دیکھ کر ڈر لگ رہا تھا اس لیے میں نے کہا تھا کہ گھر چلیں۔ میں نے ان کا پورا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ اس وجہ سے کہ اُس پہ سارا خون خون تھا۔ پتا نہیں ہاسپٹل والوں نے بابا جان کو ایک سفید کپڑے میں کیوں لپیٹا ہوا تھا؟ وہ انہیں اس میں سے نکال نہیں رہے تھے۔ بابا جان کا جنازہ اللہ تعالیٰ کے گھر میں ہوا تھا۔ اور ان کو جنت المعلیٰ میں دفن کیا تھا۔ ہم بابا کے ساتھ حرم بھی جاتے تھے۔ لیکن ایک دن وہ یونیورسٹی سے پڑھا کر آرہے تھے شرطی نے اپنی گاڑی سے بابا کی گاڑی کو ٹکر لگائی اور وہ فوت ہو گئے۔ جب ہم پاکستان واپس آرہے تھے تو میں سوچ رہا تھا کہ بابا اللہ میاں کے پاس خوشی کر رہے ہیں۔ اگر وہ شہید نہ ہوتے تو وہ بھی ہمارے ساتھ ملتان آجاتے۔ اب وہ وہیں دفن ہیں جنت المعلیٰ میں اور ان پر مٹی ڈالی ہوئی ہے۔

میرے بابا جان کا پورا نام سید ذوالکفل بخاری ہے اور ان کا نام قرآن میں بھی آتا ہے ”ذوالکفل“۔

بابا جان ہمیں بہت یاد آتے ہیں۔

ذرا رُت بدلنے کی دیر ہے

وہ جو سونے کی گلیوں میں ننگے پاؤں پھرتے ہیں، سوچتا ہوں کیسے مزے میں ہیں۔ بس ایک دُھن، بس اک خیال میں مگن۔ شانت اور سرشار۔ یہ ”سرشاری“ مجھے بھی چاہیے لیکن اس راہ پر چلوں تو، چلنا تو کجا جینا بھی ممکن نہ رہے۔ بس ایک خیال کی اسیری، آدمی کو کہاں سے کہاں لے جاتی ہے؟ عمل راہِ دشوار۔ خیال راہِ فرار۔ اور یہ جو سونے کی قوم ہے نا؟ صحرا نشین، بادیہ پیما۔ یہ بھٹک سکتی ہے، بہک سکتی ہے، بھول سکتی ہے لیکن ”بھاگ“ نہیں سکتی۔ اس کا یہ کردار ہی نہیں۔ یہ بھاگنے والی ہوتی تو یہاں ذرّے ذرّے سے معجزے نمودار نہ ہوتے۔ میں ان ذرّوں کو دیکھتا ہوں، میں ان معجزوں کو سوچتا ہوں۔ آج بھی مجھے یقین ہے کہ ان بھٹکے ہوؤں کو، بہکے ہوؤں کو اور بھولے ہوؤں کو بس راستہ ملنے کی دیر ہے۔ معجزے پھر سے نمودار ہوں گے۔ راہِ دشوار کے اُس طرف۔ ”یہ بجا کہ آج اندھیر ہے...... ذرا رُت بدلنے کی دیر ہے۔“ ہاں ہاں، جب دشوار راہیں پھر سے آباد ہوں گی۔ راہیں موجود ہیں۔ وہی کی وہی۔ وہیں کی وہیں۔ ویسی کی ویسی۔ اور......

کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی
ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے

ذوالکفل بخاریؒ

(روشنی، پھول، صبا　　سفر نامہ حجاز کا ایک ورق)

چچا جان! ہم بہت اُداس ہیں

سید عطاء المحسن بخاری ابن سید محمد کفیل بخاری

ہمارے ایک ہی چچا جان تھے۔ بہت پیارے ہنستے مسکراتے چہرے والے۔ کبھی غصے نہیں ہوئے اور نہ کبھی ڈانٹا، ہمیشہ پیار کیا۔ اُنھوں نے ہم بہن بھائیوں کے نام رکھے ہوئے تھے۔ جب زیادہ پیار کرتے تو ہمیں اِن ناموں سے بُلاتے۔ میری بڑی بہن کو کہتے ''بھُتنی اِدھر آؤ''، چھوٹی بہن کو کہتے ''بِگّی بلا! بات سنو''۔ مجھے کہتے ''مولانا! تم کھیلتے بہت ہو پڑھا بھی کرو۔

اُن کے پاس بہت کتابیں تھیں۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر کتابیں پڑھتے یا کچھ لکھتے رہتے۔ وہ بہت بڑے عالم تھے۔ اُن سے ہم جو بات پوچھتے وہ اُس کا ہنستے ہوئے جواب دیتے۔ ہمیں کہانیوں کی کتابیں اور رسالے لا کر دیا کرتے اور کہتے کہ ان کو پڑھا کرو۔ اُنھوں نے ہمیں کمپیوٹر بھی لے کر دیا۔ جب بھی سعودی عرب سے آتے ہمیں بہت خوشی ہوتی۔ صبح صبح کے وقت آیا کرتے۔ ہماری بہت خواہش ہوتی کہ بس یا ہوائی اڈے سے اُن کو لینے کے لیے جائیں۔ پھر ہم سب اکٹھے گاڑی میں بیٹھ کر اُنھیں لینے جاتے، گھر آتے تو سب بچے اُن کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کرتے۔ ابا جی، امی، دادی اماں سب بیٹھے ہوتے۔ چچا جان ہمیں وہاں کی باتیں سناتے۔ لطیفے اور واقعات بتاتے۔ سارے گھر والے اُن کی باتیں شوق سے سنتے۔ گھر میں بڑی رونق ہوتی۔ پھر چچا جان ہمیں کھلونے ٹافیاں اور چاکلیٹ وغیرہ دیتے۔ ہم سب بہت خوش ہوتے۔

چچا جان ہمیں بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ ہمارا بہت خیال رکھتے تھے۔ ہر ایک سے پوچھتے کہ آپ آج کل کیا پڑھ رہے ہیں؟۔ مجھے کہتے جلدی جلدی حفظ کرلو تمھیں ابھی بہت ساری کتابیں پڑھنی ہیں۔ وہ ہمیں بزرگوں کے، صحابہؓ کے اور انبیا کے واقعات سناتے۔ وہ سعودی عرب سے فون کرتے تھے تو سب بچوں کی خواہش ہوتی کہ اُن سے بات کریں۔ اور ہم اُن سے بات کرتے اپنی باری لینے کے لیے ہماری آپس میں لڑائی بھی ہو جاتی۔ ہم پورا سال چچا جان کے آنے کا انتظار کرتے۔ جس دِن چچا جان کی شہادت ہوئی اُس دن سے آج تک ہم اُنھیں بہت یاد کرتے ہیں۔ ہمارے دونوں بھائی عطاء المکرم اور عطاء المنعم اپنے بابا کو بہت یاد کرتے ہیں اور اُن کی باتیں سناتے ہیں۔

سب کہتے ہیں کہ اب وہ کبھی نہیں آئیں گے۔ مجھے یہ بات پوری طرح سمجھ نہیں آ رہی۔ چچا جان آپ واپس کیوں نہیں آئیں گے؟ اب آپ واپس آ جائیں۔ آپ کے بغیر ہم سب بہت اُداس ہیں۔ آپ نہ آئے تو ہمیں کتابیں اور رسالے کون دے گا۔ آپ کی اتنی ساری کتابیں رکھی ہوئی ہیں اُن کو اب کون پڑھے گا۔ ہمیں کھلونے اور ٹافیاں کون دے گا۔ ہمیں اتنے اچھے لطیفے اور واقعات کون سنائے گا۔ ہمارے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کون کرے گا۔ چچا جان آپ ہمارے ایک ہی چچا تھے۔ عطاء المکرم اور عطاء المنعم میرے ابی کو تایا ابّو کہتے ہیں، اُن سے باتیں کرتے ہیں۔ اُن کو بابا جان نظر نہیں آتے اور مجھے چچا جان نہیں ملتے۔ آپ کے بغیر ہم سب اُداس ہیں۔ آپ جب بھی کہیں جاتے تھے تو آ کر وہاں کی باتیں بتاتے تھے، اب بھی بتائیں ناکہ آپ کا نیا گھر کیسا ہے؟ امی کہتی ہیں کہ آپ جنت المعلیٰ میں رہتے ہیں۔ یہ جنت کیسی ہے؟ آپ وہاں خوش ہیں؟ آپ کی صحت کیسی ہے؟ کیا ہم بھی آپ کو یاد آتے ہیں؟ وہاں آپ کن لوگوں کے ساتھ رہتے اور کن سے باتیں کرتے ہیں؟۔ اتنا تو بتا دیں...... چاہے خواب میں ہی آ کر بتا دیں، ہم خوش ہو جائیں گے۔

میرے خوش نصیب چچا جان

سیدہ رُغینہ بنت سید کفیل بخاری

۱۵/ نومبر ۲۰۰۹ء کی اُداس شام مجھے کبھی نہ بھولے گی ۔ نمازِ مغرب کے لیے وضو کیا ہی تھا کہ بڑی پھوپھو جان ہمارے کمرے میں آئیں اور بتایا کہ چچا جان کا مکہ مکرمہ میں ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ تمھارے ابی کہاں ہیں؟ امی نے بتایا کہ باہر مدرسہ میں ہیں۔ یہ خبر سن کر میرے تو اوسان خطا ہوگئے ۔ میں نے فوراً مصلیٰ بچھایا اور نماز پڑھی۔ پھر مدرسے میں جا کر اپنی باجی کو بتایا اور اُن سے کہا کہ چچا جان کے لیے دعا کریں۔ مدرسے میں دعا مانگ کر گھر آئی تو امی نے بتایا کہ تمھارے چچا جان اللہ میاں کے پاس چلے گئے ۔ یہ سن کر بہت غم ہوا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ ابا جی (دادا ابو) دادی اماں، میرے ابّی ، پھوپھو اور ہم سب بھائی بہنیں برآمدے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ آنسو تو سب کے نکل رہے تھے لیکن چیخ وپکار نہیں تھی ۔ بہت صبر کررہے تھے۔ رات دیر تک جاگتے رہے۔ میری تو نیند ہی ختم ہوگئی، رو رو کر رات گزاری۔ نمازِ فجر کے بعد مکہ سے چچا جان کے ایک دوست نے میرے ابی کو فون پر بتایا کہ ہم آپ کی امانت حرم شریف میں لے آئے ہیں۔ نمازِ جنازہ کے وقت بھی انھوں نے فون کیا۔ چچا جان کتنے خوش قسمت تھے کہ ان کی نمازِ جنازہ حرم شریف میں ہوئی۔ لاکھوں مسلمانوں نے اُن کے لیے مغفرت کی دعا کی ۔ وہ جنت المعلیٰ میں اماں خدیجہ رضی اللہ عنہا کے قدموں میں دفن ہوئے۔ میرے چچا جان، اللہ تعالیٰ کے خاص بندے تھے۔ اسی لیے وہ جنت المعلیٰ میں جا کر ہمیشہ کے لیے سوگئے ۔ وہ جنتی انسان تھے۔

میرے ابی بتاتے ہیں کہ تمھارے چچا بچپن سے ہی بہت قابل تھے۔ وہ بڑی محنت سے پڑھتے تھے۔ بہت ذہین تھے اور اپنے سکول کے لائق ترین بچوں میں شمار ہوتے تھے۔ کھیل کود میں وقت ضائع نہیں کرتے تھے۔ ابا جی (دادا ابو) انھیں کتابیں، رسالے لاکر دیتے اور وہ انھیں پڑھتے رہتے۔ چچا جان نے ایم اے تک تعلیم مکمل کی۔ اس کے علاوہ بھی کئی ڈگریاں حاصل کیں۔ وہ ادیب اور شاعر بھی تھے۔ اخبارات میں اُن کے مضامین اور کالم بھی چھپتے تھے۔ ہم بچوں سے بہت پیار کرتے ۔ وہ ہمیں کبھی غصے نہیں ہوئے۔ ہمیشہ محبت سے سمجھاتے۔ ہم سے مذاق بھی کرتے۔ ہم اُن کی باتیں غور سے سنتے ۔ وہ مجھے پیار سے ''بھتنی'' کہتے۔ گزشتہ سال انھوں نے آخری رمضان ہمارے ساتھ گزارا۔ سحری وافطاری میں اُن کی وجہ سے گھر میں بہت رونق ہوتی۔ افطاری میں سموسے، پھل وغیرہ لے کر آتے ۔ ہمیں قیمے والے سموسے پسند نہیں تھے۔ میں نے کہا چچا جان اِن میں سے بد بوآتی ہے۔ مذاق سے کہنے لگے ان میں جنگلی بھیڑوں کا قیمہ ہوتا ہے۔ ہم سب بچے یہی سمجھے کہ واقعی ایسا ہے۔ ہم نے سموسے کھانا چھوڑ دیئے۔ وہ کہتے کہ پھل کھایا کرو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ چھوٹی عید پر انھوں نے مجھے اپنے پاس بلایا اور چار عینکیں دیں اور عیدی بھی دی۔ کہنے لگے اپنے بہن بھائیوں کو دے دو۔ میری عینک جامنی رنگ کی تھی جو میرے جوڑے کے ساتھ ملتی تھی۔ چھوٹی عید کے بعد جب

وہ سعودی عرب گئے تو ہم اپنی نانی اماں کے ہاں گاؤں گئے ہوئے تھے۔ اُن سے ہماری فون پر بات ہوتی رہتی تھی۔ وہ سب بچوں سے بات کرتے تھے۔ انتقال سے پندرہ دن پہلے بھی انھوں نے مکہ مکرمہ سے فون کر کے ہم بچوں سے بات کی۔ یقین نہیں آتا کہ چچا جان کا انتقال ہوگیا ہے۔

چچا جان سعودیہ جانے سے پہلے گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی میں پروفیسر تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ وہ مکہ یا مدینہ میں رہ کر پڑھائیں۔ ان کی دعا قبول ہوئی اور وہ جامعہ ام القریٰ مکہ میں استاد مقرر ہوگئے۔ ہمارے نانا جان حج پر گئے ہوئے تھے۔ وہ چچا جان سے بھی ملے۔ چچا جان نے انھیں کہا کہ آپ مدینہ منورہ سے واپس میرے گھر آئیں۔ ہم اکٹھے حج کریں گے۔ لیکن چچا جان تو حج سے چند روز پہلے ہی اپنے اللہ سے جاملے۔ نانا ابو نے بتایا کہ چچا جان نے موت کے وقت کلمۂ شہادت پڑھا پھر چند منٹ بعد اُن کا انتقال ہوگیا۔ یہ بات موقع پر موجود ''شرطی'' (سپاہی) نے بتائی۔ چھوٹی عید پر چچا جان ہمارے پاس تھے اور بڑی عید ہم نے چچا جان کی یاد میں گزاری۔ میں نے اُن کی یاد میں وہی جوڑا پہنا اور اُن کی دی ہوئی عینک لگائی۔ نانا ابو نے انھیں نہلایا اور قبر میں خود اتارا۔ میرے چچا جان بہت اچھے تھے۔ وہ مجھے بہت یاد آتے ہیں۔ وہ جہاں چلے گئے ہیں وہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ اللہ کو یہی منظور تھا۔

چچا جان اپنے دوستوں سے کہتے تھے:

دعا کرو تھوڑی عمر ہو اور اللہ راضی ہو جائے۔ لمبی عمر میں گناہ بھی زیادہ ہوتے ہیں۔

چچا جان نے چالیس سال عمر پائی لیکن نیکیاں بہت زیادہ ساتھ لے کر گئے۔ میری خواہش ہے کہ وہ مجھے خواب میں ملیں۔ میں اُن کی باتیں سنوں اور اُن سے باتیں کروں۔ آخری بار چچا جان جانے لگے تو ہم بہت اداس تھے۔ ایک دفعہ امی نے اُن سے کہا کہ اس کے حفظِ قرآن کے لیے مکہ مکرمہ جا کر دعا کریں کہ جلدی مکمل ہو جائے۔ کہنے لگے ان شاء اللہ دعا کروں گا۔ میں نے کہا چچا جان میرے دانت میں درد ہے۔ اس کے لیے بھی دعا کرنا۔ ہنس کر کہنے لگے کہ اچھا ضرور کروں گا۔ ان شاء اللہ۔ مکہ مکرمہ جا کر تو میرے چچا جان کی زندگی ہی بدل گئی تھی۔ وہ بہت زیادہ نیک ہوگئے تھے۔ چچا جان کا کمرہ کتابوں سے بھرا پڑا ہے لیکن وہ نہیں ہیں۔ چچا جان کے بیٹے اور ہمارے بھائی عطاء المکرم اور عطاء المنعم بہت زیادہ اداس رہتے ہیں۔ ہر وقت اپنے بابا جان کو یاد کرتے ہیں۔

چچا جان! ہم سب بہن بھائی آپ کو بہت یاد کرتے ہیں، آپ کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جنت الفردوس میں بہت اچھا گھر دیں۔ آپ ہمیشہ خوش رہیں۔ آپ کو ہم سب کی طرف سے سلام۔

مُنّے چچا جان

سیدہ فکیہہ بنت سید کفیل بخاری

چچا جان سید محمد ذوالکفل بخاری مکہ مکرمہ میں شہید ہوگئے۔ وہ بہت نیک انسان تھے۔ چچا جان بہت کتابیں پڑھتے تھے۔ وہ ہم سب بچوں کو بہت پیار کرتے تھے۔ ہمیں غصے نہیں ہوتے تھے۔ مجھے پیار سے ''بگّی بلا'' اور ''چینی گڑیا'' کہتے تھے۔ وہ اتنے قابل تھے کہ لوگ ان سے اپنے مسئلے پوچھنے آتے تھے۔ ہم بہن بھائی انھیں مُنّے چچا جان کہتے تھے۔ ہماری دادی اماں اُن کو جو کام بھی کہتیں وہ فوراً کرتے۔ نہ نہیں کرتے تھے۔ دادی اماں کی دوائی وہی لے کر آتے۔ گھر میں کوئی بیمار ہوجاتا تو اس کے لیے بھی دوا لاتے۔ وہ کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ کافی عرصہ پہلے سعودی عرب چلے گئے، وہاں بھی پڑھاتے تھے۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں گھر آتے تو بہت رونق ہوجاتی تھی۔ چچا جان ہمیں لطیفے سناتے، ہمارے ساتھ اردو اور پنجابی میں باتیں کرتے۔ اُن کو انگریزی اور فارسی بھی آتی تھی۔ ملتانی سرائیکی بھی بولتے۔ سعودی عرب میں رہ کر عربی بھی سیکھ لی تھی۔ چچا جان مجھے بہت اچھے لگتے تھے۔ آخری دفعہ رمضان میں گھر آئے تھے۔ ہمارے ساتھ سحری افطاری کرتے جمعہ کے دن ہم بچے بھی روزہ رکھتے اس دن چچا جان ہماری افطاری کے لیے بہت سارا پھل اور کئی چیزیں لے کر آتے۔ اگر عید پر یہاں ہوتے تو ہمیں عیدی بھی دیتے۔

چچا جان کے متعلق جب پتا چلا کہ وہ شہید ہوگئے۔ مجھے بہت غم ہوا۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ ابی جان، دادی اماں اور پھوپھی جان نے بتایا کہ انھوں نے موت کے وقت شہادت کی انگلی کھڑی کر کے کلمۂ شہادت پڑھا۔ چچا جان اتنے اونچے درجے میں چلے گئے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے جنت المعلیٰ میں ام المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے قدموں میں دفن ہوئے ہیں۔ اب وہ جنت میں مزے کر رہے ہیں۔ چچا جان کے دونوں بیٹے اور ہمارے بھائی عطاء المکرم، عطاء المنعم، اور ہم بہن بھائی سب لوگ چچا جان کے بغیر بہت اداس ہیں۔ کیونکہ وہ ہم سب کو پیار کرتے تھے۔ ہم بھی دعا کرتے ہیں آپ بھی دعا کریں اللہ تعالیٰ ہمارے مُنے چچا جان کو ہمیشہ جنت میں خوش رکھے اور ہمیں نیک بننے کی توفیق دے۔ (آمین)

بہار آخر شد

ڈاکٹر اسلم انصاری

بعض اوقات قرطاس وقلم کا لاؤ لشکر — کتنا بے سروساماں نظر آنے لگتا ہے، اس کا اندازہ گزشتہ ڈیڑھ دو ماہ کے عرصے میں مجھے کئی بار ہوا۔ میں نے رثائیہ نظم اس لیے لکھی تھی کہ شدتِ احساس نے اظہار کے لیے خود ہی فوری طور پر ایک پیرایۂ بیان اختیار کرلیا تھا۔ میں نے ان کی ذات کے بارے میں جب بھی لکھنے کے لیے سوچنا شروع کیا، سلسلۂ خیال ٹوٹ ٹوٹ گیا۔ باوجودیکہ ایک عرصے سے صورتِ حال یہ تھی کہ ملنا ملانا، سالوں اور مہینوں میں ہوتا تھا، پھر بھی ایک طویل مدت تک ایسا تھا کہ ملاقاتیں کم سے کم وقفوں سے ہوتی تھیں اور ممکنہ حد تک طویل ہوجاتی تھیں، ادب، شاعری، علوم وفنون، تاریخ و تہذیب، شخصیات، واقعات، لطائف ومطائبات، غرض بیان اور تبصرے کے قابل کوئی موضوع کم ہی بچتا تھا۔ ہم عصر صورتِ حال اور ہمہ گیر انحطاطِ اقدار بہت حد تک عمومی موضوع ہوتا تھا، انھیں میری ذات اور میری ناچیز کاوشوں سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ میرے ماضی میں جھانکنا اُنھیں بہت مرغوب تھا۔ میرے اندازِ بیان کے آئینے میں گزشتہ نصف صدی کی علمی اور ادبی تاریخ کے مختلف ادوار اور مختلف پہلوؤں کو دیکھنا انھیں بہت پسند تھا۔ اس لیے اُن کے پاس ہر وقت ایسے سوال خاصی تعداد میں موجود رہتے تھے جن کے ذریعے وہ میرے جذبۂ اظہار کو مسلسل مہمیز کرتے تھے، اُن کی موجودگی میں بعض اوقات مہمیز کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر، اور میں انھیں دیکھ کر اکثر باتیں خود ہی سمجھ جاتے تھے اور شروع سے شروع کرنے کی بجائے کہیں بیچ سے بات شروع ہوجاتی تھی، ادیان ومسالک کے نازک ترین معاملات ومسائل پر بعض اوقات استفہام کے نتیجے میں، اور بعض اوقات استفہام کے بغیر مکالمہ جاری رہتا تھا۔ بعض بنیادی معاملات طے شدہ تھے۔ اس لیے ان میں کسی قسم کے اختلاف کا امکان نہیں تھا۔ اس کے باوجود ایک دوسرے کے نقطۂ نظر کو احترام اور محبت سے سمجھا اور سمجھایا جاتا تھا۔ بعض مہماتِ مسائل میں اُن کے سوالات اور نقطہ ہائے اعتراض کے جواب میں میری گفتگو تقریر کا رنگ اختیار کرجاتی تھی۔ اور میں دیکھتا تھا کہ وہ خفیف اور دل پزیر مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھتے جاتے تھے۔

ابتدائی ملاقاتوں میں جن کا آغاز اب سے اور کچھ نہیں تو بیس برس پہلے ہوا تھا۔ وہ اور عزیزِ مکرّم وحید الرحمٰن خان ساتھ ہی کرم فرماتے تھے۔ دراصل ان دونوں میں دوستی اور محبت کا رشتہ اتنا گہرا اور پائیدار تھا کہ بعض اوقات وہ مجھے ایک ہی شخص معلوم ہوتے تھے۔ اب وحید الرحمٰن خان کہتے ہیں کہ گفتگو تو زیادہ تر وہی کرتے تھے۔ میں تو صرف سنتا تھا۔ اور دیکھتا تھا کہ گفتگو کس رُخ پر جارہی ہے۔ اور اب اُس نے اچانک کیا رخ اختیار کرلیا۔

اصل قصہ یہ تھا کہ سید ذوالکفل بخاری اور وحید الرحمٰن خان میں کامل ہم آہنگی تھی۔ اور میں ان دونوں باصلاحیت

نوجوانوں کے ساتھ آج کی زبان میں INTER-ACT کر کے بے حد راحت محسوس کرتا تھا۔ یہاں مجھے ایک بات یاد آتی ہے۔ اٹلی کے شہرۂ آفاق شاعر اور ڈوائن کامیڈی　　کے خالق ڈانٹے کو اس کے مخالفین نے اُس کے وطن فلارنس سے جلاوطن کر دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں وہ بقیۃ العمر شہر بہ شہر، مارا مارا پھرا۔ کبھی کسی نواب کے ہاں پناہ لی، کبھی کسی ڈیوک کے دربار سے وابستہ ہوگیا۔ ایک بار کسی نواب کے دربار میں ایک درباری مسخرا کچھ ایسی مضحکہ خیز حرکتیں کر رہا تھا کہ نواب اور درباری ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہورہے تھے۔ لیکن ڈانٹے کے چہرے پر وہی فکر انگیز سنجیدگی تھی جو اس کی اکثر تصویروں میں نظر آتی ہے۔ ہنسنا تو دور کی بات ہے، درباری مسخرے کی حرکات پر اُس کے ماتھے کی گرہ تک نہ کھلی۔ اس کے اس حال کو دیکھ کر نواب نے پوچھا: کیوں صاحب آپ محظوظ نہیں ہوئے! ڈانٹے نے جو جواب دیا، وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ اس نے کہا _____ "Like to Like"۔ یعنی کند ہم جنس با ہم جنس پرواز

حقیقت یہ ہے کہ بعض اوقات ناظر و منظور ایک دوسرے کا آئینہ ہوتے ہیں۔ سامع اور متکلم کا بھی یہی حال ہے۔ بعض لوگوں کی موجودگی ایسی خیالات کش ہوتی ہے کہ کوشش کے باوجود انسان کوئی ڈھنگ کی بات نہیں کر پاتا۔ جب کہ بعض لوگوں کو دیکھتے ہی، یا ملتے ہی خیالات کا دھارا پھوٹ نکلتا ہے۔ سید ذوالکفل بخاری اور وحید الرحمٰن خان کے ساتھ میرا یہی معاملہ تھا۔ سید ذوالکفل شروع سے ہی وسیع المطالعہ تھے اور حسنِ گفتار تو اُن کی خاندانی وراثت تھی۔ وہ جستہ جستہ اُن تمام موضوعات کا ادراک رکھتے تھے، جن سے راقم کو ایک عرصے سے دلچسپی رہی ہے۔ ان اشتراکات میں استثناء کے کئی پہلو بھی تھے۔ بعض موضوعات اُن کے ممنوعات میں سے تھے، بعض سے مجھے اجتناب تھا۔ اس کے باوجود دائرۂ گفتگو بہت وسیع رہتا تھا۔

اُن کی ذاتی خوبیوں میں، شرافتِ نفس اور سلامتیِ طبع کو اوّلیت حاصل تھی۔ سلامت روی اُن کا شیوہ تھا، لیکن اپنی رائے کے اظہار میں بھی انھیں کوئی باک نہیں تھا اور تبلیغ کا حق ادا کرنے سے بھی اُنھیں کوئی روک نہیں سکتا تھا، لیکن وہ افہام و تفہیم کے قائل تھے اور درست استدلال کو قبول کرنے میں انھیں ذرا بھی تأمل نہیں ہوتا تھا۔ لیکن خیال رہے کہ ہماری گفتگو بحث و مناظرہ ہرگز نہیں ہوتی تھی۔ میرا Privilege یہ تھا کہ میں بعض فلسفیانہ امور میں، نیز بعض تمدنی مسائل کے حوالے سے کچھ نکات کی تصریح کرتا تھا۔ جو میں دیکھتا تھا کہ اُن کے لیے طمانیت کا باعث ہوتی تھی۔ اشعار اور الفاظ کی تشریح و تعبیر کے حوالے سے بھی اکثر یہی صورتِ حال ہوتی تھی، _____ لیکن ان تمام حوالوں سے وہ اپنی سوچی سمجھی رائے میں تفصیل سے بیان کرتے تھے۔

میر تقی میرؔ کا ایک شعر ہے:

بہار اک طرف، اک طرف ابر ہے
گلستاں کے ہیں دونوں پلّے بھرے

شرافت اور نجابت اگر ترازو کے دو پلّے ہیں تو قدرت نے اُن کے یہ دونوں پلّے پوری طرح بھر دیئے تھے۔ نجابت اُن کی تاریخی اعتبار سے معروف و مسلّم تھی۔ وہ حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے نواسے تھے۔ اُن کے والد پروفیسر سید محمد وکیل شاہ صاحب ایک نیک نام استاد اور منتظم ہیں۔ اُن کے ماموؤں میں سید ابوذر بخاریؒ اور سید عطاء المحسن بخاریؒ کے نام ہائے نامی سرفہرست ہیں۔ اُن کے برادرِ اکبر سید محمد کفیل بخاری دینی صحافت و خطابت کے اعتبار سے گزشتہ ربع صدی سے زیادہ عرصے میں بہت خوب نام کما چکے ہیں اور اب وہ خود بھی شہرت کے بامِ عروج کی طرف تیزی سے رواں دواں تھے۔ یہ نسبتوں کا عالم

تھا۔ ذاتی شرافت کے حوالے سے اُن کے اقران ومعاصرین شاہدِ عدل ہیں۔ غرض اس گلستاں کے دونوں پلّے پورم پُور بھرے ہوئے تھے۔ ذہن بنیادی طور پر تخلیقی تھا۔ اسی لیے آخر آخر میں شعر گوئی کی طرف توجہ کی اور بعض خوبصورت اور قابل ذکر نظمیں وجود میں آئیں۔ ''شام جھانکتی ہوئی'' کے عنوان سے ایک پورا سلسلۂ نظم وجود میں آ گیا۔ آخری بار جب ملتان کو مراجعت کی تو عندالملاقات میں نے کہا کہ اس طرح کی دس بیس نظمیں اور لکھ دیجیے تو شاعری کی ایک مختصر مگر خوبصورت کتاب بن سکتی ہے۔ میری اُس بات سے انھوں نے اتفاق کیا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ انھوں نے ماضی قریب میں کچھ ایسی نظمیں بھی لکھ ڈالی تھیں جن میں ہئیت اور موضوع ہر دو اعتبار سے کچھ نئے تجربے کیے گئے تھے۔ ایک نظم کے بارے میں میرا خیال ہے کہ بھوپالی اردو میں لکھی گئی ہے لیکن ساتھ ہی مجھے خیال آیا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ وہ حیدر آبادی اردو میں لکھی گئی ہو۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اُن کی آخری نظموں کے رشتے بے حد تجریدی موضوعات سے ملتے جا رہے تھے۔ ان نظموں کی فضا سے لگتا ہے کہ وہ ذہنی طور پر کسی اور سمت اور کسی اور سطح پر سفر کر رہے تھے۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ۱۹۹۰ء کی دہائی کے ابتدائی سالوں کی بات ہے کہ سید ذوالکفل بخاری اور وحید الرحمٰن خان نے کچھ ہم خیال دوستوں اور بزرگوں، بالخصوص پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان کی سرپرستی اور نگرانی میں فاران اکادمی کے نام سے ایک ادبی انجمن کی تشکیل کی۔ جن سینئرز نے معمولاً اس کے اجلاسوں میں شرکت شروع کی اُن میں عبدالمجید خان ساجد اور پروفیسر مختار ظفر بھی شامل تھے۔ خاکسار بھی ان عزیزوں کی پاسِ خاطر سے فاران اکادمی کے اکثر اجلاسوں میں شریک ہوتا رہا۔ یہ اجلاس سنٹرل کالج میں منعقد ہوتے تھے۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ سید ذوالکفل اُن ایام میں اسی کالج میں ایم اے انگلش کی کلاس کے طالب علم تھے اور یہاں کے ماحول میں باوجود نوعمری کے اعتبار واثر پیدا کر چکے تھے۔ علاوہ ازیں مرزا عبدالغنی اس ادارے کی انتظامیہ میں شریک تھے اور مرزا صاحب اور پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان میں پرانا اخلاص تھا۔ چنانچہ اس اکادمی کو اپنی ادبی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کے لیے ایک حد تک خوشگوار اور سازگار ماحول حاصل تھا۔ اس کے نوجوان اراکین میں شعیب ودود، مستحسن خیال اور مختار پارس جیسے باصلاحیت لوگ شامل تھے۔ گورنمنٹ کالج سے میرے شعبۂ اردو کے رفیقِ کار منیر احمد شامی بھی اسی قافلے میں شامل تھے۔ اجلاسوں سے پہلے اور بعد کی غیر رسمی صحبتیں اصل اجلاسوں سے بھی زیادہ اہم تھیں۔ سید ذوالکفل اور وحید الرحمٰن خان اپنی ذہانت اور متانت کے اعتبار سے سب میں نمایاں تھے۔ اور اپنی صفاتِ جمیلہ سے روز بروز ''عزیزِ دلہا'' ہوتے چلے گئے۔ ان دونوں نوجوانوں کی ایک بڑی صفت دوستوں اور بزرگوں کے بعض مہماتِ امور میں دلچسپی لینا اور مسائل کے حل میں عملی معاونت کرنا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وصفِ خاص میں یہ دونوں عزیز ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے۔ یہ عزیز جب یہ دیکھتے تھے کہ میرا بہت سا کلام ابھی یکجا نہیں ہوسکا، یا میری بہت سی نثری تحریریں طبع نہیں ہوسکیں تو ہر نوع کی کوشش اور تدبیر اس کام میں صرف کرتے تھے کہ مطلوبہ مقاصد بہ طریقِ احسن اور بہ شرطِ حفظ مراتب حاصل ہو جائیں۔ دستِ قدرت نے اُن کے اخلاص میں بہت برکت دی، اس لیے نتائج حسبِ دل خواہ رہے۔

سید ذوالکفل بخاری کو قدرت نے دل ودماغ کی بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ اپنے خاندانی پس منظر کے اعتبار سے تعلق داری اور معرفتِ قدیمہ کے اکرام کے تقاضوں کو خوب سمجھتے تھے۔ اسی لیے باہمی دوریوں کو قربتوں میں تبدیل کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔ انھوں نے نثر میں جو کچھ لکھا وہ زیادہ تر کتابوں پر تبصروں، کالموں اور ادبی اور نیم سیاسی مضامین کی

صورت میں ہے۔ اُن کی روشنی میں دیکھیں تو اعتدال اور انصاف پسندی نیز حسنِ ادراک ان کی اوّلین خصوصیات قرار پاتی ہیں، جولوگ اُن کو قریب سے جانتے تھے اور اُن کی صلاحیتوں کا ادراک رکھتے تھے وہ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ اُن کا تحریری سرمایہ اُن کی حقیقی صلاحیتوں کا صرف ایک پرتَو ہے۔ لیکن جو کچھ ہے، اس کی قدر و قیمت کسی طرح کم نہیں، یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ انھوں نے اپنی جودتِ طبع سے اپنے ماحول کو خوب روشن کیا، یہ جوت جہاں جہاں پہنچی، ذہن وفکر کے اُجالے اُس کے ساتھ رہے۔ اُن کی وفات کے چند دن بعد ہی اتفاقاً دوستِ گرامی ڈاکٹر خورشید رضوی سے فون پر میری گفتگو رہی۔ میں نے غیر اختیاری طور پر اُن سے اس حادثۂ فاجعہ کا ذکر کیا، وہ بھی اس خبر سے ملول تھے۔ انھوں نے کہا کہ اگر چہ اُن کی صرف چند ہی ملاقاتیں سعودی عرب میں اُن سے رہیں لیکن وہ اُن کی طبعی خوبیوں سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ انھوں نے بتایا:

> ''سید ذوالکفل میرے ذرا سے کہنے پر کسی عربی رسالے میں شائع ہونے والے ایک مضمون کی فوٹو کاپی دینے کے لیے بہت دور سے اور ٹریفک کی دشواریوں کو عبور کر کے تشریف لاتے تھے۔ اور لگتا تھا کہ وہ کوشش کر کے وقت نکال کر صرف اس کام کے لیے آئے ہیں۔''

میں نے عرض کیا کہ وہ اس نیاز مند کے توسط سے ایک عرصے سے آپ کے ساتھ اخلاص اور محبت کا رشتہ استوار رکھتے تھے۔ البتہ اُن کے اس عمل کو اُن کے حسنِ کردار کی ایک ہلکی سی جھلک سمجھنا چاہیے۔ ابھی حال ہی میں جنابِ مستحسن خیال نے بتایا کہ اب کی بار پاکستان آئے تو اُن کو مجموعۂ شاعری مرتب کرنے کا مشورہ دیا اور ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان سے مشورہ اور اس نیاز مند سے (بقول اُن کے) رہنمائی حاصل کرنے کی بار بار تاکید کی۔ اپنے شاگرد اور رفیق عزیز الیاس میراں پوری کو بھی اُن کی تاکید رہی کہ راقم کے بعض طباعتی امور میں معاون رہیں۔ (اُن کے انتقال کی غم انگیز خبر بھی الیاس میراں پوری ہی نے فون پر دی تھی)۔

میرے بچوں کے لیے اُن کی محبت اور خیر طلبی مجھے بہت متاثر کرتی تھی۔ بعض اوقات انھیں کوئی مسئلہ بتا دینا کافی ہوتا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد پتا چلتا تھا کہ وہ اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکال چکے ہیں۔ ایسے اخلاص، ایسی خیر طلبی اور انسان دوستی کا عام طور پر پرچار تو کیا جاتا ہے لیکن اس کے عملی نمونے خال خال ہی ملتے ہیں۔ سید ذوالکفل بخاری ان خوبیوں کا ایک خوبصورت مرقع تھے اور اپنے اقران ومعاصرین کے لیے ہی نہیں، سب کے لیے ایک دلآویز نمونۂ عمل تھے۔ بلاشبہ اگر اُن کے برادرِ اکبر سید محمد کفیل بخاری صاحب نے سیاست، صحافت اور خطابت میں خاندان کا نام روشن کیا ہے، تو سید ذوالکفل بخاری علم وادب اور معنوی خوبیوں کے اعتبار سے فخرِ خاندان تھے۔ گو اُن کی آواز، اُن کا لہجہ ابھی تک کانوں کے پردوں سے ٹکرا رہے ہیں لیکن اُن کی بازیافت افسوس کہ اب ممکن نہیں۔ برسوں کے تعلق کے باوجود ایسا لگتا ہے کہ ''روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد'' لیکن وہ ہماری یادوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ ع　　رفتید، ولے نہ از دلِ ما

سلیم الغفاری
۱۲ صفر ۱۴۳۱ھ / ۲۸ جنوری ۲۰۱۰ء

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان

سید ذوالکفل بخاری زیست کا مجازی لباس جہان رنگ و بو میں چھوڑ کر عالم بقا کی طرف رخصت ہو گئے لیکن ذوالکفل بخاری اپنی گونا گوں خوبیوں کے طفیل بہت سے دلوں میں دیر تک زندہ رہیں گے۔ وہ جیتی جاگتی انسانی صفات کا حسین مرقع تھے گو عمر زیادہ نہیں پائی، یہی کوئی انتالیس سال لیکن اس مختصر عرصۂ حیات میں انھوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا اس کی رمز کو سمجھا اور شعور و آگہی کے ساتھ برتا۔ وہ جو میرؔ نے ایک بات اپنے لیے کہی تھی۔

خوش ہیں دیوانگیِ میرؔ سے سب
کیا جنوں کر گیا شعور سے وہ

وہی بات آج کے پر آشوب دور میں ذوالکفل بخاری کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔

عام طور پر رفتگاں کو اہل دنیا مادی رشتوں ناتوں اور دنیوی علائق کے حوالوں سے یاد کرتے ہیں اپنی ذات اور تعلقات کے آئینوں سے ان کا عکس دیکھتے اور تحریر و تقریر میں سب کو دکھاتے ہیں یہ سلسلے یہ حوالے بھی شخصیت سے وابستہ یادوں کو زندہ اور تازہ رکھنے کے ضمن میں اہمیت رکھتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ بڑے آدمی کا اصل حوالہ اس کے تصورات و خیالات اور کردار و عمل ہے۔ مرحوم کی زندہ افراد سے وابستہ یادیں دلوں میں رہتی ہیں لیکن تصورات اور کردار و عمل کا ایک قندیل ہے جسے وہ زندگی میں ہتھیلی پر لیے اردگرد کے اندھیروں کو کم کرتے رہتے ہیں اور وقت رخصت طاقِ زمانہ پر رکھ چلے جاتے ہیں۔

سید ذوالکفل بخاری نے جس گھرانے میں آنکھ کھولی، علم و عرفان اور بصیرت و آگہی کے چراغ ماحول کو پہلے ہی روشن کیے ہوئے تھے دین متین کے سانچے میں ڈھلے ہوئے جیتے جاگتے عملی مرقع گھر میں ہمہ وقت آنکھوں کے سامنے رہتے تھے۔ فیضانِ نظر، خداداد ذہانت و فطانت اور شفاف تعلیم و تربیت کے طفیل ایک ایسا ہشت پہلوی نگینہ وجود میں آ گیا، جس سے اعلیٰ انسانی اوصاف کی رنگا رنگ کرنیں پھوٹ رہی تھیں اور سب نے دیکھا کہ ذوالکفل بخاری نوعمری ہی میں فہم و فراست کے موتی بکھیر رہا تھا۔

مجھے یاد ہے نوجوان بخاری ابتدائی زمانۂ طالب علمی ہی میں علمی خزائن سے مالا مال تھا۔ میں اُنھیں دنوں اس کے انداز تکلم سے چونک گیا تھا کہ ایک گوہر یکتا ہاتھ آیا، اسے مزید اُجالنے نیز اُس کی آب و تاب سے میرے سمیت سب کو ضیا پانے کے مواقع ملیں گے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اُسے کچھ دے پایا البتہ اِس بات کے اعتراف سے خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ نوجوان ذوالکفل بخاری سے بہت کچھ روشنی حاصل کی۔ روشن اور زندہ خیالات و تصورات کا بیش بہا خزانہ جو اس کے رخصت ہو جانے کے بعد آج بھی میرے اندر کے جہان کو تابندہ رکھتا ہے۔ ایک نادر و نایاب خوبی ہمارے نوجوان میں یہ تھی کہ وہ ہر عمر اور ہر ذہنی و علمی سطح کے لوگوں کے ساتھ ان کی سطح و معیار کے مطابق گفتگو کرتا۔ جود و سخا کا وصف سادات کو ورثے میں منتقل ہوتا ہے۔ بارہا دیکھا گیا کہ سید ذوالکفل بخاری گھر سے نکلتا اور رستے میں جس بھی شناسا یا اجنبی سے ملاقات اور بات چیت ہوتی اس کے دل و دماغ کو روشن، توانا اور معطر خیالات سے عطر بیز کر دیتا۔ غرض وہ جہاں کہیں بھی جاتا اپنے حیات بخش اور حیات آموز تصورات کو بانٹتا چلا جاتا ہے۔

ذوالکفل بخاری دوست دار آدمی تھا۔ اس کا حلقۂ احباب بے حد وسیع تھا۔ ہر عمر، ہر نظریے اور ہر مسلک کے لوگ اس کے ساتھ دوستانہ تعلق میں خوشی محسوس کرتے۔ وہ صاحبانِ علم وکمال کی مجالس میں سنجیدہ مباحث میں بڑے علمی وقار کے ساتھ شریک ہوتا، محفل شعر وادب میں ادبی وفنی اور تنقیدی نکات پر نہایت بلیغ انداز میں اظہار خیال کرتا اور ہم چشموں اور یارانِ باصفا کے حلقے میں بزلہ سنجی، شوخی اور لطائف سے محفل کو زعفران زار بنادیتا۔ یقین جانیے ہم نے بڑے بڑے لطیفہ گوؤں، گفتار کی کی پھلجڑیاں بکھیرنے والوں اور کالم کا پیٹ بھرنے والوں کو ان کے سامنے دریوزہ گر پایا۔ خطابت بخاری کی گھٹی میں تھی۔ تقریر کرتے تو فصاحت و بلاغت کے دریا بہادیتے۔ تحریر میں علم ومطالعے کی جھلک ہر جملے اور فقرے میں نظر آتی۔ غرض تحریر وتقریر کا ایک ایسا پیرایہ ہوتا کہ میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔ بارہا دیکھا کہ مجلس میں ہر نظریے ہر مکتب فکر کے لوگ بیٹھے ہیں۔ ذوالکفل بخاری نے اپنا نکتۂ نظر اس قدر اثر آفریں انداز میں بیان کیا کہ سب نے ''آمنا وصدقنا'' کہا۔ وہ دوستوں کے دوست اور یاروں کے یار تھے لیکن دوستی یاری میں ہر خوب و ناخوب پر صاد نہیں کرتے تھے بلکہ حق بات برملا کہتے اور بڑے سے بڑے نظریاتی مخالف سے اپنا نکتۂ نظر بہت کچھ منوا لیتے۔

ملتان کے ادبی حلقوں میں ایک طویل عرصے تک ایک خاص ادبی تنقیدی انداز فکر ونظر کو پذیرائی حاصل رہی ہے۔ گزشتہ صدی کی نویں دہائی میں ایک دوسری آواز ''فاران اکادمی'' کے عنوان سے سنائی دی جہاں اغیار کے افکار وتخیل کی پیروی کے بجائے قومی وملی زاویۂ نگاہ اور ''پاکستانیت'' کو شعر وادب کا روحِ رواں مانا گیا۔ کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے یہ حقیقت ہے کہ فاران اکادمی نے ملتان کے ادبی افق پر گہرے اثرات رقم کیے اور نئے لکھاری پوری آب وتاب سے جگمگا رہے ہیں نئے لکھنے والوں میں خالد مسعود خان، منیر چودھری، وحید الرحمن خان، شعیب ودود، مختار پارس، خالد محمود سنجرانی، افتخار شفیع خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ذوالکفل بخاری اس قبیلہ شعر وسخن اور ادب وتنقید کے سرخیل تھے۔ انھوں نے نئے لکھنے والوں کی فکری وفنی تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔ یہ فیضان نظر ان کے رخصت ہوجانے کے بعد دیر تک ماحول میں ضیاء پاشی کرتا رہے گا۔ سید ذوالکفل بخاری رخصت ہوگئے لیکن ان کا باوقار اور محبت آمیز شگفتہ وشاداب سراپا بہت سے دلوں میں زندہ رہے گا۔ یہاں میں نے زیادہ تر فکری، علمی و ادبی تشخص اور کردار وعمل کا ذکر کیا ہے۔ شخصی اور ذاتی حوالے سے ان کے والدین، اعزہ واقارب، بزرگوں اور دوستوں کے دلوں اور دل آویز یادوں کے دیے روشن ہیں، ان کے بیان کے لیے دفتر درکار ہیں۔ وفات کی خبر سن کر دارِ بنی ہاشم گیا۔ والد محترم پروفیسر حافظ وکیل شاہ، بھائی سید محمد کفیل شاہ اور خانوادہ بنی ہاشم کے سب بزرگ وجواں صبر واستقامت کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ اس وقت پیغمبر اسلام سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ بار بار میرے دل ودماغ میں آرہے تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے فرزند حضرت ابراہیم کی وفات کے موقع پر ارشاد فرمائے تھے:

> آنکھیں آنسو بہارہی ہیں، دل غمزدہ ہورہا ہے لیکن منہ سے ہم وہی باتیں کہیں گے جن کو خدا پسند کرتا ہے۔'' ایک ایمان افروم اور قابل رشک روایت ذوالکفل بخاری کی وفات کے آخری لمحات کے حوالے سے پہنچی ہے وقتِ رخصت انھوں نے اپنا ہاتھ اوپر کرکے اور انگشت شہادت آسمان کی طرف بلند کرکے اونچی آواز میں کلمۂ شہادت پڑھا اس امر کی گواہی موقع پر موجود سعودی پولیس اہلکار نے دی اور درخواست کی کہ یہ شہادت پاکستان میں مرحوم کے والدین تک پہنچا دی جائے۔ سبحان اللہ ''یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا۔

(روزنامہ نوائے وقت ۲۴/نومبر ۲۰۰۹ء)

مانوس اجنبی

ڈاکٹر خورشید رضوی

اس بار جدہ میں قیام کے دوران ۹/ اکتوبر ۲۰۰۹ء کو اردو مرکز جدہ کے فعال رکن ڈاکٹر عرفان ہاشمی صاحب کے اصرار پر ان کے گھر اردو مرکز کے ایک مختصر اجلاس میں بطور مہمان مقرر حاضری کا موقع ملا۔ ''اقبال کے ہاں انسان بمقابلہ کائنات'' موضوعِ گفتگو تھا۔ گفتگو کے دوران اس روز کے پچیس تیس سامعین میں اکثر جانی پہچانی صورتوں میں ایک چہرہ میرے لیے اجنبی تھا۔ یہ چہرہ نوجوان نہ سہی، جوان ضرور تھا۔ گورا چٹا، سیاہ ریش کے حاشیے میں روشن روشن۔ مجھے تجسس ہوا کہ شعرو ادب کی محفل میں یہ مولوی صاحب کون ہیں؟ گفتگو کرتے کرتے جب اس چہرے پر نظر پڑتی تو اس سے پھوٹتی ہوئی ذہین مسکراہٹ اور چمکتی ہوئی فطین آنکھیں اس کے باذوق ہونے کی غمازی کرتیں۔ گفتگو سے فراغت ہوئی تو ایک مختصر سی شعری نشست کا آغاز ہوا اور جب اپنی باری پر ان باریک روشن لبوں سے آزاد نظمیں سنیں تو تجسس اور بڑھ گیا۔ مجلس برخاست ہوئی تو یہ تابناک چہرہ چل کر خود میرے پاس آ بیٹھا اور صاحب خانہ نے تعارف کراتے ہوئے کہا: ''یہ ہیں ذوالکفل بخاری، عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ کے نواسے۔''

ذوالکفل بخاری کا نام میرے لیے اجنبی نہ تھا۔ میرے مرحوم دوست عابد صدیق کا ملتان میں بہت عرصہ قیام رہا اور عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب کے گھرانے سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ عابد ہی کے ساتھ ایک بار عطاء المحسن شاہ صاحب سرگودھا میں میرے غریب خانے پر تشریف لائے تھے۔ اب عابد کا لائق فرزند حافظ صفوان محمد، شاہ جی کے خانوادے کی اگلی پیڑھی سے منسلک ہے۔ اگر پدر نتواند پسر تمام کند۔

حافظ صفوان محمد کے ذوالکفل سے بہت گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ چنانچہ اور بہت سے لوگوں کے علاوہ میں نے ذوالکفل کا غائبانہ تذکرہ صفوان سے متعدد بار سن رکھا تھا۔ برادرم زاہد منیر عامر بھی ذوالکفل کا ذکر کیا کرتے تھے۔ پھر مجھے یہ معلوم ہوا کہ ذوالکفل سعودی عرب چلے گئے ہیں۔ چنانچہ اس روز جب ان سے تعارف ہوا تو گویا ایک ''مانوس اجنبی'' سے ہوا جو میرے لیے محتاجِ تعارف نہ تھا۔

مجھے ذوالکفل سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور بہت جلد طبیعت ان سے ہم آہنگ ہوگئی۔ میرے شعری مجموعے امکان کا نسخہ اس وقت موجود تھا وہ میں نے ذوالکفل کو دیا۔ وہ بھی مجھ سے مل کر بہت خوش نظر آ رہے تھے کیونکہ بعض مشترک احباب کی وساطت سے وہ بھی غائبانہ مجھ سے اچھی طرح واقف تھے۔

اسی وقت مغرب کی اذان ہوگئی۔ ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں صفیں بچھا دی گئیں اور امامت کا قرعہ ذوالکفل

کے نام نکلا۔ میں نے بھی ان کی اقتدا میں نماز ادا کی۔ پھر چائے کا دور چلا۔ اور جب ہم ڈاکٹر صاحب کے گھر سے نکل کر سڑک پر ایک دوسرے سے رخصت ہونے والے تھے، ذوالکفل نے قریب آ کر مجھ سے پوچھا کہ خیبر میں جس مرحب سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مقابلہ ہوا تھا اُس کے نام کا تلفظ ''مَرْ حَبْ'' بلاتشدید ہے یا ''مُر حَّب'' تشدید حاء سے۔ میں نے پوچھا کہ مشدّد تلفظ کا گمان اُنھیں کیونکر ہوا؟ اُنھوں نے غالبًا رجز کے کسی مصرعے کے حوالے سے کہا کہ اُس میں شاید بلاتشدید وزن میں ٹھیک نہیں بیٹھتا۔ میں نے کہا کہ میرے ذہن میں تو بلاتشدید ہی ہے۔ اگر ہوسکے تو رجز کا وہ مصرع مجھے بتائیے۔ واپس آ کر میں نے غالبًا لسان العرب سے توثیق کر کے اپنے بیٹے عامر سے کہا کہ وہ ٹیلی فون پر ذوالکفل کو بتادیں کہ یہ نام ''مَرْ حَبْ'' بلاتشدید ہی ہے۔

ذوالکفل مکہ مکرمہ میں یونیورسٹی میں پڑھا رہے تھے۔ جدہ اُن کا آنا کبھی کبھار ہی ہوتا تھا۔ چنانچہ تقریبًا دو ماہ کے طویل قیام کے باوجود اُن سے جدہ میں دوبارہ ملاقات نہ ہوسکی۔ اِسی اثناء میں مجھے مدینہ منورہ حاضری دینے کے بعد، (وزٹ ویزہ رکھنے کے سبب) وہاں سے خیبر اور مدائنِ صالح جانے کا بھی اتفاق ہوا۔ اور جب میں واپس جدہ پہنچا تو شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی کی لائبریری جا کر مدائنِ صالح کے آثار کے بارے میں مختلف مآخذ سے مواد جمع کرنے کی دھن سی لگ گئی۔ جو جو حوالہ ملتا جاتا میں پرانے ریکارڈ سے اُس کی جستجو کرتا اور لائبریری کے ایک سینئر پاکستانی کارکن محمد رفیق صاحب کی وساطت سے مجھے عرب سٹاف کا بھی بے حد تعاون حاصل رہا۔ دیگر بہت سے مآخذ میں بکھرے ہوئے مضامین مجھے مل گئے اور اُن کا عکس بھی بنوا دیا گیا۔ مگر رسالہ العرب کا سارا ریکارڈ بار بار دیکھنے کے باوجود حمد الجاسر کا مضمون لیس الحجر مدائن صالح کا سراغ نہ مل سکا جو جولائی-اگست ۱۹۷۸ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ سوءِ اتفاق سے یہی شمارہ ریکارڈ سے غائب تھا۔ مجھے اِس مضمون کے دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ خیال آیا کہ مکہ یونیورسٹی کے کتب خانے میں بھی تو رسالہ العرب کا ریکارڈ موجود ہوگا۔ میں نے عامر سے کہا کہ ذوالکفل سے رابطہ کر کے اُنھیں اِس شمارے کی تفصیلات لکھوا دیں۔ ممکن ہے وہ اِسے تلاش کرسکیں۔

کچھ عرصے بعد جب میں پاکستان واپسی سے قبل اپنی اہلیہ کے ہمراہ حرم شریف میں حاضر ہوا تو ہم نے ایک رات وہیں فندق الکعکی میں گزاری جو بابِ عبدالعزیز سے نکل کر قریب ہی پیدل مسافت کی حد میں سڑک کے کنارے واقع ہے۔ ہماری واپسی نمازِ عصر کے معًا بعد ایک دوست کے ساتھ تھی۔ اور یہ طے تھا کہ حرم شریف میں نماز ادا کرنے کے بعد ہم تیزی سے ہوٹل پہنچیں اور لابی میں مستعد رہیں۔ وہ گاڑی لا کر سڑک کے کنارے بس ذرا دیر کو روک سکیں گے۔ ہم فی الفور سوار ہوجائیں تاکہ پولیس والے وہاں گاڑی کھڑی رکھنے پر مزاحم نہ ہوں۔ اِسی روز ظہر کے آس پاس عامر نے فون پر مجھے بتایا کہ ذوالکفل کا فون آیا تھا۔ اُنھوں نے وہ مضمون ڈھونڈ نکالا ہے اور اُس کا عکس بنوا کر لے آئے ہیں۔ اور جب میں نے بتایا کہ آپ مکہ مکرمہ ہی میں ہیں تو ذوالکفل خوش ہوئے اور کہا کہ واپسی سے قبل وہ آپ سے مل کر دستی طور پر یہ عکس آپ کے حوالے کردیں گے۔ میرا موبائل نمبر عامر نے ذوالکفل کو دے دیا تھا اور اُن کا نمبر مجھے بتا دیا تھا۔

یہ ۲۸/ اکتوبر ۲۰۰۹ء کی بات ہے۔ سعودی کیلنڈر کے حساب سے ذیقعدہ کی غالبًا ۹/ تاریخ تھی۔ حرم شریف میں حجاجِ کرام کا ہجوم خاصا بڑھ چکا تھا۔ نمازِ عصر بابِ عبدالعزیز کی جانب سے صحنِ مطاف میں اترنے والی سیڑھیوں سے پہلے ہی برآمدے کی صفوں میں ادا کی۔ عصر کے بعد ایک نمازِ جنازہ کا اعلان ہوا۔ اِس کی نیت باندھی تھی کہ میرا موبائل بجنا شروع ہوگیا۔

میں سمجھ گیا کہ یہ ذوالکفل کی کال ہے۔ سلام پھیرتے ہی اُن سے رابطہ کیا اور صورتِ حال بتائی کہ میں فی الفور ہوٹل جا رہا ہوں اور جس لمحے وہ دوست آ جائیں گے اُسی لمحے میرے لیے سوار ہو کر نکل جانا ضروری ہوگا۔ ذوالکفل نے کہا کہ وہ بہت جلد وہیں آ رہے ہیں اور روانگی سے قبل ضرور مجھ سے ملاقات کی کوشش کریں گے۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا ہوٹل پہنچا اور لابی میں اُن کا منتظر رہا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا ایک گونہ اضطراب پیدا ہو رہا تھا کہ کہیں ہمارے کرم فرما کی گاڑی ذوالکفل سے پہلے نہ آ جائے۔ میں نے بار بار لابی سے نکل کر سڑک پر نظر دوڑانا شروع کی۔ اچانک ایک گاڑی فٹ پاتھ کے برابر آ کر رکی۔ ایک نوجوان گاڑی چلا رہے تھے۔ وہ احتیاطاً اپنی نشست پر بیٹھے رہے اور وہیں سے ہاتھ ہلا کر مجھے سلام کیا۔ ذوالکفل برابر کی نشست سے مسکراتے ہوئے اترے اور آ کر مجھ سے ملے۔ مضمون کا عکس اُن کے ہاتھ میں تھا۔ وہ اُنھوں نے میرے حوالے کیا اور وہیں سڑک پر کھڑے کھڑے ہمارے درمیان مختصر سی گفتگو ہوئی۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ افسوس ہے اِس عاجلانہ ملاقات میں ہم اِتنا بھی نہیں کر سکتے کہ ایک پیالی چائے مل کر پی لیں۔ اُنھوں نے بڑی محبت کا اظہار کیا اور کہا کہ کل شام جدہ میں جو شام میرے ساتھ منائی جا رہی ہے اُس کی اطلاع اُنھیں مل گئی ہے اور وہ کوشش کریں گے کہ اِس میں شرکت کے لیے آئیں اور اطمینان سے ملاقات ہو سکے۔ افسوس کہ اُن کا یہ ارادہ پورا نہ ہو سکا۔

میں نے ذوالکفل کے دیے ہوئے مضمون کی پہلی قراءت جدہ واپسی کے دوران گاڑی میں ہی مکمل کر لی۔ اُن کے اِس اخلاص نے میرے دل میں گھر کر لیا اور میں آئندہ اُن سے بہت سی ملاقاتوں کی توقع دل میں لے کر پاکستان آ گیا۔ میں اُن سے ایک دلی تعلق محسوس کرنے لگا تھا۔ مگر اِس تعلق کی شدت کا صحیح اندازہ مجھے ۱۵/ نومبر ۲۰۰۹ء کو اُس وقت ہوا جب عامر نے اچانک جدہ سے فون کر کے مجھے ذوالکفل کی وفات کی اطلاع دی۔ ظاہر ہے میں کسی طرح اِس خبر کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے بوکھلا کر پوچھا ''کیوں، کیا ہوا، کیا دل کا عارضہ تھا؟'' عامر نے کہا ''نہیں۔ پولیس کی ایک تیز رفتار گاڑی اُن کی گاڑی سے ٹکرا گئی۔'' انا للہ وانا الیہ راجعون۔ طبیعت سناٹے میں آ گئی۔ یوں تو وفات کی ہر خبر دل پر کچھ نہ کچھ اثر چھوڑتی ہے مگر ذوالکفل کی وفات سے جیسے ذاتی نقصان کا احساس ہوا اُس سے پہلے صرف ہندوستان کے بے مثال غزل گو جناب عرفان صدیقی کی رحلت پر ہوا تھا اور عجیب اتفاق ہے کہ اُن سے بھی میری ملاقات نہایت مختصر تھی۔ ذوالکفل کی ذات اُس پھوٹتے ہوئے بیج کے مانند تھی جس میں امکانات کا ایک تناور درخت سانس لے رہا تھا۔ یہ سب روشن روشن امکانات اُس روشن روشن چہرے کے ساتھ ہی بجھ گئے۔

اِس سانحے کی جانکاہ خبر سننے کے بعد میں نے پہلا فون حافظ صفوان کو کیا اور چند ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں اُس کے غم میں شرکت کی جو یقیناً مجھ سے بہت زیادہ تھا کہ صفوان اور ذوالکفل تو گویا یک جان و دو قالب تھے۔ بعد ازاں صفوان نے مجھے مزید تفصیلات اگلے روز تک بتائیں کہ ۱۶/ نومبر کو نمازِ فجر کے بعد حرم شریف میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور جنت المعلیٰ کے پرانے قبرستان میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی پائنتی کی جانب جگہ ملی۔

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

ذوالکفل نے ام القریٰ میں جان جانِ آفریں کے سپرد کی اور ام المومنین رضی اللہ عنہا کے قدموں میں جگہ پائی۔ سب جانتے ہیں ماں کے قدموں میں کیا ہوتا ہے۔

ایک عالی دماغ تھا نہ رہا

محمد عبداللطیف الفت

رات کے گیارہ بجے تھے کہ میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی اس لیے کہ میرے اعزہ و احباب جانتے ہیں کہ میں دل کا مریض ہوں اور جلد سو جاتا ہوں اِس لیے اِس وقت مجھے کوئی فون نہیں کرتا۔ فون کی آواز سن کر جاگا تو دوسرے سِرے پر سید محمد کفیل بخاری کی آواز سنائی دی۔ سید کفیل بالخصوص اِس ناوقت فون نہیں کرتے۔ میرا ماتھا ٹھنکا کہ خیریت نہیں ہے۔ میرے استفسار پر پورے سکون اور باوقار طریقہ سے اُنھوں نے وہ خبر سنائی جو میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ اُنھوں نے میری بات اپنے والدِ محترم حافظ سید وکیل شاہ سے بھی کرائی۔ اُن کے لہجے میں بھی کوئی اضطراری کیفیت محسوس نہ ہوئی۔ بلکہ دونوں حضرات صبر و استقامت کی چٹان نظر آئے۔ اپنے جوان بیٹے اور بھائی کی حادثاتی اور ناگہانی موت پر اُن کا صبر و سکون مثالی تھا۔ انیس کا مصرع زبان پر آ گیا۔

دل صاحبِ اولاد سے انصاف طلب ہے

سید محمد ذوالکفل بخاری، حضرت امیر شریعت کا نواسہ، بنتِ امیر شریعت کا نورِ نظر اور میرے عزیز و محترم بھائی حافظ سید محمد وکیل شاہ کا لختِ جگر ہی نہ تھا، علم و ادب کے افق پر ایک روشن ستارہ، صاحب قلم، دردِ دل رکھنے والا نوجوان، اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عشق و محبت سے سرشار دانشور، غرضیکہ ایک ہمہ صفت موصوف انسان تھا۔

مجھ سے آدھی عمر کا تھا لیکن اپنی ان گنت خوبیوں کی بنا پر اُس نے میرے دل میں اپنا ایک خاص مقام بنالیا تھا۔ اُس کی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے میرے دل میں اُس کے لیے غیر معمولی قدر و منزلت تھی۔ ذہانت اور فطانت کا پیکر ہونے کے باوجود اُس میں ایک انکساری اور تعلقات کے ضمن میں وضعداری تھی۔ وہ جب بھی اسلام آباد آتا تو ایک دن مجھ ایسے گوشہ نشین اور علمی بے بضاعتی کے مظہر کے ساتھ ضرور گزارتا۔ دنیا کے ہر موضوع پر بات ہوتی۔ میں اس کی معلومات کی وسعت، شعر و ادب کے جدید رجحانات پر اس کی دسترس، پاکستان کے سیاسی، علمی اور ادبی حلقوں کی سرگرمیوں سے مکمل واقفیت پر حیران رہ جاتا۔ وہ چند لمحے جو اس کی معیت میں بسر ہوتے ایک عرصے تک مجھے سرشار رکھتے۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ وہ اسلام آباد آیا اور مجھ سے رابطہ نہ کرسکا۔ ملتان پہنچ کر اس نے معذرت کا فون کیا اور ایسے پرخلوص لہجے میں معافی مانگی کہ میں شرمندہ ہوگیا۔

وہ جس حلقہ سے تعلق رکھتا تھا اس کے نفوس شعلہ بجاں اور شعلہ بیان ہوتے ہیں لیکن ذوالکفل ایک شبنمی طبیعت اور دھیمے مزاج کا نوجوان تھا۔ متعدد معاملات پر اُس کی رائے مجھ سے مختلف ہوتی، لیکن اُس کا حفظِ مراتب کا احساس اتنا قوی تھا کہ

اُس نے کبھی سر اُٹھا کر یا بلند لہجے میں اختلاف کا اظہار نہیں کیا بلکہ بہت آہستگی سے نرم سے نرم الفاظ میں اپنا نقطۂ نظر بیان کر دیتا تھا۔

اس کی شخصیت کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ اس کے اندر کسی بڑی سے بڑی ہستی یا کسی سکۂ رائج الوقت نظریے کے بارے میں کسی قسم کی مرعوبیت یا احساسِ کمتری کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا تھا۔ اپنے مسلک کی پختگی اور صلابت پر چٹان کی طرح مستحکم لیکن دوسروں کے معتقدات اور نظریات کے بارے میں وسیع القلبی اُس کا خاصا تھا، یعنی نرم دمِ گفتگو اور گرم دمِ جستجو۔

زبان و بیان پر اس کی دسترس اور اپنے خیالات کو مستحکم استدلال کے ساتھ پیش کرنے کی بے پناہ صلاحیت کا مظاہرہ جو پہلے میرے علم میں آیا، اُس کا وہ کالم تھا جو اُس نے نوائے وقت میں الطاف گوہر مرحوم کے ایک کالم کے جواب میں لکھا۔ کئی برسوں پہلے کی بات ہے الطاف گوہر نے اپنے ممدوح نواب کالا باغ کے بارے توصیفی کلمات لکھتے ہوئے حضرت امیر شریعتؒ کے بارے میں کچھ متنازع باتیں لکھ دیں۔ ذوالکفل مرحوم نے جو اس وقت اور بھی کم عمر تھا اُس کے جواب میں دندان شکن مضمون لکھا۔ اُس کا یہ مضمون اپنی معنویت، قطعیت اور بھرپور استدلال کے لحاظ سے اُس پختہ کار، مسلّم دانشور اور اپنے وقت کے بلند پایہ ادیب سے کہیں آگے نکل گیا۔ میں نے اُس کی نقول گوہر صاحب کے کالم سمیت متعدد ادبی اور سیاسی ذوق رکھنے والے احباب میں تقسیم کیں۔ سبھی نے میرے جائزہ کی تائید کی۔ افسوس اُس کی تخلیقی صلاحیتوں کا بھرپور اظہار نہ ہوسکا اور موت نے ایک نابغہ کو چھین لیا۔ خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود۔

مولانا محمد علی جوہر مرحوم جیل میں تھے جب اُنھیں اپنی چہیتی بیٹی کی شدید علالت کی خبر ملی۔ اِس پیکرِ صبر و رضا نے ایک نظم کہی جس میں اُس کی صحت کی دعا تھی، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا:

تیری صحت ہمیں منظور ہے لیکن واللہ
اُس کو منظور نہیں تو ہم کو بھی منظور نہیں

لیکن اللہ کی رضا پر راضی ہونے والے اس کوہِ استقامت کو جب اپنے نائب اور کامریڈ کے ایڈیٹر، انگریزی کے بلند پایہ انشا پرداز راجہ غلام حسین کی جوانا مرگی کی خبر ملی تو صبر کے بند ٹوٹ گئے۔ نظم اُس کی موت پر بھی کہی لیکن یہ کہنے پر مجبور ہوگئے:

ابھی مرتا نہ تھا غلام حسین
اور کچھ دن ابھی جیے ہوتے

یہ گنہ گار بھی خانوادۂ بخاری کی طرح اللہ کی رضا پر راضی ہے لیکن یہ کہنے پر مجبور ہے:

ذوالکفل! تمھیں ابھی مرنا نہ چاہیے تھا

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

پروفیسر خالد شبیر احمد

سید ذوالکفل بخاریؒ کا سانحۂ ارتحال صرف امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے خاندان کے لیے ہی ایک عظیم صدمہ نہیں ہے بلکہ پاکستان کے دینی اور ادبی حلقوں کے لیے بھی ایک ایسا صدمہ ہے کہ جسے لفظوں میں بیان کرنا انتہائی مشکل ہے۔ان کی خداداد صلاحیتوں کا ادراک میرے جیسے کم علم انسان کے لیے تو سرے سے ممکن ہی نہیں ہے۔مرحوم و مغفور ہر حوالے سے ایک گوہر یکتا تھے۔انھیں زہد و تقویٰ کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس قحط الرجال کے دور میں ان جیسا دوسرا نظر نہیں آتا اور اگر علم و ادب کے حوالے سے ان کی شخصیت کا جائزہ لیا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے علمی اور ادبی حلقوں میں اتنی کم عمر میں وہ مقام و مرتبہ حاصل کرلیا تھا کہ بڑے بڑوں کو مدتِ بسیار کے بعد بھی ایسا مقام حاصل نہیں ہوتا۔مزاج میں شائستگی، گفتار میں مٹھاس، انتہائی ملنسار، انسانی اوصاف سے متصف جہاں بیٹھتے لوگوں کا دل موہ لیتے تھے۔اللہ تعالیٰ نے انھیں فکر و دانش کی صلاحیتیں وافر عطا کر رکھی تھیں۔اس پر خاندانی نسبت اور تربیت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور وہ انتہائی کم عمری میں اہل نظر کی آنکھوں کا ستارہ بن گئے۔اس لیے بھی کہ خداوند کریم نے انھیں حسنِ اخلاص، حسنِ کردار و عمل اور حسنِ افکار کے حوالے سے دینی اور علمی حلقوں سے تعلق رکھنے والے ہر فرد کے لیے لائقِ تقلید و اتباع بنانے کی ہر خوبی سے نواز رکھا تھا اور اس کے ساتھ نیکی اور پارسائی میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھے۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا زہد و تقویٰ کس قدر قبولیت کا شرف حاصل کر چکا تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ موت مکہ معظّمہ کی مقدس سرزمین پر آئی۔حرم کعبہ میں لاکھوں فرزندانِ توحید نے ان کے جنازے میں شرکت کی اور جنت المعلیٰ میں امّ المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے قدموں میں دفن ہوئے۔جب کہ وقتِ آخر کلمۂ شہادت ان کے لبوں پر تھا۔

> مولانا حبیب الرحمٰن ہاشمی صاحب نے اپنے مضمون میں سید ذوالکفلؒ کے بارے میں بجا تحریر فرمایا ہے کہ:
> اساتذہ کے سیکڑوں اشعار نوک زباں تھے۔موقع محل کی مناسبت سے یوں جڑتے جیسے انگوٹھی میں نگینہ اور پھر اپنی ذہین اور چمکدار نگاہیں مخاطب پر گاڑ دیتے اور داد طلب ہوتے۔ان کی معیت میں دسیوں سفر ہوئے اس بار خانقاہ سراجیہ ہم دونوں گئے۔تمام راستے مختلف موضوعات پر بات ہوتی رہی۔وہاں مخدوم زادہ گرامی مولانا عزیز احمد سے طویل گفتگو ہوئی۔خوب مجلس جمی۔یہاں یہ بلبلِ ہزار داستاں طوطیٔ شیریں مقال احتیاط و احترام کے دائرے میں محصور ہوجاتا۔صاحبزادگان بھی بہت احترام سے پیش آتے۔بڑی قدر فرماتے۔حضرت والا

کی مجلس میں تمام تر توجہ سمیٹ لیتے۔ حضرت کی نگاہِ التفات شاہ جی پر پڑتی اور خوب پڑتی۔

اس کے ساتھی کا یہ اقتباس اس بات کی مکمل گواہی دے رہا ہے کہ ذوالکفل بخاری اپنے پیر و مرشد کی خانقاہ میں بھی انتہائی احترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو ادب واحترام کے دائرے میں ہی محصور رکھتے۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ روحانی تعلق اگر مضبوط و مستحکم ہو تو تبھی یہ خوبی پیدا ہوتی ہے۔ ورنہ نہیں۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے مثالی خاندان کا مثالی فرد دنیا سے رخصت ہوا تو ہر دل غمزدہ اور ہر آنکھ اشکبار ہوگئی۔ خود میں نے جب یہ خبر رات کے ۹ بجے سنی تو مجھ پر کیا کیفیت طاری ہوئی بیان سے باہر ہے۔ کیفیت نام ہی ایسی حالت کا ہے جو بیان نہ کی جا سکے۔ میں فوراً سوچنے لگ گیا کہ کس سے رابطہ کروں اور اسے کیا کہوں کہ یہ سب کچھ کیسے ہوگیا۔ ایک ہی خیال دل ودماغ پر مسلط ہو کہ رہ گیا کہ کفیل شاہ، ان کے والد محترم پروفیسر وکیل شاہ صاحب اور حضرت پیر جی کا سامنا کیسے کر پاؤں گا۔ وہ انتہائی افسردہ اور غمگین ہوں گے۔ کن الفاظ سے میں تعزیت کروں گا۔ دوسرے روز جب میں دارِ بنی ہاشم اپنے چھوٹے بھائی نصیر کے ساتھ پہنچا تو یہی صورت حال تھی کہ **انا للّٰہ وانا الیہ راجعون** کے سوا کچھ بھی نہ کہہ پایا۔ الفاظِ تعزیت زبان سے ادا نہ ہو سکے جیسے منہ میں ہی منجمد ہو کے رہ گئے ہوں۔ لوگوں کا ہجوم سید وکیل شاہ صاحب کے اردگرد چارپائیوں پر بیٹھا غم واندوہ میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا۔ سوگوار فضا نے ہر ایک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ وکیل شاہ صاحب صبر واستقامت کا پہاڑ بنے بیٹھے تھے۔ ادھر پیر جی سید عطاء المہیمن بخاری شاہ صاحب آنے والوں کو صبر وتحمل کی تلقین کرتے نظر آئے۔ ان کے لبوں پر ''الحمد اللہ اور اللہ کا احسان ہے'' کے سوا کچھ نہ تھا رونے والوں کی خود ڈھارس بندھاتے اور میں یہ دیکھ کر سوچنے لگا کہ اس خاندان پر اللہ تعالیٰ کا کتنا فضل وکرم ہے کہ اتنے بڑے حادثے اور سانحے پر بھی شرعی حدود سے تجاوز کہیں نظر نہیں آتا۔

امیر شریعتؒ کے اس خاندان سے دیرینہ تعلق خاطر ہے اور اسی تعلق کی بنیاد پر میں نے ان کی ہر خوشی اور ہر غمی میں شرکت کی ہے۔ دیکھا تو یہی دیکھا، کہ یہ لوگ نہ ہی خوشی کے موقع پر شرعی حدود کو توڑتے ہیں اور نہ ہی غم کے موقع پر۔ حالانکہ ہمارے معاشرے میں یہی دو مواقع ایسے ہوتے ہیں کہ لوگ جذباتی ہو کر شرعی حدود کو پھلانگ جاتے ہیں لیکن اس خاندان میں مجھے ایسا نظر نہیں۔ خوشی اور غمی کے ایسے ماحول میں مجھے ہر مرتبہ ایمان کی تازگی حاصل ہوئی۔ راضی بہ رضائے الٰہی منہ سے کہہ لینا آسان سی بات ہے لیکن عملاً اس کا مظاہرہ کرنا ایک بہت مشکل امر ہے۔ لیکن اس خاندان کے لیے کوئی مشکل بات نہیں۔

صبر کی عملی تصویر مجھے اسی خاندان کے انھی مواقع پر نظر آئی اور یہ خوبی اس خاندان کا ایک ایسا امتیازی وصف ہے جو آپ کو ہمارے معاشرے کے دوسرے خاندانوں میں بہت کم نظر آئے گا۔ شاید اس لیے بھی کہ دینی حوالے سے یہ خاندان قائدانہ صلاحیتوں سے پہچانا جاتا ہے اور قیادت کا فرض ہے کہ وہ دوسروں کے لیے اپنے عمل سے ہر معاملے میں ایک مثال بن کے نظر آئے تا کہ اس طرز عمل کی تقلید کے لیے دوسروں میں حوصلہ پیدا ہو۔

پھر یہ خوبی بھی دیکھنے میں آئی کہ کفیل شاہ صاحب کبھی کبھی شدتِ غم سے اشکبار ہو جاتے اور پھر سنبھل بھی جاتے اور آنے والے مہمانوں کی مہمان نوازی میں مصروف ہو جاتے۔ سارے انتظام انھی کے ہاتھ میں تھے۔ ادھر وہ اتنے بڑے صدمے کے باوجود بطور میزبان اپنے فرائض سے غافل نہ تھے۔

مجھے سید ذوالکفل بخاریؒ کے پاس بیٹھنے کا موقع بہت کم میسر آیا۔ مرحوم ۱۹۶۹ء میں پیدا ہوئے اور میں مارچ ۱۹۶۹ء کو گورنمنٹ کالج سول لائنز سے تبدیل ہو کر ایس۔ ای کالج بہاول پور چلا گیا تھا۔ بہاول پور سے ملتان کئی مرتبہ آنا جانا رہا۔ لیکن معمول کے مطابق سید ابوذر بخاریؒ، سید عطاء المحسن بخاریؒ کی محفلوں سے ہی فیض یاب ہوتا رہا۔ کفیل شاہ صاحب بھی ان دنوں اپنے گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ مدرسہ خیر المدارس میں تعلیم حاصل کر رہے تھے اور وہیں پر ایک کرائے کے مکان میں رہائش پذیر تھے۔

سید ذوالکفل بخاریؒ ان دنوں اپنی والدہ ماجدہ کی گود میں ہوں گے۔ جب وہ زیورِ تعلیم سے آراستہ ہو کر عملی زندگی میں آئے تو میں ان دنوں فیصل آباد گورنمنٹ کالج جا چکا تھا۔ اس طرح میں ان کی صحبتوں سے محروم رہا۔ حالانکہ میں وہ خوش قسمت فرد ہوں جسے امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ سمیت ان کے خاندان کے ہر فرد سے بھرپور فیض حاصل کرنے کا موقعہ میسر آیا۔ اس پر میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ وہ سب کچھ جو ایک انسان میں کم از کم ہونا چاہیے اسی خاندان کی عطا ہے۔

بہرحال ملتان میں سید ذوالکفل بخاریؒ سے بھی ملاقات ہوجاتی تھی اور جب میری ادنیٰ سی ادبی کاوش خواب خواب روشنی منصۂ شہود پر آئی تو اس کی تقریب رونمائی جس کا اہتمام گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں ہوا مہمان خصوصی کے لیے میری نظر سید ذوالکفل پر پڑی انھوں نے کمال مہربانی سے میری درخواست کو قبول کرلیا۔ اور تشریف لائے، پروفیسر تاثیر وجدان ان کے ہمراہ تھے اور وہ اس تقریب رونمائی کے صدر تھے۔ انھوں نے بڑے خوبصورت انداز میں میری غزلوں کے اس مجموعے پر اپنے تاثرات بیان کیے۔ جو میرے لیے سب کچھ تھا۔ اس کے بعد ایک مرتبہ مجھے فاران اکادمی میں بھی لے گئے اور وہاں ایک مشاعرے میں مجھے بطور صدر اپنا کلام سنانے کا موقع ملا۔

ان کی موت پر جس طرح اہل علم حضرات نے اپنے تاثرات قلمبند کرائے ہیں۔ ان سے بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ اس موت کا صدمہ ان کے خاندان کو ہی نہیں اور یہ نقصان صرف ان کے خاندان کا ہی نہیں پورے معاشرے کا ہے اور خاص طور پر علم و ادب کے پرستار لوگ جو اس موت پر نوحہ خواں نظر آئے ہیں۔ اس بات کی ایک بیّن دلیل ہے کہ وہ ایک بہت بڑے انسان، علم دوست، فہم و فراست کا استعارہ، علمیت و شعریت کا نقطہ کمال، فکر و دانش، تحقیق و تجسس اور زہد و تقویٰ کی خوبصورت تصویر تھے۔ جو ہمارے درمیان نہ رہے۔ انھوں نے اپنے علمی و ادبی دوستوں کے دلوں میں جو مقام پیدا کرلیا تھا۔ وہ مقام ان کے دلوں میں زندہ رہے گا اور وہ ان کی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے انھیں سراہتے رہیں گے اور آنے والی نسلوں کو ان سے متعارف کراتے رہیں گے کہ یہی ان کا ہم سب پر حق ہے اور وہ اس کے ہر حوالے سے مستحق بھی ہیں۔ ایسے لوگ صرف آنکھ سے اوجھل ہوتے ہیں مرتے نہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

مرجھا گیا بہار میں کیوں گلشنِ خیال

ڈاکٹر مختار ظفر

ذوالکفل بخاری، جواں سال فراست، علمیت، شعریت اور خوبصورت سوچ کا نام ہے۔ اس کی دور اندیشی اور دور نگاہی حیرت انگیز تھی۔ جس شعری موضوع اور علمی مسئلے پر بات کرتا، اس کے پیچ وخم کو جس طرح سمجھتا اور ان کو سلجھانے کے لیے جو راہیں بتاتا، وہ عمومی فہم سے بالا ہوتی تھیں۔ مطالعہ وسیع، یادداشت تیز، تجزیہ گہرا اور تبصرہ Dimentional۔ فی الواقع وہ اپنے نانا کی دینی فراست اور علمی نجابت کا وارث تھا۔ اس کی بے وقت حادثاتی موت پر غالبؔ کا یہ مصرعہ بار بار آتا ہے:

کیا تیرا بگڑا جو نہ مرتا کوئی دن اور

اُس سے میرا پہلا تعارف ان کے بڑے ماموں ابوذر بخاری مرحوم کے ہاں ہوا تھا۔ میں حافظ وکیل شاہ کے ہمراہ حضرت سے ملنے اور علامہ طالوت کے سلسلے کچھ معلومات لینے کے لیے حاضر ہوا تھا۔ وہیں یہ نوجوان سا لڑکا ملا۔ ذوالکفل نام بتایا۔ میں اُس کا پیغمبری نام سن کر چونکا۔ جب اُس نے مولانا ابوالکلام آزادؒ کے بارے میں بھی کچھ ذکر کیا تو میں ذہنی طور پر مستقبل میں اُس کے علمی و ادبی کردار کو Visualize کرتا رہا۔

میں اپنی کالج سروس کے آغاز میں کچھ عرصہ تک اردو اکادمی کی محفلوں میں شریک ہوتا رہا۔ مگر گھر میں رہنے کی عادت اور محفلوں میں شرکت سے طبعی گریز کی وجہ سے اِس سلسلے کو قائم نہ رکھ سکا۔ یہ ذوالکفل اور وحید الرحمٰن خاں تھے جنھوں نے مجھے فاران اکادمی کی مجالس میں شرکت کی تحریک دی۔ اور پھر میں نے انہی کے کہنے پر فاران کے پلیٹ فارم پر، اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر معین نظامی کے شعری مجموعے تجسیم کی تقریبِ رونمائی میں پہلی دفعہ شریک ہو کر اس پر تبصرہ پڑھا تھا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ آخری کتاب جو اُس نے تنقید و تبصرہ کے لیے مجھے دی تھی وہ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے سوانح و افکار پر مبنی اُن کی والدہ محترمہ کی تصنیف سیّدی وَ اَبی تھی۔ میں نے حسبِ معمول اُس کی خواہش کا احترام کرنے میں دیر نہ کی۔ اس کے بعد صرف ایک دفعہ ملاقات ہوئی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں آج ادبی منظر نامے پر جس طرح متحرک ہوں، اُس میں اِس عزیز القدر کا خاص کردار ہے۔ اُس کو یاد کر کے دل بہت دکھتا ہے۔ خدا اُسے جنت الفردوس میں مقامِ اعلیٰ عنایت کرے۔ سچ ہے:

سرِ آبِ رواں کس کو بقا ہے
اٹھایا جس نے سر، اِک بلبلہ ہے
بساطِ جہاں کی ہے اتنی کہانی
کہ اللہ باقی ہے، باقی ہے فانی

ذوالکفل بخاری کی نظمیں: فکر وجذبہ کا امتزاج

پروفیسر انور جمال

اردو نظم اپنے اسالیب کے اعتبار سے ایک گلشنِ ہشت رنگ ہے۔ مغربی دریچوں کی تازہ ترین فکری ہواؤں نے اس چمنستان کے غنچوں، شگوفوں کو ہمیشہ تازہ دم رکھا۔ آزاد نظم کے امکانات اس قدر زیادہ ہیں کہ شاعر اپنی شعور کی رَو Stream of Consciousness کے بہاؤ میں ایک جہانِ نو آباد کرتا ہے۔

ذوالکفل بخاری کی نظموں میں ''رُودِ شعور'' اپنی پوری توانائی سے رواں نظر آتی ہے۔ ذوالکفل بخاری کا نسبی سلسلہ ایک شگفتہ علمی وادبی خاندان سے منسلک ہے۔ لہٰذا اس کی شعری کائنات میں ''فکر'' بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ یہاں مشاہدہ تخلیقی تجربہ میں ڈھلنے سے پہلے ہی گہری فکر کی فسانِ تیز کے سامنے حاضر ہوتا ہے۔ فکر وتجربے کی اس کڑی اور نسبتاً دشوار گزار واردات کے بعد وہ تخلیق کی سطح کو چھوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ نظموں کا تانا بانا اس انداز سے بُنا گیا ہے کہ جذبہ، فکر کا پیرو کار ہے۔ گویا قاری پہلے شاعر کی فکری سطح سے ملاقات کر کے جذبے کی شدت تک پہنچ پاتا ہے۔ یوں ذوالکفل کی نظموں کے Thesis کی تفہیم ایک ہی قرأت میں قاری کے بس کی بات نہیں بلکہ نظم پاروں کے معنوی بطون میں اترنے کے لیے قاری کو ایک حسّی نردبان کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی ایک عمدہ شاعری کی پہچان بھی ہے کہ نظم کے ظواہر کی نسبت Beyond میں معنی کی ایک اور سطح بھی موجود ہو۔ ورنہ شاعری ایک Statmental رخ سے اوپر نہیں اٹھتی۔ یہاں میری مراد محض دوراز کار علامت کی نمائش گری نہیں بلکہ تخلیقی جذبے کی تپش اور فکری اُپج کے امتزاج سے ہی آرٹ کا انگبینِ تازہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ذوالکفل بخاری کی نظمیں کتبہ ، آپ سے آپ ، مجھے محسوس ہوتا ہے ، معلوم نہ معلوم اس نوع کی نظمیں ہیں جن میں جذبہ اور فکر باہم اس طرح گھلے ملے ہوئے ہیں کہ معنی کا ایک نیا غرفہ کھلا محسوس ہوتا ہے۔ نظموں کے درج ذیل ٹکڑے اس بات کی شہادت دیں گے:

پُر تحیرّ روشنی کی اَن چھوئی ٹھنڈک کا پیاسا
صد ہزاراں سال کی تشنہ دہانی لے گیا
روشنی باطن کی، آنکھوں کی چمک
دوپہر کی دھوپ سی اُجلی جوانی لے گیا
(کتبہ)

تمام باتیں
ادھورے پن کی صلیب پر خود سے سج گئی ہیں
پر اُن میں لذّاتِ نو بہ نو کی
ہزار دنیائیں اب نہیں ہیں
نہ مشغلے ہیں، نہ اشقلے ہیں
نہ ویسی باتیں اِدھر اُدھر کی!

(آپ سے آپ)

مجھے معلوم ہے
اک عمر اب بھی انت کو آواز دیتی ہے
مگر اس خام خواہش، حسرت بے جا کی بستی میں
ہٹیلے اور ضدی سبزۂ نوعمر کے ہر ایک باز یچے
گل و برگ و نہال و نخل کے اک ایک کوچے میں
ہزاروں شبنمی پیکر
فنا انجام ہو جانے سے بچنے کے جنون و خبط میں
خیل سواران عدم آباد کے پاؤں پکڑتے ہیں

(معلوم، نامعلوم)

ذوالکفل نے مقدار Quantity کے لحاظ سے بہت کم لکھا ہے لیکن وارداتِ فکر و جذبہ کے بغیر قلم نہیں اٹھایا، کیونکہ سچ وہیں سے جنم لیتا ہے جہاں جھوٹ کی توانائی ختم ہو جاتی ہے۔

(۶/ستمبر ۲۰۰۹ء)

تابوت

محمد اظہار الحق

یہ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں میری مزدوری کی نوعیت ایسی تھی کہ ملک کے مختلف حصوں میں جانا پڑتا تھا۔ ان میں ملتان بھی شامل تھا۔ ایک بار وہاں پہنچا تو دوست دیرینہ خالد مسعود خان کو فون کیا اور بتایا کہ کہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ شام کو خالد مسعود آئے تو ان کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا۔ جو وضع قطع، لباس اور شرعی داڑھی میں کسی مسجد کا امام لگتا تھا لیکن جب گفتگو شروع ہوئی تو مجھے محسوس ہوا کہ میرا اندازہ نہ صرف غلط بلکہ احمقانہ تھا۔ مولوی نما نوجوان نہ صرف انگریزی زبان وادب کا پروفیسر تھا۔ بلکہ انگریزی اور اردو ادب کا ذوق بھی رکھتا تھا۔ اعلیٰ درجے کا ذوق! گفتگو ساری سہ پہر اور پھر شام گئے تک جاری رہی اور جب وہ رخصت ہوا تو میں اسے یوں ملا جیسے ایک مرید، اپنے شیخ کو ملتا ہے۔

سید ذوالکفل بخاری سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد معمول یہ ہوگیا کہ جب بھی میں گردو گرما گداو گورستان کے شہر ملتان پہنچتا تو مزدوری کی مکروہات سے فارغ ہوتے ہی ذوالکفل بخاری کے گھر کا رخ کرتا۔ کھانا بھی وہیں کھاتا، چائے بھی وہیں پیتا اور بار بار پیتا اور شہر بھر کے ادیبوں، شاعروں اور اہل علم سے بھی وہیں ملاقات ہوتی۔ ذوالکفل سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا نواسہ تھا۔ میں نے جب آنکھ کھولی تو ہمارے گھر میں کئی دوسرے ادبی اور سیاسی جرائد کے ساتھ ساتھ چٹان کا بھی غلغلہ تھا۔ والد گرامیؒ چٹان کی فائلیں سنبھال کر رکھتے جو آج ان کی رحلت کے بعد بھی موجود ہیں۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ چٹان پڑھنے والے اور شورش کاشمیری سے تعلق رکھنے والے کو عطاء اللہ شاہ بخاری کے مقام اور مرتبے کا اندازہ نہ ہو۔ کسے معلوم تھا کہ بچپن میں چٹان سے عطاء اللہ شاہ بخاری اور دوسرے احراری رہنماؤں کی تصویریں کاٹ کاٹ کر البم بنانے والا بچہ جب بڑا ہوگا تو ملتان میں واقع ''دار بنی ہاشم'' اس کے لیے اپنا دروازہ، شفیق بازوؤں کی طرح وا رکھے گا۔ شاہ صاحب کے صاحبزادے، یعنی ذوالکفل کے ماموں بھی ہماری ادبی تقاریب میں شریک ہوتے اور یوں مجھے ان کی زیارت کے متعدد مواقع ملے۔ دنیا میں انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جسے مل کر آپ کو کوئی اشتباہ نہیں رہتا کہ یہ شخص جعلی ہے، بناوٹی ہے اور FAKE ہے۔ اس کا لباس جتنا بھی فاخرہ ہو، اس کی گفتگو جتنی مرصع ہو، وہ ملتے وقت اور رخصت ہوتے وقت جتنا بھی ڈرامہ کرے، گھٹنوں کے بل جھک جائے، دوہرا ہوجائے، آپ کے لیے آسمان سے ستارے توڑ لانے کا پکا وعدہ کرے، اپنی دیانت، بے نیازی، استغنا اور عظمت کا جتنا تذکرہ کرے، آپ کو دو جمع دو برابر ہے چار کی طرح ایک رمق بھر شبہ بھی نہیں رہتا کہ اس شخص سے ملنا اور اس کے ساتھ کچھ وقت گزارنا خدا کے عذاب سے کم نہیں۔ دوسری قسم وہ ہے جس سے مل کر آپ کا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ شخص جتنا باہر سے متبرک ہے اتنا ہی اندر سے کھرا اور خالص چاندی کی طرح سفید اور چمکدار ہے۔ اس کے ماتھے پر

ستارہ صاف چمکتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے اندر سے ایک خوشبو پھوٹتی ہے جو اردگرد کے ماحول کو اپنے نشے میں لے لیتی ہے اور دل چاہتا ہے اس شخص کی معیت کبھی ختم نہ ہو۔ ذوالکفل اس دوسری قسم سے تھا۔ اس کے روئیں روئیں سے نجابت، خلوص، خاندانی وقار، سچائی اور ایک مافوق الفطرت قسم کی شیرینی پھوٹتی تھی۔ انتہائی سادہ لباس میں ملبوس وہ شخص کسی بڑی اقلیم کے بادشاہ کی طرح بارعب اور متین لگتا تھا۔ جس محبت سے ملتا، اس محبت کے زرِخالص ہونے کا انکار کرنا بڑے سے بڑے جوہری کے لیے ممکن نہیں تھا۔ استغنا اسے ورثے میں ملا تھا، دستِ سوال دراز کرنا تو دور کی بات ہے، وہ ایسا کوئی اشارہ بھی کرنے سے گریز کرتا جس سے کسی غرض کی طرف دور سے بھی راستہ نکلنے کا امکان ہوتا۔ پھر وہ سعودی حکومت کی دعوت پر وہاں کے محکمہ تعلیم میں خدمات سرانجام دینے چلا گیا۔ کبھی تعطیلات پر آتا تو فون پر بات ہوتی۔ ای میل پر ہمارا مسلسل رابطہ تھا پھر وہ واپس ہی آ گیا، لیکن حجاز کی خوشبو اس کے جسم سے جا نہیں رہی تھی۔ وہ پھر وہیں جانا چاہتا تھا اور اس طرح جانا چاہتا تھا کہ حرمین میں سے کسی ایک حرم کے نزدیک ہو۔

اس کوشش میں عرصہ ہی لگ گیا، اس اثنا میں جناب پروفیسر فتح محمد ملک نے مقتدرہ قومی زبان کے چیئر مین کا منصب چھوڑتے وقت، اپنے جانشین کے طور پر جو تین نام تجویز کیے، ان میں سرفہرست اس فقیر کا نام تھا۔ ملک صاحب کی منطق یہ تھی نفاذِ اردو کے لیے زمین ہموار ہو چکی ہے اور اب مقتدرہ کا سربراہ کسی ایسے شخص کو ہونا چاہیے جو بیوروکریسی سے، کسی احساس کمتری کے بغیر بات کر سکے اور افسر شاہی کے اندر اور باہر کو بخوبی جانتا ہو، ظاہر ہے حکومت کا ظاہری مرکز اسلام آباد لیکن اصل مرکز ملتان تھا۔ پینل میں شامل ایک اور دوست ملتان سے تھے اور نظریاتی طور پر بھی وہ اربابِ حل وعقد کو زیادہ راس آ سکتے تھے۔ میرا نام سرفہرست ہونے پر ذوالکفل بخاری کی مسرت کی انتہا نہ تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ پی آر میں صفر ہونے کی وجہ سے میری کامیابی کا کوئی امکان نہیں، لیکن اس نے نظریاتی طور پر صف بندی کر لی اور میرے لیے کوششیں کرنے لگا۔ نظریاتی حوالے سے اپنے (اور میرے) کسی نہ کسی حوالے سے اسے مقتدرہ اور اوپر کے فیصلہ سازی کے مرکزوں کی خبریں ملتی رہتی تھیں اور وہ مجھے معاملے کی پیش رفت سے آگاہ کرتا رہتا۔ اس کی بے تابی سے بعض اوقات مجھے شبہ ہونے لگتا کہ مقتدرہ کے سربراہ کے لیے میرا نہیں، بلکہ اس کا نام زیرِ غور تھا! لیکن یہ محض اس کا خلوص، بے غرضی اور وہ بلند مقام تھا جس پر وہ شخصیت اور کردار کے حوالے سے فائز تھا! بعد میں یوں ہوا کہ اس فہرست میں سے وزیرِاعظم نے کسی کو بھی نہ چنا اور قرعۂ فال ایک بار پھر دوستِ مکرم جناب افتخار عارف کے نام نکل آیا۔ ذوالکفل کو معلوم ہوا تو اس نے مجھے ٹیلی فون کیا۔ وہ بالکل بجھا ہوا اور خاموش سا تھا لیکن میں نے اسے یاد دلایا کہ اس میں ہمارے لیے ضرور کوئی بہتری ہوگی۔ اسے جب میں نے بتایا کہ جناب افتخار عارف کی تعیناتی میرے لیے انتہائی اطمینان کا باعث ہے کیونکہ میرے ذاتی تعلق کے علاوہ ان کا جو گہرا اور والہانہ تعلق والدِ گرامیؒ سے رہا اور ہے، اس کے پیشِ نظر وہ میرے لیے بہت محترم ہیں اور میں اس محبت اور احترام کو ایک لمحے کے لیے بھی پس پشت نہیں ڈال سکتا جو جناب افتخار عارف کے باطن اور ظاہر میں والدِ گرامی کے لیے تھا۔ اس پر وہ لمحۂ یاس جو اس پر طاری تھا، گزر گیا۔

رواں سال کا کوئی ابتدائی مہینہ تھا۔ فروری یا مارچ، ٹھیک سے یاد نہیں، ذوالکفل کا فون آیا کہ وہ سعودی ویزے کے سلسلے میں اسلام آباد آ رہا ہے۔ وہ کام سے فارغ ہو کر میری قیام گاہ پر آ گیا۔ شام کو اس نے رخصت ہونے کی بہت کوشش کی

لیکن میں نے جانے نہ دیا۔ اس رات وہ میرے پاس ٹھہرا۔ میری اہلیہ اپنی بیٹی اور نواسوں کو ملنے لاہور گئی ہوئی تھی اور مجھے قلق تھا کہ ذوالکفل کی کما حقہ خاطر مدارت نہ ہوسکے گی۔ شام کو باتیں کرتے رہے اور احساس ہی نہ ہوا کہ رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ وہ ان چند لوگوں میں سے تھا جو اسلام کی روح کو روحِ عصر کے حوالے سے سمجھ سکتے تھے۔ اس کے ایک عقیدت مند نے ایک ملازمت کی پیشکش جب صرف اس وجہ سے ٹھکرانا چاہی کہ وہاں انگریزی لباس پہننا پڑتا تھا تو ذوالکفل نے اسے منع کیا اور سمجھایا کہ صرف لباس کی وجہ سے نہ جانا کہ بہت سے وہ کام کس طرح کیے جاسکیں گے ایک اچھا مسلمان ہی کرسکتا ہے۔

چند دن بعد اس نے مکہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے شمولیت کرلی۔ فون پر اس نے بتایا کہ اب وہ مکہ شریف میں رہائش پذیر ہے۔ خانوادہ آنے والا ہے اور یہ کہ میں اہل وعیال کے ساتھ آؤں تو خوب رونق رہے گی۔ اپریل میں ایک مشاعرے کے سلسلے میں میرا جدہ جانا ہوا۔ میں عمرہ کے لیے حرم پہنچا تو ذوالکفل میرا منتظر تھا۔ عرب لباس میں وہ ایک وجیہہ شہزادہ لگ رہا تھا۔ جتنی دیر میں عمرہ کرتا رہا، وہ مقررہ جگہ پر انتظار کرتا رہا۔ عمرہ ختم ہوا اور حجام کے پاس گئے تو اس نے حجام سے قینچی لے کر میرے بالوں کی ایک لٹ اپنے ہاتھوں سے کاٹی۔ اس نے فاسٹ فوڈ ریستوران سے ڈھیر سارا کھانا خریدا اور ہم حرم کے جوار میں بیٹھ کر، پہروں باتیں کرتے رہے۔ دوسرے دن شام گئے وہ جدہ پہنچ گیا اور گردش زمانہ سے کچھ وقت ہم نے پھر چھین لیا۔ دو ماہ پہلے اس نے رمضان ملتان میں گزارا۔ فون پر بات ہوئی تو میں نے اصرار کیا کہ شاہ صاحب! اسلام آباد کو اپنے قدموں سے تھوڑی دیر ہی کو سہی، سرفراز فرما جائیے، لیکن ذوالکفل رمضان کے فوراً بعد مکہ مکرمہ واپس چلا گیا۔ دس بارہ دن پہلے میں گھر کے لاؤنج میں بیٹھا تھا۔ ایک طرف اخبارات کا پلندہ تھا اور دوسری طرف لیپ ٹاپ کھلا تھا۔ عجیب اداس اور پھیکی شام تھی۔ میں نے بیزار ہوکر سامنے پڑا ٹی وی بند کردیا۔ فون کی گھنٹی بجی۔ حافظ صفوان تھے۔ مجھے اچنبھا ہوا۔ حافظ صاحب ای میل پر ہر وقت رابطے میں رہتے ہیں لیکن فون پہلی بار آیا تھا۔ کاش نہ آتا! ذوالکفل شہرِ امن مکہ کی ایک گلی میں ٹریفک حادثے کی نذر ہوگیا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کیا کروں، کس سے بات کروں، المیہ یہ تھا کہ رونا بھی نہیں آرہا تھا۔ ملتان خالد مسعود کو فون کیا معلوم ہوا وہ امریکہ میں ہے۔ امریکہ کا فون لے کر وہاں اس سے بات کی لیکن ہزاروں دوستوں سے بھی بات کرلینے سے سینے کے اندر جو آگ سی لگی ہوتی ہے، کہاں بجھتی ہے! میں ڈرائنگ روم میں چلا گیا، جس جگہ وہ بیٹھا رہا تھا، وہاں بیٹھ کر اندھیرے میں آنسو بہائے۔ شائستگی، شرافت، حلم اور محبت کا ایک پیکر تھا، جو رخصت ہوگیا۔ کیا رومی نے دیوانِ شمس تبریز کا یہ شعر ذوالکفل ہی کے لیے نہیں کہا تھا؟

بروزِ مرگ چو تابوتِ من رواں باشد
گماں مبر کہ مرا فکرِ این و آں باشد

(روزنامہ نوائے وقت ۲۴،۲۵/نومبر ۲۰۰۹ء)

سید محمد ذوالکفل بخاری

امجد اسلام امجد

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے نواسے سید محمد ذوالکفل بخاری اپنے خاندان کی اعلیٰ مذہبی روایات کے امین ہونے کے ساتھ ساتھ علمی، تعلیمی اور ادَبی حوالوں سے بھی ایک غیر معمولی انسان تھے۔ انگریزی اور اردو میں ایم اے کرنے کے علاوہ اُنھوں نے ایل ایل بی اور بی ایڈ کے امتحانات بھی پاس کرر کھے تھے اور اِس کے ساتھ انگریزی زبان کی تدریس کے حوالے سے بھی ٹیفل (Teaching of English as Foreign Language) اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد سے انگلش لینگویج میں ڈپلوما کورس مکمل کر چکے تھے۔ ادب اور صحافت کے میدان میں بھی مختلف ادبی صفحوں کی ادارت کے ساتھ ساتھ کالم نگاری اور شاعری کی اصناف میں بھی نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اور یہ سب کچھ اُنھوں نے ۱۰/ دسمبر ۱۹۶۹ء سے ۱۵/ نومبر ۲۰۰۹ء کے درمیانی عرصے میں کیا، یعنی مکہ مکرمہ میں ایک ٹریفک حادثے میں انتقال کے وقت اُن کی کل عمر ۴۰ برس سے بھی کم تھی۔

مرحوم کے بیان کے مطابق کتابوں اور مشاعروں کی وساطت سے اُن کی میری ملاقات بہت پرانی اور مسلسل تھی۔ مگر مجھے اُن سے صرف ایک ملاقات کا ہی موقع مل سکا جو کوئی دس بارہ برس پہلے ملتان میں برادرم خالد مسعود نے کروائی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اِس ملاقات کا مقام اُن کے خاندانی مدرسے سے ملحق کوئی رہائشی جگہ تھی۔ اُنھوں نے اپنے عظیم نانا کی تقلید میں خطابت اور دینی تعلیم و تدریس کا راستہ تو اختیار نہیں کیا لیکن احراریوں کی مخصوص صفات اور خصوصیات اُن کی بات بات سے نمایاں تھیں۔ برجستہ گوئی اور شگفتہ طبعی کے ساتھ ساتھ خداداد ذہانت اور زبان و ادب سے خصوصی شغف کی وجہ سے اُن کی گفتگو میں گہرائی بھی تھی اور گیرائی بھی۔ اِس مختصر سی واحد ملاقات کے مجموعی تاثر کی فوری طور پر جو مثال میرے ذہن میں آرہی ہے وہ سراج منیر مرحوم سے پہلی ملاقات ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ اُس غیر معمولی ذہین نوجوان کو بھی جوانی ہی میں موت نے آلیا تھا۔

سید محمد ذوالکفل مرحوم کے برادرِ بزرگ سید محمد کفیل بخاری نے اُن کی وفات پر ماہنامہ نقیبِ ختمِ نبوت کے دسمبر ۲۰۰۹ء کے شمارے میں کیا دِوانے نے موت پائی ہے کے عنوان سے ایک مختصر مضمون لکھا ہے جس میں اُنھوں نے مرحوم کا ایک پسندیدہ شعر بھی درج کیا ہے، جو خود اُن کی موت کے حوالے سے ایک عجیب کیفیت کا حامل ہو گیا ہے۔ آپ چاہیں تو اُسے ایک غیبی اشارہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

ہاتھوں میں دے کے ہاتھ، ابھی کل کی بات ہے
وہ چل رہے تھے ساتھ، ابھی کل کی بات ہے

موت لاکھ ایک ناقابلِ تردید حقیقت سہی لیکن سچی بات ہے ذوالکفل ایسے کسی غیر معمولی جواں مرگ کا اس طرح اچانک دنیا سے پردہ کر جانا کئی خوابیدہ سوالات کو پھر سے بیدار ضرور کر جاتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ دنیا میں آنے والے ہر بشر کی موت کا ایک وقت معین ہے اور اُسے ایک نہ ایک دن یہاں سے جانا ہی ہوتا ہے، اور یہ بھی طے ہے کہ اِس وقت کا تعین صرف اور صرف اُس پروردگار کی صوابدید پر ہے جس کے قبضے میں ہم سب کی جان ہے، اور جس کے فیصلے پر سرِ تسلیم خم کر دینے کے سوا کوئی راستہ اور چارا نہیں، لیکن پھر بھی کسی کی جوان موت پر یہ خیال دماغ میں آتا ضرور ہے کہ ابھی اُس کا کچھ دن اور زندہ رہنا بنتا تھا۔ اپنے لے پالک بیٹے عارف کی جواں مرگی پر غالبؔ نے بھی اِسی مخمصے کو کچھ اِس طرح بیان کیا ہے کہ:

ہاں اے فلکِ پیر، جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

عزیزی حافظ صفوان محمد نے ابھی کچھ عرصہ قبل مجھے ایک انگریزی۔اردو لغت بھجوائی تھی جو طلبہ و طالبات کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر بنائی گئی تھی (اور جس پر میں نے اپنے ایک کالم میں تعریفی اظہارِ خیال بھی کیا تھا)۔ اس لغت میں اُن کے ساتھی اور شریک یہی ذوالکفل تھے جو گزشتہ کئی برس سے سعودی عرب میں انگریزی پڑھا رہے تھے اور اِس زبان کی تدریس سے متعلق خصوصی اسناد اور تجربہ حاصل کرنے کی وجہ سے اِس بات کا گہرا احساس اور شعور رکھتے تھے کہ ہائی سکول کی سطح پر طلبہ کو کس قسم کی ڈکشنری کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے صفوان کو فون پر مبارک باد دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا تھا کہ اب جب بھی ذوالکفل پاکستان آئے مجھے اُس سے ضرور ملوانا، کہ ایسے ذہین اور محنتی نوجوانوں کی تعداد بہت تیزی سے کم ہوتی جارہی ہے جو جدید دنیا کے مسافر ہونے کے ساتھ ساتھ پرانی دنیا کے حسن اور اُس کی اقدار کو بھی ہمراہ لے کر چلتے ہیں۔ چند دن قبل جب اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں مجھے فون کر کے بتایا کہ اب وہ میری یہ فرمائش کبھی پوری نہیں کر سکے گا کیوں کہ اُس کا عزیز دوست اب اُس سفر پر روانہ ہوگیا ہے جہاں سب آوازیں ساتھ چھوڑ جاتی ہیں اور پیچھے رہ جانے والوں کے پاس یادوں کے علاوہ کچھ نہیں بچتا۔ پتا نہیں کہاں سے وہ بھولے بھٹکے شعر بغیر کسی تلازمے کے ذہن کی سکرین پر چمک اُٹھے:

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو کہ بہت یاد رہو
غم بھی گزشتنی ہے خوشی بھی گزشتنی
کر غم کو اختیار کہ گزرے تو غم نہ ہو

(روزنامہ ایکسپریس لاہور، ۱۷/ جنوری ۲۰۱۰ء)

اُس پھول کے بغیر بہت جی اُداس ہے

شیخ حبیب الرحمٰن بٹالوی

۱۹۶۸ء میں تعلیمی بورڈ ملتان کے قیام پر میں لاہور سے ملتان چلا آیا۔ اُس وقت جوابی کاپیوں کی مارکنگ، اساتذہ گھروں میں کیا کرتے تھے۔ جوابی کاپیاں، بل وغیرہ جمع کرانے کے لیے اکثر اساتذہ کرام دفتر تشریف لایا کرتے۔ اُن میں میرے مہربان علامہ فضل احمد عارف اور پروفیسر وکیل شاہ صاحب بھی شامل تھے جو اُن دنوں میونسپل کالج اوکاڑہ تعینات تھے۔ دونوں بزرگوں کا گھر ملتان میں تھا، اس لیے اُن سے اکثر ملاقات رہتی۔ پروفیسر وکیل شاہ صاحب کے بچے خیر المدارس کے احاطے میں رہائش پذیر تھے۔ دوسری طرف (غالباً ۱۹۸۱ء کی بات ہے) میرے محسن و مربی سید عطاء المحسن بخاری مرحوم نے دارِ بنی ہاشم، مہربان کالونی ملتان میں نمازِ جمعہ کی ادائیگی شروع کردی تھی۔ میری رہائش محلّہ طارق آباد میں ہے۔ جمعہ میں باقاعدگی سے شاہ صاحب کی امامت میں ادا کرتا۔ اُن دنوں گیارہ بارہ سال کا ایک دھان پان سا، ہونہار پروا کے چکنے چکنے پات والا لڑکا، شاہ جی کے پیچھے آکر کھڑا ہو جاتا۔ وہاں جہاں حال ہی میں بیری کا ایک تن آور درخت کاٹ دیا گیا ہے۔ اُس وقت وہ ایک چھوٹا سا پودا تھا۔ دکھ کی بات ہے کہ بیری کے اُس درخت کے کاٹنے کے کچھ عرصہ بعد ہی قدرت کی طرف سے میرے اُس پیارے دوست کی سانس کی ڈوری بھی کاٹ دی گئی ہے جس کی یادوں بھری باتیں اور باتوں بھری یادیں تادیر مجھے ستاتی رہیں گی۔ میرے اُس دوست کا نام سید ذوالکفل بخاری ہے۔ (پروفیسر وکیل شاہ صاحب کا دوسرا بیٹا اور سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا چھوٹا نواسہ)

میرا دوست دی سنٹرل کالج ملتان سے ایم اے انگریزی کر کے گورنمنٹ ٹیکنالوجی کالج لیہ میں بطور لیکچرار اپنے فرائض انجام دینے لگا۔ مہینے پندرہ دن بعد ملتان آنا ہوتا تھا۔ ملاقات ضرور ہوتی۔ میرا یہ شعر اُنہی دنوں کی یادگار ہے:

کیا پیارے پیارے لوگ یاں بستے ہیں شیخ جی
ملتان اور میلسی، لیہ کے ساتھ ساتھ

اور کچھ عرصہ بعد ہی وہ گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی ملتان چلا آیا۔ محنت اور لگن سے کام کرنے والا ایک عبقری دماغ—انتھک آدمی—درس و تدریس—ادب، شاعری—صبح ٹیکنالوجی کالج میں انگریزی ادب اور شام پنجاب کالج میں اردو ادب کا درس دیتا رہا۔ اس دوران روزنامہ خبریں کے ادبی ایڈیشن کی ادارت بھی اُس کے پاس تھی۔

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

ایم اے انگریزی، ایم اے اردو، ایل ایل بی، بی ایڈ اور ٹیفل—یہ سارے امتحانات ایسے چلتے چلتے پاس کر لیے کہ دنیاوی عہدوں کے لیے یہ اسناد ضروری تھیں ورنہ میرے دوست کا علم ان ڈگریوں سے کہیں ماورا تھا—وہ عجیب مزاج کا آدمی تھا اور......

ساغر یہی لکھا ہے کتابِ حیات میں
حق آشنا جو ہوتے ہیں، ہوتے عجیب ہیں

دارِ بنی ہاشم میں میرا روزانہ ہی جانا ہوتا تھا۔ اُس سے گھنٹوں گفتگو رہتی۔ مجھے یہ بات تحریر کرنے میں کوئی باک نہیں کہ میرے کئی مضامین میرے اُس دوست کی گفتگو کا حاصل ہیں۔ میرے قلمی نام ''ساغر اقبالی'' اور ''عینک فریمی'' اُسی نے رکھے۔ بعض اوقات وہ کسی نہ کسی لذیذ پکوان کا ڈونگا اٹھائے، مہربان کالونی سے پیدل چلتا اور میرے گھر پہنچ جاتا— بیٹھا رہتا— پہروں باتیں ہوتیں— ادبی باتیں— لطیفے— چٹکلے— گھریلو باتیں— اُس کا مطالعہ، ابلاغ، ادراک، حافظہ، مشاہدہ قابلِ داد تھا۔ شگفتہ بیانی اُس کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی— تحریر وتقریر کا دھنی— مجلس میں بات چیت اتنی شستہ و رفتہ اور نپے تلے الفاظ میں کرتا کہ بڑے بڑے اہلِ علم دنگ رہ جاتے۔ اُس کی شاعری پُر تاثیر تھی:

مرے سچے محمد!
مجھے سچائی کی، پاکیزگی کی اور بھلائی کی
جتنی ادائیں یاد ہیں وہ آپ ہی کی ہیں
ادادارِ نبوت...... میری اتنی سی گزارش ہے
مری اپنے ادافہموں سے نسبت خاص کر دیجیے
مجھے سچوں، بھلوں، پاکیزہ تر لوگوں کے قدموں میں جگہ دیجیے!
مجھے میری ہی دنیا میں قوی و معتبر کیجیے

(میرے مولا محمد، میرے سچے محمد　　　)

تمھاری قسمت میں رت جگے ہیں ہماری قسمت میں خوابِ غفلت......
تمام غفلت شعار نسلوں کو ہو سکے تو معاف کر دو
ہمیں بھی ورنہ یہ رت جگوں کے عذاب دے دو
بلا حساب و کتاب دے دو
عجب طرح کی اداس نسلو! میں جانتا ہوں
دیارِ حرماں میں پلنے والی
تمام نسلوں کی سرگزشتوں کے
سارے عنوان ایک سے ہیں

(سرنوشت　　)

یونہی اس خام خواہش، حسرت بے جا کی بستی میں
میں صدیوں سے فقط اک عمر کو
اک انت کو آواز دیتے سنتا رہتا ہوں

میں اپنی عمر، اپنے انت کو آواز کب دوں گا؟
مجھے معلوم ہی کب ہے!

(معلوم، نامعلوم)

فاران اکادمی کے کئی اجلاسوں میں، میں نے اُس کے ساتھ حاضری دی جہاں ڈاکٹر مختار ظفر، پروفیسر تاثیر وجدان، پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان، ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان، مختار پارس، محمد مختار علی، حامد سراج، خالد مسعود، مستحسن خیال، سلیم ناز، نسیم شاہد، شعیب ودود اور اسی قبیل کے کئی ادباء و شعراء سے میری ملاقات ہوئی۔ مشفق خواجہ، ڈاکٹر اسلم انصاری، محمد اظہار الحق، جعفر بلوچ، ہارون الرشید جیسے ادیب و شاعر اُس کی علمیت کے معترف تھے۔

ایک مرتبہ میں جیل روڈ سے گزرا۔ دیکھا کہ ڈاکٹر اسلم انصاری اور ذوالکفل بخاری سرِ راہ محوِ گفتگو ہیں۔ اردگرد کا کوئی ہوش نہیں۔ میں اپنا کام ختم کر کے واپس آ گیا اور وہ لوگ ابھی تک وہیں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔

پھر ایک وقت آیا کہ میرے دوست کی امید بر آئی۔ اُس کی بڑی خواہش تھی کہ خانۂ خدا اور روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی قربت نصیب ہو۔ سعودی حکومت کی ڈیمانڈ پر، عرب بچوں کو انگریزی زبان سکھانے کے لیے، تبوک کے شہر اُملج میں چھ سال تک بطور استاد اپنے فرائض انجام دیئے۔ اُملج سے میرے نام، اُس کے ایک خط کی چند سطور نذرِ قارئین ہیں:

''یا حبیبی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

ہفتہ بھر پہلے آپ کا مکتوبِ گرامی موصول ہوا۔ ساتھ میں عید کارڈ بھی۔ یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ کتنی خوشی ہوئی۔ بس وہی بات ہے۔ ''سانبھ سانبھ رکھیاں نے تیریاں نشانیاں'' عید کارڈ کی عبارت اور ڈیزائن نے لفافے سے نکل کر، دل کے ایک خانے میں جگہ بنا لی ہے۔ ''جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ''۔ گہرے تاریک پس منظر میں دمکتا اور مہکتا نیلا گلاب اور اس پر:

" I am blue without you"

"It realy made me feel blue....."ہاں

یہاں ہم قبیل لوگوں نے ایک ''حلقۂ طعام'' تشکیل دیا ہے— روٹی بازار سے — سالن قاری علی صاحب کے ہاتھ کا پکا ہوا— حساب ماہ بماہ— شعر سنیے:

لنگر سے روٹی لیتے ہیں، پانی سبیل سے
اچھی گزر رہی ہے دلِ خود کفیل سے
دنیا میرے پڑوس میں آباد ہے مگر
میری دعا سلام نہیں اس ذلیل سے''

اور آج میرے دوست! جب تم اس جہانِ فانی سے بہت دور جا چکے ہو۔ تمھیں معلوم نہیں کہ تمھارے ننھے منے بچے تمھارے بغیر اپنے آپ کو کتنا ''بلیو'' محسوس کر رہے ہیں — ۱۵/ نومبر ۲۰۰۹ء کو تمھارے جان لیوا حادثے کے بعد، رات کے وقت یہاں ملتان سے، کسی عزیز نے فون پر مکہ میں تمھارے پانچ سالہ عطاء المکرم سے بات کی۔ پوچھا۔ کیا کر رہے ہو؟ اُس نے معصومیت سے جواب دیا: ''بابا جان، یونیورسٹی سے ابھی تک نہیں آئے۔ اُن کا انتظار کر رہا ہوں۔'' اُسے کیا معلوم تھا کہ تم

ہمیشہ کے لیے داغِ مفارقت دے چکے ہو۔

کفیل شاہ جی بیان کر رہے تھے کہ جدہ میں طاہر جمیل مرحوم کی ایک محفل میں یہ بات ہو رہی تھی کہ زندگی کیا ہے؟ ذوالکفل بخاری بھی بیٹھے تھے۔ کہنے لگے: ''آدمی کی زندگی اَپ ٹوڈیٹ ہونی چاہیے۔ مثلاً آدمی نے ایک کام کرلیا اور دوسرے کام کی وہ تیاری کر رہا تھا کہ موت آگئی۔ یہی زندگی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ اُس کی زندگی کے آئندہ پروگرام کا خیال بھی ایسا پاکیزہ ہو کہ مرنے کے بعد اُس کے لیے باعثِ راحت بن جائے— باقی اگر موت کے بعد حرم پاک کی قربت نصیب ہو جائے تو کیا کہنے ورنہ پاکستان میں اپنے دوستوں میں مرنا بہتر ہے۔''

اور کیا خوش قسمتی ہے۔ میرے اُس دوست کی کہ نہ صرف موت، حرم پاک کے قرب میں آئی بلکہ اُس کی تدفین بھی اُم المومنین حضرت سیّدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے قدموں میں ہوئی۔

زندگی میں بہت سے دوست ملتے ہیں مگر میرا دوست ایک ہیرا تھا— ایک انمول ہیرا۔ جو میرے مولا کو بھا گیا اور اُس نے اُسے ہم سے واپس لے لیا— ایک گلاب تھا جو باغباں کو پسند آ گیا اور اُس نے اپنے لیے رکھ لیا۔ میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ میں ملول ہوا— غمزدہ ہوں— پژمردہ ہوں— میں اپنا دکھ کس سے بیان کروں— صبح دم پھول نے آسمان کی طرف منہ کر کے فریاد کی۔ مجھ سے میری شبنم چھین لی گئی ہے۔ اُسے کیا خبر تھی کہ آسماں اپنے ستارے بھی کھو چکا ہے۔

خالد مسعود خان نے صحیح لکھا:

> سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے حوالے سے تو ذوالکفل کو لوگ جان لیں گے لیکن یہاں یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ شخص اپنی اس خاندانی پہچان کے علاوہ کیا تھا اور میرے لیے کیا تھا۔ کسی کو کچھ بتانا بیکار ہے۔

دوست! تمھاری والدہ بڑے حوصلے اور ہمت والی خاتون ہیں۔ کوئی واویلا نہیں کوئی بین نہیں۔ آنسو بہہ رہے ہیں اور رکے جاتی ہیں:

> میرا بچہ—! میں اُسے گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتی تھی— کہاں— گھر سے دور حادثے میں جان ہار گیا— مرنے سے ایک دن پہلے اُس کا ٹیلی فون آیا تھا۔ اوروں سے باتیں ہوتی رہیں— میں بات نہ کر سکی— مجھے کیا معلوم تھا یہ اُس کا آخری ٹیلی فون ہے، میں بھی اُس سے کوئی بات کر لیتی!

والد صاحب بڑے حوصلے کے ساتھ جی رہے ہیں— دل فگار ہے—! بھائی، بظاہر تو نظر آتا ہے کہ صدمہ سہہ گیا ہے مگر کون کہہ سکتا ہے اندر سے اُس کے ساتھ کیا بیت رہی ہے! دوست احباب غمِ فرقت میں بے حال ہیں— ہم سب تمھارے بغیر افسردہ ہیں:

کیا لکھوں! کیا بتاؤں! شبِ غم گزار کے
''تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے''

خانوادۂ بخاری کا گُل سرسبد

ابوسفیان تائب

۲۳۲ کوٹ تغلق شاہ کاشانۂ معاویہ کی بیٹھک میں جب سید محمد ذوالکفل بخاریؒ سے پہلی ملاقات ہوئی تب ان کی عمر کوئی چودہ پندرہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔ یہ ۸۴-۱۹۸۳ء کا دور تھا۔ ان دنوں ہر دو تین ماہ بعد امامِ تاریخ وسیرت جانشینِ امیرِ شریعت قائدِ احرار حضرت مولانا سید ابومعاویہ ابوذر بخاری نوراللہ مرقدہ کے قدموں سے اوصافِ حمیدہ کے کچھ پھول چننے کے لیے کاشانۂ معاویہ پر میری حاضری ہوا کرتی تھی۔

نگاہیں نیچی، باادب، بااخلاق، چھوٹی عمر میں ہی چہرے پر سنجیدگی اور متانت لیے ہوئے ذوالکفل بخاریؒ کا خوبرو چہرہ آج بھی اسی طرح میرے سامنے ہے۔ اور اب تو وہ حسین چہرہ اپنی نانی اماں رضی اللہ عنہا کے قدموں میں پہنچ کر اور زیادہ حسین ہوگیا ہے۔

سید محمد ذوالکفل بخاری جب بھی ملا...... باادب، بااخلاق اور نگاہیں نیچی کیے ہوئے ملا۔ پھر علم وادب کے راستوں کا یہ عبقری مسافر تیزی سے چلنے لگا اور مختصر عرصہ میں......عرصۂ دراز سے چلنے والوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا بہت آگے نکل گیا۔ حتیٰ کہ ......ام القریٰ سے ہوتا ہوا خاکِ حرم کی آغوش میں گہری اور میٹھی نیند سوگیا۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نواسۂ امیر شریعت سید محمد ذوالکفل بخاریؒ کو اپنے قرب کے درجاتِ اعلیٰ نصیب فرمائے اور ہم سب پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

علم و ادب کا روح رواں ذوالکفل بخاریؒ
تھا نظم و نثر میں بھی ''مہاں'' ذوالکفل بخاریؒ
آسودگی سے نانی رضی اللہ عنہا کے قدموں میں سو گیا
تائب کو اب ملے گا کہاں ذوالکفل بخاریؒ

سید ذوالکفل بخاری

ڈاکٹر سعید عنایت اللہ

اللہ تعالیٰ اگر اپنے کرم سے انسان کو شرفِ نسب کے ساتھ ساتھ حقیقت علم اور توفیق عمل کی نعمت سے نواز دے پھر اسے سنوارنے کے لیے اپنی عطا کردہ صلاحیتوں، بیان میں فصاحت و بلاغت قلم میں حق کی خاطر قوت سے حرکت اور اعضاء و جوارح میں طاعات ودیعت فرما دے تو یہ اس منعم حقیقی کی اپنے بندے پر کمال رحمت اور بے پایاں نعمتوں کا مظہر ہے۔

شریف النسب عالی حسب جذاب شخصیت اور بے شمار صفات حسنہ سے موصوف سید ذوالکفل بخاری رحمہ اللہ ان خوش نصیب انسانوں میں سے ایک تھے جنھیں اللہ تعالیٰ نے مذکورہ اوصاف کا وافر حصہ عطا کیا تھا۔ حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے نواسے، نجیب الطرفین، سید محمد ذوالکفل کے ساتھ میری مصاحبت، کمیت لیل و نہار کے اعتبار سے بہت مختصر اور قلیل مگر ذہنی اور فکری یگانگت، تحریکی لگاؤ، کاز میں فنائیت، مقاصد کے حصول اور عالی اہداف کی تکمیل کے لیے انتھک مزاج اور بے حد جد و جہد جیسے امور نے ہماری اس مصاحبت کی کیفیت کو اس قدر قوی بنا دیا کہ گویا ذوالکفل مدتوں سے میرا مصاحب رہا ہو۔

سید ذوالکفل کی طبیعت وفطرت اور مزاج جو میں سمجھ سکا وہ کچھ اس طرح ہے:

محبت میں اخلاص، تعلق میں صفائی، راحت میں پیچھے، مشقت میں آگے، یادوں کے لیے مار کھانا، قوت برداشت، دوسروں کی عظمت کے لیے کوشاں، ان کی خاطر اپنے آپ کو مٹانا، ان صفات حمیدہ کا خوگر سید ذوالکفل رحمہ اللہ صرف مجھ میں ہی نہیں اپنے سینکڑوں رفقاء کار، مصاحبوں بھائیوں اور دوستوں میں عقیدت و محبت اخلاص و جاں نثاری کے انمٹ نقوش چھوڑ گیا ہے۔

مکہ مکرمہ میں ۳۳ سالہ طویل قیام اور ربع صدی سے اوپر مدت کے دوران متنوع دینی، علمی، ادبی اور تحریکی ذمہ داریاں، مدرسہ صولتیہ میں تدریسی خدمات، عُرُوَۃ اخبار میں حج ایڈیشنوں کی نگرانی کے ساتھ اپنی دیگر علمی مساہمت، تراجم کی نگرانی، تحریر مقالات، کاز کی خدمت، میں سوچتا ہوں یہ معلم حقیقی کا خصوصی انعام محض اس کے فضل و کرم، اس کی رحمت و عنایت، بزرگان دین کے ساتھ تعلقات، والدین اور احقر کی دعاؤں کے ساتھ ساتھ ''اوّل بیت'' کا سایہ، زمزم شریف کی برکت، ام القریٰ میں اقامت کا صدقہ ہے، ان مذکورہ چیزوں کا ذکر تحدیثِ نعمت کے طور پر کرنے کے ساتھ ساتھ اس امر کا بیان مقصود ہے کہ کتنے ہی اہل علم، اہل قلم، اہل دین اور مخلصین کی مصاحبت کے مواقع میسر آئے ہوں گے؟ مگر اپنے کسی مصاحب سے ذمہ داریوں کی ادائیگی اور حسن تکمیل تک اپنے علم و فن اور تجربات سے استفادہ اور کاز میں اخلاص کے ذریعہ جو سکون و اطمینان مجھے ذوالکفل رحمہ اللہ کی صحبت سے میسر آئی وہ میری زندگی میں پہلی اور بے نظیر مثال تھی۔ مذکورہ میدانوں میں بہت کم مصاحب ایسے ملتے ہیں جو کام کے آغاز میں بڑے شوق سے شرکت کریں پھر درمیان میں اسی جذبے کے ساتھ چلتے رہیں، پھر تکمیل تک اسی اخلاص کے ساتھ پہنچیں۔

ذوالکفل کی میرے متنوع کاموں میں مصاحبت اور مشارکت نہ صرف آغاز سے انتہاء تک مساوی درجہ کی محبت و

☆ مدرس مدرسہ صولتیہ، مکہ مکرمہ

اخلاص کے ساتھ رہی بلکہ بسا اوقات عمر کے فاصلے کے اعتبار سے انہیں میری تھکان کا احساس ہوتا تو مجھے تاکید سے کرنے پر مجبور کرتے اور خود ذمہ داری کی تکمیل کرنے میں راحت محسوس کرتے۔

مجھے اگر ایک عمل سے کسی دیگر ذمہ داری کی خاطر نکلنا ہوتا تو ان کے موجود ہونے کی حالت میں وہ ایسی ذمہ داری سے کام کو نبھاتے کہ مجھے اپنی غیبوبیت کا احساس نہ ہونے دیتے۔ ذوالکفل میرا ایسا مصاحب تھا کہ میں خود سوچتا ہوں بلکہ بسا اوقات انہیں بھی کہتا کہ جناب آپ کو مکہ مکرمہ میں میری نصرت کے لیے ہی بھیجا گیا ہے۔

متنوع کاموں میں ایسی مخلصانہ معاونت ومشارکت کہ اپنی عملی زندگی میں مجھے ایسا مخلص باکمال مصاحب پہلی بار میسر آیا، اللہ کا فیصلہ کہ وہ ابدی زندگی کا راہی، گہرے نقوش، ہمیشہ یادرہنے والے تذکرے چھوڑ کر داعی حق کی دعوت پر لبیک کہہ کر ہم سے جدا ہوکر اپنے حقیقی مالک سے جاملا۔ اور ملاپ بھی ایسا کہ ذوالکفل حرم مکی میں بیت اللہ شریف، مسجد الحرام زمزم شریف کے قریب ام المؤمنین کے قدموں میں ہمیشہ کے لیے ام القریٰ کی سکونت اختیار کرگیا۔ یہ نصیب، خوش قسمت ذوالکفل ہی کا تھا۔

ذوالکفل واقعی اسی حرم، اسی ام القریٰ اور مکہ مکرمہ میں اقامت کا سچا طلب گار تھا۔ یہی محبت اسے پاکستان سے املج پھر وہاں سے بذریعہ پاکستان ام القریٰ لے آئی۔ ذوالکفل نے مجھ سے اپنی اوّلین ملاقات میں بھی ام القریٰ سے اپنی اسی محبت کا اظہار کیا تھا۔

ان سے میری پہلی ملاقات ان کے برادر بزرگ سید کفیل شاہ صاحب بخاری کی معیت میں شیخ حرم حضرت مولانا مکی حجازی کے گھر ہوئی۔ چند لحات کی ملاقات میں ہمارے احراری لب ولہجہ نے ہمارے لیے اکابر کی یادوں کو دہرانے کا موقع بھی فراہم کیا، اور باہم ایک دوسرے کے انتہائی قریب ہونے کا بھی۔ وہ فرمانے لگے آج احراری انداز گفتگو سے ارض حرم میں لطف اندوز ہونے کا موقع میسر آیا ہے، پھر شاہ صاحب نے املج سے جلد مکہ مکرمہ آنے اور ام القریٰ کے مدارس میں تدریس کے جوہر دکھانے کی تمنا ظاہر کی تو بندہ نے دعاء و دوا ہر دو کا وعدہ بھی کیا۔ آخر کار ان کی تعیین ہماری کوشش سے نہیں محض اللہ کے فضل وکرم اور ان کی قابلیت کی بنا پر ہوگئی، مگر بعض وجوہات کی بنا پر پاکستان میں کچھ تاخیر ہوگئی تو میں نے ایک اہم انگریزی کتاب جو سعودی عرب کی شناخت پر لکھی گئی تھی ترجمہ کے لیے شاہ صاحب کو پیش کی جسے انھوں نے قبول کرتے ہوئے حامی بھرلی، حالانکہ اس سے قبل کئی افراد کو وہ کتاب دی گئی مگر چونکہ اس کی ایک شرط انگریزی ادب سے گہری واقفیت اور دوسری عربی ثقافت سے واقفیت تھی، پھر تیسری شرط جو ڈاکٹر رشاد حسین نائب صدر حج کارپوریشن ساؤتھ ایشیا نے لگائی تھی کہ اس کا انگریزی ترجمہ بھی اردو ادب کا مظہر ہو۔

بہت سے لوگوں نے اس کام کو شروع کر کے آخر میں معذرت کردی مگر شاہ صاحب نے خود اور اپنے ثقہ اہل علم وادب احباب کے ساتھ مل کر مذکورہ تینوں شرائط کی رعایت کرتے ہوئے اس کی تکمیل فرمادی۔ اور اس تکمیل میں جب تاخیر ہونے لگی تو میں شاہ صاحب کو بار بار یاد دلاتا تو شاہ صاحب معقول عذر بیان کر کے مجھے مطمئن کردیتے۔ ایک رات ۱۲ بجے میں نے انہیں کہا کہ شاہ صاحب کل تک اس کام کو تمام کرنا ہے تو فرمانے لگے ان شاء اللہ، میں نے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ آج رات کو تو اب آپ آرام کرلیں پھر صبح کو بقیہ کام کا اتمام کرلیں، کیونکہ وہ آخری جزء کی تکمیل فرمارہے تھے تو فرمایا ان شاء اللہ۔

دوسرے روز عصر کے قریب جناب رؤف طاہر جدہ اور مکہ کے راستے سے فون پر سید ذوالکفل بخاری کی عمر کے تمام ہونے اور کار ایکسیڈنٹ میں ان کی شہادت کی المناک خبر دے رہے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جب ان کے گھر والوں نے ان کا آخری علمی شاہکار تلاش کیا تو وہ اس کتاب کا تکمیلی صفحہ تھا جس کی تکمیل کا وعدہ ذوالکفل نے مجھ سے گزشتہ رات کیا تھا۔ کام تو اس نے مکمل کردیا مگر ایسا خلا چھوڑ گیا جس کا پر ہونا مشکل ہے۔ علم وعمل، تقویٰ اور ایفاء عہد کا مرقع ایک عظیم انسان، ایک بڑا دانشور اور مفکر ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگیا۔ ذوالکفل کی حسین یادیں پیاری باتیں اور حیا آفریں مسکراہٹیں کبھی فراموش نہ کی جاسکیں گی۔ رحمہ اللہ رحمۃ الابرار مع النبیین والصدیقین والشہداء۔ آمین۔

کل من علیہا فان

خالد مسعود خان

میں لاس اینجلس میں فجر کی نماز پڑھ کر دوبارہ سویا ہی تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس وقت صبح کے پانچ بج کر سینتیس منٹ ہوئے تھے۔ دوسری طرف پاکستان سے اظہار الحق صاحب تھے۔ میں حیران تھا کہ اظہار صاحب کے پاس میرا امریکہ کا موبائل نمبر کس طرح آیا ہے۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اظہار صاحب کہنے لگے: مجھے یہ نمبر آپ کے گھر سے ملا ہے۔ میں نے پوچھا خیریت ہے؟ اظہار صاحب ایک لمحے کے لیے چپ ہوئے پھر کہنے لگے آپ کو ذوالکفل کی کوئی خبر ملی ہے؟ میں نے کہا بس آخری خبر یہی ہے کہ وہ سعودیہ میں ہے۔ اظہار صاحب کہنے لگے مجھے حافظ صفوان کا فون آیا تھا۔ پھر پوچھنے لگے آپ حافظ صفوان کو تو جانتے ہیں ناں! میں نے کہا بہت اچھی طرح۔ اظہار صاحب کہنے لگے مجھے حافظ صفوان نے بتایا ہے کہ مکہ مکرمہ میں ایکسیڈنٹ میں ذوالکفل خالق حقیقی سے جاملا ہے۔ صدمے سے میں بالکل گنگ اور بے جان ہوگیا۔ مجھے نہیں پتا پھر اظہار صاحب نے اور کیا کہا۔ اگلے تین چار منٹ ایک عجیب کیفیت میں گزرے۔ میں فون پر بات بھی کر رہا تھا مگر مجھے نہ تب یاد تھا کہ کیا کہہ رہا ہوں اور نہ اب ہی کچھ یاد آرہا ہے۔ میں علی الصبح لاس اینجلس میں اپنے کمرے میں بالکل اکیلا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں شاید پوری دنیا میں بالکل اکیلا ہوں۔ تب فون کی گھنٹی دوبارہ بجی۔ دوسری طرف میری بیٹی تھی۔ پوچھنے لگی آپ کو اظہار انکل کا فون آیا ہے۔ میں نے کہا کہ ہاں آیا تھا۔ پھر وہ کہنے لگی آپ ماما سے بات کریں۔ میری بیوی کو اس بات کا پورا اندازہ تھا کہ میری اس وقت کیا کیفیت ہوگی۔ وہ میری جانب سے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر مسلسل بول رہی تھی۔ وہ مجھے حوصلہ دے رہی تھی۔ ذوالکفل کی باتیں کر رہی تھی۔ مجھے آج صحیح اندازہ ہوا کہ وہ میرے دوستوں سے میرے تعلق کے بارے میں کتنی آگاہی رکھتی ہے۔ اس کے فون نے مجھے کھل کر رونے کا موقع بھی دیا اور حوصلہ بھی دیا۔

سید ذوالکفل بخاری سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم ومغفور کا سب سے چھوٹا نواسہ تھا۔ میری اور اس کی دوستی کب ہوئی؟ مجھے اس کا صحیح اندازہ نہیں ہے۔ میرا دوست تو دراصل اس کا بڑا بھائی سید کفیل بخاری تھا۔ ہماری دوستی کل پاکستان بین الکلیاتی مباحثوں کے دوران ہوئی۔ خطابت عطاء اللہ شاہ بخاری کے خانوادے کی نمایاں خصوصیت ہے اور کیوں نہ ہوتی؟ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو فن خطابت میں اس وقت پورے ہندوستان پر فضیلت حاصل تھی جب پورا ہندستان، شعلہ بیان خطیبوں اور مقرروں سے بھرا پڑا تھا۔ ذوالکفل ہم سے بہت چھوٹا تھا اور ایک عرصہ تک میں نے اسے محض برخوردار سمجھ کر درخور اعتنا نہ سمجھا۔ ایک دوبار محض مروتاً میں نے اس سے وقت گزارنے کے لیے (کفیل بخاری کے انتظار کے دوران) اس سے بات چیت کی تو اندازہ ہوا کہ یہ کم عمر نوجوان تو بہت پڑھا لکھا ہے۔ ادب، مذہب، فلسفہ، شاعری، تنقید اور تصوف، غرض وہ ہر موضوع پر اپنی عمر سے کہیں زیادہ بالغ اور علمی گفتگو کرتا تھا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ نہ صرف خود بلکہ اپنے تمام ہم عمر دوستوں روف کلاسرا، مختار پارس، عبدالودود شعیب،، حبیب الرحمٰن خان کو بھی میرے حلقۂ دوستی میں لے آیا۔ یہ تمام نوعمر لڑکے اس طرح خاموشی سے میری زندگی میں داخل ہوئے کہ بہت عرصہ بعد پتا چلا کہ یہ سب میرے لیے کتنے اہم ہو چکے ہیں۔

پھر یہ ہوا کہ میں جو کبھی پہلے مدرسہ خیر المدارس کے اندر پچھلی طرف واقع ایک چھوٹے سے کچے صحن میں اور بعد ازاں مدرسہ معمورہ کے اندر دارِ بنی ہاشم میں صرف اور صرف کفیل بخاری کو ملنے جاتا تھا۔ اب دونوں بھائیوں سے ملنے جاتا تھا۔

اور پھر ایسا ہوا کہ میں ذوالکفل کو ملنے جاتا تھا اور اگر وہ نہ ہو تو کفیل بخاری کے پاس بھی بیٹھ جاتا تھا۔ کفیل بخاری اب پورا مولوی بن چکا تھا۔ ایک ایسا مولوی جس کے پاس بیٹھ کر زندہ دِلی کا ایک خوشگوار احساس ہوتا تھا لیکن میں اُسے ہنس کر کہتا تھا کہ تمھارے جیسا پڑھا لکھا اور زندہ دل مولوی ملتان تو کیا شاید پورے پاکستان میں نہ ہو مگر جب میں تمھارا بھاری بھرکم نام مختلف جلسوں کے پوسٹروں پر دیکھتا ہوں تو گھبرا جاتا ہوں کہ بہرحال تم ایک شعلہ بیان مقرر، خطیب اور نجانے کیا کیا ہو اور خدا جانے غیر ارادی طور پر ہم سے تمھاری شان میں کیا گستاخی ہو جائے۔ لہٰذا تم ہمیں بخشو، ہم خود کو ذوالکفل کے ساتھ زیادہ خوش اور آرام میں محسوس کرتے ہیں۔ تاہم سب سے مزیدار وقت وہ ہوتا تھا جب دونوں بھائی اکٹھے ہوتے تھے۔ تب ذوالکفل نے عرصے سے غیر متحرک ادبی تنظیم ''فاران اکادمی'' کو دوبارہ سے زندہ کیا اور تمام دوستوں کو پھر سے ہفتہ وار اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔ عبدالودود شعیب، مختار پارس، خالد سنجرانی، مختار علی اور اسی قسم کے تمام نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی ایک کھیپ اس نے اکٹھی کر لی۔ وہ ہر قسم کے لوگوں کو ایک جگہ اکٹھا کر لینے پر قادر تھا۔ اسی دوران اس نے ایم اے انگریزی پرائیویٹ طور پر کر لیا۔ وہ اردو ادب کے علاوہ فارسی اور عربی ادب پر ابتدائی قسم کے علم سے کہیں آگے درجوں تک پہنچا ہوا نوجوان تھا۔ اب انگریزی ادب بھی اس کا میدان تھا۔ اس نے بطور انگلش لیکچرر ایک گورنمنٹ کالج جوائن کر لیا۔ اِسی اثنا میں اُس نے ایم اے اردو بھی کر لیا۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ اس ڈگری سے پہلے بھی میرے بے شمار جاننے والے اردو کے پروفیسروں سے کہیں زیادہ اردو ادب اور زبان سے آگاہ شخص تھا۔ یہ ڈگری تو محض اس کے علم کا ایک ایسا سرکاری اعتراف تھا جو فی زمانہ نوکری کے حصول کے لیے لازمی قرار پایا ہے۔ وہ صبح سرکاری کالج میں انگریزی اور بعد از دوپہر ایک نام ور پرائیویٹ کالج میں اردو پڑھاتا تھا۔ مجھے ان طلبہ پر رشک آتا تھا جو اس سے اکتسابِ علم کر رہے تھے۔ وہ پڑھانے کے فن سے مالا مال تھا اور کیوں نہ ہوتا؛ ابلاغ، خطابت اور تاثیر اس کا خاندانی ورثہ تھا اور وہ اس وراثت کا صحیح امین تھا۔ میرے پرانے دوست تو پہلے ہی بکھر چکے تھے۔ دوستوں کا یہ نیا حلقہ بھی آہستہ آہستہ غائب ہو گیا اور صرف ذوالکفل ملتان میں رہ گیا۔ اس عرصے میں ہم نے بہت سا وقت ساتھ گزرا۔ یہ میری زندگی کے بہترین وقتوں میں سے ایک تھا۔ پہلے ایسا ہی وقت صفدر سہیل کے ساتھ گزارا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ ذوالکفل عربی بچوں کو انگریزی سکھانے کے لیے سعودیہ چلا گیا۔ کئی سال تک وہ سکول میں پڑھاتا رہا پھر گزشتہ سال وہ مکہ مکرمہ کی ام القریٰ یونیورسٹی میں منتخب ہو گیا اور درمیان میں پاکستان آیا اور کئی ماہ یہاں رہا۔ یہ پیریڈ پرانی یادوں سے بھرپور تھا۔ وہ سعودیہ سے ہر سال ایک ماہ کے لیے آتا تو تمام ممکنہ میسر دوستوں کو صبح کے ناشتے پر اکٹھا کرتا۔ تقسیم میں امرتسر سے آنے والے اس سید خاندان پر کشمیر سے امرتسر اور پھر وہاں سے ملتان ہجرت نے کچھ خاص اثر نہیں کیا تھا۔ میں وہاں بننے والی نہایت عمدہ کشمیری چائے سے مستقل فیض یاب ہونے والوں میں سے تھا۔ جن دنوں ذوالکفل ملتان ہوتا میرے لیے کشمیری چائے کا قہوہ ہمہ وقت موجود رہتا تھا۔ اس مرتبہ وہ پاکستان آیا تو ملاقاتوں کا سلسلہ پرانی ڈگر پر چل نکلا لیکن آخری دنوں میں ہم دونوں اپنی اپنی مصروفیات کے باعث نہ مل سکے اور وہ سعودی عرب چلا گیا۔

میری اہلیہ نے مجھے کہا کہ میں کفیل بخاری سے فون پر بات کر لوں مگر میں نے اسے صاف جواب دے دیا کہ میرے پاس اتنی ہمت ہی نہیں کہ میں کفیل بخاری سے بات کر سکوں۔ یہاں یہ عالم ہے کہ سید عطاء اللہ بخاری کے حوالے سے تو ذوالکفل کو لوگ جان لیں گے لیکن یہاں یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ شخص اپنی اس خاندانی پہچان کے علاوہ کیا تھا اور میرے لیے کیا تھا۔ کسی کو کچھ بتانا بے کار ہے۔ یہاں امریکہ میں اکیلا میں ہوں اور میرا بھیگا ہوا تکیہ ہے۔ ذوالکفل کو تو بیت اللہ میں نماز جنازہ نصیب ہوئی۔ درجنوں دوستوں کی موجودگی کے باوجود میں یہاں اس وقت تنہا ہوں اور اس تنہائی میں مجھے قرآن مجید کی ایک آیت حوصلہ دے رہی ہے۔ **کل من علیھا فان**۔ (ہر چیز جو اِس زمین پر ہے فنا ہو جانے والی ہے)۔ (روزنامہ جنگ ۱۸/ نومبر ۲۰۰۹ء)

انا للہ وانا الیہ راجعون

سجاد جہانیہ

چہار جانب عمارت کے بیچوں بیچ ایک وسیع صحن ہے اور ایک کشادہ پھیلاؤ والے درخت تلے کتنی ہی چارپائیاں بچھی ہیں۔ جن پر یہاں وہاں افسردہ لوگ بیٹھے ہیں۔ شمالی سمت لائبریری ہے۔ اس کی دیوار کے ساتھ چارپائیوں کے بیچ ایک کرسی دھری ہے۔ کرسی پر دودھ ایسی اُجلی دراز ریش اور ویسی ہی اُجلی رنگت والے ایک بزرگ بیٹھے ہیں۔ انھوں نے ٹیک چھوڑ رکھی ہے۔ دو کہنیاں کرسی کے بازوؤں پر ہیں اور بائیں ہاتھ کی پشت کو داہنے ہاتھ کی ہتھیلی سے سہلایا کرتے ہیں۔ لوگ آتے ہیں۔ ان سے مصافحہ کرتے ہیں۔ پرسا دیتے ہیں۔ یہ کمال ضبط سے پرسا لیتے ہیں اور آنے والے کو بیٹھنے کا کہتے ہیں۔ میں اور جمشید رضوانی ان بزرگ سے مل کر بیٹھ چکے ہیں۔ اتنے میں ایک سروقامت نیم سپید، نیم سیاہ ڈاڑھی والے نوجوان مردفون سنتے ہوئے آتے ہیں۔ سب کے ساتھ ساتھ ہم سے بھی گلے ملتے ہیں۔ جب بھی کوئی تعزیت کے کلمات بولتا ہے تو ان کے چہرے کے خطوط متغیر ہونے لگتے ہیں، آنکھیں گویا چھلک پڑنے کو ہوتی ہیں لیکن فوراً ہی وہ با آواز بلند **انا للّٰہ وانا الیہ راجعون** پڑھنے لگتے ہیں۔ ''بے شک ہم اللہ ہی کے ہیں اور اسی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں'' یہ کلمات ان کے ضبط کی گرتی ہوئی دیوار کو پھر سے استوار کر دیتے ہیں۔

یہ منظر شہر ملتان کے چوک پل مردہ خانہ کے پہلو میں واقع دارِ بنی ہاشم کا ہے۔ کرسی پر بیٹھے بزرگ وکیل شاہ صاحب ہیں اور جو فون سنتے ہیں ان کا نام کفیل شاہ بخاری ہے۔ امیر شریعت کے گھر کا یہ آنگن ہے اور ان دونوں حضرات میں سے اول الذکر کا فرزندِ ثانی اور مؤخر الذکر کا برادرِ خورد اور ہمارا دوست ذوالکفل بخاری ایک ہی روز قبل مکہ مکرمہ میں اذنِ ایزدی کی بجا آوری میں پیامِ اجل کو لبیک کہہ گیا ہے۔ مرحوم کو ام المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی آخری آرام گاہ کے قریب ہی آسودۂ خاک کیا جا چکا ہے۔ ایسی جگہ اور ایسی زمین میں روزِ محشر تک سونے کے لیے جگہ مل جانا ہر مسلمان کی خواہش ہے اور آرزو۔ مگر کیا اب عینک کے شیشوں کے عقب سے مسکراتی ہوئی آنکھیں کبھی نظر نہ آئیں گی! قدرے بیٹھی ہوئی مگر شوخی سے بھرپور آواز اب یہ کان کبھی نہ سن پائیں گے۔ اب اس آنگن میں کوئی ہمیں گاڑی تک رخصت کرنے نہیں آئے گا اور بالکل آخری لمحے پر روک کر یہ نہ کہے گا ''اچھا اک لطیفہ سندے جاؤ'' موت تو ہر سانس لینے والے کا مقدر و منتہیٰ ٹھہری مگر ایسی جلدی اور ایسی اچانک۔ لیکن جب اس مٹی کے گھر میں بولنے والی روح کے لیے رجوع کرنا ہی انجام ہے تو کیسی جلدی اور کیا اچانک۔

مدت ہوئی کہیں پڑھا تھا کہ جب کشمیر میں کسی شادی شدہ شخص کی وفات ہو جائے تو اس کی بیوہ میت پر ''ہے تو بو، ہے تو بو'' کہہ کر بین کرتی ہے۔ ان کشمیری الفاظ کو اگر اردو کا جامہ پہنایا جائے تو ''ہائے میری روٹی'' بنتا ہے۔ سچی بات ہے جب پندرہ نومبر کی شب جمشید نے فون پر شاہ جی (ذوالکفل بخاری) کی وفات بارے بتایا تو میرا جی چاہا کہ میں بھی بلند آہنگ سے ''ہائے میرا ناشتہ، ہائے میرا ناشتہ'' کے بین کروں۔ ناشتوں کا اہتمام کرنا اور دوستوں کو جمع کرنا شاہ جی کا پسندیدہ شغل تھا۔ پتا نہیں امیر شریعت کے اس گھر میں ناشتے کا دسترخوان دوستوں کے آگے دراز کرنے کی روایت کب سے ہے۔ تاہم پچھلے بارہ برسوں سے چنیدہ دوستوں کے اس ناشتے کا ایک شریک میں بھی رہا ہوں۔ اس ناشتے کے لیے یوں تو کوئی لگے بندھے ایام نہ تھے۔ تاہم عیدین پر، عید کے

دوسرے تیسرے روز تو یہ اہتمام ضرور ہوتا۔ عیدین کے ناشتے کی حکمت یہ تھی کہ وہ دوست جو بسلسلہ روزگار شہر سے باہر قیام رکھتے تھے، وہ ان تہواروں پر دستیاب ہوتے۔ خالد مسعود، رؤف، جمشید اور میں تو عیدین کے ان ناشتوں کے یقینی مہمان ہوتے باقی بدلتے رہتے۔ ناشتہ ایسا بھرپور اور متنوع کہ آپ سارے لوازمات چکھ نہیں سکتے۔ پھر شاہ جی گھر کے اندر چکر پہ چکر لگاتے اور لسی کے لبالب جگ لاتے۔ بہ اصرار ایک ایک ڈش اٹھا کر سب کو پیش کرتے۔ ایسے میں کبھی ان کے والد وکیل شاہ صاحب بھی گھڑی کی گھڑی آن بیٹھتے تو منڈلی قدرے سنجیدہ ہو جاتی۔ کفیل شاہ تو خیر موجود ہی رہتے۔ امیرِ شریعت کو میں نے نہیں دیکھا تاہم مختار مسعود نے اور دیگر تذکرہ نگاروں نے اپنی تحریروں میں ان کا جو حلیہ باندھا ہے، میرا خیال ہے کہ وہ ہوبہو کفیل شاہ جیسے رہے ہوں گے۔ ☆

پچھلے چھے برسوں سے ناشتے کے ان جلسوں میں وقفے بڑھ گئے تھے اور یہ سلسلہ کسی قدر بے قاعدگی کا شکار تھا۔ اس کی وجہ شاہ جی کا سعودی عرب کے ایک کالج میں پروفیسر مقرر ہونا تھا مگر جو بھی عید وہ یہاں کرتے، اس کے دوسرے تیسرے روز ناشتے کی محفل ضرور جمتی۔ گزشتہ برس کے اواخر میں شاہ جی کا کنٹریکٹ ختم ہوا تو وہ کوئی چھے ماہ تک ملتان میں رہے۔

خبریں کے قارئین کو یاد ہوگا کہ انھوں نے ادارتی صفحہ پر اس دوران کالم بھی لکھے۔ افسوس کہ ایسی خوبصورت اور پرشکوہ نثر لکھنے والا قلم خاموش ہو گیا۔ سالِ رواں کے ابتدائی ایام میں انھوں نے ایک ناشتے کا اہتمام کیا۔ ان کا فون موصول ہوا مگر میں شہر سے باہر تھا، جمشید بھی نہ جا سکا اور میرا خیال ہے شاید خالد مسعود بھی۔ اس خفت کو مٹانے کے لیے میں اور جمشید پروگرام بناتے رہے کہ اپنے ہاں ناشتے یا کھانے کا انتظام کرتے ہیں۔ شاہ جی کو اور دیگر دوستوں کو اکٹھا کریں گے۔ مگر ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ''۔ ہم دونوں وقت ہی طے نہ کر سکے اور شاہ جی ایک مرتبہ پھر عازمِ سعودی عرب ہو گئے۔ سو اب پچھتاوے ہیں اور سوچیں۔ ان یادوں کے بوجھ سے دل ہے کہ ڈوبا جاتا ہے مگر پھر یکا یک چارپائیوں پر بیٹھے لوگوں میں ہلچل پیدا ہوتی ہے۔ سکوت سے بہتی لہروں میں جیسے ارتعاش سا آ گیا ہے کہ جس نے میری یادوں کے اس سلسلے کو بھی منتشر کر دیا ہے۔ پتا چلتا ہے کہ امیرِ شریعت کی آخری نشانی، ان کے فرزند سید عطاء المہیمن بخاری آتے ہیں۔ لائبریری کی دیوار تلے بچھی چارپائی پر جگہ بنا دی گئی ہے۔ فرزندِ امیرِ شریعت ایک ایک سے مصافحہ کرتے اور سلامتی بھیجتے ہوئے آن کر وہاں بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ بھی بڑے حوصلے میں ہیں۔ بہت سی باتیں کرتے ہیں، ویسی ہی کہ جیسی ابنِ امیرِ شریعت کو زیبا ہیں۔ ایک جملہ ایسا ہے کہ ذوالکفل کے سفرِ آخرت میں ریفرنس کے طور پر ان کے کام آتا رہے گا۔ سید عطاء المہیمن بخاری کہتے ہیں ''اپنی عمر کے اعتبار سے ہمارے خاندان کا وہ صالح ترین نوجوان تھا۔'' سننے والوں کے گوشہ ہائے چشم نمی چھوڑنے لگتے ہیں۔ جمشید کہ میرے ساتھ بیٹھا ہے، اس کا پیمانہ بھی چھلک پڑنے کو ہے۔

ہم دونوں اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وکیل شاہ صاحب اور عطاء المہیمن شاہ صاحب سے الوداعی مصافحہ کرتے ہیں۔ کفیل شاہ سے بغل گیر ہوتے ہیں۔ ہمیں رُخصت کرتے ہوئے کفیل شاہ صاحب جمشید سے کہتے ہیں ''تعزیت کے لیے آنے والوں کا رش ذرا کم ہو جائے پھر اس کے تمام دوستوں کو ناشتے پر اکٹھا کریں گے اور اس کی خوب باتیں کریں گے۔'' یہ جملہ مکمل کرتے ہوئے کفیل شاہ کے گلے میں گویا کوئی گولا سا اٹک گیا ہے جس کے زیرِ اثر آواز بھرانے لگتی ہے۔ وہ پھر زور لگا کے گولا نگل جاتے ہیں اور بلند آہنگ سے کہتے ہیں ''انا للہ وانا الیہ راجعون۔''

(روزنامہ خبریں ملتان ۱۸/ نومبر ۲۰۰۹ء)

☆ صاحبِ مضمون کا حسن ظن ہے اور حقیقت یہ ہے کہ امیر شریعت کی شکل وشباہت، قامت وجسامت، علم وعمل، اخلاق وکردار اور جرأت وشجاعت کی جھلک ان کے چاروں فرزندوں میں بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے محاسن اُن کی ذریت میں بھی ودیعت فرما دیں۔ میں کیا اور میری مماثلت کیا؟ اک بس ذرۂ حقیر کو اُن سے نسبت حاصل ہو گئی۔ الحمد للہ (کفیل)

یادِ یارِ مہرباں

ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان

سال کی آخری رات ......آخری رات کا آخری پہر...... باہر تاریکی ہے اور اندر بے قراری ......آنکھیں شاید بند ہیں لیکن کان سن رہے ہیں۔ زباں بات کرنے کو ترستی ہے۔ فون ملاتا ہوں تو دوسری جانب سے ایک آواز سنائی دیتی ہے۔ آواز شاید کسی دور کے سیارے سے آرہی ہے، اس لیے پہچانی نہیں جا رہی ہے۔ پوچھتا ہوں ’’کون؟‘‘

’’ذوالکفل بخاری!‘‘

’’کون؟‘‘ حیرت سے دوبارہ دریافت کرتا ہوں۔

’’ذوالکفل بخاری!‘‘ آواز سنائی دیتی ہے۔

’’ملاقات کیسے ہوگی۔؟‘‘

’’ہمارے درمیان بہت سے فاصلے حائل ہیں‘‘

’’تو کیا میں آجاؤں آپ کے پاس؟‘‘

اس سوال کا جواب نہیں ملتا۔ فون بند ہو جاتا ہے۔ آنکھ سے خواب رخصت ہو جاتا ہے، فقط اک قطرۂ آب رہ جاتا ہے۔

یہ مختصر ترین مکالمہ تھا جو ہمارے درمیان ہوا تھا، ورنہ ہم تو طویل کلام کے قائل تھے۔ ایک دوسرے کو لذیذ اور دراز حکایتیں سناتے تھے۔ باتیں تھیں کہ ختم ہونے میں نہ آتی تھیں ......دین و دنیا اور شعر و سخن کی باتیں، رسالوں اور کتابوں کی باتیں، دوستوں، یاروں اور شہر یاروں کی باتیں، ادب، ایمان اور فاران کی باتیں، شاعری، دلداری اور اسلم انصاری کی باتیں! سچی بات تو یہ ہے کہ: مزے ملے ہیں انہی ’’باتوں‘‘ میں عمر بھر کے مجھے!

پیاری پیاری باتیں کرنے والا یہ شخص، اٹھارہ برس پہلے، ایک سنہری شام کو مجھے پہلی بار ملا تھا۔ ان دنوں میں نے نیا نیا چھپنا چھپانا شروع کیا تھا اور خوش فہمی کے مارے خود کو ایک ’’مشہور‘‘ ادیب بھی خیال کرنے لگا تھا۔ چناں چہ میں یہ سمجھا کہ شاید کوئی ’’مداح‘‘ ملاقات کے لیے آیا ہے۔ اس نے مجھ سے میرے نظریۂ فن اور اندازِ تحریر کے بارے میں سوالات کیے تھے اور میں نے نہایت ’’مدبّرانہ شان‘‘ سے ان کے جوابات دیے تھے۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ وہ والد صاحب (پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان صاحب) سے ملنے آیا تھا اور ان کی غیر موجودگی میں مجھ سے ہم کلام ہوا تھا۔ لیکن میں نے کیسے لہجے بنا بنا کر اور ہاتھ ہلا ہلا کر اسے مرعوب کرنے اور اپنی ’’ادبی عظمت‘‘ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی......آج بھی یہ واقعہ یاد کرتا ہوں تو شرمسار ہو جاتا ہوں۔ میں نے اس کے سامنے اپنی خوش فہمی کا اعتراف بھی کیا تھا لیکن وہ وضع دار شخص طرح دے گیا۔ گویا ہوا ’’اچھا، مجھے یہ بات یاد نہیں۔‘‘ انسانی

کمزوریوں کو نظر انداز کرنا اور خامیوں سے اغماض برتنا اس کا شیوہ تھا۔

اس کے نام میں کتنی کشش، مٹھاس اور دل آویزی تھی ......ذوالکفل بخاری! پکاریے تو زبان کو شہد کا ذائقہ محسوس ہوتا ہے۔ اس کی شخصیت بھی شہد کی طرح منزّہ، لطیف اور شیریں تھی۔ وہ ایک پرکشش مسحور کن اور دل آویز شخصیت کا مالک تھا۔ ہم تو اسے پا کر دیوانے ہو گئے تھے۔ مستحسن خیال، خالد مسعود، شعیب ودود، مختار پارس، افتخار شفیع، توحید الرحمٰن ...... ہم سب اس کے دیوانے ہی تو تھے۔ نوجوان تو ایک طرف رہے، بزرگ بھی اس کے گرویدہ تھے۔ جناب اسلم انصاری، جناب تاثیر وجدان، جناب حفیظ الرحمٰن خان ...... سب اس کی علمی اور تخلیقی خوبیوں کے معترف تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ مشفق خواجہ مرحوم ملتان تشریف لائے تھے۔ خواجہ صاحب جو خود محبوبِ نظر اور مرجع خلائق تھے، ذوالکفل بخاری پر فریفتہ ہو گئے۔ وہ ایک وضع دار شخص تھے لیکن ایسے از خود رفتہ ہوئے کہ بار بار ذوالکفل کے گلے سے رومال چھیننے کی کوشش کرتے تھے اور بے تکلفی سے گویا ہوتے: ''یہ آپ نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟'' خواجہ صاحب دراصل ذوالکفل کے حسنِ تکلم، علمی لیاقت اور اندازِ تحریر سے بہت متاثر تھے اور چاہتے تھے کہ ذوالکفل پورے کا پورا ادب میں داخل ہو جائے۔ ذوالکفل ان کی اس ادا پر بس مسکراتا رہا۔ وہ کسی اور منزل کا مسافر تھا...... حکمت، ہدایت اور حقیقت کی منزل کا مسافر! ادب کو تو وہ محض چراغِ راہ خیال کرتا تھا۔

ادبی شہرت سے وہ یکسر بے نیاز تھا۔ فاران اکادمی میں بھی اس نے صرف اس لیے شمولیت اختیار کی تھی کہ یہ ایک نظریاتی تنظیم تھی۔ فاران اکادمی میں ذوالکفل بخاری کی شمولیت ملتان کی ادبی تاریخ کا سنہری واقعہ ہے۔ سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک آملا تھا۔ اکادمی کی سرگرمیاں ایک عرصے سے معطل تھیں۔ ۱۹۹۱ء میں تنظیم کا احیاء کیا گیا۔ اس دوسرے دور میں شعیب ودود، مختار پارس اور غم زدہ راقم فاران کے فعال رکن تھے لیکن ذوالکفل سب میں نمایاں اور برتر تھا۔ ایک طویل عرصے تک ذوالکفل نے فاران کے اجلاسوں میں نظامت کے فرائض انجام دیے۔ وہ ناظمِ محفل بھی تھا اور رونقِ محفل بھی!! وہ کچھ اس ادا سے محفل پر چھایا ہوتا تھا کہ بزرگ اسے ستائش کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور نوجوان رشک سے تکتے تھے۔ اس زمانے میں اس نے اکادمی کے بعض اجلاسوں کے رپورتاژ بھی تحریر کیے۔ ان رپورتاژوں نے ملتان کی دنیائے ادب کو چونکا دیا تھا...... تھی ''حریفوں'' کو بھی حیرت کہ یہ آواز ہے کیا؟..... اس کی نثر اس کی گفتگو کی طرح شگفتہ، معنی خیز اور خیال انگیز تھی۔ وہ قلم کار اور خوش گفتار...... دونوں حیثیتوں میں ایک صاحب اسلوب شخص تھا۔

ذوالکفل بخاری یوں تو بہت لطیف، مہربان اور خلیق تھا لیکن اس کی شخصیت میں ایک خاموش سا رعب، دبدبہ اور جلال بھی تھا جسے صرف ''رزمِ حق و باطل'' میں ہی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ میں نے آپ دیکھا یہ معجزہ...... کہ اس کے سامنے ثقہ قسم کے الحاد پرست اور مذہب بیزار قرآن و حدیث کی باتیں کرنے لگتے تھے۔ اس امر کا میں نے بارہا مشاہدہ کیا تھا اور یہ بات کئی بار اسے شوخ انداز میں بتائی تھی۔ میں نے خود جب کبھی اس سے کسی دینی مسئلے کی بابت دریافت کرنا ہوتا تھا تو کچھ اس انداز کی تمہید باندھتا تھا ''ذوالکفل صاحب، آپ کو دیکھ کر لوگوں کو قرآن و حدیث کی باتیں یاد آتی ہیں...... ذرا مجھے یہ تو بتائیں کہ فلاں مسئلے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟'' کبھی کبھار کچھ اس انداز سے استفسار کیا جاتا ''آپ ہمارے عالم دین ہیں

...... ذرا اس مسئلے پر تو روشنی ڈالیں۔'' یہ بے تکلفی کا ایک پیرایہ تھا جسے سائل اور مسئول خوب سمجھتے تھے۔ آخری ملاقات میں ...... ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے جدا ہونے سے کچھ دیر پہلے ...... میں نے اسی پیرائے میں ایک حدیث کے بارے میں اس سے سوال کیا تھا جس کا اس نے مدلل جواب دیا تھا۔ ہم آسانی سے ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے۔ وقتِ رخصت، ملاقات کے دورانیے سے طویل ہوتا تھا۔

جب تک ذوالکفل میری زندگی میں نہیں آیا تھا، زندگی کتنی بے رنگ، بے روح اور بے معنی تھی۔ اب جب کہ وہ زندہ تر شخص، حیات نہیں رہا، دنیا اندھیر ہوگئی ہے۔ ذوالکفل عدم کی راہ پر روانہ ہوگیا ہے لیکن شہرِ دل کے ہر راستے پر اس کا نقشِ پا ہے اور گلی گلی اس کی یاد بچھی ہے۔ جب تک یہ دل دھڑکتا ہے، نقشِ پا جگمگاتا رہے گا اور یاد کا چراغ روشن رہے گا۔ اس وقت کیفیت یہ ہے کہ فون کی گھنٹی بجتی ہے تو سماعت، آوازِ دوست کو ترستی ہے۔ کتاب اٹھاتا ہوں تو صورتِ یار دکھائی دیتی ہے۔ آج بھی میں نے داغ ہائے سینہ کو تازہ کرنے کے لیے ذوالکفل کے اس مضمون کا مطالعہ کیا جو اس نے میری کتاب ''گفتنی شگفتنی'' کے حوالے سے تحریر کیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر محض چوبیس برس تھی لیکن اتنی کم عمری میں وہ حد درجہ پختہ، شگفتہ، معنی خیز اور خیال انگیز نثر لکھنے پر قادر ہو چکا تھا۔ اس کے مطالعے کی وسعت اور اندازِ بیان کی ندرت کا اندازہ اہلِ نظر اس تحریر سے بخوبی کر سکتے ہیں۔ مضمون کے آخر میں اس نے فارسی کا ایک شعر درج کیا تھا۔ شعر سادہ ہے لیکن اب اس کی معنویت پیچیدہ اور پُر اسرار ہوگئی ہے۔

ایں نوشتم تا بہ ماند یادگار
من نہ مانم، ایں بہ ماند برقرار

اسرارِ حیات کے عارف نے اپنی جواں مرگی کی جانب پندرہ برس قبل ہی اشارہ کر دیا تھا۔ یہ شعر لکھ کر اس نے دوستی کے افسانے کا انجام بھی تحریر کر دیا تھا۔ مگر وقت کی روانی ایسی تھی کہ تب شعر کی معنویت سمجھ میں نہ آئی تھی۔

کل رات میں کمپیوٹر پر اس کی ایک ای میل دیکھ رہا تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ میں جلد ہی تمھارے حکم کی تعمیل میں مضمون مکمل کر کے بھیج دوں گا ...... تمھارا بھتیجا بختیار خلجی۔ یہ تحریر پڑھ کر دل افسردہ ہوگیا۔ مجھے وہ خوبصورت دن یاد آ گئے جب اس نے ایک روز اکیلے میں، زندگی کے میلے میں ...... مجھے ''چچا عبدالباقی'' کا خطاب عطا کیا تھا۔

''چچا عبدالباقی'' دراصل اردو طنز و ظرافت کا ایک ایسا کردار ہے جو بیک وقت معصوم بھی ہے اور چالاک بھی اور جو اپنی بات منوانے کے لیے ہر طرح کے حربے ...... سادگی، پرکاری، ہوشیاری اور نادانی ...... استعمال کرتا ہے۔ ادھر بھتیجا ہے جو نہایت سعادت مند اور وضع دار ہے اور اپنے چچا کی ہر بات خاطر سے یا لحاظ سے مان جاتا ہے۔

بھتیجے بختیار خلجی! تم شاید اپنے چچا کی ''فرمائشوں'' اور ''فریب کاریوں'' سے تنگ آ کر کسی گوشہ چمن میں آباد ہو گئے ہو لیکن یہ تو سوچا ہوتا کہ تمھارے بغیر چچا عبدالباقی کی زندگی ادھوری ہے اور اس کے کردار میں کوئی کشش اور معنویت نہیں رہی ...... باقی، باقی!

فاران اکادمی کا آخری اجلاس

مختار پارس

فاران اکادمی کا آخری اجلاس ۱۵/نومبر ۲۰۰۹ء کو کعبۃ اللہ کے مطاف میں بعد نمازِ فجر منعقد ہوا۔ صدارت ذوالکفل بخاری کے جسدِ خاکی نے کی۔ حاضرینِ مجلس کی تعداد تو شاید لاکھوں میں تھی لیکن سارے چہرے اجنبی تھے۔ اجلاس چونکہ ہنگامی نوعیت کا تھا، اس لیے صدرِ مجلس کے دوست اس محفل میں شرکت نہ کر سکے۔ بخاری کے گھر والے پہلے بھی اس کی ادبی تقریبات میں شرکت شاذ و نادر ہی کرتے تھے۔ اس دن بھی دارِ بنی ہاشم سے فاران اکادمی کے اس اہم اجلاس میں شرکت کے لیے کوئی نہ آیا۔ جانے کون لوگ تھے جنھوں نے ذوالکفل بخاری کے خاموش خطبۂ صدارت کو سر دھن کر سنا اور خاکِ بنو ہاشم کو اٹھا کر جنتِ معلیٰ میں بکھیر آئے۔

داستانِ رفاقت اچانک ختم ہوگئی اور کہانی کے کردار یکلخت اپنے اپنے انجام کو دیکھے بغیر ریگزارِ گماں میں گم ہوگئے۔ پہلی ملاقات میں ہم ایسے ملے تھے جیسے کئی نسلوں کی شناسائی تھی۔ میں نے اپنے نانا سے اُن کے نانا کا تذکرہ سن رکھا تھا۔ اپنے بابا سے موچی گیٹ کے احوال بھی روز سنتے تھے۔ ایسے میں جب ان سے پہلی بار مصافحہ کیا تو اس ایک لمحے میں جنم لینے والی دوستی کا وقت کی کسی سرحد سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ پچھلے سال میرے گھر آئے تو اپنے عطاء المکرم کی میرے حسنات سے دوستی کروا گئے۔ یہ آنے والے وقتوں کے لیے بہت ضروری تھا۔ اس سال عطاء المکرم اکیلا واپس آیا۔ میں نے اُس کے ننھے ہاتھوں کو ٹٹول کر، اُس کی روشن آنکھوں میں جھانک کر ذوالکفل کی جھلک دیکھنے کی بہت کوشش کی۔ وہ جھلک تو یقیناً وہاں موجود تھی مگر مجھ سے زمانوں دور۔ وہ آنکھیں جو میری روح تک رسائی رکھتی تھیں، وہاں موجود تو تھیں مگر انھیں اب کچھ اور دیکھنا تھا۔ ہمیں اپنے حصے کی رفاقت دے کر اس نے نگاہیں وقت کے کسی اور دروازے پر رکھ دیں۔ سات سال سے حجاز کے مدار میں گھومنے والے کو بالآخر منزل مل ہی گئی۔

ڈاکٹر رب نیاز سے ان کا گہرا راز و نیاز تھا۔ مجھے اُن سے گلہ ہے کہ انھیں معلوم تھا لیکن انھوں نے پھر مسافر کا راستہ نہیں روکا۔ مسافر نے ایک بار شکوہ کیا کہ عزمِ سفر باندھتا ہوں مگر ہر بار کوئی زنجیر قدموں کو روک لیتی ہے۔ رب نیاز نے کہہ کہہ کر اُن کے عزم کو اور پختہ کر دیا کہ منزل اگر بلا رہی ہے تو آپ جائیں گے ضرور۔ نہیں معلوم کہ رب نیاز نے ذوالکفل بخاری کا وہ آخری خط کھول کر پڑھا بھی ہے یا نہیں جو اسے ان کی وفات کے بعد موصول ہوا ہے۔ اسے ضرورت تو نہیں ہے اس مراسلے کو چاک کرنے کی۔ وہ تحریر ذوالکفل کی جبینِ شوق پر ثبت اشاروں سے مختلف نہیں ہوگی۔ رب نیاز نے ایک روز پوچھا کہ آج کچھ مضطرب نظر آتے ہیں! خیریت؟ جواب میں آنکھیں بھر آئیں۔ آواز لرز گئی۔ کہنے لگے کہ آج حضرت نے مجھے کچھ عجیب نظروں

سے دیکھا ہے۔ یہ کہہ کر آنکھیں اور بھیگ گئیں۔ رب نیاز نے حوصلہ دیا کہ فقیر کی نگاہ سے کچھ ملا ہی ہوگا۔ رنجیدہ کیوں ہوتے ہیں؟ جواب کچھ نہیں آیا مگر ہچکی اور بندھ گئی۔ وہ لمحے چٹکی بجاتے میں بیت گئے۔ نئے لمحوں میں پرانے رونے والے نہ رہے اور نئے رونے والوں نے پرانے لمحوں کی ارادت اختیار کر لی۔ کون ہجر میں ہے اور کون فراق میں، کون مرشد ہے اور کون مرید، کسے خبر ہے اور کسے نہیں، یہ کون جانتا ہے۔ جو جانتا تھا وہ بجھارتیں ڈال کر چلا گیا۔ اور پہیلیاں بوجھنے والے عالمِ بے یقینی میں ابھی بھی پوچھتے ہیں کہ یہ کیا ہوا؟

خالد مسعود ہمیں کہتا تھا کہ ذوالکفل جیسا روشن خیال مولوی پورے پاکستان میں نہیں ہے۔ ایک دفعہ میں نے بہت سوچا کہ خالد مسعود نے یہ کیا بات کہی۔ بہت غور و فکر کے بعد ہجومِ یاراں پر نگاہ ڈالی تو راز افشا ہو گیا۔ درحقیقت وہ فقط آئینہ تھا۔ ہر شخص کو وہ اپنے جیسا لگتا تھا۔ وہ امید تھی، ستارہ تھا، سراب تھا یا گرداب، وہ وہی تھا جو اس کے سامنے تھا۔ کبھی وہ میں تھا اور کبھی وہ کوئی اور۔ ایسے شخص کو تو اچانک ہی غائب ہونا تھا۔ نہ جانے کتنے لوگ ہیں جنھوں نے تب سے اپنا چہرہ نہیں دیکھا۔

ایک بار نہ جانے مجھے کیا ضرورت تھی کہ ذوالکفل کو ڈھونڈ رہا تھا، اور وہ کہیں موجود نہ تھا۔ رفیقِ دیرینہ ذیشان قادری سے اسی اثنا میں کہیں ملاقات ہوگئی تو کہا کہ بخاری صاحب نہیں مل رہے، اور ضرورت بھی شدید ہے۔ وہ کھلکھلا کر ہنسا اور بولا کہ جناب ادھر ادھر بھاگ کر ہلکان نہ ہوں۔ ملتان کی کسی سڑک پر خاموشی سے کھڑے ہو جائیں، بخاری صاحب اپنے کالے ہنڈا پر پندرہ بیس منٹ میں وہاں سے ضرور گزریں گے۔ اب تو بیسیوں دن گزر گئے۔ ملتان کی سڑکوں پہ گھنٹوں کھڑے ہو کر دیکھا ہے۔ لگتا ہے اس شخص نے اب راستہ بدل لیا ہے۔ مجھے اس سے کوئی اور کام نہیں۔ مجھے صرف انھیں یہ بتانا ہے کہ پندرہ نومبر سے پندرہ دن پہلے جو دوائیاں میری علیل اماں کے لیے دے گئے تھے، وہ ابھی ویسے کی ویسے پڑی ہیں۔ شاید انھیں خبر نہ ہو کہ پندرہ نومبر کے پندرہ دن بعد میری اماں بھی چل بسی تھیں۔ مجھے تو صرف یہ پوچھنا ہے کہ یہ کیسی رمزِ کائنات ہے کہ امیدوں کے چراغ جلانے والے پہلے عازمِ سفر ہو جاتے ہیں اور چراغ ہوائے ناموافق میں گل کہیں بعد میں ہوتے ہیں۔ مجھے کہنا تھا کہ اس سال کی سردیوں نے میرے ساتھ بڑی سرد مہری دکھائی۔ ۲۰۰۹ء کی زمستانی ہواؤں میں نہ چراغ رہا اور نہ دودِ چراغِ محفل۔

آہ! سید ذوالکفل بخاری

رؤف طاہر☆

ابھی تو یارِ طرحدار طاہر جمیل اور وضعدار و سراپا انکسار قاری شکیل کی جدائی کے زخم بھرے نہیں تھے کہ سید ذوالکفل بخاری بھی ایک گہرا گھاؤ دے گئے۔ ۳۹ سالہ سید زادے کی اچانک رحلت کی خبر، جس نے بھی سنی، دل تھام لیا۔ ڈاکٹر عرفان ہاشمی نے فون پر تصدیق چاہی اور ہاں میں جواب پا کر بے ساختہ پکار اُٹھے: خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود۔ ڈاکٹر ہاشمی میں مزید کچھ کہنے سننے کا یارانہ تھا۔ بھرّائی ہوئی آواز میں خدا حافظ ہی کہہ پائے اور فون بند کر دیا۔

تقریباً سات سال ہوتے ہیں، سعودی وزارتِ تعلیم نے ابتدائی مدارج سے ہی سعودی بچوں کو انگریزی سکھانے کے لیے پاکستان سے لگ بھگ اڑھائی سو اساتذہ کا انتخاب کیا۔ یہ کالجوں کے نوجوان اساتذہ تھے۔ ان میں سید ذوالکفل بخاری بھی تھے جو ان دنوں ملتان کے ایک سرکاری ادارے میں انگریزی کے لیکچرار تھے۔ برِصغیر کے بے مثل خطیب اور تحریک آزادی میں ''احرار'' کے قافلۂ سالار سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے نواسے..... لیکن یہ محض ''پدرم سلطان بود'' والا معاملہ نہیں تھا۔ ذوالکفل اپنی ذاتی خوبیوں اور صلاحیتوں کے ساتھ خود کو اس عظیم خانوادہ کے لائق وفائق سپوت کہلوانے کے حقدار تھے۔

سعودی عرب ملازمت کے لیے آنے والے اکثر افراد کے ذہن میں حرمین کی قربت کا خیال ہوتا ہے۔ ذوالکفل کو بھی یہی گمان تھا۔ لیکن یہاں ان کا تقرر منطقہ تبوک کے قصبے اُملج میں ہوا۔ مدینہ منورہ سے تقریباً ۳۵۰ اور مکہ مکرمہ سے ۵۰۰ کلومیٹر دور چند ہزار نفوس پر مشتمل یہ ساحلی قصبہ اپنی سرسبزی و شادابی کے باعث خاصا پُرکشش ہے۔ لیکن ذوالکفل کی تشنگی کا سبب کچھ اور بھی تھا۔ یہاں ان کے علمی و ادبی ذوق اور تحقیق و جستجو کے شوق کا سامان نہیں تھا، جب تک فیملی پاکستان میں تھی، وہ ویک اینڈ پر عموماً جدہ کا رخ کرتے۔ نمازِ جمعہ کی حرم مکی میں ادائیگی کے علاوہ ان کا بیشتر وقت طاہر جمیل (مرحوم) کی ادبی بیٹھک میں گزرتا۔ یہاں جدہ کی علمی و ادبی شخصیات سے گفتگو رہتی۔ عمرے کے لیے پاکستان سے آئے ہوئے کسی شاعر یا ادیب سے بھی یہاں ملاقات ہو جاتی۔ جدہ کے بک سٹالز پر پاکستان سے آئی ہوئی کوئی نئی کتاب دستیاب ہوتی تو اسے خرید لیتے۔ ہفتے کے باقی پانچ دنوں کے لیے سیرابی کا اہتمام کر کے واپس اُملج چلے جاتے۔ وہ محکمہ تعلیم پنجاب سے ''طویل رخصت'' پر تھے۔ یوں پاکستان میں ان کی سرکاری ملازمت محفوظ و مامون تھی۔

اُملج کے چھوٹے سے قصبے میں ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں کے اظہار اور فروغ کے لیے کچھ نہ تھا۔ کئی بار وطن واپسی کا سوچا، پھر یہ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا کہ شاید حرمین کی قربت کی تڑپ رنگ لے آئے اور اللہ تعالیٰ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں قیام کی کوئی صورت پیدا کر دے۔ ۲۰۰۸ء میں ان کے نالوں کا جواب آ گیا۔ مکہ مکرمہ کی اُم القریٰ یونیورسٹی میں انگریزی کے

☆اردو میگزین، جدہ

استاد کی حیثیت سے ان کا انتخاب ہو گیا تھا۔ اُم القریٰ یونیورسٹی میں ملازمت کے لیے نیا ویزہ اسلام آباد میں سعودی سفارت

خانے سے لگتا تھا۔ انھوں نے اُملج والی ملازمت سے استعفیٰ دیا اور نئے ویزے کے لیے پاکستان روانہ ہوگئے، لیکن عشق کا امتحان ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ نئے ویزے میں کچھ تکنیکی مسائل حائل ہوگئے تھے۔ اس دوران ذوالکفل سے فون پر عموماً رابطہ ہوتا۔ ایک روز میں نے کہا: شاہ جی! پریشانی کی کیا بات ہے، آپ کی سرکاری ملازمت محفوظ ہے، اِسے جوائن کرلیں، اوراب تو کالج اساتذہ کی تنخواہیں بھی اچھی خاصی ہیں۔ خانوادۂ رسول ویسے بھی سیر چشم واقع ہوا ہے۔ آپ انگریزی کے استاد ہیں۔ دو تین ساتھیوں کے ساتھ مل کر شام کو انگلش اکیڈمی کھول لیں۔ اس بکھیڑے میں نہ پڑنا چاہیں تو کسی پرائیویٹ ادارے میں ایک دو پیریڈ لے لیا کریں۔ آپ کے لیے ملتان ہی سعودی عرب ہوجائے گا۔

......لیکن ذوالکفل کی تڑپ سعودی ریالوں کے لیے تو نہیں تھی۔ مجھے یاد آیا ایک بار انھوں نے کہا تھا، حرمین کی قربت ان کے لیے کسی بھی نعمت، کسی بھی دولت سے بڑھ کر ہے۔ ’’یوں لگتا ہے یہاں کی مٹی مجھے اپنی طرف کھینچتی ہے۔‘‘ ’’یہ مٹی ہے بھی تو یہیں کی۔‘‘ میں نے جواب دیا تھا...... پھر اس سال مارچ میں ویزہ لگ گیا اور اور ذوالکفل اپنے خوابوں کی سرزمین میں واپس آگئے۔ اب وہ بہت خوش تھے، جیسے دولتِ کونین مل گئی ہو۔ انھوں نے محلّہ عزیزیہ میں گھر لیا، جو حرم سے پانچ سات منٹ کی مسافت پر تھا۔ یوں بھی ہوتا کہ رات کے کسی پہر دلِ بے تاب مچل اٹھتا اور ذوالکفل حرم کا رُخ کرتے۔ ڈھلتی شب کے اس پہر طواف کا اپنا لطف تھا۔ ہجوم نہ ہونے کے باعث حجرِ اسود کو بوسہ دینا بھی آسان تھا اور غلافِ کعبہ سے لپٹ کر دیر تک آہ وزاری میں بھی کوئی مخل نہ ہوتا۔ صحنِ حرم میں بیٹھ کر کعبے کو دیکھتے رہنے کا اپنا ہی لطف تھا۔ ذوالکفل ان نعمتوں سے خوب فیضیاب ہوتے۔ میں جدہ سے روانہ ہوتے ہوئے فون پر رابطہ کرتا تو حرم کے اندر یا اس کے قرب و جوار میں کوئی جگہ میٹنگ پوائنٹ کے طور پر طے پاتی۔ حرم کے اندر یا اس کے قرب وجوار میں پاکستان سے آئی ہوئی کسی علمی وادبی شخصیت پر نظر پڑتی تو ذوالکفل اسے جالیتے۔ یہ صورتحال ان کے لیے ’’اضافی کشش‘‘ کا باعث تھی۔

اس سال جون کے اوائل میں ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کے ساتھ ایسی ہی ایک طویل نشست میں ان سطور کے راقم کو بھی شرکت کا موقع ملا۔ جدہ میں کوئی علمی وادبی تقریب ہوتی تو ذوالکفل اس میں شرکت کا بھی اہتمام کرتے۔ انھیں نام ونمود سے حتی الامکان گریز ہوتا۔ ان کی خواہش ہوتی کہ پچھلی نشستوں پر بیٹھ کر خاموشی سے استفادہ کرتے رہیں۔ احباب بہ اصرار اگلی قطار میں لاتے۔ کسی پروگرام میں ان کی تقریر ہوتی تو کامیاب ترین مقرر وہی ہوتے۔ وہ خطیبِ برِصغیر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے نواسے تھے۔ شاہ جی کے بعد، ان کے صاحبزادگان سید عطاء المنعم بخاری، سید عطاء المحسن بخاری، سید عطاء المومن بخاری اور سید عطاء المہیمن بخاری نے بھی خطابت کی اس شمع کو روشن رکھا۔ لیکن ذوالکفل کی خطابت کا رنگ مختلف تھا۔ کسی سیمینار، کسی کانفرنس میں ان کی تقریر اپنے ’’مواد‘‘ کے علاوہ ’’انداز‘‘ میں بھی ایک پروفیسر اور اسکالر کا رنگ لیے ہوتی۔ وہ روسٹرم پر مکّے برسانے اور گلے کے پورے زور سے حاضرین کے لیے سمع خراشی کا باعث بننے کی بجائے دھیمے لہجے میں الفاظ کے مناسب زیروبم کے ساتھ سامعین کو مسحور کردیتے۔ زورِ خطابت اور شورِ خطابت کے بجائے استدلال کے ساتھ اپنی بات کو آگے بڑھاتے اور سامعین کو مٹھی میں کرلیتے۔ وہ انگریزی کے استاد تھے، لیکن اردو میں تقریر کرتے ہوئے انگریزی سے مکمل پرہیز کرتے۔

وہ دوستوں کے دوست تو تھے ہی، دشمنوں کے بھی دوست تھے کہ ان کے لیے بھی اس کے ہاں خیر خواہی کے سوا کوئی جذبہ نہ تھا۔ وہ انسانی تعلقات کے حوالے سے وسیع المشرب تھے۔ زاہدوں کے علاوہ رِند بھی ان کے حلقۂ احباب میں شامل تھے کہ وہ انسانوں سے مایوس نہیں ہوتے تھے۔ کیا خبر کب انسانی فطرت کا خیر، شر کے جذبے پر غالب آجائے۔ جنگ / نیوز والے رؤف کلاسرا، فکر ونظر میں بُعد المشر قین کے باوجود ان کے قریبی دوستوں میں شامل تھے۔ وہ اپنے مسائل کے حوالے سے دوستوں کو آزمائش میں ڈالنے سے حتی الامکان گریز کرتے، لیکن ان کے مسائل میں بڑھ چڑھ کر دلچسپی لیتے۔ ان کے مسئلے کو اپنا مسئلہ بنا لیتے اور جب تک اسے حل نہ کر لیتے، چین سے نہ بیٹھتے۔ صاحب تدبر ایسے کہ پیچیدہ مسائل کا حل چٹکیوں میں ڈھونڈ نکالتے۔ انگریزی کے علاوہ اردو ادب پر بھی گہری نگاہ تھی۔ اقبالیات سے خصوصی شغف تھا۔ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی سے مکہ مکرمہ والی نشست میں اور گزشتہ ماہ ڈاکٹر خورشید رضوی کے ساتھ جدہ کی نشستوں میں بھی بیشتر گفتگو اقبالیات ہی کے حوالے سے ہوئی۔

وہ غزل بھی کہہ لیتے تھے، لیکن زیادہ تر آزاد نظم ہی کہی اور اس پر اصحاب نقد ونظر سے داد وتحسین بھی پائی۔ اُم القریٰ یونیورسٹی میں تدریسی سرگرمیوں کے علاوہ مختلف تصنیفی، تالیفی اور تحقیقی منصوبوں پر بھی کام کر رہے تھے۔ اس میں سعودی عرب کے قدیم ادب وثقافت پر کام بھی تھا، جس میں انھیں ملتان کے پروفیسر ڈاکٹر اسلم انصاری اور پاکستان انٹرنیشنل سکول جدہ کے ڈاکٹر امتیاز بلوچ کا تعاون بھی حاصل تھا۔ سعودی عرب میں اردو ادب پر کام کا ارادہ بھی رکھتے تھے۔ گورنمنٹ کالج سول لائنز ملتان کے پروفیسر محمود الحسن اردو ادب و خطابت کی روایت میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی خدمات پر پی ایچ ڈی کر رہے تھے کہ اسی دوران آسمانوں سے بلاوا آ گیا۔ اِس ادھورے کام کی تکمیل بھی ذوالکفل کے پیشِ نظر تھی۔ لیکن اُدھر مہلتِ عمل ختم ہوگئی تھی۔ ۱۵/ نومبر کو نمازِ ظہر پڑھ کر یونیورسٹی سے گھر کے لیے روانہ ہوئے۔ ابھی راستے ہی میں تھے کہ دوسری سمت سے آنے والی ایک تیز رفتار گاڑی اُن کی کار سے آٹکرائی اور بندہ اپنے رب کے حضور حاضر ہوگیا۔ وصیت تھی کہ اگر سرزمین حرم میں موت آئے تو یہیں دفن کر دیا جائے۔ نمازِ فجر کے بعد حرم میں نمازِ جنازہ ہوئی اور جنت المعلیٰ میں آسودۂ خاک ہوگئے:

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

(روزنامہ اردو نیوز جدہ، ۱۹/ نومبر ۲۰۰۹ء)

(روزنامہ پاکستان ۲۰/نومبر ۲۰۰۹ء)

دوپہر کی دھوپ سی اُجلی جوانی لے گیا

جاوید اختر بھٹی

ذوالکفل کی وفات نے بہت سے لوگوں کو اداس کر دیا۔ آج انھیں اس دنیا سے گئے پچیس دن گزر گئے (ابھی دنوں کو برسوں میں تبدیل ہونا ہے) اور رات کے دو کا وقت ہے۔ میرے اردگرد اُداسی کی فضا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں لکھنا شروع کیا۔ یہ کوشش میں پچیس دنوں سے کر رہا ہوں۔ لیکن کاغذ کورا ہی رہا۔ اس پر لکھا نہ جا سکا۔ لکھنے میں ایسی بے بسی کبھی محسوس نہیں کی۔ آج میں نے پھر کوشش کی تو ذوالکفل لکھ کر دیر تک ان کا نام دیکھتا رہا۔ وہ کیا کیا باتیں تھیں جو تیزی سے یاد آتی گئیں، اور سامنے سے گزر گئیں۔ کوئی ایک لمحہ بھی میری گرفت میں نہ آیا۔

وہ نوجوان ذوالکفل جس نے ابھی میٹرک کیا ہے۔ وہ اپنے بڑے بھائی کفیل بخاری کے دوستوں سے دور دور رہتا ہے۔ اور پھر ایک دن کفیل بخاری نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''مُنّے نے شاعری شروع کر دی ہے۔'' مجھے پہلی بار ذوالکفل نے اُس وقت متوجہ کیا جب اُن کی نظمیں شائع ہونے لگیں۔ انھوں نے بی اے کیا تو ان کی ادبی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔ فاران اکادمی کے اجلاس باقاعدگی سے ہونے لگے اور ان کے نوجوان دوست اس میں شامل ہوگئے۔ جب انھوں نے ایم اے انگلش کیا، اس وقت وہ شہر کے معروف ادیبوں اور شاعروں میں شمار ہونے لگے تھے۔ ان کا کمرہ کتابوں سے بھرا رہتا تھا، جس کے آثار بیٹھک تک دکھائی دیتے تھے۔ میز پر ہر وقت کتابیں رکھی ہوتی تھیں۔ وہ مسلسل مطالعہ کرتے تھے۔ لکھنے سے پڑھنے کی رفتار زیادہ تھی۔ وہ ہر موضوع پر گفتگو کر سکتے تھے۔ وہ بہت کم عمری میں بزرگی کی منازل طے کر گئے تھے۔ ان کی گفتگو میں اعتماد تھا۔ بات کہنے کا سلیقہ تھا اور مخاطب کو متاثر کرنے کی صلاحیت تھی۔

مجھے یاد آ رہا ہے کہ جب ''منے'' نے شاعری شروع کی تو کفیل بخاری ان کے لیے کلیاتِ فیض، کلیاتِ ارشد، کلیاتِ میراجی اور کلیاتِ مجید امجد لے کر آئے۔ اس لیے ان کا رجحان نظم کی طرف بڑھ گیا۔ انھوں نے آزاد نظم کہی۔ وہ لفظ کی حرمت اور اہمیت سے واقف تھے۔

اُن دنوں ان کے دوستوں کا حلقہ وسیع ہوگیا تھا: خالد مسعود خان، رؤف کلاسرا، مختار پارس، حافظ صفوان، جمشید رضوانی، وحید الرحمٰن خان، شعیب ودود، مستحسن خیال اور افتخار شفیع سے ان کی ملاقات رہتی تھی۔

بزرگ ادیبوں میں ڈاکٹر اسلم انصاری اور پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان کے ساتھ ان کا تعلق زیادہ تھا۔ انھوں نے کسی نوجوان سے گفتگو کی یا بزرگ سے، اُس کے دل میں جگہ ضرور پیدا کی۔ بات کہنے کا ہنر انھیں آتا تھا۔ یہ قدرت کا خاص عطیہ تھا۔ وہ مسکراتا ہوا چہرہ سب کا دوست اور غم خوار تھا۔ وہ اختلاف کے باوجود لہجہ میں تلخی نہ آنے دیتے تھے۔ یہ تحمل اور بردباری انھیں اپنے نانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری مرحوم سے وَرثے میں ملی تھی۔ اس نیک نامی کی انھوں نے قیمتی اثاثے کی طرح حفاظت کی۔

انھوں نے خبریں کو معیاری ایڈیشن دیا۔ خبریں میں ایسے ادبی ایڈیشن دوبارہ دیکھنے کو نہیں ملے۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکا، کیونکہ انھوں نے سعودی عرب کے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ ایک دن معلوم ہوا کہ ذوالکفل سعودی عرب جا رہا ہے۔ وہ ترقی کرنا چاہتے تھے۔ نام پیدا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کے لیے انھوں نے ہمیشہ مشکل راستے کا انتخاب کیا۔ یہ

ہمارے نزدیک مشکل ہوا کرتا تھا۔ وہ اسے بہت آسانی سے عبور کرلیا کرتے تھے۔

وہ سعودیہ کے شہر ملیح میں کئی سال ایک ادارے میں تدریس کے شعبہ سے وابستہ رہے۔ وہ ہر سال ایک ماہ کے لیے آتے تھے اور اس ایک مہینے میں ان کے ساتھ ملاقات رہتی۔ مختلف موضوعات زیر بحث آتے تھے۔ وہ دوستوں سے زیادہ سے زیادہ ملاقات کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔ وہ لاہور اور اسلام آباد کا بھی ایک چکر لگاتے۔ ایک دن اچانک معلوم ہوتا کہ ذوالکفل کی چھٹی ختم ہوگئی ہے اور وہ واپس جارہے ہیں۔ وہ بھرپور زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ سعودیہ میں بھی ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔

آخری بار جب ملتان آئے (کون جانتا تھا کہ وہ آخری بار آئے ہیں؟) تو ان کا قیام تقریباً چھے ماہ رہا۔ اس بار انھیں اپنی بیٹی کی موت کا صدمہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ یہ چھے ماہ انھوں نے بہت مصروف گزارے۔ انھوں نے روزنامہ خبریں میں کالم لکھنا شروع کیا۔ ٹی وی کے پروگرام کیے۔ ایک کالج میں پڑھانے لگے۔ وہ مستقبل کی منصوبہ بندی کررہے تھے۔ اطمینان ہوا کہ اب وہ پاکستان میں ہی رہیں گے۔ انھوں نے اپنے عزیز دوست حافظ صفوان کے ساتھ مل کر ایک منفرد اردو۔انگلش لغت مرتب کی۔ شعری مجموعے کے لیے اپنی نظمیں یکجا کررہے تھے۔ مشفق خواجہ اور اپنے خطوط کو ترتیب دیا، یعنی ایک خط ان کا اور دوسرا خط خواجہ صاحب کا جواب میں آیا ہوا۔ یہ دلچسپ خط کتابت ہے۔

تمام احباب خوش تھے کہ اب ذوالکفل پاکستان میں رہیں گے۔ اچانک اطلاع آئی کہ وہ جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ میں استاد مقرر ہوگئے ہیں۔ یہ اُن کی زندگی کا خواب تھا۔ وہ بہت خوش تھے اور ان کی زندگی کی آخری چھٹیاں ختم ہوگئی تھیں، انھیں گئے ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ پندرہ دن پہلے ان کے بچے ان کے پاس گئے تھے۔

۱۵/نومبر کی ایک افسردہ شام کو کفیل بخاری صاحب نے ان کی وفات کی خبر دی، کہ ذوالکفل مکہ مکرمہ کے ایک حادثے میں انتقال کرگئے ہیں۔ یہ ناقابلِ یقین خبر تھی۔ دیر تک اس پر اعتبار نہ آیا۔

انھوں نے اپنے ایک دوست کی وفات پر منظوم کتبہ لکھا۔ دراصل یہ کتبہ وہ اپنے لیے لکھ رہے تھے۔ اس کا ایک ایک لفظ ان کی شخصیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اب وہ ایسی جگہ چلے گئے ہیں۔ جہاں ان کے صالح اعمال ان کی حفاظت کریں گے۔ ان کی نیکیاں ان کے درجات بلند کریں گی۔

وہ جہاں گردِ زمانہ
ناکشودہ منظروں کے کھوج میں محوِ سفر
نت نئی راہوں پہ پھیلی
پُرتحیّر روشنی کی اَن چھوئی ٹھنڈک کا پیاسا
صد ہزاراں سال کی تشنہ دہانی لے گیا
روشنی باطن کی، آنکھوں کی چمک
دوپہر کی دھوپ سی اُجلی جوانی لے گیا
اک مہا گیانی جو اپنی گیان دانی لے گیا
شَبد اپنے لے گیا وہ، اپنی بانی لے گیا
وہ سبھا ساجن، پریمی، ہاں وہ سیلانی پریتم
بھیدیا، بھیدوں بھرے جیون جگت کا بھیدیا

سنجوگ، سنگت، سانجھ کے، سمبندھ کے بھیدوں بھری
جیون کہانی لے گیا
کردار باقی رہ گئے
بے کار باقی رہ گئے

یہ کتبہ اردو ادب کے چند خوب صورت کتبوں میں شمار کیا جائے گا۔ اس میں ایک خاص کیفیت کا اظہار ہے۔ ''بے کار باقی رہ گئے'' زندگی کے عارضی قیام اور انسان کا اپنے خدا کی طرف واپسی کا سفر ہے۔ یہی سچ کا راستہ ہے۔ دنیا کی حقیقتیں بے معنی نظر آنے لگتی ہیں۔

انھوں نے کم عمری میں بزرگ ادیبوں کو متاثر کیا۔ ان کی گفتگو سن کر مخاطب پریشان ہو جاتا تھا۔ میں نے انھیں علم و ادب، مذہب و فلسفہ، تصوف، تاریخ، سیاسیات، صحافت اور جدید میڈیا پر گفتگو کرتے سنا۔ میں کفیل بخاری صاحب کے دوستوں میں سے ہوں، اس لیے انھوں نے مجھے احترام دیا۔ ہمیشہ خلوص اور محبت سے پیش آتے۔ کبھی کسی بحث میں نہیں الجھے۔ مکہ مکرمہ تشریف لے جانے سے پہلے انھوں مجھ سے ایک طویل ملاقات کی۔ کئی موضوعات پر بات ہوئی اور یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔

جاتے ہوئے کہتے ہو، قیامت کو ملیں گے
کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

اب تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ مکہ مکرمہ کی مٹی انھیں اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ وہ بہت تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شاید وہ اس مقام اور سعادت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار ہی نہیں تھے جس کا اہتمام اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے کیا تھا۔ ذوالکفل ایسے صاحبِ ایمان نے سیدہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے پہلو میں آسودۂ خاک ہونے کے اعزاز کو ترجیح دی۔ زندگی کو بہرحال ختم ہونا ہی ہوتا ہے اور یہ ختم ہو کر رہتی ہے۔ لیکن بعد از وفات خوش نصیبی بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔

میرے لیے دیر تک ذوالکفل کے بارے میں لکھنا ممکن نہیں۔ میں نے انھیں جوان ہوتے اور زندگی کی موج میں شامل ہوتے دیکھا ہے۔ ان کی ابتدائی شاعری سے آخری دور تک کی شاعری کو دیکھا ہے۔ جب لوگوں نے محسوس کیا کہ علم و ادب کے سفر میں ذوالکفل ان سے کئی قدم آگے ہیں تو قدرت نے ان کا سفر مکمل کر دیا۔ کیونکہ زندگی کے سفر کا آغاز اور اختتام قدرت کے ہاتھ میں ہے۔

میرے پاس تو لفظ بھی نہیں کہ میں ان کے خاندان کے ساتھ تعزیت کر سکوں۔ میں تو ان کی وفات کے بعد، آج تک ان کے بارے میں زیادہ گفتگو بھی نہ کر سکا اور کروں بھی تو کیسے؟ ان کا مسکراتا ہوا چہرہ ہر وقت میرے سامنے ہے اور ان کی آواز ابھی سنائی دے رہی ہے۔ میں کوشش کے باوجود اپنے خیالات کو مربوط نہیں کر سکا۔ ذہن کی کیفیت ہی عجیب ہے۔ قلم کی صلاحیت ساتھ نہیں دے رہی۔ اپنے عزیزوں کے بارے میں لکھا ہی نہیں جا سکتا۔ جو لوگ لکھتے ہیں وہ بہت بہادر ہوتے ہیں۔ میرے ہاتھ میں تو مزید سکت نہیں رہی۔

ذوالکفل کس دیس جا بسے ہو......؟

محمد حامد سراج

دھند ہے...... گہری اور دبیز دھند......

آنسو خشک ہوگئے، پھر بھی دھند ہے۔کفیل شاہ آپ نے کیوں کہا کہ مجھے بھی لکھنا ہے۔ میں ذوالکفل پر کیسے لکھوں......؟ میرا دل بہت کمزور ہے۔آنسو پھر سرسبز ہوگئے اور دھند چھاگئی۔کفیل شاہ آپ نے کیوں کہا...... بولیے نا کیوں......؟ ذوالکفل میرے لان میں بیٹھا ناشتہ کر رہا ہے۔کل شام میں اپنی خانقاہ کی مسجد کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ مسجد کے صحن میں متبسم ذوالکفل اور مولانا حبیب الرحمٰن کو دیکھا۔ جی کھِل اٹھا۔ مسجد کے صحن میں کتنی دیر باتیں کرتے رہے۔

حامد صاحب! آپ کے چہرے پر تھکن ہے......ذوالکفل نے پوچھا

بس شاہ جی......ڈیوٹی سے لوٹ کر تھکن جسم میں گھر بنالیتی ہے۔

اگلی صبح ناشتے کی میز پر مجھے ذوالکفل نے بہت شستہ لطائف سنائے۔ایک لطیفہ مولانا حبیب لرحمٰن صاحب نے بھی سنایا۔ وہ میری دل جوئی میں مصروف تھے کہ میرے اندر جو بھی درد ہے، اداسی، وہ کم ہو.....تحلیل ہوجائے۔ ناشتہ کے دوران اردو ادب کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو ہوئی۔ وقت ہمارے درمیان تھا اور ہم خوش تھے۔ایسی ملاقاتیں انسان کی سانسیں بڑھا دیتی ہیں۔

معلوم نہیں تھا یہ آخری ملاقات ہے......ہمیں ہمارے رب نے بے خبر رکھا ہے۔اور اچھا کیا بے خبر رکھا، ورنہ ہم روز مرا کرتے......

مغرب کی نماز کے بعد کا کوئی سمے تھا......موبائل پر بیل ہوئی۔

ملتان سے ماں جی (میرے بیٹے داماد سعد قیوم خاکوانی کی والدہ محترمہ) کا فون تھا اور پھر لامتناہی سناٹا......خبر تھی یا کوئی قیامت، جو گزری۔ مجھے سکتہ ہوگیا۔

''بیٹا! سعودی عرب میں ذوالکفل شاہ جی کار کے حادثے میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔''

پھر مسلسل فون بجنا شروع ہوگیا...... ڈاکٹر عنایت صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سے بات ہوئی۔ حافظ صفوان کا فون آیا۔

میں تھا......آنسو...... اور بس آنسو...... پہلو میں درد اٹھا...... جیب سے دل کو سنبھالنے والی گولی نکالی کہ زبان کے نیچے رکھ سکوں......اہلیہ سے کہا صبح دارِ بنی ہاشم ملتان پہنچنا ہے...... اِسی سہ پہر میں راولپنڈی سے لوٹا تھا، لیکن مجھے دارِ بنی ہاشم کا احاطہ کھینچ رہا تھا جہاں میں نے اپنی رفاقتوں کا سلسلہ سید عطاء المحسن شاہ صاحب سے پہلی بار جوڑا تھا اور، اور پھر مجھے کوئی ایسا

سفرِ ملتان کا یاد نہیں کہ دارِ بنی ہاشم کے مکینوں کی قدم بوسی اور دعاؤں کے بغیر لوٹتا ہوا ہو۔

آج دل کے بائی پاس آپریشن کو ابھی ایک ماہ دس دن ہوئے ہیں۔ درد جاگ رہے ہیں اور مجھے اِس تحریر کو مکمل کرنا ہے۔ ذوالکفل سے پہلی ملاقات کب ہوئی، یاد نہیں۔ بس اتنا یاد ہے سر پر سفید ٹوپی اوڑھے ایک خوبرو جوان سے ملاقات ہوئی جس کے چہرے پر رونق، نور اور مسکراہٹ تھی۔ اُس کے پاس موٹر سائیکل تھی۔ اُس نے موٹر سائیکل سٹارٹ کرنے سے پہلے مفلر اچھی طرح لپیٹا۔ میں اُس کے ساتھ بیٹھا اور ہم کتابوں کی ایک بڑی دکان میں پہنچ گئے۔ مجھے کتابیں خریدنا تھیں۔ پھر اُس کے بعد محبتوں اور رفاقتوں کا ایک طویل سلسلہ ہے جس میں ذوالکفل کی محبتیں، اپنائیت، خلوص، اور لہجے میں شہد ایسی مٹھاس شامل ہے۔

خانقاہ سراجیہ کے ساتھ اُن کی وابستگی اِتنی گہری تھی کہ سعودیہ سے لوٹنے پر بھی وہ اپنے مشاغل اور ذمہ داریاں تیاگ کر بابا جی قبلہ حضرت مولانا خان محمد مدظلہٗ العالی کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتے۔ شاہ جی کی خواہش ہوتی کہ مجھے تسبیح خانے میں لنگر کی دال سبزی کھانا ہے۔ اور میں اُن سے کہتا یہ سب میرے دسترخوان پر دستیاب ہوگا۔ سرائیکی میں کہتے: ''لالہ بہوں ڈاڈھے او۔'' ...... (بھائی بہت زور آور ہو۔ اپنی منواتے ہو)

دراز قد ذوالکفل کے چلنے کے انداز میں ٹھہراؤ تھا۔ بالکل ایسے لگتا جیسے بلندی سے کوئی شخص اتر رہا ہو۔ (سیرتِ طیبہ میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے چلنے کا انداز ایسا ہی لکھا ہے۔ وہ رسُولی چال چلتا تھا اور اِس سنت پر عامل تھا۔) نماز میں انہماک، خشوع وخضوع کمال تھا۔ میں نے خانقاہ کی مسجد میں اُنھیں جب بھی نماز کی حالت میں دیکھا، رشک کیا کہ ہمیں بھی ایسی نماز نصیب ہو۔ شادی کے بعد ذوالکفل کی صحت اِس لحاظ سے بہتر ہوگئی کہ اُن کا جسم بھر گیا اور تھوڑے مائل بہ فربہی نظر آنے لگے۔ ہم نے کہا ''الحمدللہ شاہ جی کو شادی راس آ گئی ہے۔''

بابا جی قبلہ حضرت مولانا خان محمد مدظلہٗ العالی کی نہ صرف صحبت سے فیضیاب ہوتے بلکہ شاہ جی نے اُن سے سلوک کی منازل طے کیں۔ ایک اہم بات کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے گھرانے سے بابا جی کو جو محبت اور عقیدت تھی اُس کا نظارہ کئی بار دیکھا۔ ایک بار اپنے حجرے میں پاؤں کی تکلیف کی وجہ سے ڈاکٹرز کے کہنے پر چارپائی پر تکیوں کے سہارے پاؤں پسار کر آرام کر رہے تھے، اِسی دوران ذوالکفل آئے۔ میں نے عرض کیا:

''بابا جی...... ذوالکفل شاہ صاحب آئے ہیں۔''

مسکرائے اور کہا اچھا...... مصافحہ کرنے کے ساتھ ہی بابا جی نے پاؤں سمیٹ لیے اور چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ حال احوال پوچھا۔ ایک درویش کو کھانے اور آرام کا خیال رکھنے کی تاکید کی...... میں نے عرض کیا:

''بابا جی...... شاہ جی کو میں نے گرفتار کر لیا ہے۔ قیام وطعام میرے پاس ہے۔

فرمایا...... ''بھئی بہت اچھا۔''

جتنی دیر ذوالکفل موجود رہے، بابا جی پاؤں سمیٹ کر بیٹھے رہے۔

ایک بار بابا جی کی علالت کی وجہ سے ہم نے نمازِ باجماعت اُن کے ساتھ گھر اُن کے کمرے میں ادا کی۔ نماز کے بعد

باباجی نے دعا کی۔ میں نے عرض کیا:

''باباجی...... ذوالکفل کی والدہ محترمہ کا اصرار ہے کہ یہ سعودیہ سے مستقل پاکستان لوٹ آئے۔''

باباجی قبلہ نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا......

علالت اور ضعیفی کے باوجود باباجی نے لیٹنے سے گریز کیا اور پاؤں لٹکا کر بیٹھے رہے۔ ہم نے اُن کے پاؤں کے نیچے دو تکیے رکھ دیے۔ ڈاکٹر عنایت اللہ صاحب موجود تھے جن کی وابستگی خانقاہ سراجیہ سے عشق کی حدوں کو چھوتی ہے۔ ذوالکفل نے کہا۔

''باباجی...... آج کچھ دیر آپ سے باتیں کرنے کو جی کر رہا ہے۔''

''ضرور بھئی ضرور...... خوشی سے......''

قریبًا ایک گھنٹہ محفل رہی جس میں ذوالکفل نے باباجی سے دارالعلوم دیوبند میں اُن کے تعلیمی مشاغل، اساتذہ، معاصرین اور اُس عہد کے بارے میں گفتگو کی...... کاش میرے پاس ریکارڈنگ کا اہتمام ہوتا اور اُس رات کی گفتگو محفوظ ہوجاتی۔ جب ایک گھنٹے سے اوپر وقت ہوا تو میں نے آہستہ سے شاہ جی سے کہا کہ جب تک آپ موجود ہیں آپ کے گھرانے کے احترام میں باباجی لیٹیں گے نہیں...... اجازت نہ لی جائے...... ہم نے اجازت لی۔

ذوالکفل علم کا سمندر تھا۔ جس موضوع پر بولتے اُن کی معلومات حیران کر دیا کرتی تھیں۔ دینی موضوعات سے لے کر ادبی، سیاسی، معاشرتی، ملکی، بین الاقوامی موضوعات اُن کے سامنے طفلِ مکتب تھے۔

میں نے اپنی والدہ کا طویل خاکہ جو قریبًا ڈیڑھ سو صفحات پر محیط تھا، مکمل کیا اور اُسے کتابی شکل میں لانے کے لیے نام تجویز کرنا زیرِ غور تھا۔ کئی نام، کئی تجاویز تھیں۔ ایک دن ڈرائنگ روم میں ہم کھانا کھا رہے تھے تو میں نے کہا:

''یار ذوالکفل، میری کتاب کا نام تجویز کرو۔''

ذوالکفل سے میری بے تکلفی تھی اور عرض کر رکھا تھا کہ بے تکلفی سے پکارنے اور بات کے دوران اگر کوئی جملہ، کوئی بات حدِ ادب سے گر جائے تو معاف کر دیا کریں۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا...... ذوالکفل نے کہا:

''لالہ...... ''میا'' بہترین نام ہے۔ اِسی کو فائنل کرلیں۔''

اِس کے بعد کسی اور نام کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ ''میّا'' کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا تو میں نے کہا:

''پیر و مرشد...... (کئی بار محبت سے میں ذوالکفل کو پیر و مرشد پکارتا) یہ آپ کے نام رکھنے کی برکت ہے کہ ''میّا'' کا تیسرا ایڈیشن آ گیا۔

ذوالکفل نے مسکرا کر کہا:

''لالہ تساں وی کمال کریندے او۔ محنت تہاڈی تے کریڈٹ اساڈے ناں''

اردو ادب اکثر زیرِ موضوع رہتا۔ ایک بار میں نے پوچھا:

''شاہ جی.... مشہور ادبی سکالر سراج منیر نے ایک ادبی جریدہ روایت نکالا تھا۔ اس کے چار شمارے منظرِ عام پر

آئے تھے۔ وہ کہیں سے مل جاتا......نا......؟

وہ تو میری کولیکشن میں ہے......اگلی بار لیتا آؤں گا۔

اگلی بار جب خانقاہ آئے تو ہم مسجد کی سیڑھیاں اتر رہے تھے۔ چائے تیار تھی۔ وہ میرے گھر کی بجائے تسبیح خانے کے رخ ہو لیے......

''شاہ جی خیریت......''

''لالہ تہاڈے واسطے سراج منیر دے روایت دے چاروں شمارے آندے ہن۔ او میں بیگ وچوں کڈھی آواں''

میں نے عرض کیا کہ میں اِن کی فوٹو کاپی کرالیتا ہوں۔

کہنے لگے ''فوٹو کاپی کیوں، یہ آپ کے لیے ہیں۔''

''لیکن شاہ جی یہ آپ کی نایاب کولیکشن ہے۔''

''لالہ......ایک ہی بات ہے۔ یہ آپ کے پاس ہوں یا میرے پاس۔''

ذوالکفل شاہ جی کا ایک واقعہ مجھے ڈاکٹر اطہر نے سنایا کہ ایک دفعہ باباجی قبلہ اسلام آباد تشریف لائے۔ آپ کا قیام حاجی یعقوب صاحب کے ہاں تھا۔ حاجی یعقوب صاحب کا تعلق جھنگ سے ہے اور ملازمت کے سلسلے میں وہ اسلام آباد مقیم ہیں۔ انتہائی سادہ، ملیح، نیک، بردبار اور پرخلوص انسان ہیں۔ حاجی صاحب کے سرکاری کوارٹر کی بیٹھک بہت چھوٹی ہے۔ باباجی وہاں قیام پذیر تھے۔ ذوالکفل شاہ جی بھی اسلام آباد میں تھے اور وہ باباجی کی زیارت کو آئے اور مصافحہ کر کے بیٹھ گئے۔ بعد میں آنے والے ساتھیوں کو جہاں جگہ ملی بیٹھتے گئے۔ ڈاکٹر اطہر کا کہنا ہے کہ اِسی دوران ایک ساتھی آیا اور باباجی اور ذوالکفل شاہ کے درمیان بیٹھ گیا۔ میری نظر پڑی۔ حضرت کی طبیعت میں بے چینی تھی اور وہ ہاتھ کے اشارے سے کچھ فرما رہے تھے۔ میری جرات نہیں تھی کہ لب کشائی کروں اور سوچ رہا تھا کہ کوئی پرانا ساتھی اشارہ سمجھ لے۔ اللہ نے میری سن لی اور ایک ساتھی نے اُس ساتھی سے جو باباجی قبلہ اور ذوالکفل کے درمیان بیٹھا تھا، کہا:

''بھائی تم یہاں آجاؤ۔''

جیسے ہی وہ صاحب وہاں سے اٹھے، میں نے دیکھا باباجی کے چہرے پر اطمینان کی لہر اتر آئی۔

دھند ہے...... گہری اور دبیز دھند......

آنسو خشک ہوگئے۔ پھر بھی دھند ہے۔ کفیل شاہ آپ نے کیوں کہا کہ مجھے بھی لکھنا ہے۔ میں ذوالکفل پر کیسے لکھوں......؟ میرا دل بہت کمزور ہے۔ آنسو پھر سرسبز ہوگئے اور دھند چھاگئی۔ کفیل شاہ آپ نے کیوں کہا...... بولیے نا کیوں......؟ ذوالکفل میرے لان میں بیٹھا ناشتہ کررہا ہے۔

۲۰۰۶ء کی بات ہے میری بیٹی امامہ کی شادی کی تیاریاں ہورہی تھیں۔ میں نے سعودیہ فون کیا

''شاہ جی......آپ کی بھابی کی فرمائش ہے کہ آپ سعودیہ سے فرانس کی ''مورا کمپنی'' کے دو سنگل کمبل لیتے آئیں۔ ادائیگی ہمارے ذمہ۔''

''لالہ......کمبل لیتا آؤں گا۔ باقی باتیں جھگڑے پاکستان آنے پر چکالیں گے۔''

ذوالکفل میرے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ناشتہ کررہے تھے......کمبل سامنے رکھے تھے۔ میں نے عرض کیا آپ کی بھابی پوچھ رہی ہیں یہ کتنے میں آئے ہیں......؟

''لالہ بھابی سے کہہ دیں رقم ادا کر کے لینا تھے تو پھر مجھے کیوں کہا۔ یہ بیٹی کے لیے ایک حقیر سا تحفہ قبول کریں۔''

شادی کے بعد میں نے امامہ سے کہا۔ یہ کمبل بہت قیمتی ہیں۔ اِنھیں ساری عمر سنبھال کے رکھنا ہے۔''

وقت سرکتے دیر ہی کتنی لگتی ہے......

کہا ہے نا...... یہ ۲۰۰۹ء ہے......آخری ملاقات...... ذوالکفل میرے لان میں بیٹھا ناشتہ کررہا ہے۔کل شام میں اپنی خانقاہ کی مسجد کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا کہ مسجد کے صحن میں متبسم ذوالکفل اور مولانا حبیب الرحمٰن کو دیکھا۔ جی کھل اٹھا۔مسجد کے صحن میں کتنی دیر باتیں کرتے رہے۔

ناشتے کے دوران میں نے کہا:

''شاہ جی......حفصہ بیٹی کی اِسی سال رُخصتی متوقع ہے۔ دو سنگل کمبل ''مورا کمپنی'' کے......اور......اور ہم ذوالکفل کو رقم ادا نہیں کریں گے۔''

''لالہ مجھے آپ کی اِس بات سے اِتنی خوشی ہوئی ہے کہ آپ کو اندازہ نہیں۔''

''بھائی ذوالکفل......کس نے کہا تھا اِتنی بے تکلفی پالیں۔''

ہنسی کی مترنم آواز......

''لالہ فکر نہیں کرنا۔ بیٹی کی رُخصتی سے پہلے کمبل بھیج دوں گا۔''

پھر ایک فون آیا......مجھ سے خیریت معلوم کر کے کہا۔

''لالہ فکر نہیں کرنا۔ میں بیٹی کی رُخصتی سے پہلے کمبل بھیج دوں گا۔''

پھر چار دن بعد فون آیا......

ملتان سے ماں جی (میرے بیٹے داماد سعد قیوم خاکوانی کی والدہ محترمہ) کا فون تھا اور پھر لامتناہی سناٹا......خبر تھی یا کوئی قیامت جو گزر ی۔ مجھے سکتہ ہوگیا۔

''بیٹا سعودی عرب ذوالکفل شاہ جی کار کے حادثے میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔''

پھر مسلسل فون بجنا شروع ہوگیا۔

فون اب بھی بج رہا ہے۔

خانقاہ کی مسجد کی سیڑھیاں چڑھتے اُترتے کوئی میرے اندر مجھ سے سوال کرتا ہے۔

''ذوالکفل کس دیس جا بسے ہو......؟''

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ڈاکٹر امتیاز حسین بلوچ، جدہ

آج یہ سطور لکھنے بیٹھا ہوں تو ماضی کے جھروکوں میں شاہ جی سے جڑی کئی یادیں اور کئی باتیں آبیٹھی ہیں۔ کئی ادھورے خواب ہیں جو ہم مل کر دیکھتے رہے۔ کئی پراجیکٹ دھرے رہ گئے۔ جب میں نے سعودی عرب میں اردو شاعری پر ایک تحقیقی وتنقیدی مسودہ مرتب کیا تو کہنے لگے صرف شاعری کیوں؟ میں تمھارے ساتھ ہوں۔ دونوں مل کر سعودی عرب میں اردو پر کام کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں مرحوم نے چند مفید مشورے بھی دیے۔ ۲۰۰۷ء میں مجھے سعودی وزارت ثقافت کی طرف سے انگریزی سے اردو ترجمے کا کام ملا تو میں نے سکول کے ایک پھٹے خاں پروفیسر کو کتاب لا دی۔ پروفیسر صاحب پندرہ دن کے بعد کتاب واپس لائے۔ کتاب کے ابتدائی اوراق کے ترجمے کے لیے بھی انھیں جدہ میں موجود انگریزی اردو ڈکشنریاں کم پڑ رہی تھیں۔ سو وہ کام میں نے ذوالکفل بخاری مرحوم کو بتایا۔ شاہ جی نے ڈاکٹر اسلم انصاری کے ساتھ مل کر وہ کام مکمل کیا اور آج کل یہ کام سعودی عرب میں اشاعت کے مراحل میں ہے۔

سعودی عرب میں ان کا پہلا تقرر سعودی وزارت تعلیم وتربیت کے تحت چلنے والے ایک سرکاری سکول میں ہوا۔ یہ سکول املج میں واقع ہے۔ شاہ جی یہاں عربی بچوں کو انگریزی پڑھاتے رہے۔ املج سعودی عرب کا ایک سرحدی شہر ہے اور مکہ و مدینہ سے خاصے فاصلے پر ہے۔ مگر میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ اس دوری کے باوجود وہ اکثر و بیشتر حرمین شریفین میں حاضری دیتے رہے۔ جب وہ حرم کعبہ تشریف لاتے تو جدہ ضرور آتے۔ جدہ سے شائع ہونے والے واحد ادبی رسالے سحاب نے بھی شاہ جی کے لیے ایک تعارفی پروگرام منعقد کیا۔ اردو میگزین نے ان کی نظمیں شائع کیں۔ انھوں نے جدہ کے مشاعروں میں اپنی نظمیں سنا کر داد وصول کی۔

شاہ جی بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ انھیں ہلکی پھلکی گپ شپ میں خاص کمال حاصل تھا۔ دوستوں نے سید محمود خاور کے اعزاز میں جدہ میں ایک پروگرام منعقد کیا۔ میں نے جان بوجھ کر اُنھیں نہ بلایا کہ شاہ جی کیسے آئیں گے؟ املج جدہ سے بہت دور ہے۔ لیکن جب اُنھیں پروگرام کی خبر ہوئی تو بہت ناراض ہوئے۔ جدہ میں وہ جب بھی آتے ان کا قیام ہمیشہ میرے یہاں رہتا۔ جدہ میں میرا گھر ایک پرانی عمارت میں واقع تھا جس کے کمرے کھلے اور باتھ کشادہ تھا۔ شاہ جی کو پورے جدہ میں میرا غریب خانہ پسند تھا۔ میرے گھر میں وہ رات کو ایک بجے سے پہلے کبھی نہیں آئے۔ جب آتے تو اپنی چادر قالین پر بچھا کر چپ چاپ سو جاتے۔ نماز باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ میں بھی جدہ سکول کی صبح پونے ۷ بجے شروع ہونے والی ڈیوٹی کی وجہ سے سحر خیز تھا۔ وہ جب بھی آتے تو ہم ناشتہ اکثر ایک ساتھ کرتے مگر مل کر ڈنر کرنے کی نوبت کم کم ہی آئی۔ اس کے باوجود کہ وہ رات کو دیر سے آتے مگر اپنی جدہ آمد کی خبر فوراً کر دیتے۔ جب آتے تو اکثر سونے کی کوشش کرتے۔ میں جان بوجھ کر چھیڑتا تاکہ کچھ سننے کو ملے۔ ملتان کی ادبی شخصیات، کتابوں، تقریبات اور ادبی رسائل پر ان کی گہری نظر رہتی۔ وہ پکے ٹھکے ملتانی تھے اور ملتان کی ہر خبر سنانے کے لیے بے چین رہتے۔ رات گئے گپ شپ شروع کرتے تو اکثر صبح ہو جاتی۔ نماز پڑھ کر اور ناشتہ کر کے وہ تو سو جاتے، البتہ میں مدرسے کی راہ لیتا۔ میں جب ڈیوٹی سے واپس آتا تو گھر سے جن کی طرح غائب ہوتے۔ البتہ

جب املج پہنچ جاتے تو فون ضرور کرتے کہ میں پہنچ گیا ہوں اور ہاں رات کو جو میں نے قصہ سنایا تھا، یار اس کا ذکر پاکستان میں کسی سے نہ کرنا، ورنہ جن صاحب کا قصہ ہے وہ ویزہ لے کر سیدھے املج آئیں گے اور مجھے قتل کر کے ہی جائیں گے۔ میں بھی جان بوجھ کر چھیڑتا کہ شاہ جی وہ تو میں نے ملتان سے بھی آج تصدیق کی ہے آپ نے جو بتایا ہے وہ درست ہے آپ نہ گھبرائیں۔ جب وہ اس جواب پر پیچ یا ہوتے تو بڑا مزا آتا۔ آئندہ میرے پاس نہ آنے کی دھمکی کے ساتھ فون تڑاخ سے بند۔ مگر پھر اگلے ہفتے یا پندرہ دن بعد خود آجاتے یا فون کر دیتے۔ شاہ جی کو میرے بارے میں عجیب وغریب ادبی مغالطے تھے۔ جب فکاہات جلیس شائع ہوئی تو ایک نسخہ بغیر بتائے اُٹھا کر لے گئے۔ ایک دن خبر دی کہ بھائی رسالہ سہ ماہی الزبیر (بہاول پور) نے فکاہات جلیس پر ایک مضمون شائع کیا ہے۔ (یہ مضمون شاہ جی نے خود لکھا تھا)۔

جدہ کی ادبی مجالس اور حلقوں میں شاہ جی نے بہت جلد ایک اہم مقام بنایا تھا۔ انھیں ہر ادبی گروہ کے ''گرو'' سے خاص ربط تھا۔ اردو نیوز اور اردو میگزین نے ان کی تخلیقات شائع کیں۔ ان کی نظمیں کو سرورق کی زیست بنایا گیا۔ جدہ میں عالمی سطح کے مشاعرے پڑھتے رہے اور داد سمیٹتے رہے۔ ان کی ناگہانی وفات پر ادبی تنظیموں اور انگریزی اردو اور عربی اخبارات نے ان کی تدریسی اور ادبی خدمات پر انھیں بھرپور خراج تحسین پیش کیا اور خصوصاً پاکستانی کمیونٹی پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اپنی سکول سروس کے دوران وہ ہمیشہ یونیورسٹی یا کالج کی پروفیسری کے متلاشی رہے۔ میں نے انھیں کچھ دوستوں سے ملوایا۔ بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کے ایک سابق ہونہار طالب علم پروفیسر مصطفی شاہد کاہلوں (کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ) نے ان کے لیے بڑی مساعی کیں۔ شاہ جی کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ تو نہ پہنچ سکے تاہم انگریزی ادب کا یہ لائق پروفیسر ام القریٰ یونیورسٹی مکہ شریف میں شعبہ انگریزی میں تدریس کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ دراصل یہیں سے ان کی موت کے سفر کی کہانی شروع ہوتی ہے۔ امسال جب گرمیوں کی چھٹیوں میں ان سے ملنے مہربان کالونی نزد ایم ڈی اے چوک ملتان دار بنی ہاشم پہنچا تو تین دن بعد ان کی جدہ کے لیے فلائٹ تھی۔ میں نے پوچھا ادھر کی پروفیسری کا کیا حال ہے۔ کہنے لگے محکمے نے شوکاز نوٹس جاری کر دیا ہے مگر میں رک نہیں سکتا۔ تمھاری بھابی نے آنا ہے، مجھے مکان لینا ہے، گاڑی لینی ہے۔ شاہ جی مکہ پہنچ گئے۔ مکان لے لیا، گاڑی لے لی۔ بھابی اور ننھے بیٹے بھی مکہ پہنچ گئے۔

آہوں اور سسکیوں کے درمیان جب ان کی میت کو پاکستان بھجوانے کے مشورے ہو رہے تھے تو انکشاف ہوا کہ شاہ جی نے وصیت کی تھی کہ موت کی صورت میں مجھے جنت المعلیٰ میں دفن کیا جائے۔ سو وصیت پر عمل کیا گیا۔ امامِ کعبہ نے نماز جنازہ پڑھائی اور انھیں جنت المعلیٰ میں دفن کیا گیا۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

پروفیسر سید ذوالکفل بخاری کی رحلت

ممتاز احمد بڈانی

تحریکِ احرارِ اسلام کے امیر سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے نواسے پروفیسر سید ذوالکفل بخاری گزشتہ روز مکہ مکرمہ میں کار حادثہ میں انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دعا ہے کہ رب کریم انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔ سید ذوالکفل بخاری مکہ مکرمہ کی معروف یونیورسٹی ام القریٰ میں انگلش کے پروفیسر تھے۔ اتفاق کی بات ہے کہ گزشتہ ماہ طائف تشریف لائے اور ایک مقامی ریسٹورنٹ میں پاکستانی کمیونٹی سے خطاب کیا اور اپنی اعلیٰ دینی بصیرت سے لوگوں کو مستفید کیا۔ وہ ایک مذہبی رہنما اور سکالر تھے اور کسے معلوم تھا کہ یہ ان کی زندگی کا آخری خطاب ہے۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا تھا کہ ہماری تمام پریشانیوں کا حل دینِ اسلام اور سنتِ رسول پر عمل پیرا ہونے میں ہے۔ غیر مسلم قوتیں ہماری نوجوان نسل کو گمراہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم تعصّبات اور تمام تفرقات سے بالاتر ہو کر ایک ہو جائیں اور آئندہ نسلوں کو دین اسلام کے طور طریقوں کی طرف راغب کریں۔ ان کی اچھی تربیت کریں۔ ورنہ کل قیامت کے روز ہم سب خدا کے حضور جوابدہ ہوں گے۔ اس موقع پر انھوں نے گورنر پنجاب سلمان تاثیر اور ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان لوگوں کو دین اسلام کے بارے میں کوئی علم نہیں ہے ورنہ وہ آج ختم رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون میں تبدیلی کی بات ہرگز نہ کرتے۔ یہ چند الفاظ تھے جو سید ذوالکفل بخاری نے طائف میں پاکستانی کمیونٹی سے خطاب کرتے ہوئے کہے تھے۔

انسان اِس فانی دنیا سے چلا جاتا ہے مگر اس کی اچھائیاں ہمیشہ باقی رہتی ہیں۔ سید ذوالکفل بخاری اپنی کار میں ام القریٰ یونیورسٹی سے اپنے گھر کی طرف جا رہے تھے کہ مخالف سمت سے تیز رفتار آنے والی گاڑی کی ٹکر سے موقع پر جاں بحق ہو گئے۔ پاکستان اور سعودی عرب کے علمی و ادبی حلقوں نے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے اسے بہت بڑا المیہ قرار دیا۔ نماز فجر کے بعد حرم شریف میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور ان کی وصیت کے مطابق جنت المعلیٰ میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ سوگواروں میں بیوہ اور دو بیٹے چھوڑے ہیں۔ ان کے بھائی سید کفیل بخاری ملتان میں ایک بڑے مدرسے کے منتظم اعلیٰ اور ماہانہ میگزین نقیبِ ختمِ نبوت کے مدیرِ اعلیٰ ہیں۔ نماز جنازہ میں مولانا عبدالحفیظ مکی، صدر انٹرنیشنل ختم نبوت موومنٹ ڈاکٹر سعید عنایت اللہ، مولانا ابوبکر، مولانا محمد حجازی المعروف مولانا مکی صاحب، مولانا اسحاق، مولانا سیف الرحمٰن کے علاوہ ام القریٰ یونیورسٹی کے پروفیسرز نے شرکت کی۔ طائف کی معروف شخصیات پروفیسر چودھری زاہد، انجینئر قاضی خالد، ڈاکٹر زمان خان، ڈاکٹر محمد رفیق ذاکر، محمد اقبال بڈانی، حاجی فقیر بخش دستی نے تعزیتی پیغام میں کہا کہ دعا ہے کہ اللہ پاک مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (روزنامہ نوائے وقت ۲۱/نومبر ۲۰۰۹ء)

شب کی سنگین سیاہی کو مبارک ہو

وقار نسیم وامق

سید ذوالکفل بخاری ہم سے جدا ہوگئے لیکن وہ اپنی خوشگوار یادوں کے سہارے ہمارے ساتھ زندہ رہیں گے۔ امیر شریعت اور شہنشاہِ خطابت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا نواسہ ہونا خود ذوالکفل بخاری کے لیے ایک اور اعزاز سے کم نہ تھا کہ اس خانوادے کی عظمت کا ایک زمانہ گواہ ہے اور اس عظیم المرتبت خانوادے کے چشم وچراغ نے اپنے آباء کی اعلیٰ اقدار کو نہ صرف زندہ رکھا بلکہ عملی جامہ بھی پہنایا۔ مرحوم علمی، ادبی اور فکری آدمی تھے۔ جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ میں انگریزی کے استاد تھے۔ قرآن، حدیث وفقہ کا بھرپور علم رکھتے تھے۔ گفتگو فرماتے تو انتہائی دھیمے اور پُر اثر لہجے میں کہ ان کی کہی ہوئی بات سیدھی دل میں اتر جاتی تھی۔ فنِ خطابت کے حسن سے آراستہ تھے اور مطالعہ سے مالا مال۔ شعر بھی کہتے تھے اور اہل سخن ایسے کہ کئی اشعار انھیں از بر تھے۔

طاہر جمیل مرحوم کی رحلت کے موقع پر جدہ میں ان سے آخری ملاقات نصیب ہوئی اور چند روز قبل قلم قبیلے کے جاوید اختر جاوید کے ذریعے ان کا ایک پیغام ملا جس میں انھوں نے پاکستان سے ایک کتاب لانے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ ذوالکفل بخاری نام کی کتاب پاس موجود ہے لیکن وقت نے مہلت نہ دی اور جواں سال تازہ فکر ذوالکفل ہمیں داغِ مفارقت دے گئے۔ انھیں اللہ تعالیٰ سے پیار تھا اور وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(روزنامہ اردو نیوز جدہ ۱۹/ نومبر ۲۰۰۹ء)

☆ ریاض، سعودی عرب

ایک دوست کی موت پر!

رؤف کلاسرا

ذوالکفل بخاری کو مکہ میں ایک ایکسیڈنٹ کے بعد وہیں پر دفن ہوئے آج پورے آٹھ دن ہوگئے ہیں۔ پتہ نہیں اِس دوران کتنی صدیاں بیت گئیں یا وقت رک گیا تھا، مجھے پتہ نہیں۔ سوچا تھا کہ کسی دوست کی موت کی خبر اتنی جلدی سننے کو ملے گی اور مجھ سے یہ بوجھ نہیں اٹھایا جائے گا۔ اپنے بوڑھے ہونے کا احساس بڑھ گیا ہے۔ لگتا ہے جیسے کسی صحرا میں تھکے ہارے مسافر کی جھکی کمر پر کسی نے منوں بوجھ ڈال دیا ہو جو اِس مسافر نے ساری عمر اُٹھائے پھرنا ہے۔ دوستوں کی فون کالز کی ایک لمبی فہرست ہے۔ مختار پارس سے لے کر جمشید رضوانی، شکیل انجم، جاوید الرحمٰن، خالد سنجرانی،، خالد مسعود۔ مجھے پتہ ہے وہ مجھے کیا خبر دینا چاہتے ہیں۔ اور میں اِن سے بالکل بات نہیں کرنا چاہتا۔

یادوں کا ایک ریلہ ہے اور ان میں میں بھٹکتا اسلام آباد کی سرد اداس شاموں میں تنہا۔ ۱۹۹۳ء کے بعد کا وقت میرے لیے بڑا مشکل تھا۔ میں زکریا یونیورسٹی ملتان سے فارغ ہوا تھا۔ مختار پارس کی ڈانٹ ڈپٹ سننے کا اب عادی ہو چکا تھا۔ پارس ہمیشہ مجھ سے ناراض رہتا کہ بے روزگاری سے زیادہ مجھے اپنے معاشقوں کی فکر تھی۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میرا کیا بنے گا۔ اُسے اپنے سے زیادہ میرے اور شعیب کے مستقبل کا غم کھائے رکھتا۔ ایک شام پارس نے مجھے بڑی اچھی طرح بریف کیا کہ وہ مجھے مجلسِ احرار کے بانی عطاء اللہ شاہ بخاری کے گھر اُس کے نواسے سے ملانے جا رہا تھا۔ اُس نے مجھے بڑی سختی سے تنبیہہ کی کہ وہاں ہنسی مذاق یا کسی بدتمیزی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میں چپ چاپ مداری کے بچے جمورے کی طرح اُس کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر ایک حویلی میں اتر گیا جہاں ایک ادبی محفل کا انعقاد ہو رہا تھا۔ مجھے ہمیشہ سنجیدہ محفلوں سے ایک عجیب سی الجھن ہوتی تھی۔ پارس نے میرا تعارف ایک باریش نوجوان سے کرایا۔ پارس نے اپنے بدنامِ زمانہ مخصوص اسٹائل میں ہم دونوں کا ایک دوسرے کو اپنی اوقات سے زیادہ بڑھ چڑھ کر تعارف کروایا۔ میں اور ذوالکفل ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے رہے۔ میرے منہ سے صرف اِتنا نکلا کہ اِن موصوف کی ڈاڑھی پر نہ جائیں۔ یہ جو اوپر سے نظر آ رہے ہیں وہ اندر سے ہرگز ایسے نہیں ہیں۔ مختار پارس نے مجھے گھوری ڈالی جیسے کہہ رہا ہو کہ میں نے تمھیں بدتمیزی سے منع بھی کیا تھا۔ اِس سے پہلے کہ پارس کچھ مزید لعن طعن کرتا اُس شرارتی آنکھوں والے نوجوان نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگایا اور بولا میری زندگی میں یہ پہلا شخص ہے جس نے مجھے صحیح پہچانا ہے۔ یہ میرا ذوالکفل سے پہلا تعارف تھا۔ اور پھر چل سو چل۔ اس کے بعد پتہ نہیں کتنی دوپہریں، شامیں اور راتیں ہم نے اکٹھے گزاریں۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرا کر کہتا کہ کھانا تو آپ نے کھانا ہی ہوگا، اِس کے علاوہ کچھ اور لوازمات بھی بتا دیں۔ میں نے اپنی زندگی کی اچھی چائے ذوالکفل کے گھر بیٹھ کر پی ہوئی ہے۔ میں کبھی حیران ہوتا کہ کیا اِسے کبھی غصہ بھی آتا ہوگا۔ کئی دفعہ ایسے ہوا کہ رات گئے وہ اپنا فون اُٹھا کر میرے سامنے رکھ دیتا۔ اُسے علم تھا کہ میں نے کچھ عشق کے تقاضے بھی پورے کرنے تھے۔ کتنی دفعہ اُس نے چپکے سے میری جیب میں پیسے ڈال دیے کیونکہ اُسے علم تھا کہ میری جیب خالی تھی۔

جب ۱۹۹۸ء میں ملتان چھوڑ کر اسلام آباد آنے لگا تو میرے راستے کی سب سے بڑی دیوار جمشید رضوانی، مختار پارس، شکیل انجم اور ذوالکفل جیسے دوست تھے۔ وقت تیزی سے گزر گیا تھا۔ اسلام آباد میں اُس کا پڑاؤ میرے گھر ہوتا۔ ایک دفعہ اُس نے مجھے کہا کہ مجھے ڈیپوٹیشن پر اسلام آباد لے آؤ۔ میں اُسے ایک افسر دوست کے پاس لے گیا۔ رات کو وہ میرے کمرے میں میرے بستر پر ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ اچانک نیند سے بیدار ہو کر مجھے کہا کہ یار یہ بات تو ہم تمھارے دوست کو کہنا بھول گئے کہ وہ نوکری کوئی ایسی ڈھونڈے جہاں کام نہ کرنا پڑے۔ مجھے ہنسی کا ایک شدید دورہ پڑا۔ میں کتنے عرصے تک مختار پارس اور خالد مسعود کے ساتھ مل کر اُس کا مذاق اُڑاتا کہ مولوی اگر تم جوانی میں بھی کام نہیں کرو گے تو کیا بڑھاپے میں جا کر کرو گے۔ کئی دفعہ میں نے اُسے دھمکی دی کہ میں تمھاری اس بات پر کالم لکھوں گا۔ اور وہ ہمیشہ منت سماجت پر اُتر آتا۔

وہ ایم اے انگلش سے مطمئن نہ ہوا تو نمل یونیورسٹی میں انگریزی بہتر کرنے کے لیے داخلہ لے لیا۔ میں اسے اپنے دو کمروں پر محیط فلیٹ میں لے آیا۔ وہ ایک ماہ میرے بیوی بچوں کے ساتھ گھر میں رہا۔ میرا دوسرا بیٹا پیدا ہوا تو میرا اور میری بیوی کا جھگڑا چپ چاپ سنتا رہا کہ نام کون رکھے گا۔ میری بیوی اُٹھ کر گئی تو صرف اِتنا بولا کہ کیا ایک ماں اپنے بچے کو نو ماہ پیٹ میں رکھ کر بھی اِس قابل نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے بیٹے کا نام رکھ سکے۔ تم ویسے تو عورتوں کے حقوق کی بات کرتے ہو لیکن گھر میں ایک ڈکٹیٹر ہو۔ میں نے مسکرا کر بیوی کو بتایا کہ مولوی صاحب نے فتویٰ تمھارے حق میں دے دیا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ چھ مہینے تک اپنے بیٹے کا نام نہیں رکھ سکی تھی۔

مجھے ہمیشہ سے اُس کا سعودی عرب جانا ہضم نہیں ہوا تھا۔ اُسے کئی دفعہ کہا کہ لوٹ آؤ کہ اُس کے بغیر دوستوں کی محفلیں ویران تھیں۔ اُس کا کنٹریکٹ ختم ہوا تو میں بڑا خوش ہوا۔ پھر پتہ چلا کہ مکہ کی یونیورسٹی میں پروفیسر لگ گیا تھا۔ میں اُس سے ناراض ہو کر لندن چلا گیا۔ وہ اکثر مجھے فون کرتا اور میرے کالموں پر تبصرے کرتا۔ میں خالد مسعود اور مختار پارس کا خوب گلہ کرتا کیونکہ مجھے علم تھا کہ وہ دوستوں کے درمیان ایک پل تھا۔ میں پتہ نہیں زندگی کے کتنے مرحلوں پر اداس اور مایوس ہوا، اور اِس نوجوان دوست نے مجھے ہمیشہ اپنا وقت اور مسکراہٹیں دیں۔ دو بیٹوں کے بعد اُس کی ایک بیٹی پیدائش کے کچھ دنوں بعد اللہ کو پیاری ہو گئی تو بھی وہ ویسا ہی رہا جیسا پہلے تھا۔ وہ اُن دوستوں میں سے تھا جنھیں ہمیشہ یہ پتہ ہوتا تھا کہ کس دوست کو کب کس چیز کی ضرورت تھی۔

ذوالکفل کی اِس اچانک موت نے ایک عجیب سا دکھ دل میں بھر دیا ہے۔ دوست بھی ایک فیملی ہوتے ہیں۔ دوستوں کی موت بھی بوڑھا کر دیتی ہے۔ لگتا ہے کوئی قیمتی چیز کھو سی گئی ہے۔ شاید اب نئے دوست زندگی میں نہ بنائے جا سکیں کہ دوستوں کی موت پر مزید آنکھیں نم نہیں کی جا سکتیں۔ ایک عجیب سا دھواں ہے۔ سمجھ میں نہ آنے والا شدید درد ہے جو آنکھوں کے ذریعے نہ بہہ سکتا ہے اور نہ ہی رک سکتا ہے۔ ایک ناقابلِ برداشت سے بے کلی ہے۔ اپنے اندر دور تک کہیں بڑھتی ہوئی اذیت ہے۔ بے چینی ہے۔ تنہائی اور اداسی ہے۔ مجھے پتہ نہیں یہ سب کچھ کیا ہے!

(روزنامہ جنگ ۲۲/ نومبر ۲۰۰۹ء)

سید ذوالکفل بخاری اور میں

محمد افتخار شفیع

الفاظ سے میرا رشتہ خاصا پرانا ہے۔ یہ ہمیشہ میری دسترس میں رہے ہیں۔لیکن نہ جانے کیوں آج میرے قابو میں نہیں۔ میرے اندر شکست وریخت کے اِس عمل کی وجہ میرے ظاہری و باطنی اعمال کی تقسیم بھی ہے۔ بخاری صاحب کے بارے میں لکھتے ہوئے الفاظ نے بغاوت کردی ہے۔ حواس کا باہمی ربط تعطل کا شکار ہے۔ میرے ذہن میں متعدد سوالیہ نشانات اپنی شدت کے ساتھ اٹھتے ہیں اور اپنے وجود کی نمود کے بعد آنِ واحد میں کہیں غائب ہوجاتے ہیں۔ واقعات گنگ ہیں۔ یادوں پر کہرا جما ہے اور تصورات کے آبگینے ایک چھناکے کے ساتھ ٹوٹنے کے منتظر ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے بس ایک زیرِ لب تبسم کی ہلکی سی پھوار ہے جس نے ملتان سے حرمین تک کے ہر راستے کو کچی مٹی کی سوندھی سوندھی مہک سے آباد کردیا ہے۔ ملتان کی کچی مٹی اور مکہ کی تقدس مآب پتھریلی زمین، دونوں کی خوشبوئیں اِس طرح باہم یکجا ہوئی ہیں کہ پہچان مشکل ہے۔ یہی جنت المعلیٰ کا قبرستان، مجھے اِس قبرستان میں جاروب کشی کی سعادت حاصل ہوچکی ہے۔ کسے خبر تھی کہ اِسی قبرستان میں ہمارے شاہ صاحب، ہمارے شاہ جی اور ہمارے سید صاحب کو بھی ایک قطعۂ اراضی الاٹ ہوگا۔

برادرم ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان نے جب ٹیلی فون پر مجھے سید ذوالکفل بخاری کے سانحۂ ارتحال کی خبر سنائی تو ہوش میں آنے کے بعد میرا پہلا سوال یہی تھا: ’’بخاری صاحب کا جسدِ خاکی کب لایا جارہا ہے؟ اُن کا جنازہ کب ہوگا اور کہاں ہوگا؟‘‘ وحید کی آواز بھرّائی ہوئی تھی۔ کہنے لگے: ’’ظاہر ہے جہاں کی مٹی تھی، وہیں دفن ہوگی۔‘‘ آج جب میں اِس جملے پر غور کرتا ہوں تو ’’وہیں کی مٹی‘‘ والی بات ہر لحاظ سے سچ لگتی ہے۔ وہ مٹی واقعی حجاز کی تھی۔ اُس کی خوشبوئیں بھی مدینے سے نسبت رکھتی تھیں۔ یہ سطریں جو میں لکھ رہا ہوں، میرے دوست اور مرشد سید ذوالکفل بخاری کے لیے ہیں۔ شاہ صاحب بڑے دل دار، بڑے ہی جلیل و مکرم، بے ساختہ درویش اور دوست نواز قسم کے آدمی تھے۔ میں نے شاہ صاحب کا جنازہ نہیں پڑھا، اُن کی قبر کی زیارت نہیں کی۔ اِس لیے اب میرے لیے ہر قبر ذوالکفل بخاری کی قبر بنی ہوئی ہے۔ یہاں مجھے احسان دانش کا ایک شعر یاد آرہا ہے:

دانش میں خوفِ مرگ سے مطلق ہوں بے نیاز
میں جانتا ہوں موت ہے سنت حضورؐ کی

یہ بات سچ، لیکن غم کی کیفیت والہانہ ہوتی ہے۔ میرا اور بخاری صاحب کا معاملہ ایسا ہی ہے۔ متمم بن نویرہ نے اپنے بھائی مالک بن نویرہ کی وفات کا مرثیہ لکھا تھا۔ اُس نے کہا تھا:

لقد لامنی عند القبور علی البکا   رفیقی لتذراف الدموع السوافک
فقال أتبکی کل قبر رأیتہٗ   لقبر ثوی بین اللوی فالدکادک
فقلت لہٗ، ان الشجا یبعث الشجا   فدعنی، فہذا کلہ قبر مالک

اِن مراسم کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے اِن کا تفصیلی جائزہ لینا ضروری ہے۔ یہ اپریل ۱۹۹۶ء کی بات ہے جب میں لوئر مڈل کلاس کی روایتی سی ہچکچاہٹ میں مبتلا تلاشِ روزگار کے سلسلے میں ملتان پہنچا۔ ملتان کے ادبی ناموں تک میری رسائی فقط ایک قومی اخبار کے ادبی ایڈیشن کے سبب تھی۔ میں اُنھیں ملتان کا چہرہ سمجھتا تھا۔ یہ بات اور کہ اپنے دس سالہ قیامِ ملتان کے عرصے میں یہ لوگ مجھے بڑے ہی بودے اور ''بونا پارٹ'' قسم کے محسوس ہوئے۔ ملتان کی ادبی شناخت کچھ اور لوگ تھے۔ اِن ''اور لوگوں'' میں ایک نام بخاری صاحب کا بھی تھا۔ کسی زمانے میں ذوالکفل کا ایک خط ''سرِ راہے'' والے مشہور کالم میں شائع ہوا تھا جس میں کالم نگار کی کسی معاملے میں درستی کی گئی تھی۔ تب سے یہ نام بھی ''طاقِ نسیاں'' پر کہیں دھرا تھا۔

ایک دن کسی محفل میں گفتگو کے دوران ''ذوالکفل بخاری'' کا نام ایک دفعہ پھر سننے میں آیا۔ میں چونکا۔ ''ارے ہاں ہاں، یہ کون ہیں؟'' پتا چلا کہ آپ انگریزی کے لیکچرار ہیں۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے نواسے ہیں اور بڑے علمی اور مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہوگا کوئی زاہدِ خشک، ناصح، محتسب اور واعظ قسم کا آدمی۔ میرے اندر کے شاعر نے اپنا کلاسیکی غزل کا مطالعہ کھول کر رکھ دیا۔

پھر ایک شام ایسی آئی جب محمد مختار علی اور میں سنٹرل لاء کالج (ملتان) میں فاران اکادمی کے اجلاس میں پہنچے۔ مختلف لوگ پہلے سے ہی موجود تھے۔ مختار نے تعارف کروادیا۔ یہ نیلے شیشوں والا چشمہ لگائے اسلم انصاری بیٹھے ہیں۔ یہ دھیمے انداز میں گفتگو کرنے والے پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان ہیں۔ یہ کھچڑی ڈاڑھی والے آدمی خالد مسعود خان ہیں جو تیز طرار لگتے ہیں لیکن ''ماٹھا کالم'' لکھتے ہیں۔ یہ سفید لٹھے کی کلف لگی شلوار قمیص پہنے، وقفے وقفے سے ہنسی کی پھلجڑی والے وحیدالرحمٰن خان ہیں۔ اور یہ ہیں ذوالکفل بخاری۔ کسی نے حیرتوں کے متعدد باب مجھ پر کھول دیے۔ سادہ سی شلوار قمیص، گلے میں گہرے رنگ کی چادر، سر پر ٹوپی، پیروں میں ہوائی چپل اور اُس میں چمڑے کے موزوں والے پاؤں۔ سنت کے مطابق ڈاڑھی، چہرے پر ایک ہلکا سا تبسم۔ پہلا تاثر یقیناً مرعوب کن نہ تھا۔ گفتگو کا سلسلہ چلا۔ تنقید کے لیے پیش کیے گئے فن پاروں پر تبصرے ہوئے۔ ذوالکفل بخاری کی بے ساختہ گفتگو کے دوران وہ بات کررہے تھے اور میں ''اے ترکِ غمزہ زن کہ مقابل نشستہ ای'' کی عملی صورت میں مبہوت بیٹھا تھا۔ اجلاس کے اختتام پر اُن کی علمیت، سادہ طبع اور مسحورکن شخصیت نے میرے دل میں گھر کرلیا تھا اور میں عجز و نیاز سے اُن کے پاس کھڑا تھا۔ اِس کے بعد ملاقاتوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوا۔ وہ پہلے مرحلے میں دوست اور پھر مرحلہ وار یار اور مرشد بنتے چلے گئے۔

فاران اکادمی سے مجھے پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان جیسے شفیق بزرگ اور ذوالکفل بخاری اور وحیدالرحمٰن خان جیسے مخلص دوست میسر آئے۔ ملاقاتوں کا یہ دور ۱۹۹۶ء سے ۲۰۰۲ء تک پھیلا ہوا ہے۔ ایک روز اُنھوں نے مجھے فون پر اطلاع دی کہ میں چند روز بعد سعودی عرب روانہ ہورہا ہوں۔ مجھے وہاں کے محکمۂ تعلیم نے انگریزی کے مدرس کے طور پر منتخب کیا ہے۔ مستحسن خیال کے گھر پر الوداعی دعوت ہے۔ وہ دوستوں کو کھانا دے رہے ہیں۔ آپ نے بھی اِس میں لازمی شریک ہونا ہے۔ اُس رات مستحسن صاحب کا گھر ''رونق کدہ'' بنا ہوا تھا۔ تادیر دوستوں کی گپ شپ جاری رہی اور ذوالکفل کو ''آہِ سرد'' کی غم ناک کیفیات کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ اُن دنوں میں اردو میں ایم اے کرچکا تھا، اور دورانِ تعلیم مجبوراً اختیار کرنے والے ٹیکسٹائل مل کے شعبۂ خریداری کی ملازمت سے بیزار تھا۔ شاہ جی میری اِس قلبی کیفیت کو سمجھتے تھے اور گاہے بگاہے مجھے اچھے مستقبل کی نوید دیتے رہتے تھے۔ ذوالکفل بخاری سعودی عرب چلے گئے، خان کو لاہور نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ بزرگ اپنے اپنے گھروں میں معتکف ہوگئے۔ چند ماہ بڑی خاموشی کے ساتھ گزرے۔ شاہ جی مجھے سعودی عرب جاکر بھول چکے ہیں۔ یہ خیال اکثر آتا اور ملول کرجاتا۔ میں نے ابھی

عرض کیا ہے کہ میں نے ایم اے اردو کیا تھا۔ دل میں استاد بننے کی خواہش بھی موجود تھی۔ فاران اکادمی کے اجلاس میں ذوالکفل بخاری، خان اور مختار پارس جیسے نوجوان لیکچراروں کو دیکھ کر رشک کرتا تھا۔ میری تنخواہ شاید اُس وقت ''نئے آنے والے لیکچرار'' سے زیادہ تھی لیکن مسئلہ علمی معاملات سے وابستہ اور ذہنی طور پر آسودہ ہونے کا تھا۔۲۰۰۳ء میں مجھے اپنی والدہ کے ہمراہ عمرے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ہم ''باب السلام'' کے راستے حرم شریف میں داخل ہوئے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ کعبے کو دیکھ کر جو دعا سب سے پہلے مانگی جاتی ہے وہ ضرور قبول ہوتی ہے۔ مالک کے حضور یہ دعا تو بہت چھوٹی تھی لیکن میں نے اپنے لیے ''تدریس'' کا شعبہ مانگا۔ میں ابھی مکے میں ہی تھا کہ ایک روز مجھے پتا چلا کہ ٹیکسٹائل مل والی ملازمت کو خطرہ ہے۔ یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے؟ میں نے پروفیسری مانگی اور تو نے مل مزدوری بھی خطرے میں ڈال دی۔ مکہ اور مدینہ میں اپنے قیام کی مدت پوری کر کے جب میں ملتان واپس پہنچا تو ''مل مزدوری'' واقعی خطرے میں تھی۔ میں شعبۂ خریداری میں ایک ایمان دار اور سخت افسر کے طور پر ''ناپسندیدہ'' تھا اِس لیے اپنے شعبے کے لوگوں اور مل کے فورمینوں کی سازش کا شکار ہوگیا تھا۔ لوگ مجھے عجیب نظروں سے دیکھتے تھے۔ میری ایمان داری اب اُن کی نظروں میں مشکوک ہوچکی تھی۔ میرا سارا دفتری کام التوا کا شکار تھا۔ میری ایمان داری اور محنت کی مثالیں دینے والا مل مالک ایک دن مجھے یہ کہنے پر مجبور ہوگیا کہ ''آپ کا عمرہ ہمیں بہت مہنگا پڑا ہے۔''

میں اب اِس ملازمت کو چھوڑ دینا چاہتا تھا۔ یہی دن تھے کہ جب ایک روز بہت عرصے کے بعد مجھے سید ذوالکفل بخاری کا فون آیا۔ وہ چھٹی پر ملتان آئے ہوئے تھے اور انھوں نے میرے لیے ملتان کے ایک اہم پرائیویٹ کالج میں ملازمت ڈھونڈ لی تھی۔ شاہ جی کا حجازِ مقدس سے آکر میرے لیے متعلقہ نوکری کا انتظام کرنا، دراصل میری دعا کی قبولیت کا ثمرہ تھا۔ دعا چوں کہ حجاز مقدس میں کی گئی تھی لہٰذا مشکل حالات میں کمک بھی اُسی سرزمین سے عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا نواسہ لے کر پہنچا تھا۔ اب مشکل مرحلہ یہ تھا کہ ''کیا میں کلاس پڑھا پاؤں گا؟'' ''کنٹرول کر سکوں گا؟'' شاہ جی نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا۔ انھوں نے کہا ''میں اور پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان صاحب آپ کی مدد کریں گے۔'' پہلے مرحلے پر مجھے حفیظ صاحب کے ہاں بھیجا گیا۔ ان سے مجھے تدریس اردو سے متعلق ہدایات ملیں اور اس کے بعد شاہ جی کے ہاں جا پہنچا۔ انھوں نے اپنے طور پر میری Demonstration لی۔ میں ان کی سادہ سی بیٹھک میں کھڑا ہو کر انھیں لیکچر دے رہا تھا اور وہ واحد سامع کی حیثیت سے آنکھیں بند کیے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے۔ بیس منٹ بعد انھوں نے ''ہاں'' کہی۔ یہ اِس بات کا اظہار تھا کہ میں استاد بننے کے قابل ہوں۔ پنجاب کالج ملتان کی شعبۂ اردو کی ملازمت کا اہتمام ذوالکفل بخاری نے کیا تھا۔ وہاں دو سال گزارنے کے بعد جب میری پنجاب پبلک سروس کمیشن کے تحت محکمۂ تعلیم حکومتِ پنجاب میں بطور لیکچرار (اردو) کا انتخاب ہوا تو وہاں سے فراغت کے لیے بھی شاہ صاحب ہی میرے ہمراہ تھے۔ اُن دنوں بھی وہ چھٹی پر گھر آئے ہوئے تھے۔

فاران اکادمی کی سرگرمیاں چوں کہ تعطل کا شکار تھیں۔ میں نے فرصت میسر آتے ہی اِسے دوبارہ متحرک کیا۔ پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان کی شفقت بھی میرے ہمراہ تھی۔ شاہ جی سعودی عرب سے آئے تو کہنے لگے ''اسلام آباد پہنچتے ہی مجھے مختار پارس نے بتایا کہ فاران اکادمی پھر سے زندہ ہوگئی ہے۔'' پھر مجھے کہنے لگے ''آپ سے اِس کی تو بہرحال توقع تھی۔'' یہ جملہ اُنھوں نے اِس انداز سے بولا کہ ادائیگی کے لحاظ سے اپنی پوری جزئیات کے ساتھ مجھ پر آج بھی طاری ہے۔

وہ شہر کی ادبی فضا میں تحرک کے خواہش مند تھے۔ کم کم سہی لیکن ادبی اجتماعات میں وہ آتے جاتے رہتے تھے۔ جب بھی ملاقات ہوتی وہ ناصح نہیں بلکہ دوست بن کر لامحسوس طریقے سے میری تربیت کرتے۔ ایک دفعہ عرش صدیقی اکیڈمی کے

مشاعرے کے بعد (جس کی صدارت مستنصر حسین تارڑ کررہے تھے) وہ مجھے ایک طرف لے گئے۔ کہنے لگے آپ کی غزل میں ہندی ڈکشن کا استعمال کچھ زیادہ ہونے لگا ہے۔ فارسی تراکیب سے بھی لگاؤ پیدا کریں۔ اِس کے بعد انھوں نے فارسی کی تہذیبی، مذہبی اور فکری اہمیت پر تفصیل سے گفتگو کی۔

محکمۂ تعلیم میں میرا پہلا تقرر گورنمنٹ کالج فورٹ عباس میں ہوا، اور میں ملتان سے اپنے گھر ساہیوال پہنچنے کی کوشش میں گھر سے اور بھی دور ہوگیا۔ صحرا کی زندگی میں دن کو غزال اور رات کو مہتاب دیکھتے دیکھتے آخر میں اُکتا گیا۔ میں نے ایک دن ذوالکفل کو فون کیا اور کہا شاہ صاحب! صحرا نشین ہوکر تو میں بالکل ہی تنہا ہوگیا ہوں، ملتان میں گھر سے دور تھا تو کم از کم حفیظ الرحمٰن خان اور جاوید اختر بھٹی کی صحبتوں سے لطف اندوز تو ہوتا تھا اور یہاں تو وہ بھی نہیں رہیں۔ اُنھوں نے مجھے حوصلہ دیا، وعدہ کیا کہ میں جب بھی پاکستان آیا تمھارے پاس فورٹ عباس ضرور آؤں گا۔ سنا ہے وہاں ہرن کا شکار ہوتا ہے۔ مجھے شکار کا بہت شوق ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ باتیں وہ صرف میری ہمت بڑھانے کے لیے کررہے تھے۔ ورنہ اب صحرا، کہاں وہ صحرا رہے ہیں:

ہم اہلِ ہجر کو صحرا ہی ایک رستہ تھا
اب اُس طرف سے بھی خلقِ خدا گزرتی ہے

شاہ جی کے آنے سے پہلے ہی میرا تبادلہ گورنمنٹ کالج ساہیوال میں ہوگیا۔ اب میں ذہنی طور پر نہایت آسودہ تھا۔ ایک دفعہ ملتان کا چکر لگا تو جاوید اختر بھٹی صاحب کی معیت میں شاہ جی کے ہاں پہنچا۔ کہنے لگے:

> افتخار صاحب! مجھے اِس بات کی نہایت خوشی ہوئی ہے کہ آپ ساہیوال پہنچ گئے ہیں۔ اب آپ ایک اچھے تعلیمی ادارے کے استاد ہیں۔ ایک استاد کے لیے ضروری ہے کہ لائق شاگردوں کا ایک حلقۂ اثر پیدا کرے۔ ساہیوال کالج کو ہی لے لیں۔ ڈاکٹر خورشید رضوی جب بھی کہیں کوئی انٹرویو دیتے ہیں اپنے ساہیوال کے استاد ڈاکٹر صوفی ضیاء الحق کا ذکرِ خیر ضرور کرتے ہیں۔ یہ ہے ایک استاد کی معراج۔

وہ خود بھی ایک اچھے استاد تھے اور چاہتے تھے کہ ان کے دوست بھی ان جیسے بن جائیں۔ اُملج جیسے دور دراز کے قصبے سے ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ میں اُن کا تقرر ہونا اُن کے اچھا استاد ہونے کا ثبوت ہے۔ جب سید ذوالکفل بخاری آخری دفعہ ملتان آئے تو میں بھی ملتان گیا۔ اتفاق سے وحید الرحمٰن خان بھی آئے ہوئے تھے۔ میں وحید الرحمٰن اور توحید الرحمٰن کے ہمراہ اُن کے پاس گیا۔ بڑی دیر تک گفتگو کا سلسلہ چلتا رہا۔ اس کے بعد میں نے اجازت لی اور بھٹی صاحب (جاوید اختر بھٹی) کے فرزند، حسن کے ساتھ ان کے والد صاحب سے ملاقات کی خاطر چل پڑا۔ ذوالکفل بخاری بھی پطرس بخاری کی طرح ہمارے حلقے کے ''بخاری'' تھے۔ دونوں اپنے اپنے حلقے کے مرشد تھے۔ دونوں انگریزی کے استاد تھے۔ دونوں بیرونِ ملک، ملکِ عدم کو سدھارے اور اپنے اپنے مزاج کی مٹی کا رزق بنے۔ میرا جو تعلق اپنے اِس ''دوست نما مرشد'' سے ہے اُس کا احاطہ کرنا اِن چند صفحات میں ممکن نہیں۔ اِس کے لیے ایک کتاب چاہیے۔ یہ مضمون تو عاجلانہ انداز میں لکھا جارہا ہے۔ میری آنکھیں تر ہیں اور دل بوجھل ہے، ہاتھ کپکپا رہے ہیں۔ الفاظ میرے قابو میں نہیں۔ لیکن اِس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ جب اگلے جہان میں اُن سے ملاقات ہوگی تو وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ کہیں گے: ''آپ سے اِس کی تو بہرحال توقع تھی۔''

قسمت کا دھنی

ڈاکٹر عبدالرازق☆

کیسا قسمت کا دھنی ہم کو دلآرام ملا ہے
ماں کے قدموں میں اسے گوشۂ آرام ملا ہے

بار ہا ارادوں کا اعادہ کیا مگر قلم کو حوصلہ کہاں؟ طبیعت کچھ لکھنے کی طرف آتی ہی نہیں۔ جو کچھ لکھا ہے اُسے میرے مرحوم دوست کے حکم کی تعمیل سمجھ لیں۔ چالیس سالہ ''منّا'' شہزادۂ دارِ بنی ہاشم، ذہنی طور پر بوڑھے لوگوں کی آرزوؤں اور تمناؤں کا محور، جسے مرحوم لکھتے ہوئے یوں احساس ہونے لگتا ہے کہ ابھی فون کی گھنٹی بجے گی اور لائن پر دوسری طرف ''وہ'' یوں گویا ہوں گے ''—''۔ خوش بخت مجھ سے کہا کرتے تھے کہ ''اپنے مشاہدات کو قلمبند کر کے کہیں چھپوا دیا کرو۔ یہ امانت ہے اور اِسے آگے منتقل ہونا چاہیے۔ اور پھر تمھارے شہر میں تو الزبیر چھپتا ہے، وہاں بھیج دیا کرو۔'' مجھے کیا خبر تھی کہ اُن کی زندگی میں تو میں یہ نہ کر پاؤں گا مگر اُن کے چلے جانے کے بعد خود اُنہی کی باتیں مجھے لکھنا پڑیں گی۔

پہلی مرتبہ جنوری ۱۹۹۵ء میں دارِ بنی ہاشم ملتان میں سیّد ذوالکفل بخاری سے ملاقات ہوئی۔ یہ خاندانِ بخاری کا پہلا فرد ہے جس سے میں ملا۔ اِس وقت میں ایف ایس سی سالِ اوّل کا طالب علم تھا اور اِسی سال سیّد ابوذر بخاری کا انتقال ہوا۔ پھر ملاقاتوں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ بارہا ملتان جانا ہوا۔ کوشش ہوتی کہ ہر بار ملاقات کی کوئی صورت نکل آئے اور ہر بار اللہ رب العزت کوئی سبب بنا دیتا۔

ایک مرتبہ جناب سیّد مرتضٰی شاہ صاحب (ذوالکفل کے چچا) سے دریافت کیا کہ ذوالکفل بھائی ہیں؟ بولے: ''او بھائی اَے تے اساں دشمن آں!'' اُنھیں اِس بات کا خیال رہتا تھا کہ میری پڑھائی تو ٹھیک جا رہی ہے۔ جب مجھے ایم بی بی ایس میں داخلہ مل گیا تو بتانے لگے کہ آپ کے والد صاحب کہہ رہے تھے کہ یہ ہر وقت بڑے شاہ صاحب (سید ابوذر بخاریؒ) کی تقریریں سنتا رہتا ہے، پتہ نہیں کیا کرے گا؟ اِس لیے میں تو ڈرا ہوا تھا مگر اللہ کا شکر ہے کہ آپ کا داخلہ میڈیکل کالج میں ہو گیا۔

میڈیکل کالج کے ابتدائی دنوں میں میرے ایک ہم جماعت عدنان طارق، جن کا نام میں اُس وقت نہ جانتا تھا، نے میرے قریب آ کر جب مجھے میرے نام سے پکارا تو میں چونکا۔ کہنے لگے پریشان مت ہوں۔ آپ کو سیّد ذوالکفل

☆وکٹوریہ ہسپتال، بہاول پور

بخاری کا سلام ہے۔ خاندانِ بخاری کے دیگر افراد سے میرا تعارف انہی کی وجہ سے ہوا۔ میرے لیے تو اُن کا وجود اللہ پاک کی ایک نعمت تھا۔ جب بھی ملنے جانا ہوتا ہر بار کوئی نیا مشورہ، نئی بات، نئی کتاب اور نیا آدمی بتلا دیتے۔ گھنٹوں نشست ہوتی، جی تھا کہ بھرنے کا نام ہی نہ لیتا۔ بلکہ، تھوڑے سے اضافے کے ساتھ، یوں کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا:

تشنگی روز ملاقات میں رہ جاتی تھی
میری اِک بات کہیں بات میں رہ جاتی تھی
چاند آنکھوں سے گزرتا تھا، گزر جاتا تھا
روشنی دل کے مضافات میں رہ جاتی تھی

پروفیسر ظفر احمد چودھری، پروفیسر عابد صدیق، پروفیسر انور مسعود، مسعود اوکاڑوی، اشفاق احمد مرحوم، حافظ صفوان محمد چوہان، معاویہ رضوان کا تعارف سید صاحب ہی کا مرہونِ منت ہے۔ چند برس بعد ملتان سے جناب محمد خان صاحب کا قائدِ اعظم میڈیکل کالج بہاول پور داخلہ ہوگیا۔ پھر اُن کے واسطے سے رابطہ رہا۔ اس کے بعد فون ذریعہ بنا۔ اُن کا شادی کارڈ مجھے خان صاحب ہی نے پہنچایا مگر مجھے آج تک اس بات کا قلق رہا کہ میں اُن کی شادی پہ پہنچ نہ سکا کیونکہ مجھے وارڈ سے چھٹی مل نہ سکی۔ سعودی عرب ڈیپوٹیشن پر جانے سے پہلے ان کی ایک مرتبہ کامرس کالج میں امتحان پر ڈیوٹی لگی تھی۔ تب وہ بہاول پور آئے تھے مگر میری ملاقات نہ ہوسکی۔ سعودی عرب جانے کے بعد گزشتہ سردیوں میں پنجاب کالج بہاول پور میں اُن کا تقریباً پون گھنٹے کا لیکچر ہوا، وہاں ملاقات ہوئی۔ اُنھیں واپس اُسی رات جانا تھا۔ لہٰذا وہ اُسی رات ہی ملتان لوٹ گئے۔ مذکورہ لیکچر میں فرمایا کہ ڈاکٹر ف عبدالرحیم صاحب مدراس کے رہنے والے ہیں۔ اُن سے مکہ میں ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا کہ زبانوں میں لینا دینا تو رہتا ہی ہے، آپ کا اِس بارے کیا خیال ہے؟ فرمایا کہ میرا تو تھیسس ہی یہی ہے۔ اب چھپ گیا ہوگا، میں کہتا ہوں کہ پورا یورپ انگریزی نہیں بلکہ عربی بولتا ہے۔ وہ اس لیے کہ انگریزی زبان کے بیشتر الفاظ عربی ہی سے ماخوذ ہیں۔ قرآن وحدیث اور دیگر عربی کتب کے تراجم جب دیگر زبانوں میں ہوئے تو یہاں سے بہت سارے الفاظ انگریزی نے بھی لے لیے۔ میرا دعویٰ ہے کہ قرآن وحدیث میں سے کہیں نہ کہیں اِن کا مفہوم آپ کو مل جائے گا اور میں نے تو اِس کو مثالیں دے کر اپنے مقالہ میں لکھا ہے۔ پھر فرمانے لگے کہ جس طرح دیگر ممالک کے لوگ اپنی اپنی زبان میں علوم وفنون پڑھتے اور سیکھتے ہیں، یہی طرح اگر ہمارے ملک میں بھی پڑھ جائے تو ہم لوگ کیسے پیچھے رہ سکتے ہیں؟

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کے ایک شاگرد کا واقعہ یوں سنایا کہ اُن کے شاگرد نے فارغ التحصیل ہونے پر اجازت چاہی کہ میں مروّجہ نظم سے ہٹ کر کسی اور نظم میں کام کرنا چاہتا ہوں۔ اس سے دین کا کام بھی ہوگا اور میری کچھ مالی حالت بھی بہتر ہوجائے گی۔ شیخ الہندؒ نے اجازت دے دی۔ کچھ عرصے کے بعد جب شاگرد اپنے استاد سے ملا تو اُس نے اعتراف کیا کہ میرا وہاں جانا بہتر نہ تھا بلکہ بہتری آپ کے ساتھ ہی کام کرنے میں تھی۔ گزشتہ ملاقات میں فرمایا کہ مجھے مولانا بدرِ عالم میرٹھیؒ کی اولاد میں سے ایک صاحب ملے اور اُنھوں نے بتلایا کہ سعودی گورنمنٹ نے تین مرتبہ مولانا کی قبر کھولی اور تینوں ہی بار جب اُنھیں صحیح سلامت پایا تو قبر بند کر دی۔

اُن کا خیال تھا کہ فارغ التحصیل علماء کو پروفیسر ظفر احمد چودھری صاحب سے خوب استفادہ کرنا چاہیے۔ اِس سلسلے میں میں پروفیسر صاحب سے ملا اور اُن سے گزارش کی تو اُنھوں نے ہماری اِس خواہش کو شرفِ قبولیت سے نوازا۔ مگر موصوف

بہاول پور سے جا کر جتوئی رہائش پذیر ہوگئے اور یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔

کوئی سال بھر پہلے کی بات ہے جب میرا ملتان آنا ہوا تو اُس وقت ذوالکفل بھائی کی پروفیسر صاحب سے کافی لمبی بات چیت ہوئی تھی جس میں اُنھوں نے اپنی اِس خواہش کا بھی اظہار کیا تھا کہ موصوف اپنا غیر مطبوعہ مواد بھی منظرِ عام پر لائیں۔ پروفیسر صاحب بڑے کام کے آدمی ہیں۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اُن کا بڑا کام ہے۔ تشکیلِ جدلی اُن کا خاص موضوع ہے اور السّیرۃ میں اُن کے کافی طویل مضامین چھپتے رہتے ہیں۔

اُن کے انتقال کے وقت میں ملتان میں نبیرۂ امیرِ شریعتؒ (سید محمد معاویہ بخاری) کے پاس حضرت امیر شریعتؒ کی اُسی بیٹھک میں بیٹھا ہوا تھا جہاں ذوالکفل بھائی کے نانا تشریف فرما ہوتے تھے۔ ہمارے بے تکلف اور مہربان ومحسن، سید محمد معاویہ بخاری نے ہی یہ اندوہناک خبر سنائی۔ خبر کیا تھی۔ جیسے دل کے وسیع وعریض صحرا میں ایک دم اندھیرا سا چھا جائے، اچانک بادل گرجیں، بجلی کوندے اور گر جائے۔ ہماری حالت کچھ اِس طرح کی تھی جیسے کوئی ہاتھ ملتا رہ جائے۔ فوراً اُٹھ کر دارِ بنی ہاشم گیا۔ وہاں حضرت پیر جی سید عطاء المہیمن بخاری مدظلہ سے بغلگیر ہوا اور میرے صبر کا پیمانہ تو ٹوٹ گیا مگر آفرین ہے خانوادۂ امیرِ شریعتؒ پر کہ خلافِ سنت سانس بھی نکلے۔ فرمایا: ’’ڈاکٹر صاحب! آپ تو ہمیں تسلی دینے آئے تھے، آپ کو کیا ہوگیا؟‘‘

وہاں سب سے ملا، اگر کسی سے نہ مل سکا تو اُس سے جس سے اکثر ملنے جایا کرتا تھا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اللہ رب العزت روزِ قیامت اُن سب سے ملوا دے گا جن سے ہم ملنا چاہتے ہیں۔ مگر وہ وہاں جاچکے ہیں جس کے بارے میں شادؔ عظیم آبادی نے یوں کہا ہے:

پیغام بھیجتا ہے نہ لکھتا ہے خط کوئی
یہ بھی عجب طرح کا عدم میں رواج ہے

ایک بار پیر سید نصیر الدین نصیر گولڑویؒ کا یہ شعر میں نے اُنھیں لکھ بھیجا:

شیخ جی کل رات چوری چھپے مے خانے گئے
اِس قدر چہرہ تھا نورانی کہ پہچانے گئے

اِس کا یہ جواب آیا:

مے کدے میں شیخ جی رندوں کو سمجھانے گئے
اور جب لوٹے بڑی مشکل سے پہچانے گئے

ایک بار مسعود اوکاڑوی کا یہ شعر پڑھ رہے تھے:

حائل ہیں ابھی حیات کے یہ چند روز ورنہ
وہ گوشۂ آرام میرے سامنے ہے

’’گوشۂ آرام‘‘ پہ زور دیتے اور انگلی سے اشارہ بھی کرتے۔ اُن کے حسنِ خاتمہ پر بھی یہ شعر کس قدر چست بیٹھتا ہے:

کیسا قسمت کا دھنی ہم کو دلآرام ملا ہے
ماں کے قدموں میں اُسے گوشۂ آرام ملا ہے

روحوں کی شناسائی

سید عزیز الرحمٰن☆

ہر آنے والے کو جانا ہے، لیکن یہ سفر اس قدر سریع اختیار ہو جائے گا، کسے خبر تھی؟ ذوالکفل بخاری بھی چلے گئے۔ یہاں سے چل کر دور دوسرے نگر جا بسے۔ رب تعالیٰ ان کی روح کو شاد کام اور مسرور کرے۔ ہمارے پاس اب دعاؤں اور ان کی یادوں کے سوا کچھ نہیں بچا۔

ذوالکفل بخاری کا نام عرصے سے سنا ہوا تھا، اخبارات میں مضامین اور بعض اوقات تصویریں بھی نظر آ جاتی تھیں، گو کہ برادرِ اکبر سید محمد کفیل بخاری سے ۱۹۹۵ء۔۹۶ء سے یاد اللہ تھی مگر ذوالکفل سے ملاقات عرصے تک نہ ہو سکی۔ دار بنی ہاشم ملتان آنے کا اتفاق ہوجاتا تھا، مگر ذوالکفل سے ملاقات ۲۰۰۱ء میں ہوئی۔ ہاں رابطہ پہلے سے تھا، خصوصاً ۱۹۹۹ء میں جب ششماہی السیرۃ کے اجرا کا ارادہ کیا گیا تو ملک و بیرون ملک کے اہلِ علم و اہلِ تحقیق سے رابطہ کیا گیا، ذوالکفل بخاری سے بھی رابطہ ہوا۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ اپنی خاص دل چسپی کا اظہار کیا، تجاویز دیں، مشوروں سے نوازا، بلکہ پروفیسر ظفر احمد سے رابطے کا سبب بھی وہی بنے۔ السیرۃ کے قارئین جانتے ہیں کہ جناب پروفیسر ظفر احمد کا السیرۃ میں حصہ سب اہلِ قلم سے زیادہ ہے، ۲۲ شماروں میں انیس بیس مضامین کی اقساط شائع ہو چکی ہیں، اگر گزشتہ پچاس ساٹھ برس کی اردو سیرت نگاری کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ پروفیسر ظفر احمد صاحب کا کام سب سے نمایاں، امتیازی اور تخلیقی نوعیت کا ہے۔ اس طرح یہ سلسلۂ سیرت ذوالکفل بخاریؒ کے لیے صدقۂ جاریہ ہے۔

آپ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے نواسے تھے۔ یہ انتساب بجائے خود خاصا وقیع اور زندگی گزارنے کے لیے کافی تھا، مگر تخلیقی کرب رکھنے والی روحیں آسودگی سے زیادہ اظہارِ کرب کی تمنائی ہوتی ہیں۔ ایسوں کو سکون مشقت میں اور اطمینان محنت کے بعد نصیب ہوتا ہے، یہ دو چار کی بات نہیں اہلِ فن کا صدیوں سے یہی وطیرہ و اسلوبِ حیات رہا ہے، ذوالکفل کی کیمسٹری بھی اس سنت اللہ سے مختلف نہیں تھی۔ ذوالکفل کی شخصیت کے دو نمایاں حصے تھے، ایک تو نشست آرائی اور انجمن سازی، دوسرے تخلیقی تنہائی، محفل میں دوستوں کے جھرمٹ میں نظر آنے والا ذوالکفل، تحریروں میں بالکل یکہ و تنہا نظر آتا ہے، نہ جانے کیوں؟ کیا یہ بھی انفرادیت کی متلاشی انسانی انا کا کوئی اظہار یا کچھ اور؟ اب یہ سوال کس سے کیا جائے۔ یوں بھی تشنگی انسانی فکر کے ارتقا کا ایک ناگزیر مرحلہ ہے، سو ایک تشنگی اور سہی۔

میں پہلی ملاقات کے احوال سنانے جا رہا تھا، ایک بار دارِ بنی ہاشم گیا، جناب کفیل بخاری صاحب سے ملاقات ہوئی، اتنے میں ذوالکفل تشریف لے آئے، پہلی ہی ملاقات میں بلاتمہید گپ شپ شروع ہوگئی۔ حالانکہ عموماً ایسا نہیں ہوتا۔ پہلے تعارف ہوتا ہے، پھر بات چیت شروع ہوتی ہے، بے تکلفی پیدا ہوتی ہے، تب کہیں گپ شپ کی نوبت آتی ہے۔ یہاں پر سب

☆مدیر سہ ماہی السیرۃ کراچی/ مدیر ماہنامہ تعمیرِ افکار کراچی

کچھ نہیں ہوا، شاید یہ مرحلے ملاقات سے پہلے ہی طے ہو چکے تھے، غائبانہ طور پر۔ کفیل بخاری صاحب نے موقع غنیمت سمجھا اور اپنے امور نمٹانے میں مصروف ہو گئے۔

اس وقت گپ شپ شروع ہوئی تو اتنی طول پکڑی کہ وہ نشست کئی گھنٹوں پر محیط ہوگئی۔ سیاست، مذہب، مذہبی سیاست، تحقیق وادب، سیرت، سیرت نگاری کے رجحانات، اسالیب، اہل ادب کی خدمات، شخصیات، تذکرے، لطائف، واقعات سب گفتگو کا حصہ بنتے رہے، اور ذہن کے دریچے وا ہوتے رہے۔ حیرت یہ تھی کہ تحریر میں نہایت مشکل پسند شخصیت رکھنے والا عام گفتگو میں نہایت سادہ اسلوب کا حامل تھا، واضح بات اور دوٹوک موقف، بے لاگ تجزیہ، خصوصاً سیرت پر نئے عناوین سامنے آئے۔

یہ گفتگو کوئی یبوست زدہ مخصوص قسم کی خشک گفتگو نہ تھی۔ اس میں لطائف بھی تھے، اور لطافتیں بھی، چائے آئی تو شکر کا سوال پیش ہوا۔ میں نے ڈاکٹر مفتی محمد مظہر بقاؒ کے حوالے سے کئی لطیفے سنائے۔ خالد اسحاق ایڈووکیٹ اور ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفیؒ کے حوالے سے بھی چینی کے فضائل پر بات کی۔ آخر میں ایک لطیفہ ذوالکفل نے بھی سنایا، کہنے لگے کہ چینی کا مسئلہ بڑا دل چسپ ہے، ایک صاحب سے پوچھا کہ چینی کتنی لیں گے تو بولے کہ ایک چمچہ چھ بار ڈال دیجیے۔ خاص بات یہ تھی کہ پہلی ملاقات پہلی محسوس نہیں ہوئی، ملتے ہی یوں لگا کہ برسوں کی شناسائی ہے، اسے روحوں کی شناسائی کے علاوہ کوئی عنوان نہیں دے سکتا۔

سعودی عرب جانے کے بعد ملاقات کا امکان ویسے ہی کم ہو گیا تھا، مگر جب بھی آتے تو فون پر بات ضرور ہوتی، بلکہ کئی بار ہوتی۔ کراچی آنے کا پروگرام بھی بنتا ہی رہا، ہمیشہ یہی کہتے کہ ان شاء اللہ آئندہ ضرور پروگرام بنائیں گے۔ یہاں کی اہم شخصیت سے ملاقاتوں کا ہمیشہ لالچ دیا، اور وہ لالچ میں آتے بھی، ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی، مولانا سید محبوب حسن واسطی اور پروفیسر علی محسن صدیقی سے ملنے کا اشتیاق بارہا ظاہر کیا، اب تو کشفی صاحب بھی وہیں پہنچ چکے جہاں ذوالکفل اب گئے ہیں۔ وجدان یہ کہتا ہے کہ وہاں ان دونوں کی ملاقات ضرور ہوئی ہوگی، بے نیازی اور ''سادانیت'' یہ ''دوعلل ہائے معترضہ'' ایسے تھے جو ان دونوں میں مشترک تھے، روحوں کے ملاپ میں اگر قدر مشترک کا کوئی کردار ہے تو اس ملاقات میں کوئی شبہ نہیں ہوسکتا۔

ذوالکفل سے ایک ملاقات، جو آخری ملاقات ٹھہری ان کی گزشتہ سے پیوستہ آمد پاکستان کے موقع پر ملتان میں ہوئی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے اکٹھے گزرے، گفتگو تو زیادہ تر اس وقت کے سیاسی وملکی حالات کے گرد گھومتی رہی، مگر ماحول گپ شپ والا ہی رہا۔ کسے معلوم تھا کہ یہ آخری ملاقات ٹھہرے گی۔ اس کے بعد کئی بار فون پر بات ہوئی، آخری بار پاکستان آمد پر بھی فون پر بات ہوئی، حسب سابق ملنے کا پروگرام بھی بنتا رہا، مگر اس دوران نہ میں کراچی سے نکل سکا۔ نہ انھیں ادھر آنے کا موقع ملا۔ پھر واپس سعودی عرب چلے گئے۔ ۱۶/ نومبر ۲۰۰۹ء کو الخیر انٹرنیشنل اسلامک سینٹر لاہور میں ایک روزہ ورک شاپ تھی۔ میں بھی مدعو تھا۔ گفتگو ختم کرکے کھانے پر بیٹھا تو برادرم حافظ نعمان حامد نے اچانک کہا، ذوالکفل صاحب کا پتا چلا؟ دل کی دھڑکن اچانک تیز ہوگئی۔ نہیں کیا ہوا؟ آپ کو نہیں پتا؟ نہیں بھائی ہوا کیا؟ کل روڈ ایکسیڈنٹ میں مکہ مکرمہ میں انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ بوجھل دل کے ساتھ چند لقمے لیے اور واپسی کا پروگرام تبدیل کرکے اگلے روز دارِ بنی ہاشم ملتان پہنچا۔ ذوالکفل مرحوم کے والد ماجد جناب پروفیسر سید محمد وکیل شاہ صاحب، ماموں سسر مولانا سید عطاء المہیمن بخاری اور بھائی سید محمد کفیل بخاری سے تعزیتِ مسنونہ کی۔ رسمِ دنیا میں جکڑے ہم لوگ جانے والوں کے لیے یہی کچھ کر سکتے ہیں۔ رہے نام اللہ کا۔

عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

سعود عثمانی

یہ ۱۹۹۶ء کی بات ہے جب یارِ دلنواز وطرحدار معین نظامی کی نظموں کا مجموعہ تجسیم ظہور پذیر ہوا۔ وہی معین نظامی جن کے نام کو بعد میں ماشاءاللہ پروفیسر، ڈاکٹر، صدرِ شعبۂ فارسی، محقق، دانشور وغیرہ کے سابقے لاحق ہوگئے۔ اعلیٰ اور منفرد نظموں کی اِس کتاب تجسیم کی تقریبِ پذیرائی کا اہتمام برادرم وحید الرحمٰن خان نے ملتان میں کیا۔ وحید الرحمٰن (اب ڈاکٹر) انہی دنوں اورینٹل کالج سے تازہ تازہ فارغ التحصیل ہوئے تھے۔ ان کا بے پایاں محبت اور خلوص اسی وقت سے میرے ہمراہ رہا ہے اور میں اپنی تمام تر بدتمیزیوں اور کم توفیقیوں کے باوجود اس سرمائے کی قدر کرتا رہا ہوں۔ وحید الرحمٰن صاحب نے مجھے بھی ازراہِ کرم تجسیم کی اِس تقریب میں شرکت اور مضمون پڑھنے کی دعوت دی۔ اور سچ یہ ہے کہ اس سفر میں ملتان اور اہلِ ملتان کے ادبی رخ کا اندازہ ہوا۔ جناب حفیظ الرحمٰن خان اور ان کے خوش ذوق فرزندان کے علاوہ ڈاکٹر اسلم انصاری، خالد مسعود، مستحسن خیال، مختار پارس، ڈاکٹر مختار ظفر اور دیگر حضرات ایسے نام ہیں جن سے بعد کے روابط میں ہمیشہ دل و دماغ کو آسودگی میسر آتی رہی ہے۔

لیکن ایک ملاقات ان سب پر حاوی ہوگئی۔ ملتان پہنچنے کے فوراً بعد ایک صاحب سے تعارف ہوا جو نوجوانی اور جوانی کی سرحد پر کھڑے تھے۔ لمبا قد، دبلا پتلا جسم، باریش، پتلے فریم کی عینک، آنکھوں میں تھرکتی ذہانت اور ہونٹوں سے پھوٹتے جملے۔ سادگی کے باوجود وضع قطع کسی دینی مدرسے کے ایک خوش نسب طالب علم کی۔ ان کا سید ذوالکفل بخاری کے نام سے تعارف کرایا گیا۔ مجھے یاد ہے کہ مزید تعارف سے قبل ہی ہم سب سمجھ گئے تھے کہ ان کا تعلق کسی عالی مرتبت گھرانے سے ہے۔ ویسے بھی ملتان میں اگر کسی کے نام کے ساتھ بخاری جڑا ہو تو ممکن ہی نہیں کہ پہلا خیال امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے خانوادے کے علاوہ کسی طرف جائے۔ یہ وہ گھرانہ تھا جس کا بڑی عزت واحترام سے ذکر کرتے میں نے اپنے بزرگوں کو دیکھا تھا اور حضرت شاہ صاحبؒ کی خطابت کے بعض ایسے واقعات بھی ان سے سنے تھے جو عموماً کتابوں میں بھی دستیاب نہیں ہیں۔ عالمِ اسلام کے نامور اور باکمال خطاط اور ہمارے مشفق و مہربان جناب سید نفیس الحسینی نفیس رقم صاحبؒ کے دولت کدے پر اور اپنے ادارۂ اسلامیات میں سید عطاء المحسن بخاری اور سید عطاء المہیمن بخاری کی باکمال شخصیات سے فیض یاب بھی ہو چکا تھا۔ اس لیے اُن کی خوش ذوقی، خوش گفتاری اور وسعتِ مطالعہ پر تو چنداں حیرت نہ ہوئی کہ یہ اس گھرانے کی خصوصیات ہیں لیکن یہ بات ضرور باعث حیرت تھی کہ ذوالکفل نہ صرف جدید معاصر شاعری پر بھرپور نظر رکھتے ہیں بلکہ خود اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں۔

اس ملاقات نے آئندہ کی بہت سے ملاقاتوں کے در وا کر دیے۔ میری شاعری کی پہلی کتاب ''قوس'' شائع ہوئی تو انھوں نے فون پر تفصیلی تبصرہ کیا اور بھرپور داد سے نوازا۔ میں نے اس گفتگو میں بھی یہ محسوس کیا کہ وہ کتاب سے سرسری نہیں گزرے اور انھوں نے شاعر کی کیفیات تک پہنچنے کی سعی کی ہے۔ اور کتابوں کے معاملے میں ان کا یہی رخ ہمیشہ دیکھنے میں آیا۔ شعر کے رد و قبول کا فیصلہ ان کا تربیت یافتہ شعور کرتا تھا اور وہ اس معاملے میں کسی بھی طرح کی تنگ دلی روا نہیں رکھتے تھے۔ خود اپنی شاعری کے بارے میں وہ کڑی نگاہ رکھنے والے شعرا میں تھے اور کہہ کر مطمئن ہو جانے والوں میں نہیں تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کا کلام

بہت کم چھپا ہوا دیکھا ہے۔

ان سے میری طبیعت کھلتی تھی۔ شاعری کے علاوہ ہمارے درمیان بے شمار مشترک اقدار تھیں۔ مسلک علمائے دیوبند اکابرین سے محبت، دینی مدارس سے وابستگی اور علمی کتابیں۔ میری ان سے متعدد بار گفتگو ہوئی اور یہ تاثر ہمیشہ مزید گہرا ہوا کہ وہ ان معاملات کا مکمل شعور رکھتے ہیں۔ اور ان کی سوچ میری خیال سے ہم آہنگ ہے۔ وہ دینی مدارس کے نظریاتی اور عملی تشخص کو برقرار رکھتے ہوئے ان میں اصلاحات کے قائل تھے اور اس کے لیے کوشاں بھی۔ ان کے سعودی عرب چلے جانے کے بعد ان سے رابطہ کم ہو گیا۔ ویسے بھی وہ میرے ان دوستوں میں تھے جن سے ملاقاتیں کم اور تعلق گہرا ہوتا ہے۔ وقتاً فوقتاً ان کا فون یا پیغام ملتا رہتا تھا۔ پاکستان آنے پر وہ مجھے یاد رکھتے تھے اور ایسا تو غالباً کبھی نہیں ہوا کہ لاہور آئے ہوں اور مجھے ملاقات کا شرف نہ بخشا ہو۔ ایک ڈیڑھ سال قبل جب وہ چھٹیوں پر ملتان آئے تو مجھے فون کیا۔ اس بار ان کی آواز اور لہجے میں دکھ اور افسردگی نمایاں تھی۔ ان دنوں عمِ مکرم حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم کے خلاف جو محاذ آرائی کی گئی تھی اور جس طرح اس میں کئی ایک عناصر کی جانب سے ذاتی عناد، حسد اور مخاصمت کے رویے سامنے آئے تھے، ذوالکفل اس سے بہت زیادہ دکھے ہوئے تھے۔ وہ مخالفین کی تقریری وتحریری غیر شائستگی، بھونڈے پن اور تذلیل پر مبنی طریقِ کار کا بار بار ذکر کرتے اور اس پر اپنے غم وغصے کا اظہار بھی۔ سعودی عرب میں رہتے ہوئے انھیں بہت سی نامکمل اطلاعات تھیں اور وہ جاننا چاہتے تھے کہ مولانا تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم کی جانب سے اعتراضات کے جواب میں کوئی تحریر سامنے آئی ہے۔ میں نے انھیں مجمل طور پر پس منظر اور واقعات سے آگاہ کیا۔ انھیں دنوں عمِ مکرم نے دار العلوم اسلامیہ میں منعقدہ علماء کی ایک نشست میں واقعات کا پس منظر اور اعتراضات کے بارے میں اپنا فقہی مؤقف تقریباً تین گھنٹے کی گفتگو میں واضح کیا تھا۔ اور وہ کتابی شکل میں شائع بھی ہو گیا تھا۔ میں نے ذوالکفل کو اس کتاب سے آگاہ کیا۔ انھوں نے یہ کتاب اور اس گفتگو کی ریکارڈنگ حاصل کی اور بعد میں ہونے والی ملاقات میں مجھ سے اس بات کا اظہار بھی کیا کہ وہ مولانا تقی عثمانی صاحب مد ظلہم کے فقہی مؤقف کی تائید میں اپنے دائرہ کار میں کام بھی کرتے رہے ہیں۔

ستمبر ۲۰۰۹ء رمضان المبارک ۱۴۳۰ھ میں وہ آخری بار لاہور تشریف لائے اور حسبِ روایت مجھے فون کیا انھوں نے میری یہ درخواست قبول کی کہ وہ میرے ساتھ ہی افطار کریں۔ اس شام میرے گھر پر ہم نے تین چار گھنٹے ایک ساتھ گزارے۔ میں نے اپنی شاعری کی دوسری کتاب بارش انھیں پیش کی جو وہ پہلے ہی ملتان میں دیکھ چکے تھے۔ شاعری سننے سنانے کا دور بھی چلا۔ انھیں ایک اور جگہ پہنچنا تھا لہٰذا چند گھنٹوں کے بعد انھوں نے اجازت چاہی۔ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کی خبر کس کو ہے سو یہ وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ یہ ملاقات آخری ہے اور اب ان کے بعد ان کی یادوں سے ملاقات ہی ممکن ہے۔ ان کی ناگہانی شہادت کی اطلاع مجھے اخبار سے ملی اور وحید الرحمٰن صاحب سے اس خبر کی تصدیق ہوگئی۔ بعد میں برادرم سید کفیل بخاری صاحب سے مزید تفصیلات علم میں آئیں تو اندازہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس پاک نفس دوست کے لیے اعلیٰ مقام طے کر رکھا تھا۔ لہٰذا ان جاں گداز ساعتوں سے جس طرح ذوالکفل کو سبک اور سہل گزارا گیا وہ قابلِ رشک ہے۔ حرم مکہ میں فجر کی نماز سے متصل نماز جنازہ ہوئی اور جنت المعلیٰ میں تدفین۔ وہ کارروائیاں جن میں بہت کاوش اور کئی دن درکار ہیں آناً فاناً پوری ہوگئیں اور راستے کھلتے چلے گئے۔

دارِ بنی ہاشم ملتان میں آنکھ کھولنے والا بچہ احاطۂ بنی ہاشم جنت المعلیٰ میں اپنی ماں حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے پائنتی آسودۂ خاک ہوا۔ ملتان سے مکہ تک کا یہ سفر واپسی کا سفر تھا۔ چودہ سو تیس سال قبل آغاز ہونے والا ہجرت در ہجرت کا یہ سفر بالآخر تمام ہوا۔

جان ہی دے دی جگر نے آج پائے یار پر
عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا

’’علامہ‘‘ ذوالکفل بخاریؒ

ڈاکٹر محمد عمر فاروق

۱۹۸۳ء کی ایک دوپہر جامعہ خیرالمدارس ملتان کے مہمان خانہ میں احقر، مخدوم مکرم حضرت جانشین امیرِ شریعتؒ مولانا سیّد ابومعاویہ ابوذر بخاریؒ، اپنے ماموں جناب رفیق غلام ربانی مرحوم اور مولانا غلام یٰسین جہلمیؒ کے ہمراہ حفظِ قرآن مجید کی کلاس میں داخلہ کے لیے بیٹھا ہوا تھا کہ اِتنے میں دو لڑکے جن کی عمریں گیارہ، بارہ برس ہوں گی، کمرہ میں داخل ہوئے۔ اُن میں سے نسبتاً لمبے قد کے لڑکے سے حضرت شاہ صاحبؒ نے دریافت فرمایا کہ: ’’تم نے گیلے کپڑے کیوں پہن رکھے ہیں۔‘‘ تو اُس نے بے تکلفی سے پنجابی میں جواب دیا کہ: ’’باہر مینہ ہورہیا سی، اِس لئی ساڈے کپڑے بھج گئے نیں۔‘‘ [باہر بارش ہورہی تھی۔ اِس لیے ہمارے کپڑے گیلے ہوگئے ہیں۔] بعد میں تعارف ہوا تو پتا چلا کہ یہ نوعمر لڑکا شاہ صاحب کا بھانجا ذوالکفل بخاری ہے اور اُس کے ساتھی کا نام عبدالرؤف خبیب ہے جو بزرگ احرار رہنما ملک عبدالغفور انوری مرحوم کا نواسہ ہے۔ اگلے روز جب کلاس میں پہنچا تو خبیب سے معلوم ہوا کہ وہ اور ذوالکفل چھٹی جماعت میں ایک ہی سکول میں پڑھتے ہیں اور ذوالکفل خیرالمدارس میں ہمارے کمرہ نمبر ۳۰ کے قریب ہی رہتا ہے تو پھر ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ میں میٹرک کر چکنے کے بعد قرآن مجید کے حفظ کے لیے یہاں آیا تھا۔ عمروں کے تفاوت کے باوجود ہم تینوں میں دوستی کا اَٹوٹ رشتہ استوار ہوگیا۔

ذوالکفل اپنی معلومات کی فراوانی کی بناء پر ہم سے علم وذہانت میں کئی منزلیں آگے تھا۔ اِسی بناء پر میں نے اُس کا نام علامہ رکھ دیا جو ایک عرصہ تک اُس کے اصل نام کا حصہ بنا رہا۔ وہ گھر میں چھوٹا ہونے کی وجہ سے مُنّا اور ہمارے لیے علامہ تھا۔ ذکاوت وفطانت علامہ کی گھٹی میں پڑی تھی۔ جس کے آثار وقرائن اُس کے بچپن سے ہی ظاہر ہورہے تھے۔ ذہین افراد ہی نت نئی شرارتوں کا دامن وسیع رکھتے ہیں۔ علامہ بھی ایسی ایسی شرارتوں کا موجد تھا کہ جب کبھی اُن کی یاد آتی ہے تو بے اختیار ہنسی آجاتی ہے۔ ایک دفعہ جب حضرت سیّد عطاء المحسن بخاریؒ نے تحریک طلباء اسلام کے زیرِ اہتمام مختلف نعروں اور احادیث پر مشتمل سٹکرز نما اشتہار چھپوائے تو علامہ اُن سے اشتہاروں کا ایک پلندہ لے آیا اور اُنھیں خیرالمدارس میں چسپاں کرنے کا پروگرام طے پایا۔ ہمارے اِس منصوبہ کا کسی تیسرے فرد کو علم نہیں تھا۔ اب خیال آتا ہے کہ اگر محترم کفیل شاہ صاحب اِس منصوبہ سے باخبر ہوجاتے تو ہمیں ضرور اِس اقدام سے منع کر دیتے، کیونکہ خیرالمدارس میں تنظیم سازی کی بجائے تعلیم وتربیت کو مقدم سمجھا جاتا تھا جو ہر لحاظ سے قابلِ تحسین عمل تھا، مگر اُس جذباتی دور میں ہمیں تنظیم سازی کے مفہوم کا علم تھا اور نہ ہی اشتہارات لگانے کے بعد کے نتائج سے کوئی سروکار تھا۔ رات گئے علامہ ایک سٹول اور ایک مخصوص قسم کی بنی ہوئی گاڑھی گوند کا برتن لے آیا۔ مدرسہ کے کارپردازوں سے بچ بچا کر اشتہارات لگا دیے گئے۔ بہت سی گوند بچ گئی جو علامہ اپنے ساتھ واپس لے گیا۔ علی الصبح جب مدرسہ کے ذمہ داروں نے مدرسہ کے درودیوار کو رنگا رنگ اشتہارات سے مزین دیکھا تو اُن کے کان کھڑے ہوئے

اور خاموشی کے ساتھ اُنھیں اتارنے کا عمل شروع کر دیا گیا۔ اُدھر علامہ جو ہماری طرح خوابِ خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ اچانک اُس کی چھٹی حس بیدار ہوئی۔ وہ موقعِ واردات پر پہنچا اور خاموشی سے اپنی محنت کی بربادی کا منظر دیکھتا اور خون کے گھونٹ پیتا رہا۔ اِسی دوران اُس کے ذہن میں ایک انوکھے انتقام کا تانا بانا بُن گیا۔ وہ فوراً گھر پہنچا۔ بچی ہوئی گوند اُٹھائی اور مدرسہ کے بیت الخلاؤں میں داخل ہونے والی جگہ کے اوپر اَچھی طرح انڈیل دی۔ صبح جس نے بھی دعا **اَللھم اِنی اعوذُ بک من الخبث و الخبائث** پڑھ کر بیت الخلاء میں قدم رکھا۔ وہ گوند سے پھسل کر علامہ کے منشاء کے عین مطابق ''خبث وخبائث'' سے لت پت ہوتا گیا۔ ہمارا علامہ دُور کھڑا اِن مناظر کو دیکھ کر جی ہی جی میں مسکراتا رہا اور صبح ''متاثرین'' کا شریکِ غم ہو کر بڑی بے دردی کے ساتھ ''مجرم'' پر فضیحتوں کے ٹوکرے برساتا رہا۔ آخر اُس سے بڑھ کر متاثرین کو دِلاسہ دے بھی کون سکتا تھا!

میں ایک سال کے بعد چھٹیوں میں گھر واپس آ گیا اور علامہ سے رابطہ کرنے میں تاخیر ہو گئی تو علامہ کا غصہ سے بھرا رجسٹرڈ خط موصول ہوا۔ جس میں علامہ کی نثر نگاری کے بے نظیر جواہر ہویدا تھے۔ خط میں علامہ نے مدرسہ کے طلباء کو چھٹیاں ہونے پر مدرسہ کے سنسان ہو جانے کے بارے میں یہ شعر لکھا تھا:

یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں ''جانور''
اپنی اپنی بولیاں بول کر، اُڑ جائیں گے

میں نے ''جانور'' کو واوین میں لکھنے پر اِحتجاج کیا تو علامہ کے پاس جواز کے ڈھیروں دلائل موجود تھے۔ آخر علامہ سے جیت ہی کون سکتا تھا۔ ہمیشہ کی طرح آخر وہی جیتا اور ہم ہی ہارے۔

میں چھٹیاں ختم ہونے کے بعد بوجوہ مدرسہ میں واپس نہ جا سکا اور گورنمنٹ کالج تلہ گنگ میں داخل ہو گیا۔ اِس دوران علامہ سے رابطہ کا ذریعہ فقط خط ہی تھا اور خطوط نگاری کا یہ سلسلہ کئی سال تک اتنے اہتمام کے ساتھ جاری رہا کہ ہر ہفتہ میں ایک دو خط ضرور لکھے اور وصول کیے جاتے رہے۔ علامہ کی پڑھائی کے مدارج اور امتیازی کامیابیوں کی خبروں، علامہ کے ادبی معرکوں کی روداد وں اور احرار رہنماؤں کی سرگرمیوں کے بارے میں اُس کے خطوط سے ہی آگاہی حاصل ہوتی رہی۔ اب اُس کے دوستوں کا دائرہ بھی وسیع ہو چکا تھا، لیکن ہماری دوستی میں سرِ مو فرق نہ آیا۔

علامہ سکول سے کالج پہنچنے تک اپنی علمی واَدبی صلاحیتوں کی دھاک بٹھا چکا تھا۔ نوائے وقت، مشرق، امروز، چٹان اور کالج میگزین میں اُس کی نگارشات شائع ہوتیں تو ایک عرصہ تک اُن کی گونج مختلف حلقوں میں سنائی دیتی رہتی۔ ایک نوعمر کے قلم سے سنجیدہ ہی نہیں، دقیق عبارات اور مشکل الفاظ سے مملو تحریریں کہنہ مشق ادیبوں کو بھی سر پکڑ کر سوچ میں غلطاں ہونے پر مجبور کر دیتیں۔ علامہ اپنی تخلیقات کے ایسے متاثرین کے احوال سے محظوظ ہوتا۔ جب اُس کی منظومات بعض ادبی پرچوں میں اشاعت پذیر ہوئیں تو اُن نظموں میں بھی فلسفہ کی گہرائی، ادق مضامین، مشکل الفاظ کا چناؤ اور خیالات کا عمق بدرجہ اتم موجود تھا۔ جس پر علامہ کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ بھائی تمھاری ادبی ''دہشت'' سب پر بیٹھ چکی ہے۔ اب خدارا سلیس نگاری پر ہاتھ رکھو اور ہم کم علموں کی دعائیں لو۔ جس پر اُس نے دل پر پتھر رکھ کر حتی المقدور عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی کی۔ علامہ جس برق رفتاری سے کمال کی منزلوں کو طے کرتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے اُس کی اِس تیزی سے ڈر لگنے لگا اور اس بات کا شدت سے احساس ہونے لگا کہ شاید اُردو اور انگریزی زبان کے بعض نام ور جواں مرگ شعراء کی طرح اُس کے پاس بھی زندگی کی مہلت کم ہے۔ اِسی لیے وہ دھڑا دھڑ اپنے ادبی کاموں کی تکمیل کرتا جا رہا ہے۔ اللہ گواہ ہے کہ میں نے علامہ کو اَسّی کی دہائی میں ایک خط لکھا۔

جس میں اُسے اپنے اندرونی خوف سے مطلع کرنے کی بجائے یہ لکھا کہ علامہ میرا دِل چاہتا ہے کہ اب تم اپنے رہوارِ قلم کو مت روکو۔ مہینوں کی بجائے اب ہر ہفتے تمھاری تحریر آنی چاہیے۔ زندگی، موت اللہ کے پاس ہے، مگر میں یہ چاہتا تھا کہ جتنی زندگی باقی ہے، علامہ زیادہ سے زیادہ ادبی ورثہ چھوڑ کر جائے، لیکن تقدیر سے کون لڑسکتا ہے۔ اب اُس کی جواں مرگی کا خیال آتا ہے تو دِل بیٹھنے لگتا ہے۔ علامہ نے اگرچہ کم کم لکھا ہے، لیکن جو کچھ اُس کے قلم سے نکلا۔ وہ اپنی جدت، تنوع، خیال آرائی اور معنی آفرینی کے اعتبار سے دسیوں ہم عصر ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات پر فوقیت رکھتا ہے۔

علامہ شاندار تخلیقی صلاحیتوں کی نعمت سے مالامال ہونے کے علاوہ ایک شریف النفس اور پاکباز انسان بھی تھا۔ میں پورے ایقان کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کم ازکم ہم چند بے تکلف دوستوں کے سامنے اُس سے کوئی گناہِ کبیرہ سرزد نہیں ہوا۔ وہ اپنے معمولاتِ دینیہ کا پابند تھا۔ صالحیت اُس کی فطرت میں تھی اور نجیب الطرفینی اُس کے خون میں آئی تھی۔ علامہ اپنی وراثتی روایات کا امین ہی نہیں، پاسدار بھی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کی ذات اُس کے خانوادے کی نیک نامی میں اضافہ کا سبب بنی۔ علامہ نے پدرم سلطان بود کا دعویٰ کبھی نہ کیا، حالانکہ اُس کے نانا جی کی شخصیت اپنے خداداد اِمتیازی اوصاف اور حلقۂ اثر کی بناء پر مقامی نہیں، بلکہ بین الاقوامی اثرات اور اہمیت رکھتی تھی، مگر علامہ نے اپنی ذاتی صلاحیتوں کو اِستعمال میں لاکر علم واَدب کے میدان میں اپنی شخصیت کا لوہا منوایا۔ حضرت سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سے نسبی تعلق اُس کی شہرت کا ثانوی باب تھا۔

ابھی گزشتہ سال دو جولائی کو علامہ، مکہ مکرمہ میں حرم شریف کے بابِ فہد میں ملنے کے لیے آیا تو اُسے جب پہلی مرتبہ عربی لباس پہنے ہوئے دیکھا تو محسوس ہوتا تھا کہ خانوادۂ بنی ہاشم کا کوئی بچھڑا ہوا شہزادہ پاکستان سے اپنی اصل یعنی ارضِ حجاز میں لوٹ آیا ہے۔ ڈھیروں باتیں ہوئیں۔ علامہ میرے والد گرامی (حکیم محمد ابراہیمؒ: جو ۱۳/ دسمبر ۲۰۰۹ء کو رحلت فرما گئے) سے مل بیٹھا اور اُن سے پُرخلوص دعاؤں کے خزانے سمیٹتا رہا۔ علامہ نے کھانے کی دعوت دی، لیکن اگلے دن ہماری مکہ مکرمہ سے واپسی تھی۔ اِس لیے اُس کی دعوت کو چند ماہ بعد حج بیت اللہ کے موقع پر قبول کرنے کا وعدہ کر کے معذرت کرلی، لیکن بلاکا جلدباز علامہ، میرے وہاں پہنچنے سے چندروز پہلے ہی ارضِ حرم کی مٹی اوڑھ کر اَمی خدیجۃ الکبریٰؓ کے قدموں میں ڈھیر ہوگیا اور یوں وہ اپنی زندگی کا سفر تیزی سے مکمل کر کے اپنے اجداد کے قافلے سے جاملا۔

مجھے یقین ہے کہ جب علامہ اپنے مقدس خون سے تربتر کفن کے ساتھ امی جان حضرت خدیجہؓ کے حضور حاضر ہوا ہوگا تو مادرِ مہرباں نے اپنے اِس لاڈلے لختِ جگر سے امام سیّد ابوذر بخاریؒ کی طرح ضرور پوچھا ہوگا کہ ''بیٹا! تمھارے کپڑے کیوں گیلے ہیں؟'' تو علامہ نے کمال معصومیت سے عرض کیا ہوگا کہ: ''باہر مینہ ہور ہیا سی، ایس لئی کپڑے بھج گئے نیں'' (باہر بارش ہورہی تھی۔ اِس لیے کپڑے بھیگ گئے ہیں۔)

کیسا خوش نصیب تھا، علامہ! کہ دُنیا کی منہ زور آندھیوں اور اُمڈتے ہوئے طوفانوں سے بچ کر کونین کی مادرِ گرامی کے قدموں میں سکون وراحت اور طمانیت بھری نیند سورہا ہے۔ علامہ! اللہ تمھاری مغفرت فرمائے۔ فردوسِ بریں میں اپنے اِس گناہ گار دوست کو کبھی مت بھولنا۔

ایک چہکتی ذہانت

ڈاکٹر معین نظامی ☆

حضرت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی ذاتِ گرامی اور ان کے محترم خانوادے سے ایک اُنسِ خاص تو تھا ہی، بلکہ ایک روحانی قرابت داری کہہ لیجیے۔ وہ یوں کہ ان کے اجداد کا تعلق طریقت چشتی نظامی سلسلے سے تھا اور ان کے اکابر بھی آستانۂ عالیہ سیال شریف ضلع سرگودھا سے ارادت وعقیدت رکھتے تھے۔ یہ وہی مرکزِ فیض ہے جہاں سے میرے خاندانی بزرگوں نے بھی اپنے ظرف اور نصیبے کے مطابق اکتسابِ عرفان کیا تھا۔

حضرت شاہ صاحب مرحوم کے جوہرِ خطابت، دین وملت سے ان کی غیر مشروط وابستگی اور عقیدۂ ختم نبوت کے باب میں ان کے قاطعانہ کردار کا شہرہ بھی بچپن سے سن رکھا تھا۔ ان کی شخصیت و کردار کے بارے میں کچھ محدود سے مطالعات کا موقع بھی ملا تھا مگر ان کے اسلاف کے حوالے سے میری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں۔ چند حضرات کے محض نام پڑھ یا سن رکھے تھے اور بس۔ یہاں تک کہ ۱۹۹۵ء کے اواخر میں ان کے ایک جواں سال نواسے کا غائبانہ تعارف ہوا۔ معلوم ہوا کہ ان صاحب کا نام ذوالکفل بخاری ہے اور غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل نوجوان ہیں اور حسنِ اتفاق سے بہ یک وقت رعنائی و دل آرائی اور صالحیت واخلاص جیسی پرکشش اور متاثر کن صفات سے متصف ہیں۔ اب بالکل یاد نہیں آرہا کہ ابتدائی طور پر یہ غائبانہ تعارف کن احباب کے توسط سے ہوا البتہ یہ بات دل و دماغ میں نقش ہے کہ اس تعارف کی تصدیق وتوثیق عزیز دوست ڈاکٹر خان نے کی جو نہ صرف ذوالکفل کے ہم شہری تھے بلکہ ان کے قریبی ترین حلقۂ احباب میں بھی شامل تھے۔

خان نے غائبانہ تعارف کے اس نقشِ اول میں ایسے رنگ بھرے کہ مانتے ہی بنی۔ اگر وحید ذرہ بھر بھی مبالغہ آرائی اور بے جا دوست پرستی کے عادی ہوتے تو ان کے بیان پر شک کی کچھ گنجائش بھی تھی! وحید نے بتایا کہ ذوالکفل کی جو صفاتِ حسنہ آپ تک پہنچی ہیں، وہ بہت کم ہیں اور وہ بڑی جامع الصفات قسم کی چیز ہیں۔ دین کا علم بھی رکھتے ہیں اور شعر وادب میں بھی صاحب نظر ہیں۔ ذہانت میں بے مثال ہیں اور ذکاوتِ طبع میں لاثانی، متشرع ہیں۔ مگر ملائیت اور زہدِ خشک سے نفور، وجاہت و سعادت کے پیکر ہیں مگر نمود وریا سے دور۔ جملہ باز ہیں اور اس فنِ لطیف کے جملہ اسرار ورموز کے آشنا بھی۔ خوب صورت شعر بھی برمحل پڑھتے ہیں اور دل نشیں فقرہ کسنے کے آداب سے بھی واقف ہیں اور چوکتے نہیں۔ یاروں کے یار ہیں، لیکن اپنی حد سے باہر پاؤں نہیں دھرتے۔ مطالعے کا چسکا بھی ہے اور اہل مطالعہ سے میل جول رکھنا بھی پسند کرتے ہیں۔ بیدار ذہن اور درد مند دل کے مالک ہیں۔

میں وحید کے کہے ہوئے لفظ لفظ پر ایمان بالغیب لایا اور پھر بہت جلد، انہی کے وسیلے سے، ملتان میں ذوالکفل کو دیکھ

☆ صدر شعبہ فارسی اورینٹل کالج، پنجاب یونی ورسٹی لاہور

کر، مل کر، بات چیت کر کے یقین الیقین تک بھی پہنچ گیا۔ ذوالکفل اپنے تعارف سے کہیں زیادہ بڑا تھا۔ زندگی سے بھرپور اس کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں سے عجیب ملکوتی سا خلوص جھلکتا تھا اور جب وہ مزے سے کسی علمی یا ادبی موضوع پر بات چھیڑتا تھا تو میری سماعت سیر ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی بے لوث محبت اور بے تکلفانہ ملنساری نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا۔ وہ میری شاعری کے بارے میں حسنِ ظن کا اظہار کر کے میری حوصلہ افزائی کرتا رہا۔ وہیں ایک تقریب میں اُس نے میری کتاب ''تجسیم'' کے بارے میں بہت عمدہ گفتگو بھی کی۔

بعد میں وحید الرحمٰن خان کے ذریعے سلام و پیام کا سلسلہ جاری رہا۔ کچھ اور مشترکہ دوستوں سے اُس کی خیر خبر بھی ملتی رہتی تھی۔ وہ جس شہر میں بھی جاتا تھا، وہاں کے دوستوں کو اہتمام سے ملنے کی کوشش کرتا تھا۔ سو اُس کی اِس وضع داری نے مجھے پانچ سات بار اس سے ملنے کے مواقع فراہم کیے۔ ۱۹۹۷ء میں اُس نے میری خصوصی درخواست پر میرے والد مرحوم کی ایک کتاب کے بارے میں سیر حاصل مضمون بھی لکھا، جس کی سطر سطر سے اُس کی جودتِ طبع اور شگفتگیٔ مزاج بھی جھلکتی ہے اور وسیع احاطۂ علمی کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔

ذوالکفل سے پہلی ملاقات کی طرح، آخری ملاقات بھی ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان کی عنایت ہی سے ممکن ہوئی۔ ییرے/ ستمبر ۲۰۰۹ء کو جب وہ اورینٹل کالج لاہور میں صدرِ شعبۂ فارسی کے کمرے میں میرے پاس بیٹھا ہوا پوری آب و تاب سے شعر و ادب اور سیاست و سماج پر اظہارِ خیال کر رہا تھا تو میں تہِ دل سے محظوظ ہو رہا تھا اور وحید کا ممنون تھا کہ وہ اتنی مدت بعد ذوالکفل بخاری سے تجدیدِ ملاقات کا باعث بنا۔ دفتری جھمیلوں کے مشینی طرز کے ماحول میں مدت بعد اتنی تر و تازہ، زرخیز اور اخلاص و اندوہ سے لبریز گفتگو ہو رہی تھی۔

ذوالکفل نے بتایا کہ وہ مکہ مکرمہ سے چھٹیوں پر آیا ہوا ہے اور رمضان المبارک کے بعد واپس چلا جائے گا۔ دو مہینے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ ٹریفک کے حادثے میں اس کی شہادت کا غم آن دامن گیرِ دل ہوا۔ میں شہر سے باہر تھا اور وحید نے بڑی مشکل سے، کئی واسطوں سے، یہ وحشت انگیز خبر مجھ تک پہنچوائی۔ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ذہانت و فطانت، خلوص و محبت اور ایثار و وفا کا وہ چراغِ تاباں بجھ بھی سکتا ہے!

وہ پیوندِ خاک بھی ہوا تو کس مقدس شہر میں۔ اُس کی روح بھی تو حجازی تھی۔ سو اس نے خاکِ حجاز ہی کو پیراہنِ جاں کیا۔

اللہ تعالیٰ اس عظیم دوست کی روح کو آسودگیِ جاوداں عطا فرمائے اور اس کے پسماندگان پر لطف و کرم کی دائمی نظر رکھے۔ اُس کے پسماندگان میں بیسیوں وہ بھی ہیں جن سے اس کا خون کا رشتہ نہیں تھا۔ روح کا ربط و ضبط تھا۔ اس کی ناگہانی رحلت کی خبر اس کے چاہنے والوں کے لیے بہت اذیت ناک خبر تھی۔ لکھنے والوں نے اس کی یاد میں کیسا کیسا اچھا لکھا۔ ان تحریروں میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ محبت کے غنچوں کی مہک تھی اور ذوالکفل اپنی تمام تر اچھائیوں سمیت چہک رہا تھا۔ اس کے دوستوں کی ہر تعزیتی تحریر پڑھنے کے بعد میری پلکوں کو خشک ہونے میں دیر ہوتی رہی لیکن میں نے ہر تحریر دو سے زیادہ مرتبہ پڑھی۔ لگتا تھا ذوالکفل کا آخری دیدار کر رہا ہوں۔

وہ ایک پھول جسے خوشبوؤں نے پالا ہے

منیر عباس ملک

زندگی کے بام و در پر کچھ ستارے ایسے طلوع ہوتے ہیں جو مختصر لمحوں میں دل کے آنگن کو تادیر روشن رکھتے ہیں۔ اُن کی ضیا پاشی کو اگرچہ اجل معدوم کرنے کا اعلان کرتی ہے لیکن اُن کی معصوم جلوہ ریز کرنیں موت سے ان کے امر ہونے کا خراج مانگتی ہیں۔ بلاشبہ سید محمد ذوالکفل بخاریؒ بھی اُنہی روشن ستاروں میں سے ایک ستارہ تھے جو زندگی کے افق پر بہت ہی قلیل وقت تک رہے لیکن جب تک رہے دلوں کے شبستان کو اپنی ضوفشانی سے مستنیر کرتے رہے۔

میرے وہ ہم عصر تھے لیکن عصرِ حاضر کے شاہکار ذہن کے مالک تھے۔ دراز قامت، سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مزین پروقار چہرہ، دھیمے لہجے کا فرد، سادگی وانکساری کا مرقع، انسان دوستی کی بے نظیر علامت، احباب کی محفل کا بلبلِ ہزار داستان، شعر وادب کا امین ایک قد آور سخن گو، باکمال بذلہ سنج۔

اپنے اور بیگانے سے وضع داری سے پیش آنے والا خاندانِ بنی ہاشم کا یہ فردِ فرید یوں ایکا ایکی ہم سے رخصت ہوا کہ ذہن ابھی تک اُن کے دارِ فانی سے چلے جانے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ مجھے اِس خاندان کی شرفِ معیت کا اعزاز اُس وقت سے حاصل ہے جب حضرت امیر شریعتؒ کے صاحبزادے محسنِ احرار جناب سید عطاء المحسن بخاریؒ دارِ بنی ہاشم میں واقع مدرسہ معمورہ میں اعلائے کلمۃ الحق سے سامعین کے قلوب کو منور کرتے تھے۔ خطیبِ عصر کی حریت انگیز خطابت سے میں اس قدر متاثر ہوا کہ پھر کسی اور جانب رخ کرنے کا کبھی تصور میرے ذہن میں نہ آیا۔ سید ذوالکفل بخاریؒ سے تعلق اِسی محبت کا ایک حوالہ تھا جو ماہ وسال کے گزرنے کے ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ شناسائی کے روپ بے تکلفی میں بدل گئے۔ جب بھی ملتے تبسم کے ساتھ۔ اخلاص ومحبت کے منفرد انداز سے تمام تھکاوٹیں دور کر دیتے۔ مزاج میں اللہ تعالیٰ نے ایسی لطیف کشش رکھی تھی کہ ملنے والا جدا ہونے کا نام نہیں لیتا تھا۔

تعلیمی پس منظر کے حوالے سے پہلے انگریزی ادبیات میں ایم اے کیا اور ملتان ٹیکنیکل کالج میں بطورِ لیکچرر مقرر ہوئے۔ بعد میں ایم اے اردو بھی کیا۔ ملتان کے ادبی حلقوں میں بھرپور پذیرائی حاصل کرتے رہے۔ ملتان کے تقریباً تمام معروف کالجوں میں ایک عرصۂ دراز تک آپ کو تعلیمی خدمات سرانجام دینے کا موقع ملا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں واپس ملتان تشریف لاتے اور تمام دوستوں اور محبت کرنے والوں کو اپنے پیار کے سائبان میں ایک بار پھر جمع کرتے۔ تعطیلات اِس معمول میں گزار کر پھر چلے جاتے۔

آخری مرتبہ ایک طویل رخصت پر ملتان تشریف لائے۔ میں بھی اُن کی دل افروز محفل سے گاہے بگاہے محظوظ ہوتا

رہا۔لیکن سوادِ حرم کی معطر فضاؤں نے اِس نجیب الطرفین کو پھر اپنی طرف بلالیا۔ مکۃ المکرّ مہ میں ام القریٰ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر مقرر ہوگئے۔ روانگی سے ایک روز قبل لائسنس کی Renewal (بحالی) کے سلسلے میں لائسنس برانچ میں اکٹھے گئے۔ شاہ صاحب اپنی منکسرالمزاجی کی وجہ سے اپنا تعارف کروانے سے گریزاں تھے لیکن میں نے افسرِ مجاز سے گزارش کی کہ موصوف مکہ میں ام القریٰ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ چنانچہ اس تعارف کے بعد تمام دفتری انضباطِ کار میں تیزی لاکر ہمیں ٹھیک بیس منٹ بعد لائسنس کی کاپی دے دی گئی۔ میں خوشی خوشی شاہ صاحب کو دارِ بنی ہاشم لایا۔تھوڑی دیر بعد راہِ حیات کا یہ مسافر اپنی ابدی منزل کی طرف روانہ ہوگیا جو شب و روز کے جھروکوں میں اُس کی آمد کا ایک ایک لمحہ شمار کررہی تھی۔

ام القریٰ یونیورسٹی پہنچے کوئی تین ہفتے ہوئے ہوں گے کہ وہ جان لیوا حادثہ پیش آ گیا۔

افسردہ شام کے اُس جھٹ پٹے میں انتہائی کرب کے عالم میں دارِ بنی ہاشم پہنچا تو صبر و استقامت کے کوہِ گراں ابن امیر شریعت جناب پیرجی سید عطاء المہیمن شاہ صاحب، ذوالکفل شاہ جی کے والد گرامی پروفیسر سید وکیل شاہ صاحب اور ان کے برادرِ جلیل سید کفیل شاہ صاحب موجود تھے اور تمام آنے والے احباب اُن سے تعزیت کر رہے تھے۔شیوۂ تسلیم و رضا کے یہ پیکر مشیتِ ایزدی کے فیصلے پر شاکر نظر آ رہے تھے۔سعودی انتظامیہ کی طرف سے ذوالکفل شاہ جی کے حسنِ خاتمہ کی شہادت ملی کہ آپ نے داعیِ اجل کو لبیک کہتے ہوئے کلمہ شہادت پڑھا اور یوں ۳۹ برس کے بھرپور شباب میں یہ صالح مفکر، شاعر اور ادیب مکۃ المکرّمہ میں احاطۂ بنی ہاشم میں ہمیشہ کے لیے محوِ استراحت ہوگیا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

شاہ جی کی علمی شخصیت پر جامع گفتگو اربابِ علم و دانش ہی کا کام ہے کیونکہ وہ ایک طویل عرصے تک ملتان کے ادبی افق پر جلوہ افروز رہے اور ان کے معاصرین ان کی علمی و تحقیقی صلاحیتوں کے معترف ہیں۔میرے نزدیک وہ دبستانِ علم کا ایک ایسا شگفتہ پھول تھا جس کی ہر کلی ادب کی خوشبو کا ایک بلیغ استعارہ تھی۔ وہ جب تک زندہ رہے، شہر کی رونق رہے۔ادبی جولانگاہ میں نظم گوئی کے فن کو جس وقار سے نوکِ قلم سے نظم کرتے اس پر نقد و تبصرہ کے لیے ایک طویل مضمون درکار ہے۔ بخاری کی موت پر دل مغموم اور آنکھیں اشک ریز ہیں۔ نالہ و شیون سے معمور فضا ہماری حرماں نصیبی پر نوحہ گر ہے کہ وہ ہمیں بہت جلد زندگی کے دوراہے پر تنہا چھوڑ گئے۔

زہے نصیب کہ شاہ جی کی بلادِ عرب میں ایسی جگہ تدفین ہوئی جہاں نزولِ رحمت کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوتا۔شام و سحر کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جہاں رحمتوں کی صبا بخشش کی پیامبر بن کر نہ اترے۔ خاندانِ بنو ہاشم کا یہ جواں مرگ نعائمِ فطرت کی ایک جھلک تھی جو آج نظروں سے اوجھل ہے۔

وقارِ سرو و سمن ہے بہارِ لالہ ہے
وہ ایک پھول جسے خوشبوؤں نے پالا ہے

الوَداع یا سیدی

ڈاکٹر حافظ صفوان محمد چوہان

یہ لکیریں کچھ یادوں کا تحریری سراپا ہیں۔ ایک ایسا مضمون لکھنے کی کوشش ہے جس کے لیے دل یا دماغ کبھی تیار نہیں ہوسکتے تھے، چنانچہ اِس میں کسی ترتیب یا تسلسل کا پایا جانا ضروری نہیں۔ یہ تحریر بھائی سید ذوالکفل بخاری سے میرے تعلق کی مصوری ہے۔ لیکن لفظ تعلق سے یہ التباس نہ ہونا چاہیے کہ یہ سروکار برابری کی سطح کا تھا، یا جس میں کچھ لین اور کچھ دین والی بات تھی۔ یہ سراسر یکجہت تعلق تھا جس میں میں صرف اور صرف لین ہار تھا اور وہ ہر لحظہ دین ہار۔ وہ علم وفضل اور جملہ اوصافِ حمیدہ کے زندہ شعائر میں سے تھے اور یہ نادان مجسم جہلستان۔ خوش قسمت ہیں وہ جنھوں نے اُنھیں دیکھا۔ یہ وضاحت تحصیلِ حاصل ہے، لیکن ضروری معلوم ہوئی ہے کیوں کہ شائع ہوجانے کے بعد تحریر کا اعتبار قاری کی نظر اور سوچ ہے، جو بسا حالات کوتاہی کر جاتی ہیں۔ دنیا سے سبھی کو جانا ہے لیکن میرے بھائی سید ذوالکفل ابھی اور یوں چلے جائیں گے، اِس کا کسی کو اندازہ نہیں تھا۔ اللہ اُن کی مغفرت فرمائے اور ہم پس ماندگان کے لیے صبر کو شفاعت کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔ (حافظ صفوان محمد)

یہ ۱۹۸۶ء کی بات ہے کہ میرے ابو جان مجھے پی اے ایف کا سلیکشن ٹیسٹ دِلانے کے لیے بہاول پور سے ملتان لے کر آئے۔ یہاں میں ذوالکفل سے پہلی بار ملا۔

۱۹۸۶ء سے لے کر ۱۵/نومبر ۲۰۰۹ء کی دوپہر پاکستانی وقت کے مطابق تین بجے ختم ہونے والی ٹیلی فون کال تک جو تقریبًا پانچ منٹ کے دورانیے کی تھی اور ذوالکفل کا کیا ہوا آخری ٹیلی فون، اِس بے مقدار و بے مقدور سے ذوالکفل کا تعلق ہر لمحے بڑھتا ہی چلا گیا۔ اِن چوبیس سالوں میں میں پلک جھپکنے کے برابر وقت کے لیے بھی اِس تعلق کو ٹوٹتا نہیں دیکھتا۔ بلکہ میں تو کوئی لمحہ بھی نہیں ڈھونڈ پاتا جس میں ہمیں ایک دوسرے سے محض گرانی ہی محسوس ہوئی ہو۔ مادّیات کے پیمانوں پر بنتے بگڑتے اور اِنھی کے مولوں تُلتے آج کے تعلقات کے دور میں جب کہ ماَمتا تک ناخالص ہونے لگی ہے، یہ ایک نادر بات ہے۔ میں اِس کا گواہ ہوں۔ اور اِس کا دوسرا گواہ اب صرف اللہ رب العالمین ہے جس کے جوارِ رحمت میں آج میرا بھائی سید ذوالکفل محوِ استراحت ہے، اور میری راہ تاک رہا ہے۔ اور بے شک میں ہر گزرنے والے لمحے کے ساتھ اُس سے قریب تر ہوا جا رہا ہوں۔ اور زمینوں اور آسمانوں میں موجود کوئی بھی رکاوٹ اِس سفر کی سرعت میں کمی نہیں لاسکتی یہاں تک کہ میں اُس سے جاملوں گا۔ مِنۡهَا خَلَقۡنٰكُمۡ وَفِيۡهَا نُعِيۡدُكُمۡ وَمِنۡهَا نُخۡرِجُكُمۡ تَارَةً اُخۡرٰى۔ اِنّا لِلّٰہِ وَاِنّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن۔

☆......۱......☆

بھائی سید ذوالکفل اور میں ایک دوسرے کو ''شیخ'' کہہ کر بلاتے تھے۔ خط، ای میل اور ایس ایم ایس میں بھی یہی طرزِ تخاطب چلتا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ''شیخ'' کا لقب مجھے محسن شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ نے دیا تھا اور یہ اُن کے بطورِ تفنن دیے ہوئے خطاب ''حضرت شیخ الاسلام'' کی تخفیف ہے؛ میں نے ذوالکفل کو کب سے اِس لقب سے بلانا شروع کیا، یہ پوری طرح یاد نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تب کی بات ہو جب ذوالکفل نے حضرت خواجہ خان محمد صاحب مدظلہٗ العالی کی بیعت کی تھی۔ اِس

بیعت کے کچھ دنوں کے بعد میں ملتان سے بہاول پور گیا تو کسی بات پر ابوجان نے مجھ سے کہا کہ اب ذوالکفل صرف ذوالکفل نہیں ہے بلکہ حضرت خواجہ خان محمد صاحب کا مرید ہے۔ یہ اطلاع تو مجھے بھی تھی کیوں کہ جس شام ذوالکفل کو یہ نسبت عطا ہوئی میں بھی دارِ بنی ہاشم میں تھا۔ مجھ سادہ آدمی کو اِس بات کی گہرائی کا اندازہ نہیں تھا۔ پھر ابوجان نے مجھے بتایا کہ جب تم پیدا ہوئے تو حضرت خواجہ صاحب نے تمھارے کان میں اذان دی تھی۔ میرا ذوالکفل کو ''شیخ'' کہنا شاید ابوجان کے اِسی توجہ دِلانے کے سبب سے ہوا ہو۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

پھر وہ وقت بھی آیا کہ بھائی سید ذوالکفل ایک بار مجھے خانقاہِ سراجیہ لے جانے میں کامیاب ہوگئے۔ اِس سلسلے میں اُنھوں نے دعا اور توجہ سے کام لیا اور مجھ نہایت بے پیرے قسم کے بندے کو سلامتیِ قلب ونظر کی منزل پر لے آئے۔ جب ہم پہلی بار کندیاں شریف گئے تو بھائی صاحبزادہ محمد حامد سراج صاحب ہمیں اپنی گاڑی میں میانوالی سے لے کر آئے تھے۔ خوب مہمان نوازی کی۔ ہم نمازِ مغرب کے لیے مسجد میں پہنچے۔ حضرت خواجہ صاحب کے پیچھے نمازِ مغرب ادا کی۔ میں نے دیکھا کہ سنتیں اور نفل پڑھنے کے بعد سب نمازی ایک بڑا سا حلقہ بنا کر بیٹھ گئے ہیں۔ حضرت خواجہ صاحب نے ایک تھیلی سے بڑے بڑے دانے لوگوں کی طرف پھینکے۔ پھر کچھ ذکر کرایا۔ مجھے اُن کی آواز واضح سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں بھائی ذوالکفل کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ اُن سے ہلکی سی آواز میں پوچھا کہ میں کیا کروں۔ فرمایا کہ درود شریف پڑھ لیں۔ میں ہونقوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتا رہا، اور بیچ بیچ میں درود شریف بھی پڑھتا رہا۔ پھر میں نے دیکھا کہ اُنھوں نے آنکھیں موند لی ہیں۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد میں نے بھی اُن کی طرح آنکھیں بند کرلیں۔ ذرا سی دیر میں میری کیفیت کچھ ایسی ہوگئی کہ میں جیسے زمین کی کششِ ثقل سے آزاد ہوگیا ہوں۔ اب میں ہوں یا خدا کی ذات ہے۔ کچھ چیزیں مجھے اپنے اوپر اُترتی محسوس ہوئیں۔ میرا دل شدید دھڑکن کے بعد آہستہ آہستہ ٹھنڈا اور پھر ایک دم پُرسکون ہوگیا۔ یوں لگا جیسے حدِ نگاہ تک ہر طرف ایک سفید سمندر ہے۔ پھر یہ سمندر مجھے آہستہ آہستہ لہریں بنتا محسوس ہوا۔ ٹھنڈی ہوا کے نرم لیکوں نے مجھے جیسے اُٹھالیا اور ہولے ہولے پینگنا شروع کردیا۔ میں نہیں جانتا کہ میں کتنی دیر تک زمان ومکان کی قیود سے نکلا رہا۔ مجھے ماحول کی کوئی آہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ پھر جب میں نے خود کو زمین سے لگا محسوس کیا تو آنکھیں کھولیں۔ میں نے اُن کو اُسی کیفیت میں پایا جس میں چھوڑ کر گیا تھا۔ ذرا سی دیر میں اُنھوں نے بھی آنکھیں کھولیں۔ میں نے اپنے اندر جھانکا تو دیکھا کہ اہلِ ذکر اور پیری مریدی کی بابت جو ہٹ دھرمی اور کلونس سی میرے قلب ودماغ پر چھائی ہوئی تھی، یا بلکہ جس میں قلب ودماغ چُنے ہوئے تھے، یوں فضا میں تحلیل ہوگئی ہے جیسے گیلے کپڑے کو دھوپ میں پھیلائیں تو اُس سے پانی اُڑ جاتا ہے۔ دعا ہوئی۔ ہم جلدی سے اُٹھ کر لوگوں کے پیچھے جاکر سیڑھیاں اُترے اور اُس کمرے تک گئے جہاں سے خواجہ صاحب اندر تشریف لے گئے۔ صاحبزادہ صاحب ہمیں گھر میں لے گئے۔ کھانا لگ چکا تھا۔ کھانے کے بعد ہم نے مسجد میں آکر عشاء پڑھی۔ گھر واپس ہوئے تو صحن میں بچھی چارپائیوں پر پڑ رہے۔ مجھے اُنھوں نے صرف ایک جملہ کہا: ''ایتھوں جو کجھ لے سکدے او لے لئو۔ ایتھوں بعد انھیر اای انھیر ااے، ہر پاسے۔'' صبح نماز کے بعد پھر ذکر ہوا۔ مجھے خواجہ صاحب ایک ایسے آدمی لگے جنھوں نے اپنی پوری زندگی لوگوں کی حالت سُدھارنے میں لگادی تھی۔ مجھے اُن پر بہت رشک آیا۔ میں خوش تھا کہ آج میں نے آنکھوں سے ایک ایسا آدمی دیکھ لیا ہے جن کے ہاتھوں پر ہزاروں لاکھوں لوگوں کے اسلام لانے کی باتیں تاریخ میں لکھی ہوئی ہیں۔ خواجہ صاحب تشریف لائے۔ ذوالکفل نے میرا تعارف کرایا اور اپنے نانا حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ اور میرے دادا جان، اور میرے ابوجان کا ذکر کیا۔ خواجہ صاحب نے سر ہلایا اور پلکیں جھپکائے بغیر مجھے یوں دیکھتے رہے کہ میں سر سے پاؤں تک گویا ڈھل گیا، بلکہ، درست تر الفاظ میں، اُن کے اِس دیکھنے نے مجھے ریل پیل کر رکھ دیا۔ پھر بھائی ذوالکفل نے مجھ سے چپکے سے پوچھا کہ بیعت کا ارادہ ہے؟ میں نے کہا کہ اگر آپ کہیں تو۔ اب اُنھوں نے حضرت سے درخواست کی کہ حافظ صاحب کو بیعت فرمالیں۔ حضرت باباجی مدظلہ نے مجھے بیعت فرمالیا۔ اور بہت دیر تک دعا فرماتے رہے۔ مجلس برخواست

ہوئی۔ ذوالکفل جب آخری بار خانقاہ گئے ہیں تو اُنھوں نے حضرت باباجی مدظلہٗ کو جامعۂ ام القریٰ مکہ مکرمہ میں ملازمت کی اطلاع دی۔ خصوصی دعا کی درخواست کی تو حضرت نے سرائیکی لہجے میں فرمایا کہ دعا تو تم کرو، تم وہاں پہنچ گئے ہو۔

یہ بجا کہ میرے کان میں اذان حضرت خواجہ صاحب مدظلہٗ نے دی ہے۔ لیکن مجھ ناٹھور کا تعلق خانقاہ سے کرانے کی نیکی، جس سے میری اور میرے خاندان کی سمت متعین ہوئی، صرف میرے ''شیخ'' سید ذوالکفل بخاری کے مقدر میں لکھی تھی۔ وہ میرے شیخ بھی ہیں، شیخ گر بھی۔ اللہ اُن کو اِس کارِ خیر کی بہترین جزا دے۔

☆......۲......☆

ادب کے موضوع پر فرماتے تھے کہ مجھے ادب کو کیریئر نہیں بنانا ہے خواہ کچھ ہی ہوجائے۔ یہ کارِلا حاصل ہے۔ اگر کتاب سازی ہی کی بات ہے تو میں بڑا بول نہیں بولتا، اِن شاء اللہ دو تین نشستوں ہی میں ایک مجموعہ مرتَّب کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ کام ہم نے کرنا ہی نہیں۔ اِس کی ضرورت ہی کیا ہے؟ وہ تو جائز کریڈٹ لینے کے وقت میں بھی کہیں نظر نہ آتے تھے۔ اور اگر کوئی اُن کے سامنے اُن کی تعریف کرنے پر تُل ہی گیا ہے تو سراپا انکسار بن کر بات کو دوسری طرف لے جاتے، یا ہنسی میں اُڑا دیتے۔

ایک ایسی بات جس میں وہ نایاب ترین لوگوں میں سے تھے، یہ ہے کہ وہ ہمیشہ انتہائی اخلاص سے مشورہ دیتے تھے۔ ایک بار ہم دونوں دعوۃ اکیڈمی اسلام آباد میں عبدالجبار شاکر صاحب کے ہاں گئے تو وہاں ذوق اور عمر کے اعتبار سے بچوں کی کتابیں اور کچھ اور چیزیں چھاپنے کا پورا خاکہ، مع کاروباری ضرورتوں کے، اور عرب دنیا میں بھی جہاں جہاں اردو کا چلن ہے وہاں وہاں تک اِس کی اشاعت کے امکانات کے، بیان کردیا۔ عربی میں تازہ چھپی اِن موضوعات کی کچھ کتابوں کا بتایا۔ انگریزی کی بھی دو ایک تازہ کتابوں کے تراجم کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی۔ اُن کو کچھ کتابوں کے نام بھی لکھوائے۔ الغرض وہ جہاں بیٹھتے، وہاں کے اہلِ مجلس کی ضرورتوں کے حسبِ حال کاموں کا پورا خاکہ کھینچ دیتے تھے۔

اِسی طرح جامعہ خیرالمدارس ملتان کا ایک رسالہ نکلا (یا اُس کی ادارت مولانا ازہر صاحب کے پاس آئی، صحیح یاد نہیں) تو بھائی ذوالکفل مجھے لے کر ایک دوپہر شدید گرمی میں اُن کے پاس گئے۔ مجھے راستے میں بتاتے رہے کہ اِس رسالے کی پہنچ کیسی اور کہاں تک ہے اور یہ کتنا اہم ہے۔ وہاں پہنچے تو مولانا سے تفصیلی بات چیت کی۔ پوری ترتیب بتاتے رہے۔ میں دیکھتا رہا کہ وہ خود ایک رسالہ (نقیبِ ختمِ نبوت) نکالتے ہیں، اور پھر بھی کس دلسوزی سے اپنے تجربات اُن کے گوش گزار کررہے ہیں۔ بالکل اِسی طرح صاحبزادہ محمد حامد سراج صاحب نے میّا لکھی جو اردو ہی نہیں بلکہ انگریزی و فارسی (جتنی کہ ہم نے پڑھی ہے اُس سب) میں بھی اپنی نوعیت کی منفرد کتاب ہے؛ ہم حاضر ہوئے تو اِس پر بات چیت کے ساتھ ساتھ اُن کے آئندہ عزائم سے آگاہی ہوئی۔ شیخ نے اُن کے ساتھ افسانوں کے خیالات اور اُن کی پیشکش کے بارے میں کئی نشستوں میں سیر حاصل بحث کی، اور یہ بتاتے رہے کہ خاص کر ہم (اہلِ نسبت) لوگوں کو کن موضوعات پر لکھنا چاہیے۔ صاحبزادہ صاحب ہماری مشایعت کے لیے اڈے تک تشریف لائے تو ہمارے کوچ میں سوار ہوتے تک اُن سے اِنھی موضوعات پر گفتگو فرماتے رہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ شیخ کے پاس بیٹھنے والے لوگ محض اَخفش کے ''لیلے'' نہیں ہوتے تھے (یا نہیں رہتے تھے) بلکہ اُن کی قوتِ انجذاب میں حیرت انگیز طور پر اضافہ ہوجاتا تھا۔ وہ اپنی گفتگو میں لوگوں کو منہمک (Absorb) نہیں بلکہ شامل (Involve) کیے ہوتے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جو بھی اُن سے کہیں ایک مرتبہ بھی مل لیا ہے، آج تک اُنھیں نہیں بھولا۔ آج یہ بتانے والے بہت سے لوگ ہیں کہ اُن میں کا ہر ایک یہی سمجھتا ہے کہ بھائی ذوالکفل کا تعلق اُسی کے ساتھ سب سے زیادہ تھا۔ آپ کو ایسے کئی لوگ ملیں گے جن سے اُن کی صرف ایک ملاقات ہے اور وہ بھی سالہا پہلے، لیکن اب اُن کو بڑی محبت سے یاد کررہے ہیں۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھے جن کے بارے میں ایک حدیثِ پاک میں اِس مفہوم کا مضمون آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ

بذاتِ خود ساری مخلوق میں اعلان فرماتے ہیں کہ مجھے آدم کے فلاں بیٹے سے محبت ہے، تم سب بھی اُس سے محبت کرو۔

میرے شیخ میں مشفق خواجہ صاحب والی کئی ایک باتوں کی جھلک ملتی ہے: خود کم لکھا، دوسروں کو لکھنے پڑھنے سے زیادہ لگایا؛ لکھنے پڑھنے والوں کی مدد گیری اور خبر گیری؛ مذہبی اور علمی حلقوں میں یکساں مقبولیت؛ دین داری اور شعائرِ دین کا تحفظ؛ مذہب فروشوں کے لیے نرم گوشہ رکھنے سے نفور؛ کسی سے بھی دوبدو نہ ہونا؛ قلم کی حرمت کا خیال رکھنا اور قلم کا پھوہڑپن بالکل نہ ہونا؛ ادب میں مقصدیت؛ وغیرہ وغیرہ۔ میرے شیخ بہت جلدی میں تھے۔ بہت سے کام تھے کرنے کو۔ بہت سرعت کے ساتھ سب کچھ کرتے چلے گئے۔ میں گواہ ہوں کہ وہ جہاں جاتے، کچھ کر کے اُٹھتے، یا کچھ لوگوں کو کسی ہدف پر متعین کر دیتے۔ پھر اِن میں سے بلاتخصیص ایک ایک کو پوچھتے بھی رہتے۔

☆

میری سعادت ہے کہ میں سفر و حضر میں لمبی مدت تک اُن کے ساتھ رہا ہوں، اور سالہا سے اُن کے ساتھ معاملت بھی رہی ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم والے اخلاق مجھے جس آدمی میں سب سے زیادہ نظر آئے وہ سید ذوالکفل ہیں۔ یہ یکے از دوستاں (Company) کی گواہی ہے، جسے تسلیم کیا جانا چاہیے۔

میرے شیخ کے اندر لوگوں کو جمع کرنے اور جمع کیے رکھنے کی ایک نادر صلاحیت جاگزیں تھی — صلح کُل کی ایک عجیب کیفیت۔ اُن کے پاس ایسے مختلف الخیال لوگ آ کر جمع ہو جاتے تھے جو آپس کے تعلقات کی وجہ سے شاید کبھی نہ مل سکتے۔ وہ ہر ایک سے خیر سگالی کرتے، بدسگالی اُن کے خمیر ہی میں نہیں تھی۔ میں نے اُنھیں کسی کو غلط مشورہ دیتے یا ٹرخالوجی لگاتے تو کیا، کسی کو لمبا راستہ تک بتاتے نہیں دیکھا۔ اُن کا مشورہ اور باتیں اخلاص میں گویا لتھڑی ہوئی ہوتی تھیں۔

اُن کا ظرف بہت وسیع تھا۔ سلامِ روستائی کے لیے آنے والے اور ایسے بہت سے اہلِ غرض جو اُن کے گرد منڈلاتے رہتے تھے، اُن کی تیز نگاہوں سے چھپے ہوئے نہ تھے اور نہ ہی اُن کے عزائم و مقاصد سے وہ ناآشنا تھے۔ لیکن اپنی خلقی نجابت، وسعتِ نظری اور خوش اندیشی کی وجہ سے وہ سب کو ساتھ لیے ہوتے تھے۔ اُن کا مزاج دینے کا تھا، لینے کا نہیں۔ خود پیچھے رہنا اور لوگوں کو سامنے لانا بھی اُن کی صفت تھی۔ کسی میں ذرا سا بھی کرنٹ دیکھتے، اُسے اِدھر اُدھر متعارف کراتے۔ اور صرف متعارف ہی نہ کراتے بلکہ جوڑ بھی بٹھا دیتے (Physical patching)۔ کتنے ہی لوگ ہیں جن کے قدوں میں شیخ کی علمی قامت کی اونچائی شامل ہے۔

مربی یعنی تربیت کرنے والے کا کردار اور راہ نمائی (Direction) بھی شیخ کے مجموعی کردار کی ایک دمکتی اکیت ہے۔ بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کو اُن کا مسلسل ''نگرانی'' میں رکھنا اور ایک طرح سے انگلی پکڑ کے چلائے چلے جانا میرے علم میں ہے، یہاں تک کہ یہ لوگ مختلف شعبوں میں پاؤں پاؤں چلنے کے قابل ہو گئے۔ اُنھوں نے جس کا ہاتھ پکڑا اُسے توڑ تک پہنچایا۔ اللہ کرے کہ جنھیں ڈائریکشن دی گئی تھی وہ منزل کھوٹی نہ کریں۔ درخت کا حال پھلوں ہی سے تو معلوم ہوتا ہے۔

میزبانی بھی ختم تھی میرے شیخ پر۔ وہ مشہور مقولے **مَنْ زَارَ شَیْخًا وَلَمْ یَذُقْ عِنْدَہٗ شَیْئًا فَکَاَنَّمَا زَارَ شَیْخًا مَیِّتًا** میں ''شیخ'' کی عملی تصویر تھے۔ بہت ہی کم ایسا ہوا ہے کہ کچھ دوستوں نے اکٹھے ہو کر کھانے کا پروگرام بنایا ہو اور اِس میزبانی کا سارا اجر بھائی ذوالکفل خود نہ لے گئے ہوں۔ خالد صاحب، شیخ اور اِس خاکسار کی ٹرائیکا (Troika) کی آخری میزبانی بھی شیخ نے کی تھی اپنی بیٹھک میں۔

اُن میں ہر وقت لوگوں کے کاموں میں لگا رہنے کی نایاب صفت بھی تھی؛ ہر ایک کا کام کرنے کے لیے ہر دم تیار۔ اُسی وقت کوئی ترتیب بنانے کی کوشش میں لگ جانا، یہ بھی اُن کا ایک خاص وصف تھا۔ بلکہ دوسروں کے کاموں میں وہ ہمیشہ زیادہ چوکسی دکھاتے اور ذاتی کاموں میں عموماً ڈھل مَٹھ۔ ایک مثال یاد آ رہی ہے کہ بالکل تازہ ہے: میرے ایک عزیز دوست ڈاکٹر ظہیر احمد

(سَرے یونیورسٹی، برطانیہ) کو سعودیہ میں شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ میں ملازمت کی پیشکش ہوئی۔ وہ تھوڑا ہی عرصہ وہاں رہے لیکن اُن کے اہلِ خانہ سمیت رہائش کا بندوبست، اور دیگر، سب میرے شیخ نے بڑی تندہی سے کیا۔ ایسی کتنی ہی مثالیں ہیں کہ دیارِ غیر میں جا کر سگے سمبندھی تک کام نہیں آتے، اور ایک میرے شیخ ہیں کہ اُن لوگوں کے کاموں میں بھی لگے ہوئے ہیں جن کے وہ صرف نام آشنا تھے اور کبھی سلام علیکی تک نہ تھی۔ وہ خود تو دوسروں کے کام آتے رہے اور جن سے جیتے جی کا ناتا تھا اُن کے بوجھ اُٹھاتے رہے، لیکن غیور اِتنے تھے کہ اِس کی بہا میں کسی سے کوئی کام نہ لیا۔ حتیٰ کہ ہم میں کے کسی کو کندھا تک نہ دینے دیا۔

دوستوں میں تحفے تحائف کا تبادلہ ہوتا ہی ہے۔ شیخ اِس بارے میں باذوق بھی تھے اور متحرک بھی۔ شاید ہی کبھی تحفہ دینا بھولے ہوں۔ جہاں تعلق بنا، اُس کے مناسبِ حال تحفہ ضرور دیتے تھے۔ ایک بات یاد آ رہی ہے۔ اُن کے سعودیہ کے ایک رفیقِ کار محمد سلیم صاحب ہیں جو مانسہرہ میں رہتے ہیں۔ یہ دونوں لوگ چھٹیوں میں تقریباً اکٹھے ہی پاکستان آتے۔ اور جب آنا ہوتا تو شیخ ہمیشہ اُن کے لیے ملتان سے آم بھجواتے۔ مجھے اِس کا ناغہ یاد نہیں۔

میرے شیخ سید ذوالکفل ایسے زندہ دل، بشاش اور خوش مزاج تھے کہ باید و شاید۔ ہر عمر اور ذوق کے لوگوں میں یکساں مقبول۔ لطیفوں کے بارے میں فرماتے تھے کہ کسی بھی قوم یا زبان والوں کے خلاف ایس ایم ایس نہیں کرنے چاہییں۔ منافرت پھیلتی ہے۔ اللہ کے نزدیک تو سب قومیں برابر ہیں اور اعتبار صرف تقویٰ کا ہے۔ اب سوچتا ہوں کہ اُن کے سے انداز میں ''چہار رواٹیٹ مُچپڑ''، ''پاپوش کاری''، ''ضربیات کی نشانیات''، ''ظفر المَلّتہ والدین'' اور ''وعلیکم السلام مع الکشمش والبادام'' وغیرہ وغیرہ، اب ہوا ہوئے۔ ایک اور بات یاد آئی: میں نے ۲۰۰۲ء میں حج سے واپسی پر اُنھیں حجازِ اقدس میں No Smoking کے اشتہارات کے ساتھ لکھی عبارت سنائی جس کی آخری سطر تھی: وَالدُّخانُ خَبیث (دھواں برا ہے)۔ اِسے اگر اِعراب کے بغیر پڑھا جائے (جیسا کہ وہاں سائن بورڈوں پر لکھا ہوتا تھا) تو یہ بنتا تھا: والد خان خبیث۔

تحفیظ مراتب کی بھی اُن کے ہاں خاص طور سے رعایت ملتی ہے۔ بڑے چھوٹے کا لحاظ ملاحظہ خاندانی لوگوں کی روایت اور وجہِ امتیاز ہے۔ لیکن دوسری اور تیسری پیڑھی تک کے لوگوں کی اِس وجہ سے قدر کرنا کہ مثلاً فلاں کے دادا ہمارے نانا کے ساتھ رہے، اِس لیے اُس سے ملنا اور توجہ کرنا، یہ رویہ کم سے کم میری عمر کے لوگوں میں نہیں ملتا۔ یہ شیخ کی ایک خاص ادا تھی جواب نہیں ملتی۔ کتابوں کے علاوہ شاید کہیں بھی نہیں۔ میرا اپنے ابوجان کے دوستوں سے تعلق رکھنا میرے شیخ کو خاص طور سے بہت پسند تھا۔

میرا دل بڑھانے کو کبھی کبھی کہا کرتے تھے کہ ہم بنو ہاشم حجازی سید ہیں، آپ راجپوت ہندوستانی سید ہیں۔ اِس پر بڑی باتیں چلتی تھیں۔ خصوصاً پاک و ہند کی بہت سی قوموں کے امتیازی وصف اُنھیں ازبر تھے جن سے اہلِ محفل بے حد محظوظ ہوتے تھے۔ اور بعض اوقات تو حیرت کی وہ کیفیت ہو جاتی تھی (جس کے لیے میرے پاس اردو کا کوئی مناسبِ حال محاورہ الاٰن موجود نہیں ہے) جسے ہم سرائیکی میں وات پٹّنا کہتے ہیں اور جسے ظریفؔ لکھنوی نے پوربی لہجے میں یوں بیان کیا ہے:؎

جَون بِریا پڑھوس بانکی گجل جھلاّئے کے
کوءُ جھومن لاگ، کوءُ رہ گئو منہ بائے کے

شیخ کے بارے میں ایک چلتی صحافتی اصطلاح استعمال کی جائے کہ وہ احرار کے تھنک ٹینک تھے تو یہ اُن کو محدود کر دینا بھی ہوگا، کیوں کہ اُن کی بیدار مغزی سے تنہا مجلسِ احرار ہی مستفید نہ ہوتی تھی۔ اردو میں تازہ وارد اِس اِصطلاح کا مطلب مفکرین یا دائرۂ دانش ہونا چاہیے، وہ تھنک ٹینک میکر یا اردو میں کہیں تو مفکرین ساز یا صورت گر دائرۂ دانش تھے۔ اُن کی مذہبی و سیاسی بصیرت داری کی بساطت ہم عمروں ہی نہیں بلکہ بعض بڑے دماغوں سے بھی آگے نکلی ہوئی تھی۔

میں نے کچھ ہی لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ ایک بات کسی کے حوالے سے دوہرائیں، یا کسی کا قول دوہرائیں، تو چاہے یہ دوہرانا

سالوں کے بعد ہو، لفظ بہ لفظ ہوتا ہے۔ یہی نادر بات میرے شیخ میں بھی تھی۔ یہ اُن کی خاص الخاص اور ممتاز باتوں میں سے ہے۔

میرے شیخ کے آنے پر محفل کا رنگ بالکل بدل جاتا تھا۔ لوگ لایعنی میں لگے ہوئے ہیں جیسے مثلاً تھڑے پر بیٹھے ہوئے لوگ صدام حسین کو مشورے دے رہے ہیں، تو بڑے طریقے سے ایک آدھ جملے میں سب کو ٹھیل ٹھال کر کسی کام کے موضوع پر لے آتے۔ اُن کے آنے پر محفل وہ نہیں رہتی تھی جو پہلے ہوتی تھی۔ اُن کے جانے پر بھی محفل کا رنگ بدل گیا ہے۔ جتنے لوگ اُن سے متعلق تھے، سبھی کی محفلوں کا رنگ بدل گیا ہے۔ میں نے اُن لوگوں کو بھی سنجیدہ ہوتے اور آخرت کی باتیں کرتے دیکھا ہے جو اب سے پہلے زندگی کے مقصد کے بارے میں سنجیدہ نہ تھے۔ اُن کے آنے سے تبدیلی آتی تھی، وہ جاتے ہوئے بھی تبدیلی کر گئے ہیں۔

وہ بے حد راحت رساں آدمی تھے۔ ہر ایک کو راحت ہی پہنچانا اُن کی عادتِ ثانیہ تھی۔ مر کے بھی اُنھوں نے راحت ہی پہنچائی۔ اپنی خو نہ بدلی اُنھوں نے۔ اب یہ کیفیت ہے کہ جب بھی کہیں، کبھی، اُن کا تذکرہ ہوگا، ہمیشہ مکۂ مکرمہ کے تذکرے پر ختم ہوگا۔ جب بھی اُن کو یاد کریں گے تو مکہ یاد آئے گا۔ خانۂ کعبہ کا ذکر ہوگا۔ وہ جگہ یاد آئے گی جہاں رہنے کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسرت کیا کرتے تھے، کہ میں تو رہنا چاہتا تھا تیرے مکینوں نے نہ رہنے دیا۔ وہ اُس جگہ کے ساتھ لازم وملزوم ہوگئے۔ وہ مر کے بھی ہم پس ماندگان کو راحت پہنچا گئے، اور اللہ اور اُس کے گھر کی مستقل یاد کا سامان فرما گئے۔ یہ ہم جیسے عاشقان کے لیے ہے کہ ہم شدِّ رحال میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

☆

''ثقافت'' کے لفظ کو شیخ خاص طور سے استعمال کرتے تھے۔ اور اِس کی کئی باریکیوں کے اِس خاکسار کو آگاہ بھی فرمایا۔ فرماتے تھے کہ یہ ایک نہایت ''مشکل کشا'' لفظ ہے۔ بس جہاں ''پھنساوٹ محسوس'' ہو، اللہ کا نام لیں اور اِس لفظ سے بات یا جملہ شروع کر دیں، آگے چل سوچل ہے۔ شیخ فرماتے تھے کہ اصرار اُن چیزوں پر کرنا چاہیے جن کے حرام یا حلال ہونے کے بارے میں قطعی حکم ہے۔ جو چیزیں ہمارے معاشرے کی پیداوار ہیں اور جن چیزوں کی بابت ثقافت یعنی علاقائی رواج وروزمرہ پر بات چھوڑ دی گئی ہے اُن میں شدت نہیں کرنا چاہیے۔ مثلاً ایک چیز ہمارے ہاں اِس لیے اچھی ہے کہ یہاں کی ثقافت سے میل کھاتی ہے، اُسے کہیں اور برا کہنا، یا یہیں پر کچھ لوگوں کا اُس پر ناک بھوں چڑھانا درست نہیں، جیسے پان کھانا یا سگریٹ یا حقہ پینا، دھوتی پہننا، یا مثلاً کسی علاقے میں کالر والی یا گول گھیرے والی قمیص پہننا، یا لڑکیوں کا فراک وغیرہ پہننا۔ اِن چیزوں کو حرام یا حلال کی فہرست میں نہیں لگانا چاہیے۔

☆

شیخ ہمیشہ اصرار کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ سب پڑھے لکھے لوگ سیرتِ پاک کو درسًا مطالعے میں رکھیں۔ مجھے خاص طور سے فرمایا کہ اِس بات کو تحریک کے طور پر چلاؤں۔ اور سیرتِ مطہرہ کی کچھ کتابیں تجویز کیں: سیرتِ مصطفیٰؐ، الرحیق المختوم اور سیرتِ احمدِ مجتبیٰؐ۔ الحمدللہ بیسیوں دوستوں نے اِس ترغیب پر سیرت کی یہ کتابیں لیں اور شیخ کے حسب الحکم اُن کے دفاتر میں میز پر رکھی ہوتی ہیں۔

☆

اللہ نے میرے شیخ کو جو آخری آرام گاہ دی ہے اُس نے بہت سے سوالات کا جواب از خود دے دیا ہے۔ اللہ کی یہ مشیت اُن کی سعدیت اور تقویٰ طہارت کی خوبیوں پر صاد کرنے سے زیادہ اُن کے مسلک ومشرب کی راستی پر مہر کر گئی ہے۔ دین میں ملاوٹوں، اور کاٹھ کباڑ اور جھوٹ کے انبار کو دین کے نام پر پیش کرنے والوں کے خلاف خالصتاً غیرتِ دینی کی بنیاد پر اُن کے نانا رحمۃ اللہ علیہ نے جو کام شروع کیا تھا، اور جس میں اُن کے ماموؤں نے مزید رنگ بھرے اور تحریک کے خطوط واخوال میں طرحیں ڈالی تھیں، اور جس سب کو بحیثیت عقیدہ میرے شیخ نے زندگی کی آخری سانس تک اپنے پیشِ نظر رکھا تھا اور جسے وہ اپنا بہترین توشہ

خیال کرتے تھے، اللہ نے اُن کو نبیِ آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے پہلے تصدیق کرنے والی ہستی کے جوار میں جگہ دے کر اِس مسلک و مشرب کے سُچے پن کی بھی تصدیق کردی ہے۔ اُن کا خمیر بنی ہاشم کا تھا، اللہ نے برِاعظموں کی دوری سے اُن کی خاک کو اُٹھا کر بنی ہاشم کی جدّۂ اعلیٰ کی پائینتی میں جا پہنچایا ہے۔ اللہ نے اُن کو زمین کا وہ ٹکڑا عطا کیا ہے کہ جس سے بہتر تصور میں نہیں آتا۔

☆......۳......☆

شیخ نے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی باریکیوں کی طرف کئی بار میری توجہ دِلائی۔ مثلاً یہ کہ گھر والی اور اپنے بچوں کے حقوق کیا ہیں۔ والدین اور بہن بھائیوں، ساس سسر اور سسرال والوں کے حقوق کیا ہیں۔ دفتر والوں اور اہلِ محلّہ کے کیا حقوق ہیں۔ اِن حقوق کے بارے میں وہ تفصیلی بریفنگ دیا کرتے تھے۔ اور صرف مجھے ہی نہیں بلکہ کئی اور دوستوں کو بھی۔ فرماتے تھے کہ یہ سب اہلِ حقوق ہیں اور اِن سب کے حقوق کا اپنا اپنا دائرہ اور سرحد ہے۔ یہ سیکھنے کی چیز ہے کہ ہر ایک کے حقوق اِس طرح ادا کیے جائیں کہ اِفراط تفریط نہ ہو۔ اِسی عدمِ توازن کا نتیجہ کشاکش کی صورت میں نکلتا ہے۔ کئی بار فرمایا کہ جب بھی سفر سے واپس ہوں کوئی نہ کوئی تحفہ ضرور لے جایا کریں۔ بیگم کو اگر دوست بنالیں تو یہ بڑی کامیابی ہے، جس سے آدمی کی کارکردگی میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔

میں وقت ضائع کرنے کا بادشاہ ہوں اور لااُبالی پن بھی مجھے وافر ودیعت ہوا ہے، اور میری زندگی کا بڑا حصہ تو صرف یسّو پنجو کھیلنے جیسی مصروفیات سے عبارت رہا ہے۔ شیخ نے میرے لیے نظام الاوقات اور لکھنے پڑھنے، بچوں کی تربیت، لوگوں سے میل ملاقات، وغیرہ، کئی باتوں کی پوچھ پرتیت اپنے اوپر گویا لازم کی ہوئی تھی۔

میرے گھر میں بے شمار کتابیں دیکھ کر شیخ نے فرمایا کہ وہ اللہ کی بندی جو آپ کے گھر میں اِن کتابوں کا بکھیڑا سنبھالتی ہے، اُس کا کوئی روزینہ ہی مقرر کردیں۔ میں نے فوراً دس روپے یومیّہ مقرر کردیا۔ یہ اُس وقت کی بات ہے جب میری تنخواہ ساڑھے چھ ہزار روپے ماہانہ تھی۔ بیگم کو اِس مد میں دیا جانے والا محنتانہ جو پہلے یومی اعتبار سے چل رہا تھا، اب ایک ہزار روپے ماہوار چل رہا ہے۔

بچوں کی تربیت کے بارے میں شیخ نے بتایا کہ کامیاب زندگی کے لیے بنیاد کا ایک پتھر یہ ہے کہ ماں اور باپ کو مشورے سے آپس میں گرم اور سرد تار کی طرح بن جانا چاہیے، یعنی ماں اور باپ میں کا ایک سخت گیر ہونا چاہیے کہ بچے اُس کے ڈر کے دائرے سے باہر نہ نکلیں، جب کہ دوسرے کو صرف دوستانہ رکھنا چاہیے کہ بچے اُسے اپنی جائے پناہ محسوس کریں اور ہر طرح کی باتیں اُس سے کرسکیں۔ فرماتے تھے بہتر ہے کہ سرد تار باپ بنے اور گرم تار ماں، کیوں کہ بچوں کو زیادہ وقت ماں کے سر پر رہنا ہوتا ہے۔ اِس سے بچوں کا نماز روزہ، پڑھائی، دوستیاں، تمیزداری، کھیل کود وغیرہ سبھی کچھ قابو میں آجاتا ہے۔ اگر ماں سخت گیر ہو تو سٹکے لگائے بغیر بھی بچے خود بخود سیدھے ہو جاتے ہیں۔ ماں کا داب دپٹ قائم رہنا چاہیے۔

فرمایا کہ لوگ بچوں سے دعا کیوں کراتے ہیں۔ شاید اِس لیے کہ وہ معصوم اِتنے اُلجھے ہوئے نہیں ہوتے۔ اور بوڑھے مسلمان سے بھی اللہ شاید اِس لیے حیا کرے گا کہ وہ بے چارہ دنیا گزار کے اِتنا پریشان ہو چکا ہوتا ہے کہ سب کچھ لٹا چکنے کے بعد اور مہلتِ عمل کے بھی جاتے رہنے کے بعد وہ بھوندلا گیا ہوتا ہے، اور اِسی کیفیت کی وجہ سے اب کچھ نہیں مانگ سکتا سوائے رحم والا معاملہ کیے جانے کی امید کے۔

زندگی میں کم لوگ ملتے ہیں کہ اُن کے اتباع کی خواہش کی جائے۔ دوستوں میں تو ایسا شاید ممکن ہی نہیں ہوتا کہ اُس کی ''راہ'' کو اپنایا جائے۔ مثالی کردار (Role Model) دوستوں میں ممکن نہیں ہوتا۔ میں بڑی خواہش کرکے، اُس طرح کرنے کی کوشش کرتا تھا جیسے شیخ کو کرتا دیکھتا۔ میں کبھی کبھی رشک کی بہت عجیب کیفیت کے ساتھ دعا کیا کرتا تھا کہ اللہ مجھے ذوالکفل جیسا بنادے۔ اور اب سب سے بڑی دعا ہی یہی ہے اللہ مجھے اُن جیسی موت اور آخری آرام گاہ دے دے۔ ایک بار میں نے عرض کیا کہ میں گھر میں آنے والی موت سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں، اور یہ دعا مانگتا ہوں کہ اللہ کے راستے میں گھر سے جتنا دور سے دور جانا میرا مقدر ہے جب میں وہاں پہنچ جاؤں

تو اللہ اپنے پاس بلالے۔ شیخ نے کہا کہ اللہ سے یہ دعا بھی ساتھ مانگ لیا کریں کہ اے اللہ مجھے اُس وقت اپنے پاس بلانا جب میں تیری معرفت اور تیری ملاقات کے شوق کی اُس سطح پر ہوں جتنی زیادہ سے زیادہ میرے مقدر میں ہے۔ بے شک میرے شیخ کی ذات میں یہ دونوں ہی باتیں جمع ہوگئی ہیں: گھر سے دور سے دور موت، اور معرفت وملاقات کے شوق کی انتہا۔ بلکہ اس پر کچھ مزید بھی۔

میری طبیعت بہت خراب ہوئی (۲۰۰۲ء)۔ شیخ اُن دنوں میری عیادت کے لیے ہری پور تشریف لائے جب میں اپنے اردگرد موت کے سائے منڈلاتے دیکھ رہا تھا۔ بس یوں محسوس ہوتا تھا کہ آج شام تک، یا بس ایک رات دن باقی رہ گیا ہے۔ اُنھوں نے مجھ سے توبہ کرائی۔ لینا دینا پورا کرایا اور اس کی ترتیبیں سجھائیں۔ میں دے دلا کر ہلکا ہوگیا۔ پھر اللہ کا کرنا کہ میری طبیعت بحالی کی طرف چل پڑی جس کا کہ کسی بھی ڈاکٹر کو یقین نہیں تھا، اور نہ اُن لوگوں کو جنھوں نے میرا وہ حال دیکھا ہے۔ آج جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ شیخ جا چکے ہیں اور میں ابھی باقی ہوں تو بڑی عجیب کیفیت ہو جاتی ہے۔

میں جو بھی لکھتا، اُنھیں دِکھا لیا کرتا تھا۔ میری شاید ہی کوئی تحریر ہو جو اُنھوں نے نہ دیکھی ہوئی ہے۔ بیسیوں منٹ کی کال کر کے وہ بڑی محبت سے اپنی رائے دیتے اور جہاں محسوس کرتے، درستی کرا دیا کرتے تھے۔ میری بہت سی تحریروں میں اُنھوں نے خود بھی کچھ لکھ کر ساتھ لکھوایا۔

☆

لکھنے کی بابت فرمایا کرتے تھے کہ کبھی فوری طور پر یا اشتعال میں آ کر نہ لکھنا چاہیے۔ یہ آپ کا کام نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہر موضوع پر لکھنا چاہیے، لیکن ہر ایک کو نہیں۔ یہ سوچ لیجیے کہ کس کو کس موضوع پر لکھنے کو کہا جائے، لیکن ہر موضوع پر خود سے لکھنے سے نہ صرف حق ادا نہیں ہو سکتا بلکہ بہت سے اہل لوگوں کے کام کو خود کر لینے کی وجہ سے اُن سب کا حق بھی مارا جاتا ہے۔ مجھ سے بارہا فرمایا کرتے کہ اپنے لیے موضوعات طے کر لیں (اور پھر میرے لیے یہ موضوعات طے بھی کرا دیے)۔ باقی اہم چیزوں پر لوگوں کو نگاہ میں رکھیں کہ کس سے کیا لکھنے کو کہا جائے؛ کسی بھی دوسرے ڈومین میں خود ہرگز نہیں جانا۔

اُن کے حکم کے باوجود میں جن لوگوں پر ابھی تک نہیں لکھ سکا اُن میں ابو جان، محسن شاہ جی، ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی، ڈاکٹر وحید قریشی اور پروفیسر عبدالجبار شاکر شامل ہیں۔ اِسی طرح ابھی تک ڈاکٹر ف عبدالرحیم کی کتاب ”Europe Speaks Arabic“ پر بھی لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی ہے۔

☆

میرے ای میل باکس میں کتنی ہی میلیں ہیں جن میں اُن کے لیے یا پیر دستگیر، یا پیر و مرشد، ادرکنی یا آل محمد وغیرہ وغیرہ القابات لکھے ہیں۔ کبھی میں بہت موڈ میں ہوتا تو اُنھیں السلام علیکم کی بجائے السلام علیک یا آلِ محمد کہتا۔ یہ چند اشارے ہیں جن سے ہماری آپس کی باتوں کے تیور کا خوب اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

☆

میں جن لوگوں سے اُن کی معیت میں مختلف اوقات میں ملا اُن میں کے جن کے نام ابھی یاد میں آ رہے ہیں: مولانا تقی عثمانی، مولانا انظر شاہ صاحب (ابنِ مولانا انور شاہ کشمیریؒ)، امجد اسلام امجد، ڈاکٹر سید محمد اکرم اکرام، ڈاکٹر مظہر معین، ڈاکٹر محمود الحسن عارف، ڈاکٹر عباس نجمی، ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، محمد سہیل عمر صاحب، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، پروفیسر فتح محمد ملک، پروفیسر عبدالجبار شاکر، جنابِ افتخار عارف، ڈاکٹر سید شاہد حسن رضوی، چودھری غلام یزدانی صاحب، سعود عثمانی، وغیرہ۔ یہ سب ملاقاتیں تفصیل سے ذکر کیے جانے کی محتاج ہیں۔ ہر جگہ، ہر موقع پر بڑی گہری باتیں ہوئیں۔ اِن میں سے ہر ملاقات ایک بے حد تفصیلی مضمون بنتی ہے۔ یہاں صرف یہی تذکرہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

شیخ بزرگوں سے خود بھی ملتے اور مجھے بھی اللہ والوں سے ملنے کی طرف متوجہ کرتے۔ ڈاکٹر سید محمد ابوالخیر کشفی صاحب سے میرا رابطہ ہوا تو خوشی کا اظہار فرمایا اور کہا کہ وہ مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہیں۔ اب جب بات ہو تو میرا اسلامِ نیاز عرض کر دیں۔ پھر شیخ نے اُملج سے اُنھیں فون بھی کیا۔ کشفی صاحب نے ایک خط بھی اُن کے نام لکھا۔ شیخ نے اللہ کے کئی ایسے بندوں سے مجھے ملایا ہے جن سے تعلق کو میں نجات کے اسباب میں سے جانتا ہوں۔ ایسے لوگوں میں کے ایک مولانا حبیب الرحمٰن ہاشمی (نشتر میڈیکل کالج ملتان) ہیں۔ شیخ مجھے اُن کے پاس کئی بار لے کر گئے ہیں۔ زبان دانی، دین دانی، غیرتِ دینی، تقویٰ، عالمانہ فروتنی، تصنیف و تالیف، اللہ کے راستے کی نقل و حرکت اور عوام اور علما کے جوڑ کا ایک عجیب امتزاج اللہ پاک نے اُن کی ذات میں پرو دیا ہے۔

شیخ کے ایک عزیز دوست تھے حافظ اِرشاد صاحب۔ جوانا مرگ ہوئے۔ ایک دوپہر ہم دونوں اُن کے ہاں گئے۔ کھانا کھایا۔ پھر اُن کو ساتھ لے کر خالد مسعود خان صاحب کے یہاں حاضر ہوئے۔ مجھے خالد مسعود صاحب نے کہا کہ اپنے ابوجان کا کلام جلد چھاپ دیں۔ شیخ نے کہا کہ یہی کچھ آپ بھی اپنے کلام کے ساتھ کر ڈالیں۔ چند ہی دن بعد شیخ نے بتایا کہ حافظ ارشاد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ اُن کا ذکر کیا کرتے تھے۔ اُن پر ''کتبہ'' کے عنوان سے ایک نظم بھی کہی۔

☆

بھائی ذوالکفل جب پہلی بار میرے ہاں ہری پور تشریف لائے تو میرے ایک عزیز دوست مرحوم چودھری شبیر احمد صاحب بھی اُن کے لیے چشم براہ تھے۔ شیخ نے ہمارے ہاں دو دن گزارنا تھے۔ تشریف لائے تو آتے ہی فرمانے لگے کہ وقت کی تقسیم کر لی جائے کہ ہم لوگ کن کن موضوعات پر باتیں کریں گے۔ یہ میرے لیے نئی بات تھی۔

دوپہر تک شیخ نے ہم سے تصوف کے نام پر دیے جانے والے جھانسوں اور اہل اللہ کے واقعات میں ملنے والی Overstatements کی وجوہات پر باتیں کیں۔ چلتے چلتے یہ بھی بتایا کہ مرزائے قادیان ایسے ہی جھانسوؤں کا پیشوائے اعظم ہے۔ کھانے اور نماز کے بعد عصر تک تاریخِ اسلام کے ابتدائی مصنفین کے رجحانات کا جائزہ لیا۔ عصر سے مغرب تک انگریزی میں جملوں کی بنت (Sentence Structure) پر باتیں ہوئیں۔ مغرب کے بعد سے لے کر رات گئے تک آلِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آپس داریوں اور قربانیوں کا تذکرہ ہوا۔ وغیرہ وغیرہ۔ رات کو جب سونے کے لیے لیٹے تو میں یہ سوچتا رہا کہ یقیناً حضورِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اسی طرح اوقات کی ترتیب ہوتی ہوگی: کبھی حسب و نسب پر بیان ہو رہا ہے تو کبھی اساطیر پر، اور کبھی اشعار سنائے جا رہے ہیں تو کبھی جنگی کارنامے۔ وغیرہ۔ ہم نے سارا دن شیخ کی باتیں سنیں لیکن کیا مجال ہے کہ ذرا بھی اُکتائے ہوں۔ مجھے حیات الصحابہ میں ملنے والے مختلف واقعات کی تعبیریں ملنے لگیں۔

☆......۴......☆

میری آٹوگراف البم پر شیخ کی خاص توجہ تھی۔ ایک بار مجھے ایک بہت خوبصورت قلم عنایت کیا اور فرمایا کہ کچھ آٹوگراف اِس سے بھی لوں۔ اُس سے پہلا آٹوگراف میں نے اُنہی کی معیت میں جنابِ مختار مسعود کا لیا۔ میں نے اپنی آٹوگراف البم میں ایک بار شیخ سے آٹوگراف بھی لے ہی لیا۔ آخری بار جب وہ ہری پور تشریف لائے تو میں نے درخواست کی کہ یا شیخ اب تو یہ ہو ہی جائے۔ اُن کا آٹوگراف میرا دیرینہ مطالبہ تھا۔ اُنھوں نے میرے ابوجان کے مندرجہ ذیل دو نعتیہ شعر لکھ دیے:

تہذیب کے فریب کا انسان تھا شکار
ریگِ عرب نے کھولی حقیقت سراب کی
عابد خوشا دُرود کی کثرت، زہے شرف
تفریق اُٹھ گئی ہے حضور و غیاب کی

ابو جان کو میں اُتنا نہیں جانتا تھا جتنا کہ شیخ کی وجہ سے جانا۔ فرماتے تھے کہ دو تین لوگ ہیں جن سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے: عابد صاحب، تاثیر وجدان صاحب، اسلم انصاری صاحب۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اِنھیں خاص طور سے یونیورسٹیوں سے دور رکھا گیا ہے، کہ اِن کی وجہ سے بہت سوں کی علمیت کے پول کھل جاتے۔ ایک بار فرمایا عابد صاحب کا فقر جبری نہیں، اختیاری تھا۔ اور اُنھوں نے بہت کچھ سوچ کر اِسے اختیار کیا تھا۔ اُن کو دفالیوں کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ نہیں جانتے، میں جانتا ہوں کہ وہ اِستغنا کی اِتنی اونچی سطح پر تھے کہ کم سے کم اُن کے ماحول کے لوگوں میں سے کوئی بھی وہاں تک نہیں پہنچا۔ پھر اُن کا یہ شعر سنایا:

اَنہد مُرلی کے سُر ڈاریں جان میں سو سو چھید
خالی کان چھدا لینے سے بنتا نہیں ملنگ

ابو جان کے بارے میں کئی باتیں مجھے شیخ سے پتہ چلیں۔ مجھے کہا کرتے تھے کہ اُنھوں نے آپ بچوں پر بڑی محنت کی ہے اور آپ کے لیے بڑی مشقت جھیلی ہے۔ بہت تنگی کا وقت کاٹا ہے۔ ایک بار بتایا کہ ایک دفعہ وہ تشریف لائے تو محسن ماموں نے کہا کہ یار عابد، بڑی دیر بعد چکر لگایا۔ جواب میں عابد صاحب نے کہا کہ لالہ جی، ایک تو مصروفیت رہی۔ اور دوسری، سچی بات یہ ہے کہ اتنی گنجائش بھی نہیں تھی کہ چکر لگا سکوں۔ کرائے کے پیسے نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔

میں نے شان الحق حقی صاحب پر مضمون لکھا۔ میں نے شیخ کو بتایا کہ یہ اور یہ جملہ جو میں نے اِس مضمون کی ابتدا میں لکھا ہے، تحسینیات میں ابو جان کے فلاں مضمون سے نقل ماری ہے۔ اور یہ پڑھنے کی توفیق بھی مجھے صرف تحسینیات کی پروف ریڈنگ کی وجہ سے ہوئی ہے۔ فرمایا کہ اگر اپنے ابو کے مضمون بار بار پڑھنے کے بعد اتنی بھی اردو نہ آتی تو آپ اُن کے بیٹے ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ پھر کہا کہ وہ ایسے استاد تھے کہ اُن کی کلاس میں بیٹھنے والا جاہل رہ ہی نہیں سکتا تھا۔

میرے ابو جان سے شیخ کو خاص تعلق تھا۔ مجھے قطعی الفاظ میں یہ کہا تھا کہ میں انگریزی میں تو پی ایچ ڈی نہیں کر سکوں گا کیوں کہ عمر بڑھ گئی ہے اور مصروفیات کا ہجوم بھی ہے، لیکن اردو میں ضرور کروں گا اور عابد صاحب پر کروں گا۔ یہ شاید ۲۰۰۰ء کے آس پاس کی بات ہے کیوں کہ اُن کا TEFL مکمل ہوئے کچھ زمانہ ہو چکا تھا۔ پھر جب شیخ سعودیہ چلے گئے تو ایک بار واپس ہوئے تو فرمایا کہ شاید میں پی ایچ ڈی نہیں کر سکوں گا کیوں کہ ایک منحوس نے مجھے کہا ہے کہ تم یہ نہیں کر سکو گے۔ اور اُس کی کالی زبان سے نکلی بات پوری ہوا کرتی ہے۔

☆......۵......☆

شیخ نے اور میں نے مل کر دو لغات بھی مرتّب کیے ہیں۔ پہلے یعنی اردو–انگریزی لغت کا تسویدی ایڈیشن چھپ بھی چکا ہے۔ اردو–اردو لغت پر الحمدللہ بہت سا کام ہو چکا ہے۔ اِس لغت میں ہم نے کوئی پونے دو کروڑ الفاظ کے ڈیٹا پر کام کر کے اردو کے کثیر الاستعمال نیز اہم الفاظ کو خصوصیت سے جگہ دی ہے۔ الفاظ کی سمائی کے اعتبار سے ہمارے یہ لغات قریب قریب Advanced Learner's اور Dictionary of Language & Culture کے نمونوں پر تیار کیے گئے ہیں۔ یہ دونوں لغات اردو زبان (Language) کے لغات ہیں۔ اب سے پہلے کے لغات زیادہ تر صرف ادب (Literature) کے گرد گھومتے ہیں۔ دورِ حاضر میں اردو کی جہد للبقا کے ضمن میں ادب کو زبان سے الگ کیا جانا ہماری دانست میں ضروری ہے۔ لیکن اِس کا یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ ادب کو بالکل ہی نکال باہر کیا گیا ہے۔ بہت احتیاط کے ساتھ کوشش کی گئی ہے کہ یہ لغت ادب کے لیے بھی کار آمد (Companion to literature) رہے۔ زبانِ اردو کے وقیع کام کرنے والوں کے ضمن میں ہم نے یہ طے کیا تھا کہ شاعروں میں غالب کے بعد اقبال، فیض، اکبر، مجید امجد، حفیظ، شورش، ظفر علی خاں، عدم، اختر الایمان اور جگن ناتھ آزاد کی شاعری کی لفظیات کو اردو کارپس (Corpus) کا حصہ بنایا جائے اور ناثروں میں فرحت اللہ بیگ، بابائے اردو مولوی

عبدالحق، خواجہ حسن نظامی، پطرس، منٹو، ابنِ انشا، مختار مسعود، مشفق خواجہ، مشتاق احمد یوسفی، قدرت اللہ شہاب، قرۃ العین حیدر، امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی۔ معاصر ادب اور میڈیا، مختلف رسائل و جرائد، کالم، وغیرہ۔

☆......۶......☆

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہم سارا دن اور رات گئے تک ملتان کی سڑکیں ناپا کرتے تھے۔ کبھی خالد صاحب بھی اپنی موٹر سائیکل پر ساتھ ہوتے۔ پٹرول آٹھ روپے پچھتر پیسے لٹر تھا۔ ہم خوب پٹرول پھونکتے۔ پھر پھرا کر رات کہیں واپس آتے تو عشا کی نماز اکٹھے پڑھتے۔ شدید گرمیوں میں ایک بار کہیں رات پونے تین بجے واپس ہوئے۔ تھکن سے چور تھے۔ بیٹھک میں تخت پر بیٹھ کر چٹاخ پٹاخ کھانا کھایا اور بھاگم بھاگ نماز پڑھی۔ یہ نماز بھی یادگار ہے۔ اِس میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ذکر آتا ہے، اِس طرح کہ ہم نے ایک رکعت والے وتر پڑھے۔ فجر کی اذان میں تھوڑی ہی دیر باقی تھی۔ فرمایا کہ کان لگالو۔ جہاں کوئی مؤذن غلطی سے بھی اذان شروع کردے، ہم اپنی فجر پڑھ کر سولیں گے۔ خدا خدا کر کے کہیں سے اذان کان میں پڑی۔ ہم نے سنتیں پڑھیں۔ نماز کی ''قیادت'' حسبِ معمول اِس خاکسار نے کی۔ اِس بیٹھک اور تخت سے کئی یادیں وابستہ ہیں۔

بیٹھک میں سونا ہوتا تو نمازِ فجر کے بعد ہم دونوں دودھ لینے کے لیے جاتے۔ اِس آن جان میں شیخ نے تاریخ اسلام کی بہت سی جہات پر گفتگو کے علاوہ اپنے خاندان اور بزرگوں سے متعلق بے شمار باتیں اور علی الخصوص مجلسِ احرارِ اسلام کی جدوجہد کے بارے میں بتایا۔ یہ میرے لیے بہت قیمتی ذہنی غذا تھی جس کا کہیں اور سے ملنا شاید کبھی ممکن نہ ہوتا۔ میرے لیے بہت سی باتیں بالکل نئی ہوتی تھیں کیوں کہ ہم نے جو تاریخ پاکستان پڑھی تھی وہ مطالعۂ پاکستان کا مسلم لیگ بلکہ حکومتِ پاکستان ورژن تھا (جو ہر آنے والی حکومت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ قیامِ پاکستان کا مقصد اور قائدِ اعظم کا مقصودِ نظر (vision) تک بھی ہر حکومت کی تفسیر بالرائے کے تابع ہوتا ہے اور ہر حکومت اِس کا نیا ایڈیشن متعارف کراتی ہے)۔ اللہ میرے شیخ کی قبر کو نور سے بھردے، وہ مولانا حسین احمد مدنی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے اکابر کے بارے میں اِس ناہنجار کی گستاخانہ شُرلیوں کا نہایت یکسومزاجی سے جواب دیتے۔

گلی گلی ملتان کی جہاں ہم پھرا کرتے تھے، اب کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔

☆......۷......☆

زندگی کے بے اعتبارا ہونے کا تو سنتے آئے ہیں۔ دیکھا بھی ہے۔ لیکن وقت کے اِتنی سرعت کے ساتھ گزرنے کا علم ابھی ہوا ہے۔ ابھی کل کی، بالکل کل کی بات ہے کہ شیخ کی شادی ہوئی تھی اپنے ماموں حضرت پیر جی عطاء المہیمن بخاری کی بیٹی سے۔ شیخ شادی سے محض دو دن پہلے سعودیہ سے تشریف لائے تھے۔ ہم اسلام آباد سے صبح نماز کے بعد پہنچے۔ اگلے روز بعد نمازِ عصر نکاح تھا۔ مجھے یاد ہے کہ نکاح کے موقع پر دعا کے وقت میں شیخ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ جسے دیکھ کر میرے پسینے نکل گئے تھے اُس سخت سردی میں۔ لوگ کھڑے ہوئے اور مبارک سلامت کا شور اُٹھا۔ صبح شیخ کے ولیمے میں دارِ بنی ہاشم کے احاطے میں سارا ہی شہر اکٹھا تھا۔ یہ یادیں اور یہ مناظر بسرائے نہیں بسرتے۔

۱۶/ نومبر ۲۰۰۹ء کی صبح بھی دارِ بنی ہاشم کے اِسی احاطے میں سارا ہی شہر اکٹھا تھا۔ اب کے بھی لوگ میرے شیخ سید ذوالکفل کے حوالے سے اکٹھے ہوئے تھے۔ لیکن یہ اجتماع ہک ہک کر روتے تعزیت کرنے والوں کا تھا۔ میں اِس روز اِن لوگوں میں شامل نہیں تھا۔ میں اِس مجمع میں شامل نہیں ہوسکتا تھا۔ میں شیخ کو رفتگان میں شمار نہیں کرسکتا تھا۔

☆......۸......☆

میں بہت کمزور دل آدمی ہوں۔ موت برحق ہے، اور یہ اللہ سے ملاقات ہے، جس کا شوق ایمان کی علامت ہے۔ لیکن میں

کچھ لوگوں کو فوت ہوا نہیں دیکھ سکتا۔ مثلاً مشفق خواجہ صاحب۔ میں محسن شاہ جی کی وفات پر بھی ملتان نہیں آیا۔ حالانکہ آ سکتا تھا۔ میں کیسے دیکھ لیتا اُن کو۔ اب بھی، اللہ نے مجھ سمیت سب پر رحم کیا کہ میرے شیخ کو اپنے پاس بلا کر وہیں رکھ لیا۔ اگر وہ یہاں آ کر فوت ہوتے تو مجھ سمیت بہت سے لوگ یہ صدمہ جھیل نہ سکتے۔ یہ بات جذبات میں نہیں، ہوش میں لکھی گئی ہے۔

میرے شیخ نے ایک مثالی شوہر والی زندگی گزاری۔ یہ بات محض لفاظی نہیں ہے۔ اللہ نے بیوی اور بچوں کی صورت میں اُنھیں آنکھوں کی ٹھنڈک (قُرَّةَ اَعْیُنٍ) عطا کی تھی۔ ظاہر سی بات ہے کہ ایسا نصیبا محض یک رُخا نہیں ہوتا۔ حضرت پیر جی مدّظلہ اپنی اہلیہ کے بارے میں فرمایا کرتے ہیں کہ میری ملنگنی نے تو مجھ سے کبھی یہ تک نہیں کہا کہ گھر میں چینی ختم ہوگئی ہے۔ اُس نے پوری زندگی مجھ سے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ جب وہ یہ کہتے ہیں تو ہم دنیا دار لوگ اُن کا منہ تکنے لگتے ہیں۔ ایسی ماں کی تربیت یافتہ بیٹی جہاں رہے گی، گھر جنت ہی کا نمونہ ہوگا۔

وہ ایک فرمانبردار بیٹے، ایک مخلص اور کام آنے والے دوست، محبت کرنے والے انسان، اللہ کے ایک عاجز بندے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایسے امتی تھے جنھیں اِن شاء اللہ اُن کا پڑوس نصیب ہوگا۔ بلکہ اُنھیں تو گھر والوں کا قرب نصیب ہوگا کہ وہ تو گھر کے آدمی بنتے ہیں۔ اماں جان کے قدموں میں جا لیٹے۔ اماں جان کے ساتھ ہی اللہ کے پاس جائیں گے۔ کیا معلوم اماں جان ساتھ ہی لے جائیں۔ بندہ اللہ سے مانگتا ہے کہ یہ دے اور یہ دے۔ پھر جب سب کچھ مانگ چکتا ہے تو کہتا ہے کہ اے اللہ میں نے تو وہ مانگا جو میں تیری توفیق سے مانگ سکتا تھا، تو مجھے اپنی شان کے مطابق عطا فرمادے۔ میرے شیخ یقیناً یہ مانگتے تھے۔ اللہ نے اُن کو اپنی شان کے مطابق عطا کر دیا۔

میرے شیخ کو اللہ نے چار بار حجِ بیت اللہ کی سعادت نصیب فرمائی۔ وہ اس سال بھی حج کی نیت کیے ہوئے تھے۔ گو خود حج نہ کر سکے، لیکن اُن کے لیے ایک فرشتے نے حج کیا۔ اور جب تک حج ہوتا رہے گا، ہر سال ایک فرشتہ اُن کے لیے حج کیا کرے گا۔ یہ ایک حدیثِ پاک کا مضمون ہے۔

☆

شیخ کے والد چچا جی سید وکیل شاہ صاحب تو کہتے ہیں کہ اے اللہ میں تیری رضا پر راضی ہوں۔ منّا مجھے تو نے ہی دیا تھا، تو نے ہی واپس بھی لے لیا۔ آنکھوں کے تارے، جواں سال بیٹے کے صدمے کو یوں جھیلا کہ کسی کے سامنے آنکھوں سے آنسو ڈھلکانا تو ایک رہی، تعزیت کرنے والوں کو خود دِلاسے دیتے ہیں۔ بالکل یہی کیفیت حضرت پیر جی کی ہے۔ بلکہ وہ تو گفتگو میں باقاعدہ مزاح پیدا کرنے کی کوشش فرماتے ہیں۔

کفیل بھائی جان کی ڈاڑھی کے بالوں میں سفیدی تو پہلے بھی تھی، پچھلے دو ڈھائی مہینے میں یہ بالکل ہی سفید ہوگئی ہے۔ وہ بوڑھے ہوگئے ہیں۔ اُن کے غم کو کوئی کیا بٹائے گا۔ اور کوئی کیا سہارا دے گا اُنھیں۔ بھائی جان جذبات کے اظہار میں بھی احراری ہیں۔ عیدالاضحیٰ کی شام میں نے اُنھیں فون کیا۔ فرمایا کہ بجھے ہوئے کیوں ہیں۔ ہم نے تو عید بھی پڑھائی ہے۔ عید کی خوشیوں میں بھی شریک ہوئے ہیں۔ صفوان بھائی یہ سنت ہے سنت۔ اُنھوں نے شیخ کی آخری دنوں کی بڑھتی للّٰہیت اور تضرع کے بارے میں مجھ سے وہ کچھ کہہ دیا جسے میں نہیں کہہ سکا تھا۔ نظر کا لگنا حق ہے کیوں کہ نبیِ آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس کے توڑ کے اعمال بھی تعلیم فرمائے ہیں۔

اُن کا بھائی چلا گیا ہے، اور میرا شیخ۔ نہ اُن کا بھائی محض برادرِ خورد تھا، اور نہ میرا شیخ شیخِ محض۔ ہم دونوں کو ہی شاہ مات ہوگئی ہے۔

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

قاسم محی الدین بنگیال

ذوالکفل بخاری میرے قریبی دوستوں میں سے ایک تھے۔ ان کی وفات کے بعد بھی ان کی محفلیں بہت یاد آتی ہیں۔ ان سے میرا تعارف ۱۹۹۱ء میں میجر سعید صاحب کے کلینک میں ہوا تھا۔ پھر یہ تعلق روز بروز بڑھتا ہی چلا گیا۔ شاہ صاحب کا جب بھی پی۔ ٹی۔ سی۔ ایل پر فون آتا تو میرے والد صاحب کہتے کہ مشکل نام والے کا فون آیا ہے۔ وہ بھی ان سے بڑی محبت سے باتیں کرتے تھے۔ اس سے اندازہ لگائیں کہ ان کو میرے والد سے کتنا انس تھا۔

۱۹۹۷ء میں میری شادی پر ملتان سے بارات کے ساتھ دریا خان بھی گئے اور راستے میں ہم ان کی دلچسپ اور مزاحیہ باتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ وہ سارے دوست جنھوں نے بارات میں شرکت کی، آج بھی فون پر مجھ سے تعزیت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ ایک بہت اچھے دوست سے محروم ہوگئے ہیں۔ دوست بھی کیسا جو ایک بھائی جیسا شفیق تھا۔ ۲۰۰۶ء میں، میں اور میری اہلیہ حج پر گئے تو وہ بہت اچھے میزبان ثابت ہوئے کیونکہ ان دنوں وہ مکہ میں تھے۔ حج سے چند دن پہلے میری اہلیہ کی طبیعت خراب ہوگئی تھی تو ذوالکفل دوا لے کر آئے اور ان کو حوصلہ بھی دیا۔ مسلسل ہماری دیکھ بھال کرتے رہے۔ منیٰ میں، میں نے اور میرے دوستوں نے ان سے بہت ساری دینی معلومات حاصل کیں۔ وہ بڑے اچھے رہنما ثابت ہوئے۔ ذوالکفل بخاری بہت صالح انسان اور مخلص دوست تھے۔ دیانت، شرافت اور علم اُن کی پہچان تھی۔

آخری دفعہ جب وہ پاکستان آئے تو میں ان سے ملاقات کے لیے گیا اور ان سے کہا کہ میں اپنے گاؤں دریا خان (بھکر) میں کچھ رفاہی کام کر رہا ہوں تو انھوں نے میری حوصلہ افزائی کی، بہت اعلیٰ مشورے دیے اور تعارف کے لیے دو اشتہارات بھی لکھ کر دیے۔

وہ ہمارے گھر کے فرد کی طرح تھے۔ ان کی میرے بچوں سے خوب گپ شپ ہوتی تھی۔ بچے انھیں یاد کرتے ہیں۔ ہمارے گھر میں ان کا اکثر ذکر رہتا ہے۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر ان کی یادیں اسی طرح تازہ ہیں۔ نیک اور اچھے لوگوں کی طرح وہ ہمیشہ ہمارے دلوں میں رہیں گے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

زندگانی تھی تیری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر

دل نواز دوست

محمد جاوید اختر

مولانا سید عطاء المحسن بخاریؒ نے ۱۹۸۵ء میں مدرسہ معمورہ دارِ بنی ہاشم میں نماز جمعہ پڑھانے کا باقاعدہ آغاز کیا۔ نماز کی ادائیگی کے بعد مدرسہ کے گیٹ پر میرے ایک دوست مظہر حسین نے ایک خوبصورت نوجوان سے میرا تعارف کرایا۔ سید ذوالکفل بخاری سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ روایتی تعلیم کی تکمیل کے بعد شاہ جی نے تدریسی شعبہ میں خدمات سرانجام دینے کا فیصلہ کیا۔

شعبۂ ٹیکنیکل ایجوکیشن میں انگریزی لیکچرار کی خالی اسامیاں اخبارات میں مشتہر ہوئیں۔ شاہ جی نے پبلک سروس کمشن کا امتحان دیا۔ ۱۹۹۵ء کے اواخر میں میں لاہور گیا ہوا تھا وہاں اخبار میں میں نے کامیاب امیدواروں کی فہرست میں سید ذوالکفل بخاری کا نام پڑھا۔ اگلے روز واپس آ کر شاہ جی کو مبارک دینے گیا اخبار میں نے سنبھال لیا تھا شاہ جی کہنے لگے کہ مجھے نتائج کی خبر آپ کے ذریعے پہنچ رہی ہے۔ شاہ جی کی پہلی تعیناتی گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی لیہ میں ہوئی۔ اس کے بعد کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج آف کامرس ملتان میں لیکچرار شعبہ انگریزی رہے اور پھر گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی ملتان چلے گئے۔ شاہ جی کا علمی خاندانی پس منظر اور ان کا اپنا علمی و تحقیقی رجحان انھیں ٹیکنیکل شعبہ میں محدود ہونے پر مطمئن نہ کر سکا۔ وہ دیگر علمی، ادبی و تحقیقی سرگرمیوں سے مسلسل کسی نہ کسی سطح پر وابستہ رہے۔ ۲۰۰۳ء میں سعودی وزارت تعلیم کے تحت تبوک کے مقام پر بطور انگریزی استاد سعودی تعلیمی ادارے سے وابستہ ہو گئے۔ شاہ جی کم عمری کی وجہ سے علمی، تحقیقی، ادبی و صحافتی شعبہ میں زیادہ مشہور تو نہ تھے لیکن پاکستان کے صف اوّل کے مشاہیر میں سے جس کسی کی شاہ جی سے ملاقات ہوئی وہ ان کے کردار و صلاحیتوں کا معترف ضرور ہو گیا۔ اپنی انھی صلاحیتوں کی بنیاد پر ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ کی انتظامیہ نے شاہ جی کی خدمات بطور استاد شعبہ انگریزی اسی یونیورسٹی کے لیے حاصل کر لیں۔

ایک دفعہ ۲۰۰۰ء میں عید الفطر کی چھٹیوں کے دوران جمعہ کے روز شاہ جی کے آبائی گاؤں سید والہ عبدالحکیم اور ہمارے آبائی گاؤں تلمبہ جانے کا پروگرام بنا۔ شاہ جی کے دوست حامد سراج خانقاہ سراجیہ کندیاں شریف سے باگڑ سرگانہ آئے ہوئے تھے۔ ہم لوگ عبدالحکیم پہنچے۔ حامد سراج اور فیصل متین وہیں پہنچ گئے شاہ جی کے چچا سید مرتضیٰ شاہ صاحب کے پاس ہم لوگ کچھ دیر باتیں کرتے رہے اتنے میں نماز جمعہ کا وقت قریب آ گیا اور ہم تلمبہ کے لیے روانہ ہو گئے جامع مسجد تلمبہ (سید نیاز احمد شاہ صاحب والی) میں مولانا طارق جمیل کا بیان شروع ہو چکا تھا۔ اس بیان میں مولانا نے ایک بدو کے سوالات کے جوابات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات والی طویل حدیث بیان کی۔ نماز جمعہ کے بعد مولانا طارق جمیل سے مختصر نشست ہوئی۔ مولانا نے بتایا کہ اسی مدرسہ میں انھوں نے حصول علم دین کا آغاز کیا اور اس دوران کن حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ مولانا نے پھلوں سے مہمانوں کی ضیافت کی۔ مولانا طارق جمیل سے رخصت ہو کر تمام احباب ہمارے آبائی گھر آ گئے کچھ دیر آرام کیا۔ نماز عصر کے بعد ہم لوگ عبدالحکیم کے لیے روانہ ہوئے۔ مرتضیٰ شاہ صاحب کی پر تکلف ضیافت کے بعد ہم لوگ باگڑ سرگانہ پہنچے اور رات گئے واپس ملتان آ گئے۔

ام القریٰ یونیورسٹی جانے سے پہلے شاہ جی نے کچھ ماہ ملتان میں ہی قیام کیا۔ اس دوران ایک دفعہ ہم گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی اور گورنمنٹ کالج آف کامرس ملتان اپنے دوستوں سے ملنے گئے۔ تمام احباب بڑے تپاک سے ملے۔ پروفیسر

اصغر عدیم صاحب ہمیں اپنی کلاس میں لے گئے۔ شاہ جی کا مختصر تعارف کرایا۔ ڈائس ان کے حوالے کیا۔ اصغر صاحب اور میں ہم دونوں طلباء کے درمیان بیٹھ گئے۔ شاہ جی نے طلبہ سے باتیں کیں۔ طلبہ نے کچھ سوالات کیے۔ شاہ جی کی گفتگو طلبہ کی کردار سازی اور فکری و نظریاتی رجحانات کی درست سمت کا تعین اور اس کی اہمیت کے گرد گھومتی رہی۔

ستمبر ۲۰۰۸ء میں میں اپنے والد اور چچا کے ساتھ عمرے کے لیے گیا۔ شاہ جی ان دنوں پاکستان ہی میں تھے۔ عمرے پر روانگی کا سن کر مجھے گھر پر ملنے آئے۔ مختصر الفاظ میں بڑی جامع اور قیمتی باتیں بتائیں جو اس سفر میں میرے لیے نہایت مفید رہیں۔

۱۔　دو بزرگ تمھارے ساتھ ہیں عمر کا تقاضہ اور سفر کی تھکاوٹ کی وجہ سے یہ تلخ بھی ہوں گے۔ اور انھیں دیگر پریشانیاں بھی ہوسکتی ہیں لیکن ان کی خدمت میں فرق نہ آئے اور نہ ہی کسی ردِ عمل میں اپنی نیکیاں برباد کر لینا۔

۲۔　اپنی نظروں کی حفاظت کرنا۔

۳۔　حدودِ حرمین میں گناہ کے خیال کا بھی مواخذہ ہے۔ بہت احتیاط کرنا۔

۴۔　کثرتِ اعمال کے لالچ میں بزرگ پریشان نہ ہوں۔ اُن کے آرام کا خیال رکھنا۔

۵۔　بیت اللہ کی زیارت قبولیت کا وقت ہوتا ہے۔ حرمین شریفین کے لیے اپنی آئندہ حاضری اللہ تعالیٰ سے پکی کرا لینا۔

دعاؤں کے اہتمام کے علاوہ چند انتظامی مسائل جو اِس سفر میں پیش آسکتے تھے، شاہ جی نے ان کے حل بھی بتائے۔

گزشتہ رمضان المبارک میں کفیل شاہ جی نے بتایا کہ ذوالکفل کچھ دنوں کی چھٹیوں پر آج ملتان پہنچ رہا ہے۔ اگلے دن میری شاہ جی سے ملاقات ہوئی انھوں نے بتایا کہ عید کے فوراً بعد واپسی ہے۔ عید الفطر کے بعد جمعہ کے دن تقریباً ۱۱ بجے ذوالکفل کا فون آیا۔ میں آفس میں تھا۔ پوچھا کہ کتنے بجے تک فارغ ہو جاؤ گے؟ میں نے کہا شاہ جی جمعہ گھر آ کر پڑھوں گا۔ مجھے معلوم تھا کہ آج شاہ جی کی روانگی ہے مجھے انھوں نے بتایا کہ میرا ۲ بجے نکلنے کا پروگرام ہے۔ میں نماز جمعہ پڑھ کر دار بنی ہاشم پہنچ گیا جہاں ابھی نماز نہیں ہوئی تھی۔ شاہ جی نماز سے فارغ ہو کر ائیر پورٹ روانگی کے لیے باہر آ گئے ان کے والد پروفیسر سید محمد وکیل شاہ صاحب بھی گاڑی تک انھیں چھوڑنے آئے۔ ذوالکفل اور ان کے دونوں بیٹے میرے ساتھ اور کفیل شاہ جی اپنے دوست شیخ جاوید صاحب کی گاڑی میں بیٹھے اور ہم ائیر پورٹ روانہ ہوئے۔ کچھ دیر وہاں فلائٹ کی معلومات وغیرہ لیں۔ شاہ جی ہم سب لوگوں سے ملے اور جہاز میں سواری کے لیے ائیر پورٹ کے اندر سامان کی ٹرالی لے کر چلے گئے کون جانتا تھا کہ شاہ جی سے ہماری یہ آخری ملاقات ہے۔ ذوالکفل کی روانگی کے بعد میں نے کفیل شاہ جی سے مخاطب ہو کر پوچھا شاہ جی کیا پروگرام ہے کفیل شاہ صاحب نے بھائی کی روانگی پر آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ہاں جی اب تو یہ چھوٹے شاہ صاحبان ہمارے ساتھ ہیں آپ انھیں لے کر چلیں میں شیخ صاحب کے ساتھ آ رہا ہوں، میرے ساتھ عطاء المنان اور ذوالکفل شاہ صاحب کے دنوں بیٹے واپس گھر آ گئے۔

بروز اتوار ڈاکٹر طاہر جمیل نے فون پر ذوالکفل بخاری کی حادثے میں رحلت کی اندوہناک خبر سنائی۔ میں فوراً دارِ بنی ہاشم پہنچا۔ ہر طرف افسردگی، ہر شخص مغموم۔ لیکن جس حوصلے ہمت اور صبر سے شاہ جی کے والدین، بھائی و دیگر اعزا نے اِس صدمے کو برداشت کیا، اس کی دور میں مثال نہیں ملتی۔ ذوالکفل سے ہماری ۲۴ سالہ رفاقت رہی میں نے اس زیادہ مخلص، خوش مزاج، ہمدرد، صاحبِ کردار، علم دوست اور صالح نوجوان نہیں دیکھا۔ ہمیشہ چہرے پر بشاشت، مسکراتے ہوئے بات کرنا، نہایت تحمل و برداشت کے ساتھ مدلل انداز میں اختلاف کرنا۔ گفتگو کو کبھی الجھنے نہیں دیتے تھے۔ بلکہ اسے سمجھا کر خوبصورتی سے آگے لے کر چلتے تھے۔ شاہ جی چلے گئے، یادیں باقی رہ گئیں ہم لوگ ان کے لیے دعائے مغفرت کے علاوہ اور کچھ نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ شاہ جی کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے ان کو کروٹ کروٹ راحتیں اور اپنی رحمتیں نصیب فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور اس صبر پر اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ آمین

یہ ’’شاہ جی‘‘ یہ تیرے پُراَسرار بندے

شعیب ودود

علم وعمل میں دیانت داری، طرزِ زندگی میں وضع داری، اپنے پرائے کے لیے مہمان داری، لین دین میں ایمانداری اور دوستوں لے لیے طرح داری ذوالکفل بخاری کی وہ خصوصیات تھیں کہ جو اسے آج کل کے نوجوانوں سے ممتاز کیے ہوئے تھیں۔ ذوالکفل نہ صرف میرا ہم عمر تھا بلکہ وہ میرا ہم مکتب بھی تھا اور ہم مسلک بھی۔ اس کی اور میری دوستی ذوالکفل کے عظیم نانا جان سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور میرے پرنانا جان حاجی برخوردار مرحوم کے درمیان عقیدت واحترام کے سلسلوں کی امین تھی اور پچاس برس پہلے قائم ہونے والے ایک ان مٹ رشتے کی تیسری نسل میں چلنے والی دوستی کی زندہ سلامت جیتی جاگتی تعریف تھی۔ سید ابوذر بخاری اور نانا جان ملک عبدالغفور انوری مرحوم بھی یارانِ طرح دار تھے۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو اپنے تین بھائیوں کے ہمراہ ذوالکفل کو اپنا چوتھا بھائی پایا۔ ہم دونوں درسگاہ میں اکٹھے داخل ہوتے اکٹھے بیٹھتے، اکٹھی شرارتیں کرتے اور پھر حافظ جی سے اکٹھے مار کھاتے۔ ایک دوسرے کو مار کھانے سے بچانے کی مکمل کوشش کرتے۔ درسگاہ سے باہر آکر ہنسی میں لوٹ پوٹ ہوجاتے اور اس کہاوت کو دہراتے کہ دوست وہ جو مصیبت میں کام آئے۔ ہم دونوں کاروبارِ زندگی میں ایک دوسرے کے دست و بازو بنے ہوئے تھے۔ لڑکپن میں دونوں اپنے قریبی گھروں سے تندور پر اکٹھی روٹیاں لگوانے نکلتے۔ اشیائے روزمرہ یعنی پھل سبزیاں گوشت اکٹھے ہی خریدتے تھے۔ سبزیوں پھلوں کے ’’حسب نسب‘‘ کو بہتر طریقے سے جانچنے اور پرکھنے پر ہمیشہ ذوالکفل مجھے داد کا مستحق قرار دیتا تھا۔ ذوالکفل کہا کرتا تھا کہ اللہ پاک نے تم میں قصاب حضرات کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم کرنے کی اضافی صلاحیتیں بھردی ہیں۔ بقرا عید سے یاد آیا ہم ہمیشہ قربانی کے جانور اکٹھے خریدنے نکلتے۔ بکروں کے قریب پہنچ کر ذوالکفل بخاری کی کمنٹری جاری ہوجاتی۔ بکرے کی قیمت سن کر وہ اکثر و بیشتر بہت ہی خوبصورت باتیں کیا کرتا تھا۔ کہتا تھا قربانی کے بعد جنت میں جانے کا سنا ہے لگتا ہے موصوف بکرے صاحب جنت سے ہوکر آ بھی گئے ہیں۔ بکرے کی ماں اگر منڈی میں کہیں مل جاتی تو اسے سے ٹی وی کے اینکرز کی طرح سوال کرتا کہ آخر کب تک خیر مناؤ گی؟

ایک بکرا عید پر بکرے کے مالک نے بکرے کی قیمت ۲۰ ہزار بتائی۔ وجہ پوچھنے پر مالک صاحب نے فرمایا کیونکہ یہ ایک کمینہ بکرا ہے لہٰذا اِس کی قیمت زیادہ رکھی گئی ہے۔ ذوالکفل نے جھٹ سے سوال کیا کہ اس بکرے کا کمینہ پن اسے وراثت میں ملا ہے یا پھر تمھاری صحبت کا نتیجہ ہے؟ امید ہے بکرے کے مالک صاحب نے آئندہ کسی خریدار کو بکرے کے عادات و خصائل کے بارے میں نہیں بتایا ہوگا۔ گزشتہ ستمبر ۲۰۰۹ء میں بھی وہ جب مکہ سے لوٹا تو کہنے لگا کپڑے اور عینکیں بنوانی ہے لہٰذا اتوار کی شام ہم چار گھنٹوں تک چھاؤنی بازار میں خریداری کرتے رہے۔ ۳۹ سالہ زندگی میں مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کوئی چیز اس کے لیے پسند کی ہو اور اس نے انکار کیا ہو یا زندگی میں کبھی لمحہ بھر کے لیے کبھی ہم دونوں کے درمیان رنجش پیدا ہوئی ہو۔ ہرگز نہیں۔ دوستی کا یہ مختصر سفر جو ہوش سنبھالنے سے شروع ہوا تھا اپنے مختصر سفر نامے میں کئی خوبصورت مناظر بیان کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ ذوالکفل امیلج اور میں دبئی میں بسلسلۂ روزگار مقیم تھا۔ عمرہ کی سعادت بھی اکٹھی ہی حاصل کیا کرتے تھے۔ رمضان کے آخری

عشرے میں دونوں باب الریاض کے سامنے ملتے اور پھر دس روز تک عبادات یعنی نمازِ پنجگانہ اور قیام اللیل اور نمازِ تراویح سب ہمراہ ہی ادا کرتے تھے۔ ۲۰۰۳ء میں نمازِ تراویح کے بعد ذوالکفل کہنے لگا کہ رہائش گاہ پر چلتے ہیں۔ گرمی کی وجہ سے غسل کرتے ہیں اور پھر قیام اللیل کرنے واپس حرم شریف آئیں گے۔ آخری عشرے کی ۲۴ویں رات تھی۔ غسل کر کے ہم دونوں اے سی کی ٹھنڈک میں ایسے سوئے کہ اگلے دن صبح سات بجے آنکھ کھلی۔ قیام اللیل تو درکنار سحری کرنے کا موقع بھی گنوا بیٹھے۔ بعد میں اکثر و بیشتر مجھے کسی کام کے لیے بھی ذوالکفل مشورہ دیتا تو میرا جواب یہی ہوتا تھا کہ بھائی صاحب قیام اللیل والا حال نہ کروا دینا۔

ذوالکفل کا مطالعہ انتہائی وقیع تھا۔ درحقیقت اس نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی کہ جہاں چاروں اور علم و عمل کے چراغ روشن تھے۔ نانا اپنے وقت کے عظیم خطیب، ماموں اپنے وقتوں کے جید عالم، والد اسلامیات کے انتہائی قابل پروفیسر، اہل خانہ درسِ نظامی کی فارغ التحصیل۔ یوں اسے چھوٹی عمر سے ہی ایک ادبی آب و ہوا میسر آئی کہ جہاں پر ہر لحہ مذہب، سیاست، تاریخ، شعر و ادب اور طنز و مزاح سے مزین گفتگو سننے کو ملی بلکہ اسے کتابوں کے نام بتانے والے اور کتابیں خرید کر لا دینے والے والد محترم اور بڑے بھائی سید کفیل بخاری بھی میسر آ چکے تھے۔ قدرت نے ذوالکفل کو ذہین و فطین بنایا تھا۔ وہ صرف ایک مرتبہ کوئی کتاب پڑھ لیتا تو اس کتاب کی یادداشتیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے ذہن کی ہارڈ ڈسک میں محفوظ ہو جاتی تھیں۔ تمام تر اساتذہ شعراء کا کلام اردو اور فارسی میں اُسے ازبر تھا۔ اسلامی تاریخ کا وہ حافظ تھا۔ اس کا محبوب مشغلۂ تحریر ایسے ادیبوں اور شاعروں کو جواب لکھنا ہوتا تھا کہ جو غلط باتیں لکھ کر سادہ لوح عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔ غلط باتوں کی تصحیح کروانے کے بعد وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اس کی نیت خدا جانتا ہے۔

''فاران اکادمی'' ملتان کے ادبی فورم پر پروفیسر ذوالکفل بخاری اپنے بہت سے دوستوں کو کھینچ لایا تھا۔ یہ اس کی شگفتہ شخصیت کا ہی کمال تھا کہ ہر طرح کا طبقۂ فکر اس کی دعوت پر لبیک کہتا اور حاضر ہو جاتا تھا۔

فاران اکادمی کے فورم سے اس نے جتنے دوستوں کو اکٹھا کیا وہ سب کے سب اب کئی کتابوں کے مصنف ادیب یا شاعر ہیں۔ اس کے چاہنے والوں میں اسلم انصاری، حفیظ الرحمٰن خان، خالد مسعود خان، خان، رؤف کلاسرا، مستحسن خیال، مختار پارس، خالد سنجرانی شامل ہیں۔ پروفیسر تاثیر وجدان اور ڈاکٹر مختار ظفر کے ساتھ ذوالکفل بخاری ملتان کی ادبی تاریخ پر گھنٹوں گھنٹوں گفتگو کیا کرتا تھا۔ برادر بزرگ جاوید اختر بھٹی کے ہاں میں اور ذوالکفل جب بھی حاضری دیتے تو ہماری یہ نشست کم و بیش چار پانچ گھنٹوں پر مشتمل ہوتی تھی۔

پروفیسر ذوالکفل بخاری نے حال ہی میں ام القریٰ یونیورسٹی مکۃ المکرّمہ میں بطور انگریزی لیکچرار ملازمت اختیار کی تھی۔ مگر پندرہ نومبر اتوار وہ اپنے فرائض منصبی ادا کرنے کے بعد جب یونیورسٹی سے اپنی رہائش کی طرف روانہ ہوا تو قضا کے راستوں پر چل نکلا اور ایک کار کے حادثے میں اِس دارِ فانی سے رحلت کرتے ہوئے خانے کعبہ میں نمازِ جنازہ اور جنت المعلیٰ کے احاطۂ دارِ بنی ہاشم میں دفن ہو کر بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کر گیا۔ اور اب اس کے گھر کا......طواف کرنے کو صبح بہار آتی ہے

صبا چڑھانے کو جنت کے پھول لاتی ہے

میری کتاب خامہ جنگی (اشاعت ۲۰۰۵ء) میں ذوالکفل بخاری کے متعلق کچھ فقرے سرزد ہوئے تھے:

ملتان کے باسی عمر بھر ''گرما گرمی'' کا شکار رہتے ہیں۔ وہ سب اچھے برے کام اسی گرمی میں ہی کرتے ہیں۔ عرس کے چاول اور عروس کے چھوارے اسی جہنمی موسم میں بھی چلتے ہیں۔ ''گرما گرمی'' کے عام موسم میں جب ہم میدانوں میں کرکٹ کھیلا کرتے تو یہ کاغذ اور قلم سے ''قلما قلمی'' کھیلا کرتے تھے۔ دور سے آ رہے ہوں تو لگتا

ہے فاسٹ باؤلر اپنے رن اپ کی طرف جا رہا ہے۔ ہر وقت جلدی میں ہوتے ہیں۔ اس جلدی میں ایک دن اتفاق سے ہم ان کے بالکل سامنے آ گئے۔ یہ ہمیں دھکا دے کر آگے نکل گئے۔ یہ اتنی جلدی میں تھے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ مگر چلتے چلتے فرما گئے بھائی صاحب دیکھ کر چلا کریں۔ یہ اسی جلدی میں ۲۰۰۲ء میں عربوں کو انگریزی پڑھانے املج چلے گئے۔ اپنی ناتواں جان اور توانا انگریزی کو صحرائے عرب کے منہ زور جھکڑوں کے حوالے کر دیا اور اب عربوں کو نہ جانے انگریزی کے اربوں لفظ کس طرح پڑھاتے، لکھواتے اور یاد کرواتے ہوں گے۔ یہ صاحب اور انگریزی دونوں اس صحرائے عرب میں مظلوم ہیں کیونکہ عربوں کو غیر عربی زبان کا سیکھنا انتہائی ناگوار گزرتا ہے، تو پھر سکھانے والے کتنے ناگوار گزرتے ہوں گے۔

ایک عربی صاحب تو اکثر ہمیں اپنی زخمی زبان دکھانے بطور خاص تشریف لاتے۔ فرماتے کہ انگریزی بولتا ہوں تو زبان کبھی دانتوں کی زد میں آ جاتی ہے اور کبھی دانت زبان کی زد میں آ جاتے ہیں۔ دنوں صورتوں میں نقصان تو ''زبان'' ہی کا ہے۔ وہ بقائمی ہوش وحواس کہتا ہے کہ عربوں کو ان کے ناجائز فخر اور تکبر کی سزا اللہ پاک نے اسی صورت میں دے دی ہے کہ وہ عربوں کا استاد ہے اور شعیب وودود عربوں کی کمپنی کا منیجر ہے۔ خطابت اس کی وراثت، نیکی اس کی خصلت، شاعری اس کی محبت اور دو چار یوم کا کہہ کر چھ، سات سال تک ایک کام نہ کرنا اس کی استغنائیت ہے۔ وہ ''خامہ جنگی'' کا پانچواں بڑا بھی ہے کہ ہم نے اسے تمام ویٹو اختیارات تفویض کر دیے ہیں۔ لہٰذا قابل اعتراض مواد کی اشاعت پر معترضین شاہ جی پر باآسانی (بوجہ تحریک واعانتِ جرم) ہتکِ عزت کا دعویٰ دائر کر سکتے ہیں۔ ان کا نام سید ذوالکفل بخاری ہے۔ میں پیار سے انھیں شاہ جی کہتا ہوں۔ یہ بھی خندہ پروری میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ جیو ہزار برس۔'' (مگر صرف چار سال بعد ہی وہ میری زندگی کی قبا میں ایک درد کا پیوند لگا کر چلتا ہوا)

ذوالکفل بخاری کو ان کی والدہ محترمہ اکثر وبیشتر پاکستان میں قیام پذیر ہونے کے لیے اصرار کرتیں شاید وہ جنت المعلیٰ کی ایک مرقد کے اندر جنت الفردوس کے در کا اپنے چشمِ تخیل سے دیدار کر چکا تھا۔ ۱۶/ نومبر بعد نماز فجر خانۂ کعبہ میں اس کے لیے لاکھوں احرام پوش اپنے امامِ کعبہ کی امامت میں دعائے مغفرت کرتے ہوئے اسے افق کے اس پار روانہ کر دیا کہ جہاں ہر ذی روح کو لوٹ کر جانا ہے۔ سورۃ البقرہ آیت نمبر (۵۵) کے مطابق اور یقیناً ہم تمھیں خوف اور بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی میں سے کسی نہ کسی چیز کے ساتھ ضرور آزمائیں گے۔ اور صبر کرنے والوں کو خوشخبری دے دیں۔ آیت نمبر (۵۶) کے مطابق وہ لوگ کہ جب انھیں مصیبت پہنچتی ہے تو کہتے ہیں بے شک ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور بے شک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔

ذوالکفل بخاری جیسے نابغۂ روزگار کی ناگہانی وفات نے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ ہم لوگ خواہشات کے صحرا میں کیوں بھٹکتے رہتے ہیں؟ آرزو اور جستجو کیا ہے؟ ہم عمر بھر جینے کی اپنی ہوس کی دہکائی ہوئی آگ میں کیوں جلتے ہیں؟ مستقبل کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے ہمیں یہ ضرور سوچنا ہوگا کہ مستقبل میں سب سے اہم موڑ موت ہے اور ہم اسی کو بھولتے ہیں۔

پروفیسر سید ذوالکفل بخاری: ایک تاثر

ڈاکٹر عبدالماجد ندیم ☆

پروفیسر سید ذوالکفل بخاری نے مختصر عمر پائی، لیکن ان کی شخصیت ہمہ پہلو اور انتہائی مؤثر تھی۔ مجھ ایسے کے لیے اس وسعت کو سمیٹنا اور تاثرات کو چند الفاظ میں پیش کرنا تو ممکن نہیں البتہ اختصار کا پہلو ایسا ہے جس کو اختیار کر کے قدرے مطابقت پیدا کی جاسکتی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ جب انعامات کی بارش فرماتا ہے تو ایسے جواہر بھی نچھاور ہوتے ہیں جو سید ذوالکفل شاہ بخاری کا روپ دھار لیتے ہیں۔ اگر عمومی بشری عمر کے تین مراحل: بچپن، جوانی اور بڑھاپا کے حوالے سے مختصر جائزہ لیا جائے تو مرحوم سید ذوالکفل بخاری وہ دیدہ ور تھا جس نے اپنے بچپن سے ہی ذہانت وفکری جستجو کے جوہر دکھلانا شروع کردیے تھے، عالم طفلی میں اپنی تمام تر معصومیت کے باوجود طفلانہ عادات سے محفوظ رہنے والے اس بچے نے جب عالم شباب میں قدم رکھا تو جوانی کے فطری جوش وخروش اور جذبات کی شدت کے ساتھ ساتھ حکمت وفراست اور معاملہ فہمی کے جواہر جو چہل و پنجاہ سال کی عمر کو پہنچ کر چند خوش نصیبوں کو ہی نصیب ہوتے ہیں، مرحوم میں بڑھاپے سے قبل ہی بڑی آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر تھے۔ بالغ نظری ایسی پائی تھی کہ تمام دوست واحباب اپنے خانگی وعلمی اور دیگر عملی امور میں ان کے مشوروں اور رہنمائی کے محتاج رہتے، مرحوم اپنی مخلصانہ طبیعت کے باعث دوستوں اور احباب کے لیے یہ فریضہ انتہائی کشادہ روی اور وسعت قلب سے انجام دیتے، پریشان افکار اور پیچیدہ گفتگو مسلسل اور ہمہ تن گوش ہو کر سنتے رہتے نہ تو تھکاوٹ کا اظہار کرتے، نہ ہی ملال خاطر ان کے چہرے سے عیاں ہوتا، رہبری ورہنمائی کے فریضہ سے بڑھ کر خوابیدہ ہمتوں کو جگا دینا، ہر شخص کی صلاحیتوں کو بھانپ کر کسی قیمتی مقصد کی طرف گامزن کر دینا، خاص کر جوانی میں، سید ذوالکفل بخاری کا طرۂ امتیاز تھا۔

ویسے تو مرحوم کے احسانات تمام احباب واقربا کی زندگی کا حصہ بنے جس کا اعتراف سننے اور مختلف دانش وروں کی تحریروں میں پڑھنے کو ملا ہے، لیکن اگر میں اپنی ذاتی زندگی کا جائزہ لوں تو سید ذوالکفل بخاری میرے محسنین کی فہرست میں ایک ایسا جگمگاتا ستارا ہے جس سے میں نے کئی ایک معاملات میں رہنمائی پائی مرحوم کے مشوروں اور ہمت افزائی کی بدولت وہ کامیابیاں بھی میری زندگی کا حصہ بن گئیں جو کم ہمتی کے باعث شاید مقدر نہ ہوسکتیں۔

یہ تو عالم شباب تھا، اس کے بعد جو عرصہ حیات انسان پر آتا ہے اس کو ادھیڑ عمری اور بڑھاپے سے تعبیر کرتے ہیں مگر

☆ شعبہ عربی، اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی لاہور

افسوس کہ مرحوم جواں عمری میں ہی چل بسے، اس سے آگے کی نوبت ہی نہ آئی، والدین واقربا اور دوستوں کو داغ مفارقت دے کر وہ اس دنیا سے چل بسے اور جفا کر گئے جوان کی عادت نہ تھی، غم سے دو چار، لاچار کر دیا جس کا ازالہ ان کی زندگی کا مقصد تھا، مگر جب تقدیر کے ہاتھ کسی کی طرف بڑھتے ہیں تو اس کے آہنی شکنجے سے بچنا کسی کے لیے ممکن نہیں رہتا، وفادار دوست جفا کے مرتکب ہوجاتے ہیں، غم کا ازالہ کرنے والے خود غم واندوہ کا سبب بن جاتے ہیں، لہٰذا اے برادرِ وفا کیش تم سے کوئی گلہ نہیں!

آج ان کے عالم باقی کی طرف رحلت کر جانے کے بعد ان کی یادیں باقی ہیں لیکن وہ وجود جو اپنے جسم وروح کے ساتھ دوستوں کے لیے فکر منداور منفعت بخشی کے لیے کوشاں رہتا تھا اپنی تمام تر صلاحیتوں کے ساتھ زیرِ زمیں اس انجام کا منتظر ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کے لیے خاص کر رکھا ہے، عالم آخرت کے انجام سے تو کوئی باخبر نہیں لیکن اپنے مشاہدات و معاملات کی روشنی میں حسن ظن ہی میرے فکر وخیال کا رہبر ورہنما ہے۔

آخر میں ربّ العالمین کے حضور دعا گو ہوں کہ برادر مخلص سیّد ذوالکفل بخاری سے بر بنائے بشریت جو اخطا و لغزشیں سرزد ہوئی ہوں ان کو اپنی ستاری کی چادر میں ڈھانپ لے اور دوستوں پر مرحوم کے احسانات کے اقرار واعتراف کو اور مرحوم کے حق میں صالح اعمال کی گواہی کو قبولیت عطا فرما کر اپنی شان کے مطابق پورا پورا بدلہ عطا فرمائے، مرحوم نفع رساں طبیعت کے مالک تھے، ربّ کریم ان کو اپنے محبوب، سیّد الرّسل، نبی مجتبیٰ، خاتم الأنبیاء، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان ''خير النّاس من ينفع النّاس'' کے بمصداق احوال قبر سے لے کر یوم آخر تک کی تمام منزلوں پر ہمہ قسم کی خیریت سے نوازے اور پسماندگان کو مرحوم کی منفعت بخشی کی خیریت کے فیوض و برکات سے نہال فرما دے، اے مولیٰ کریم! مرحوم کو وہ اجرِ عظیم عطا فرمایے جو آپ نے اپنے مخلص بندوں کے لیے مقدر فرمایا ہے، ایسے مخلص بندے جو اپنے تمام تر وجود کے ساتھ دینی وملّی افکار میں مشغول رہتے ہیں، نوجوانانِ قوم کی فکری رہنمائی کر کے انفرادی واجتماعی رہبری کا فریضہ انجام دیتے رہتے ہیں اور ہرکس وناکس کے ساتھ ان کے افکار وخیالات شیئرShare کرتے ہیں اور زندگی کے مقصد کی طرف رہنمائی کر جاتے ہیں، بالآخر آپ کے حضور اپنے نامہ اعمال کو داہنے ہاتھ میں پکڑے روشن چہرے کے ساتھ پیش ہوتے ہیں۔ آمین

ہمارا میزبان، اللہ کا مہمان

ڈاکٹر شاہد کاشمیری ☆

موت سے کسی بھی ذی روح کو مفر نہیں یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ موت کے آنے کا افسوس اور زندگی کے چھن جانے کا غم مناسب نہیں مگر ہم رشتوں اور واسطوں کے اچانک ختم ہوجانے، ضرورتوں کی محرومیوں اور چاہتوں کے چھن جانے پر غمناک ہوتے ہیں۔ میں یہ سطور لکھتے ہوئے رنج والم کے شدید احساس میں ہوں کیونکہ اس صوت حال کی کوئی توقع نہ تھی۔ اگر چہ عمر میں خود سے چھوٹوں کا بچھڑ جانے کا داغ ایک عام تجربہ ہے مگر ذہنی طور پر کوئی بھی اس کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ برادرم ذوالکفل بخاری کا اچانک داعیِ اجل کو لبیک کہہ دینا ہم سب کے لیے اندوہناک حیرت کا باعث ہے۔ ان کا شمار ایسے بیدار مغز، فردوس نظر اور پُر بہار لوگوں میں ہوتا ہے جو عام آدمیوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ ایسی شخصیات کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے عام پیمانے بھی استعمال نہیں کیے جاسکتے۔

دیکھ یہ لوگ کچھ الگ سے ہیں
اِن کو میزانِ عام پر مت تول

ہم دونوں میں تفاوتِ عمری کا دورانیہ چودہ برس پر محیط ہے۔ گو میں چودہ برس بڑا ہوں مگر اُن کے جسمانی قد کی طرح اُن کی علمی قامت بھی بہت بلند تھی۔ اس امر کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جو اُن کی صحبت وقربت میں رہا ہو۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ وہ کبھی میرے نظریاتی رویے یا کسی بھی قسم کے فکری، علمی اور ذاتی معاملے میں مجھ سے ناراض ہوئے ہوں یا مجھے اُن کی کوئی بات ناگوارِ خاطر ہوئی ہو۔ انھوں نے میرا ہمیشہ احترام کیا۔ اس کی شاید وجہ یہ تھی کہ میں عمر میں بڑا تھا یا یہ کہ میری قربت بڑے شاہ جی سید ابوذر بخاریؒ اور سید عطاء المحسن شاہؒ صاحب سے زیادہ رہی ہے، مگر میں نے ہمیشہ رشتوں سے زیادہ اُن کے علمی مرتبے، ادبی ذوق اور تقویٰ کی بنا پر ان کی تکریم کی ہے۔ وہ اپنے والدین اور خاندان کا تو چشم و چراغ تھے ہی مگر ہم سب کی آنکھ کا تارا بھی تھے۔

ان کے خاندان سے میری انسیت اپنے والد گرامی مرحوم و مغفور (شہزادہ محمد شفیع) کی وجہ سے تو بہت تھی۔ میرا تعلق امیر شریعتؒ کے خاندان سے اس قدر بڑھ گیا کہ وہ مجھے اپنوں سے زیادہ عزیز تھے۔ ان کے اعلیٰ کردار، حسنِ اخلاق اور اخلاصِ عمل نے مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا۔

میری ان سے جب بھی ملاقات ہوئی میرے لیے فیض بخش ثابت ہوئی کیونکہ موصوف علمی حوالے سے کوئی نہ کوئی نئی بات، نئی سوچ اور لکھنے لکھانے کی نئی سمت اور جہت پر مائل اور قائل کرتے رہے۔ میرا جب بھی ملتان جانا ہوا یا وہ لاہور تشریف لائے ہمارا سلسلہ تکلم رات بھیگنے تک جاری رہا۔ ہماری گفتگو کے موضوعات میں مذہب، ادب، سیاست، معاشرت، معیشت اور بین الاقوامی حالات حاضرہ سبھی کچھ شامل ہوتا۔ چونکہ وہ نہایت شائستہ، ہنس مکھ، خوش پوش اور خوش گفتار تھے اس لیے ہر کوئی ان کی مقناطیسی شخصیت کے حصار میں کھنچا چلا آتا۔ موصوف اپنی گفتگو میں مزاح اور شگفتگی کا ایسا تڑکا لگاتے کہ ہم کلام کے علاوہ محفل میں بیٹھے دیگر افراد کے چہرے بھی متبسم ہوجاتے۔

☆ پرنسپل گورنمنٹ کالج باغبان پورہ، لاہور

وہ خوش کلام ایسا کہ اس کے پاس ہمیں
طویل رہنا بھی لگتا ہے مختصر رہنا

میری ان سے آخری ملاقات ۱۲/ نومبر ۲۰۰۹ء کو ہوئی۔ وہ مجھے اور میرے رفیقِ سفرِ حج ملک محمد یوسف کو ضیافت پر لے جانے کی غرض سے بیت اللہ میں تشریف لائے۔ عشا کے بعد ان کا فون تھا۔ ''نماز سے فارغ ہوکر بابِ عبدالعزیز کے باہر گھڑی کے پاس آجائیں۔'' ہم باہر نکلے تو اُن کی منتظر آنکھوں اور حیا و تقویٰ سے بھرپور متبسم چہرے نے ہمارا استقبال کیا۔ پھر ہمارے ساتھ ہی وہ مسفلہ میں ہوٹل تک پیادہ پا سفر کرتے ہوئے آئے۔ راستے کے سیلابی ہجوم، میرے ذیابیطس کے مرض اور طبع نازک ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے فرمانے لگے کہ جیب میں کوئی نہ کوئی میٹھی چیز ضرور رکھا کریں۔ گھبراہٹ وغیرہ ہو تو فوراً کھالی۔ میرے رفیقِ سفر نے ذوالکفل سے میرے بارے میں کہا کہ شاہد نے یہاں پہنچتے ہی عمرہ کرنے کا حکم دیا اور مجھے تھکا دیا۔ ذوالکفل نے فوراً شکوہ دور کرتے ہوئے کہا کہ ملک صاحب! ہر آدمی کی اپنی کیفیت ہوتی ہے اس لیے درگزر فرمائیں۔

ہوٹل پہنچ کر انھوں نے اپنے ساتھی پروفیسر سجاد صاحب کو گاڑی لانے کا کہا۔ چند لمحوں میں گاڑی آگئی۔ ساڑھے دس بجے کے قریب ہم ذوالکفل کی رہائش گاہ میں تھے۔ دسترخوان بچھنے اور کھانا چننے میں تاخیر نہ کی گئی۔ مرحوم کے دونوں بچے معصوم اٹھکیلیاں کرتے ہوئے ہمارے ساتھ کھانے میں شریک تھے۔ عشائیے کے بعد حالاتِ حاضرہ اور ادب و سیاست پر تادیر گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ مرحوم کا اصرار تھا کہ رات اُن کے ہاں قیام کیا جائے مگر میں نے معذرت چاہی کہ آپ نے صبح یونیورسٹی جانا ہے اور مجھے علی الصباح حرمِ پاک پہنچنا ہے اور میری منزل یہاں کی نسبت ہوٹل سے زیادہ قریب ہے۔ میرے امرِ واقعی کو عذرِ لنگ نہ گردانتے ہوئے موصوف نے نہ صرف اجازت دے دی بلکہ اپنے پانچ سالہ بیٹے کے ہمراہ رات ڈیڑھ بجے ہمیں ہوٹل ڈراپ کرنے کے مکلّف بھی ہوئے۔

''بھائی صاحب کالم نگاری کے لیے اخبار تبدیل کرلیں تو بہتر ہے۔'' واپسی کے سفر میں میرے اِس مشورے پر انھوں نے نہ صرف تائیدی کلمات کہے بلکہ تحسین بھی کی۔ جب ہم گاڑی سے اترنے لگے تو انھوں نے ایک اور خوش خبری سنائی کہ تلہ گنگ سے محمد عمر فاروق صاحب بھی فریضۂ حج کی ادائیگی کے سلسلے میں پہنچنے والے ہیں۔

۱۴/ نومبر کو میں طواف میں مصروف تھا۔ ہر ایک کے ہاتھ میں موبائل تھا اور مختلف لوگوں کی گھنٹیوں کی آوازوں میں مجھے طواف کی یکسوئی کے ٹوٹنے کا احتمال ہوا۔ میں نے فارغ ہوکر فون کیا کہ بھائی ذوالکفل میں تو فقہی مسائل کے حوالے سے کورا ہوں۔ ذرا ایک مسئلہ تو بتادیں۔ انھوں نے جواب دیا مسئلہ تو بتا ہی دیا جائے گا مگر مجھے خوشی اِس بات کی ہے کہ آپ نے اسی بہانے فون تو کیا۔ پھر مسئلے کے حوالے سے فرمانے لگے ''آپ بھی ضروری ہو تو فون سن لیا کریں۔'' اس کے بعد انھوں نے فریضۂ حج کی ادائیگی کے ضمن میں اپنے چچا جان سید مصطفیٰ شاہ صاحب، سید محمد عقیل شاہ صاحب اور چچی صاحبہ کی آمد کے حوالے سے خوشی کا اظہار کیا اور برادرِ عزیز عامر شہزاد کی صلاحیتوں اور خاص طور پر تحفظِ ختم نبوت کے حوالے سے ان کی فکرمندی اور سوچ پر تادیر گفتگو جاری رہی۔ یہ وہ باتیں تھیں جو انھوں نے فون پر میرے گوش گزار کیں۔ مجھے کیا خبر تھی کہ یہ میری اور ان کی آخری ملاقات ہوگی۔

وہ ۱۵/ نومبر ۲۰۰۹ء ڈیڑھ بجے کے قریب یونیورسٹی سے واپسی پر ایک حادثے میں خالقِ حقیقی سے جاملے۔ مگر مجھے اس کی اطلاع بعد از نمازِ عشا ملی تو صحیح معنوں میں آسمان ٹوٹتا ہوا اور زمین پاؤں کے نیچے سے سرکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ ۱۶/ نومبر کی صبح نماز سے قبل میت بیت اللہ کے سامنے رکھ دی گئی۔ میں بیت اللہ کے سامنے اُن کی چارپائی کے ساتھ ہی نمازِ فجر تک بیٹھا رہا۔ بعد نماز فجر ۲۰ لاکھ کے قریب حرم کے نمازیوں نے نماز جنازہ ادا کی اور پھر جلدی سے جنت المعلیٰ میں ام المومنین سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے قدموں کی جانب احاطۂ بنی ہاشم میں بنی ہاشم کا یہ فرزند ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ابدی نیند سوگیا۔ وقت انتہائی سرعت سے گزر رہا ہے۔ اس سانحے کو دو ماہ سے زیادہ عرصہ ہوگیا ہے مگر دل اُن کی مفارقت مانتا ہی نہیں۔ لگتا ہے ابھی فون کروں گا اور وہ محبت آمیز بے تکلفی سے کہیں گے شکر ہے آپ نے کسی بہانے ہمیں فون تو کیا......

ایک آدمی تھا بے مثال

محمد عابد مسعود ڈوگر

سید ذوالکفل بخاری نجیب آدمی تھے۔ بلکہ نجیب الطرفین۔ پہلی ملاقات اُن سے دارِ بنی ہاشم میں ہی ہوئی۔ تب سید عطاء المحسن بخاری حیات تھے۔ بے نظیر کا پہلا دورِ حکومت تھا۔ عورت کی حکمرانی کا مسئلہ اخبارات میں زیرِ بحث تھا۔ ان دنوں مقبول الرحیم مفتی نے روزنامہ جنگ میں عورت کی حکمرانی کے جواز کے حق میں ایک مضمون لکھا جس میں کئی باتیں اُس زمانے میں میرے لیے نئی تھیں۔ میں نے سید عطاء المحسن شاہ صاحب سے اس موضوع پر پوچھنے کی کوشش کی تو انھوں نے چند جملے ہی ارشاد فرمائے تھے کہ سید ذوالکفل بخاری تشریف لے آئے۔ شاہ صاحب نے انھیں دیکھتے ہی فرمایا کہ اِس کی بات سنو اور اسے سمجھاؤ۔ وہ مجھے لے کر نقیبِ ختمِ نبوت کے دفتر میں بیٹھ گئے۔ انھوں نے بھی یہ مضمون دیکھا ہوا تھا۔ کہنے لگے اس میں تو کوئی مشکل بات نہیں۔ چند منٹوں میں مفتی صاحب کے مضمون میں بیان کردہ دلائل کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیے۔ اسی ملاقات سے مرحوم کے ساتھ وہ تعلق شروع ہوا جو اس دنیا میں ان کی موت تک جاری رہا۔ ہمیشہ پڑھتے وقت پیش آنے والی الجھنوں کو سلجھانے کے لیے میرا رابطہ انھی سے ہوتا تھا۔ وہ نہ صرف عقدہ کشائی فرماتے بلکہ اس موضوع کی وضاحت کے لیے کئی دوسری تحریروں کی طرف رہنمائی بھی فرماتے جس سے متعلقہ موضوع پر نہ صرف پوری طرح واقفیت حاصل ہوجاتی بلکہ اس کے یمین و یسار پر بھی نظر ہوتی۔ سننے کی حد تک تو سید عطاء المحسن بخاری کی مجلسوں سے میں نے الحمد للہ بہت کچھ حاصل کیا مگر پڑھنے اور اس پر غور کرنے کی تھوڑی بہت شد بد جو ہے وہ جناب ذوالکفل بخاری کا ہی فیض نظر ہے۔ میں نے کئی موضوعات اور شخصیات کو ان سے سمجھا اور ان کی رہنمائی میں پڑھا۔ تین سال قبل سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر انھوں نے ایک نشست میں دو درجن سے زائد کتب کے نام اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیے۔ وہ تحریر برکت کے طور پر میرے پاس محفوظ ہے۔ منصبِ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تو میں نے امام سید ابومعاویہ ابوذر بخاری اور سید عطاء المحسن بخاری کی تحریروں اور تقریروں سے سمجھا اور اس موضوع سے متعلقہ بحث سید ذوالکفل بخاری سے سمجھی۔ مطالعۂ تاریخِ اسلام کے مروجہ اور مشہور رخ کو چھوڑ کر دوسرا رخ بھی مرحوم نے سمجھایا اور بتایا۔ افسوس اس موضوع پر لکھنے پڑھنے والوں کی اکثریت یا تو یک چشمِ گل ہے یا پھر اپنی اپنی پسند اور دائروں کے Sunglasses چڑھائے ہوئے ہیں۔ ادب کا چسکا ان کی باتیں سن کر ہی پڑا۔ بے شمار شاعروں اور ادیبوں کے نام اور کام سے انھوں نے ہی مجھے واقف بنایا۔ آخری سالوں میں جو ان سے ملاقاتیں رہیں۔ ان میں دو باتیں میں نے ان کو سنائیں تو بار بار اصرار فرماتے رہے کہ ان کو لکھ دو۔ وقت گزر جاتا ہے، باتیں بھول جاتی ہیں۔ یا پوری طرح یاد نہیں رہتی۔ تم انھیں لکھ دو۔ کیا معلوم تھا میں ان کی اس خواہش کو ان کی شخصیت پر لکھی جانے والی ایک نا تمام تحریر میں پوری کروں گا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ ایک رات میں ٹی وی پر ایک ادبی پروگرام دیکھ رہا تھا ایک مشہور شاعر اپنا کلام سنا رہے تھے اور ساتھ ساتھ گفتگو بھی کر رہے تھے دورانِ گفتگو میزبان نے مہمان شاعر سے پوچھا کہ زندگی میں کس شخصیت نے آپ کے دل و دماغ پر غیر معمولی نقشہ چھوڑا؟ شاعر کہنے لگے ایک صاحب ایسے تھے جن سے میری کوئی باضابطہ ملاقات نہیں ہوئی مگر میں ملتان میں اپنے ایک دوست کا مہمان تھا وہ مجھے یہ کہہ کر گھر سے لے آئے کہ آؤ میں تمھیں ملتان کے سب سے خوبصورت اور پڑھے لکھے انسان سے ملواتا

ہوں۔ ہم پہنچے تو ایک جگہ ایک مولوی صاحب قرآن پاک کا درس دے رہے تھے۔ شروع میں تو میں نے اپنے دوست سے کہا کہ کہاں لا کے مجھے تو نے پھنسا دیا۔ تھوڑا سا وقت گزرا تو درس قرآن دینے والے مولوی صاحب کی گفتگو نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ میں نے تقریباً پینتالیس منٹ اُن کی گفتگو سنی۔ گفتگو کیا تھی ایک علم کا دریا جیسے بپھر گیا ہو۔ اور وہ اپنی پوری روانی کے ساتھ مسلسل تیزی سے بہہ رہا ہو۔ میں حیران کہ مولویوں میں بھی ایسی گفتگو کرنے والے لوگ ہیں، زبان ایسی صاف اور بیان ایسا دلنشین کہ دل چاہتا تھا نشست طویل سے طویل ہوتی چلی جائے۔ چہرہ اتنا منور اور بارونق کہ دیکھنے سے دل نہ بھرے اور نہ نگاہ ٹکے۔ ان کی گفتگو ختم ہوئی ہم بغیر ملے واپس چلے آئے۔ اس محفل کا رنگ آج تک میرے دل و دماغ پر نقش ہے میری اک غزل کا شعر شاید ان کے لیے ہی ہوگیا ہے۔ ان کا نام سید عطاء المنعم بخاری تھا۔

جو کوئی اس کے سامنے آ گیا وہی روشنی میں نہا گیا
عجب اس کی ہیبتِ حسن تھی عجب اس کا رنگِ جمال تھا

ذوالکفل کی بات سچ ہوئی آج واقعہ تو یاد ہے۔ مگر شاعر کا نام بھول گیا۔ دوسری بات سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ وہ آخری دفعہ ہندوستان سے پاکستان تشریف لائے تو میں ان دنوں جامعہ اشرفیہ لاہور میں دورہ حدیث کا طالب علم تھا۔ انھوں نے جامعہ اشرفیہ میں اساتذہ اور طلباء کے ساتھ ایک نجی محفل میں سید ابو معاویہ ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو شاندار الفاظ میں خراج عقیدت پیش فرمایا:

> افسوس پاکستان کے علماء نے ان کی شخصیت سے جھگڑے وابستہ رکھے مگر جتنا فائدہ ان کے علم اور اٹھایا جا سکتا تھا کسی نے اس طرف توجہ نہ دی۔ مجھے ان کی شخصیت کے علمی پہلو کی طرف قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے توجہ دلائی تھی۔

یہ دو باتیں تھیں۔ جنھیں لکھنے کا مرحوم بار بار تقاضہ فرماتے رہے۔ مگر افسوس میں اپنی سستی کی بنیاد پر یہ کام ان کی زندگی میں نہ کر سکا گزشتہ سالوں میں وہ چیچہ وطنی تشریف لائے تو گرمیوں کا موسم تھا۔ دوپہر کا کھانا مقامی جماعتی ساتھیوں کے ساتھ میرے ہی غریب خانے پر تناول فرمایا۔ یہ ان کی میرے گھر پہلی اور آخری آمد ثابت ہوئی۔ ان کے آخری سفر پاکستان میں میں ملتان گیا تو وہ کسی کام سے لاہور میں تھے۔ واپسی پر رابطہ کیا اور فرمایا کہ اب آجاؤ، احمد معاویہ بھائی بھی کراچی سے آئے ہوئے تھے ان کے ساتھ جانے کا پروگرام تھا مگر کسی ضروری کام کی وجہ سے ہم نہ جا سکے۔ اگر چلے جاتے تو ان سے یہ آخری ملاقات ہوتی۔ سعودی عرب سے بھی وہ کرم فرمائی کرتے تھے۔ پوچھتے رہتے تھے اور بتاتے رہتے تھے۔ پوچھتے تھے کہ میں کیا کر رہا ہوں اور بتاتے تھے کہ کیا کرنا چاہیے۔ ان کی اچانک موت نے تاریکی اور بڑھا دی ہے۔ کچھ لوگوں کا وجود ہم جیسے کم علموں کے لیے ڈھارس ہوتا ہے۔ مگر افسوس یہ دور ایسے بھلے آدمیوں سے تیزی کے ساتھ خالی ہو رہا ہے بلکہ ہو چکا ہے۔ ان جیسا دوسرا آدمی اب شاید کبھی زندگی میں ملے۔

میں نے جن شخصیات کو نام کے علاوہ کام کے حوالے سے پہچانا ان میں سے زیادہ تر کا تعلق بیسویں صدی عیسوی اور برصغیر پاک و ہند سے ہے۔ مثلاً علامہ محمد انور شاہ کاشمیری، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبید اللہ سندھی، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، چودھری افضل حق، ماسٹر تاج الدین انصاری، ڈاکٹر حمید اللہ اور سید ابو معاویہ ابوذر بخاری رحمہم اللہ۔ پڑھنے والے شاید یہ سمجھیں کہ ان کا میرے ساتھ ہی خصوصی طور پر ایسا معاملہ تھا۔ نہیں میرے علاوہ بھی درجنوں پیاسے ایسے ہیں جنھوں نے اس چشمۂ صافی سے جی بھر کے استفادہ کیا ہے۔ کچھ دن اور جیتے تو کئی تشنہ لبوں کی پیاس بجھاتے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے (آمین)

مفکر و دانش ور

عبدالوہاب نیازی ☆

سید عطاء اللہ بخاریؒ کا نام سامنے آتے ہی ہمیشہ عزم و ہمت اور جرات و استقامت اور راہِ خدا میں استقامت کا ایک ایسا پہاڑ نگاہ میں آجاتا ہے کہ آنکھیں عزت و احترام اور محبت میں جھک جاتی ہیں، اِس لیے کہ عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے برصغیر پاک و ہند کی سرزمین پر اَن مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ اُن کی سحر بیانی کے تذکرے آج بھی دلوں کو گرمی اور حرارت پہنچاتے ہیں......اُن کے گھرانے پر اللہ تعالیٰ نے بہت فضل و کرم کیے ہیں۔

عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے بیٹوں، پوتوں، نواسوں نے بھی اُن کے مشن اور جراتِ اظہار کا سلسلہ رکنے نہیں دیا بلکہ اِس کو مزید بڑھانے کی کوشش کی۔

سید ذوالکفل بخاریؒ بھی ایک ایسے ہی نواسے تھے جس نے اپنے نانا جان کی فکر اور نظریہ کو اپناتے ہوئے تعلیمی دنیا میں اپنا لوہا منوایا اور نونہالانِ پاکستان ہی نہیں نونہالانِ ملتِ اسلامیہ کے بچوں اور نوجوانوں کی فکری و نظریاتی آبیاری کی۔ چالیس سال کی مختصر عمر میں انھوں نے بڑا علمی و فکری سفر طے کیا جسے طے کرنے کے لیے لوگ کئی عشرے لگا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سید ذوالکفل بخاری کو زرخیز ذہن دیا تھا۔ اُن میں یہ خوبی بھی میں خصوصی طور پر نوٹ کی کہ وہ تمام طبقات زندگی میں روابط رکھتے تھے۔ حتیٰ کہ صرف دینی لوگ ہی نہیں بلکہ سیکولر، صحافی اور دانشور بھی ان کا احترام کرتے تھے کیونکہ شاہ صاحب مرحوم ان کے ساتھ رابطہ میں رہتے تھے۔ اپنی ادبی نشستوں میں تمام ادبی حلقوں کے لوگوں کو بلایا کرتے تھے۔ یہ خوبی آج ہمارے معاشرے سے ناپید ہوتی جارہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ذوالکفل بخاری کا نام ذہن کی سکرین پر آتے ہی ایک ایسی معصوم، خوبصورت، نرم و گداز اور الہڑ جوانی سامنے آتی ہے جس نے بڑی مختصر زندگی میں اپنے آپ کو ایک مقصدیت فکری و نظریاتی سوچ سے وابستہ کیا اور پھر ہمیشہ اسی کے ساتھ وابستہ رہے۔

مجھے یاد ہے کہ جب ۱۹۹۶ء میں اسلامی جمعیت طلبہ کی ذمہ داری اور بعد ازاں زکریا یونیورسٹی میں ایم اے جرنلزم میں داخلہ کے دوران برادرم عمران ظہور غازی (سابق ناظم اسلامی جمعیت طلبہ ملتان ڈویژن) اور راقم اکثر و بیشتر جمعۃ المبارک کی نماز دارِ بنی ہاشم میں ادا کرتے اور اس وجہ سے محترم سید عطاء المحسن بخاریؒ، سید محمد کفیل بخاری اور سید ذوالکفل بخاری کے ساتھ نظریاتی اور برادرانہ اور دوستانہ تعلقات قائم ہوئے کہ الحمدللہ آج تک قائم و دائم ہیں۔

☆ سابق سیکرٹری اطلاعات جماعت اسلامی پنجاب

نمازِ جمعہ کے بعد عطاء المحسن بخاریؒ کی محفل جمتی۔ سوالات و جوابات ہوتے، چائے کا دور چلتا۔ ان دنوں سید ذوالکفل بخاری گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی میں انگلش پڑھاتے تھے۔ جمعیت ملتان کے ناظم کی حیثیت سے جب بھی ٹیکنالوجی کالج جانا ہوتا تو ذوالکفل شاہ صاحب سے ملاقات ضروری ہوتی۔ چائے بھی پلاتے اور جمعیت کے کام کی بہتری اور منظّم کرنے کے حوالے سے رہنمائی دیتے۔ مسائل و مشکلات سے نکلنے کے حوالے سے بھی راستے سجھاتے۔ ان کے ساتھ گپ شپ کرتے ہوئے، ڈسکشن کرتے ہوئے بہت مزہ آتا۔ شاہ صاحب بڑی مختصر اور جامع بات کرتے، کشادہ ذہن اور کھلے دل کے مالک تھے۔

ملتان کے قیام کے دوران (۱۹۹۶ء تا ۲۰۰۴ء) درجنوں مرتبہ ملاقاتیں ہوئیں۔ بہت ساری یادیں پردہ سکرین پر آرہی ہیں۔ اور آنکھوں میں نمی اترتی جاتی ہے۔ جب وہ سعودی عرب گئے تو پھر ان سے ملاقات تو نہ ہوسکی البتہ محترم سید کفیل بخاری صاحب اور برادرم محمد الیاس میراں پوری کے ذریعے ان کا حال احوال معلوم ہوتا رہتا۔

اور پھر وہ لمحہ آن پہنچا جس کا سامنا ہر ذی روح نے کرنا ہے۔ سید ذوالکفل بخاریؒ سعودی عرب میں ایک حادثہ میں اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوگئے۔ یقین جانیے اس خبر نے مجھے صدمہ سے ہی نہیں بلکہ سکتہ کی حالت میں پہنچادیا اور بے اختیار رونا آ گیا۔ میرے دل کی دنیا اور آنکھوں کے سمندر میں اُن کے لیے جو محبت کے جذبات تھے وہ آنسوؤں کی صورت میں ٹپک پڑے اور دل و دماغ کی سکرین بن کر ماضی کی یادیں دوڑنے لگیں۔ لیکن انسان کو اپنے رب کی رضا پر راضی رہنا پڑتا ہے۔ اِس لیے کہ رب کے اپنے فیصلے ہیں، اُس کی حکمتیں اور باریکیاں وہی جانتا ہے۔ انسان کی عقل اُن کا احاطہ نہیں کرسکتی۔

میری دعا ہے کہ اللہ رب العالمین سید محمد کفیل بخاری اور ان کے خاندان کو یہ بہت بڑا صدمہ سہنے کی ہمت اور توفیق دے اور ذوالکفل بخاری کے بچوں کو اپنے والد کا حقیقی جانشین بنائے اور اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین۔

سامنے عمر پڑی ہے شبِ تنہائی کی
وہ مجھے چھوڑ گیا شام سے پہلے پہلے

گلوں کی خوشبو والے اُٹھتے جارہے ہیں

حبیب اللہ چیمہ

ہر ذی روح نے دنیا سے واپس جانا ہے نظام قدرت ہے کہ بعض انسان لمبی لمبی عمریں پاتے ہیں جبکہ بعض کم عمری میں بھی سینکڑوں برس کے کام دنوں میں کر کے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں ایسے ہی لوگوں میں ایک نوجوان شخصیت سید محمد ذوالکفل بخاری کی ہے کہ ملتان میں پیدا ہو کر زندگی کے 39 ویں برس میں اس دارِفانی کو چھوڑ کر جنت المعلیٰ (مکہ مکرمہ) پہنچ گئے ہیں۔ راقم الحروف نے جب سے ہوش سنبھالا گھر میں چند باتوں کا تذکرہ کانوں میں پڑا۔ جن میں (۱) حضرت پیرو مرشد مولانا خواجہ خان محمد مدظلہ اور خانقاہ سراجیہ (۲) مجلس تحفظ ختم نبوت (۳) جمعیت علمائے اسلام (۴) مجلس احرار اسلام اور خاندان حضرت امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ کا تذکرہ (۵) تحریک ختم نبوت اور اُسوۂ صحابہ کرام سے محبت اور منکرین ختم نبوت اور منکرینِ صحابہ کرام سے نفرت و بیزاری۔ بچپن میں سیکھی ہوئی یہ باتیں اب مزاج اور زندگی کا حصہ بن چکی ہیں۔ اللہ پاک آئندہ بھی مجھے اور میرے بیٹے سعید احمد کو ان پر کاربند رہنے کی توفیق سے نوازئیں (آمین)

سید محمد ذوالکفل بخاری برصغیر کی آزادی کے سرخیل حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے نواسے، پروفیسر سید محمد وکیل شاہ کے لختِ جگر، سید محمد کفیل بخاری کے چھوٹے بھائی اور مجلس احرارِ اسلام کے امیر مرکزیہ پیر جی سید عطاء المہیمن بخاری کے داماد تھے سید محمد ذوالکفل بخاری نے ایک ایسے علمی، ادبی اور مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی کہ جہاں ہمہ وقت دین و دانش کا چرچا تھا۔ آپ نے اپنے بڑے ماموں جانشین امیر شریعت مولانا سید ابوذر بخاری رحمتہ اللہ علیہ اور مولانا سید عطاء المحسن بخاری رحمتہ اللہ علیہ کی صحبت میں رہ کر علم وادب میں بلند مقام حاصل کرلیا۔ بڑے بڑے لوگ آپ سے تعلق رکھنے اور آپ سے کچھ حاصل کرنے میں اپنی خوش بختی سمجھتے تھے آپ کا روحانی تعلق حضرت مولانا خواجہ خان محمد مدظلہ سے تھا اس ناطے میرے ساتھ اُنس تھا۔ میں نے دیکھا کہ آپ فنافی الشیخ تھے اور اپنے شیخ سے تعلق کو اپنے لیے بڑی سعادت سمجھتے تھے حضرت پیرو مرشد مولانا خواجہ خان محمد مدظلہ العالی بھی آپ سے خصوصی شفقت فرماتے تھے آپکی وفات کے تقریباً ایک ماہ بعد راقم الحروف خانقاہ سراجیہ حاضر ہوا تو راقم الحروف نے حضرت پیرو مرشد کی خدمت میں سید محمد ذوالکفل بخاری کی شہادت کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا کہ ہاں مجھے اطلاع مل گئی ہے اور اسکے بعد آپکی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور ہمارے بھی ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے کافی دیر تک یہی کیفیت جاری رہی اور اسکے بعد بھی ہم حضرت صاحب کی خدمت میں کچھ عرض نہ کر سکے جبکہ حضرت صاحب بھی غمگین اور افسردہ ہی رہے۔

خانوادہ امیر شریعت کے ساتھ حضرت پیرو مرشد کو خصوصی لگاؤ اور محبت ہے جس کا مشاہدہ راقم الحروف نے متعدد بار کیا ہے کہ آپ جب بھی چیچہ وطنی تشریف لاتے تو ہمارے غریب خانہ پر عشاء کے بعد نجی مجالس میں برادر مکرم حاجی عبداللطیف

خالد چیمہ سے مجلس احرارِ اسلام اور خاندان امیر شریعت کے بارے میں گفتگو کے ساتھ ساتھ بھر پور انداز میں پچھلے واقعات کا تذکرہ فرماتے راقم الحروف نے ۱۹۹۱ء میں طبیہ کالج ملتان میں داخلہ لیا تو دفتر عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت اور دار بنی ہاشم اکثر جانا ہوتا کبھی کبھی کچہری روڈ پر حضرت سید ابو معاویہ ابو ذر بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے ہاں بھی حاضری ہوتی رہتی تھی۔ ہم عمر ہونے کے ناطے ذوالکفل شاہ جی سے زیادہ بے تکلفی ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ نوجوان تو ابھی سے بہت بلند پرواز پر محوسفر ہے اسکے بعد جب ذوالکفل شاہ جی نے حضرت پیرومرشد کی بیعت کی تو یہ تعلق بہت ہی گہرا ہوتا گیا اسی دوران بعض مشاہدات و واقعات کی بنا پر میں نے ذوالکفل شاہ جی سے بے تکلفی ختم کر کے ادب و احترام شروع کر دیا لیکن آپ اسی بے تکلفی سے پیش آتے رہے۔ سعودی عرب میں ملازمت کی خواہش کے پس پردہ آپکے کئی مقاصد تھے جن میں حرمین شریفین کی قربت اور حاضری سرفہرست تھی۔ ۲۰۰۷ء میں جب میں اپنے والدِ محترم حضرت حافظ عبدالرشید رحمتہ اللہ علیہ (خلیفہ مجاز حضرت خواجہ خان محمد مدظلہ العالی) کے ساتھ ادائیگی عمرہ کے لیے سعودی عرب گیا ادائیگی عمرہ کے بعد مدینہ منورہ حاضر ہوئے تو یکم جون جمعتہ المبارک کو میرے والد اس دنیائے فانی سے کوچ فرما کر جنت البقیع چلے گئے تو سید محمد ذوالکفل بخاری سے رابطہ ہوا۔ کہنے لگے کہ اپنی آمد کا پروگرام پہلے بتایا ہوتا تو میں بھی کچھ دنوں کے لیے اُملج سے حرمین شریف آجاتا۔

اپریل ۲۰۰۹ء میں حرمین شریفین کے سفر میں ذوالکفل بخاری جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ تعینات تھے ملاقات پر بہت ہی خوش ہوئے۔ راقم الحروف کے سعودی عرب سے واپسی سے پہلے ذوالکفل شاہ جی کے ساتھ جدہ میں ایک تفصیلی ملاقات بھی طے تھی کہ اچانک میرا موبائل فون گم ہوجانے کی وجہ سے رابطہ منقطع ہو گیا اور واپسی سے ایک دن پہلے شاہ جی کا نمبر تلاش کر کے رابطہ کیا تو فرمانے لگے کہ میں بھی پریشان تھا اب میں کوشش کرتا ہوں کہ رات کو ملاقات ہوجائے لیکن افسوس کہ ملاقات نہ ہوسکی۔ راقم الحروف اور میرے رفیق سفر شیخ تنویر احمد کے ساتھ ساتھ ہمارے جدہ میں میزبان حافظ محمد رفیق بھی اس خصوصی نشست کے ملتوی ہونے پر خاصے افسردہ ہوئے کیا معلوم تھا کہ اب ملاقات ہی نہ ہوسکے گی۔ لندن سے الحاج عبدالرحمان باوا بھی آئے ہوئے تھے۔ ان سے بھی ہم سب کا رابطہ رہا مدینہ منورہ میں انتہائی محترم و مکرم ڈاکٹر الیاس عبدالغنی صاحب کے ہاں حاضری ہوئی تو وہ بھی سید محمد ذوالکفل بخاری کے اس کم عمری میں علمی ادبی تاریخی اور تحقیقی کام پر بہت زیادہ متاثر تھے۔ درحقیقت سید محمد ذوالکفل بخاری اپنے نانا حضرت امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے نقش قدم پر چل رہے تھے۔ حالیہ رمضان المبارک پاکستان گزار کر واپس مکہ مکرمہ چلے گئے۔ تقریباً ایک ماہ بعد ان کی اہلیہ اور دو معصوم بچے بھی اپنے باپ کے پاس چلے گئے تھے کہ ۱۵/ نومبر بروز اتوار جامعہ القریٰ سے واپس مکہ مکرمہ آرہے تھے کہ ٹریفک حادثہ میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اُسی روز نماز مغرب کے بعد ہم لوگ مطب پر بیٹھے تھے کہ بھائی عبداللطیف خالد چیمہ کو فون پر کے حادثے کی اطلاع ملی تو ہم سب سکتے میں آگئے کہ انا للہ وانا الیہ راجعون کے سوا منہ سے کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ اگلے روز ہم لوگ برادر مکرم حاجی عبداللطیف خالد چیمہ کی معیت میں ملتان تعزیت کے لیے حاضر ہوئے تو دارِ بنی ہاشم میں حضرت پیر جی عطاء المہیمن بخاری، پروفیسر وکیل شاہ صاحب اور سید محمد کفیل بخاری کو دیکھتے ہی آنسوؤں کا سیلاب رواں ہوگیا۔ حضرت پیر جی تو بلند حوصلے کے ساتھ سب کو دلاسہ دے رہے تھے لیکن سید محمد کفیل بخاری سے ملے تو ایسا لگا یہ آج اپنے باپ سے زیادہ بوڑھے ہوچکے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے کہ آپ کے ابا جی کی طرح ذوالکفل بھی اپنے ارادوں میں کامیاب ہوگئے اور آنسوؤں سے بھری انکی آنکھیں چاروں طرف گھوم کر شائد ذوالکفل بھائی کو تلاش کر رہی تھیں لیکن انھیں یقیناً واپس نہیں آنا ہے۔ وہ تو وہاں چلے گئے جہاں کے لیے ہر مسلمان کا دل تڑپ اُٹھتا ہے۔

خلاصۂ معدنِ علم

مولانا محمد ازہر

موت اٹل حقیقت ہے اور ہر ذی روح کو ایک نہ ایک دن اس دنیا کو چھوڑنا ہے۔ گدائے بوریا نشین سے لے کر شاہانِ تخت نشین تک کوئی نہیں جو دستِ اجل سے بچا ہو۔ موت کے فرشتے کی دستک کو کوئی ڈاکٹر، طبیب، پیر، فقیر، بزرگ حتیٰ کہ نبی و رسول بھی نہیں ٹال سکتے۔ نبی الانبیاء حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک نواسی کا انتقال اِس حال میں ہوا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک ہاتھوں میں تھی اور روح قفسِ عنصری سے پرواز کر رہی تھی۔

موت کے وقت کی طرح اِس کی جگہ بھی کسی کو معلوم نہیں۔ **وماتدری نفس بأی ارض تموت۔** تاہم فطرت محبوب بندوں کے لیے محبوب و مبارک لمحات و مقامات کا انتخاب خود کرتی ہے۔

برادرِ عزیز سید ذوالکفل بخاری کی جدائی کی خبر مکہ مکرمہ کی مقدس سرزمین سے آئی تو دل سے بے ساختہ نکلا:

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

اور اِس کے ساتھ ہی وہ تمام مجلسیں اور محبتیں یاد آ گئیں جو ذوالکفل سے وابستہ تھیں، ابھی چند روز قبل شوال المکرّم میں وہ اپنی نئی جائے تقرر جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ کے لیے نہایت مسرت کے ساتھ روانہ ہوئے تھے۔ اس سے پہلے وہ تبوک (سعودی عرب) کے نواحی شہر املج میں شعبہ تدریس سے وابستہ تھے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ انھیں مکہ مکرمہ میں قیام نصیب ہوتا کہ وہ معاش کے ساتھ ساتھ حرم شریف کے فیوض و برکات سے بھی مالا مال ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ تمنا پوری کی اور آج سے چھ ماہ قبل ان کا مکہ مکرمہ میں ام القریٰ یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ بیت اللہ کے ساتھ ان کی والہانہ شیفتگی رب البیت کو ایسی پسند آئی کہ انھیں اپنے پاس ہی بلا لیا۔

برادرِ عزیز سید ذوالکفل بخاری کو حق تعالیٰ شانہ نے متنوع صفات و کمالات اور خوبیوں سے نوازا تھا۔ وہ خانوادۂ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے گلِ سرسبد تھے۔ ان کے والدین، اعزہ اور احباب و رفقاء کو اُن سے بڑی توقعات تھیں کہ یہ نوجوان اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے اسلاف کی یاد تازہ کریں گے۔ مگر افسوس کہ

خُوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

سید ذوالکفل بخاری کے والد محترم پروفیسر سید محمد وکیل بخاری ایک طویل عرصہ تک جامعہ خیر المدارس ملتان میں کرایہ کے مکان میں رہائش پذیر رہے۔ مرحوم سید ذوالکفل بخاری ان دنوں نوعمر تھے اور غالبًا ہائی سکول میں زیر تعلیم تھے۔ اپنے معمولات سے فارغ ہو کر وہ اکثر دفتر الخیر آ جاتے اور اخبارات کے علاوہ دینی جرائد و رسائل کا مطالعہ کرتے رہتے۔ اس دوران ان کی گفتگو کا سلسلہ بھی جاری رہتا جو بالعموم دینی موضوعات، علم و ادب، سیاسیات یا دینی جرائد میں شائع ہونے والے بعض مضامین کے حوالے سے ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنی نوعمری کے باوجود ہر موضوع پر اپنی عمر سے کہیں زیادہ بہتر اور علمی گفتگو کرتے۔ انھیں اکابر علمائے دیوبند کے مزاج، مسلک، دینی خدمات اور علمی تحقیقات کے متعلق قابل رشک حد تک معلومات

تھیں۔انھوں نے اپنے نانا امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا زمانہ تو نہیں پایا مگر اپنے بڑے ماموں جانشین امیر شریعت سید ابومعاویہ ابوذر بخاری سے انھیں اکتسابِ فیض کا خوب موقع ملا۔ سید ابوذر بخاری شعروادب، تصنیف وتالیف، وعظ وخطابت، درس وتدریس، سلوک وتصوف اور تعلیم وتربیت کے شعبوں میں مقامِ اختصاص وامتیاز پر فائز تھے۔ مذہب، تاریخ، ملک اور سیاست کے حوالے سے مولانا سید ابوذر بخاری کا مطالعہ قابل رشک اور حیرت انگیز تھا۔

برادرِ عزیز سید ذوالکفل بخاری کو زمانۂ طفولیت سے عہدِ شباب تک ان سے خوب خوب فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ اصل علم وہ ہے جو اہل علم کی صحبت سے حاصل ہوتا ہے اور سینوں سے سینوں میں منتقل ہوتا ہے، اس اصول کے تحت سید ذوالکفل بخاری ضابطے کے عالم نہ ہونے کے باوجود حقیقتاً ''عالم'' تھے۔ ادب، مذہب، فلسفہ، شاعری، تنقید اور سیاست پر گفتگو کرتے ہوئے کبھی احساس نہیں ہوا کہ ذوالکفل بخاری کی معلومات فلاں موضوع پر سطحی یا سرسری ہیں۔

راقم الحروف سے مرحوم کا تعلق برادرانہ، عزیزانہ، دوستانہ، محبانہ اور بے تکلفانہ تھا۔ وہ جب سے تدریس کے سلسلہ میں سعودی عرب گئے، پاکستان آمد کے موقع پر اطلاع دیتے۔ اگر مجھے حاضری میں دیر ہو جاتی تو خود آجاتے۔ مولانا نجم الحق (ناظم اعلیٰ خیر المدارس) اور مولانا عبدالمنان (خازن خیر المدارس) بھی تشریف لے آتے۔ اس مجلس کے روحِ رواں اور میرِ محفل برادر عزیز سید ذوالکفل بخاری ہوتے۔ ان مجلسوں کی یاد سے اب دل میں ہوک اٹھتی ہے اور یہ دعا کہ حق تعالیٰ شانہ مرحوم کو جنت میں درجات عالیہ نصیب فرمائیں۔

ان کی رحلت کا صدمہ تازیست رہے گا لیکن مکہ مکرمہ سے ان کے سفرِ آخرت کی جو تفصیلات ملی ہیں انھوں نے زخم پر گویا مرہم رکھ دیا ہے۔ مرحوم سید ذوالکفل بخاری کی نماز جنازہ حرم شریف میں لاکھوں مسلمانوں نے ادا کی اور انھیں جنۃ المعلیٰ کی مقدس خاک اور سیدہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے قدمین شریفین میں آسودۂ خاک ہونے کی سعادت نصیب ہوئی۔

اُنھیں موت آئی تو سرزمینِ حجاز پر
جنازہ پڑھا گیا مسجدِ حرام میں

مرحوم کی وفات ٹریفک حادثہ میں ہوئی، جب وہ یونیورسٹی سے تدریس کے بعد گھر آ رہے تھے۔ سر میں شدید چوٹ لگنے کے باوجود وہ آخری لمحے تک ہوش وحواس میں رہے اور شہادت کی انگلی آسمان کی طرف اٹھا کر بآواز بلند کلمہ شہادت پڑھتے رہے۔ جن افراد نے یہ منظر دیکھا ان کی زبان سے بے ساختہ نکلا کہ یہ نوجوان کسی شریف اور نیک خاندان کا فرزند معلوم ہوتا ہے۔ ہوش وحواس کے عالم میں اس جہانِ رنگ و بو میں برادر عزیز سید ذوالکفل بخاری کا آخری عمل حق تعالیٰ شانہ کی وحدانیت اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی تھا۔ وہ اپنے اعمالِ صالحہ کے بہت بڑے ذخیرہ کے علاوہ اس بشارتِ نبوی کے ساتھ بارگاہ خداوندی میں حاضر ہوں گے کہ **من کان آخر کلامہ لا الہ الا اللہ دخل الجنۃ** کہ جس مسلمان کا آخری کلام **لا الہ الا اللہ** ہوگا وہ جنت میں داخل ہوگا۔

دعا ہے کہ اللہ رب العزت برادرم سید ذوالکفل بخاری کی تمام حسنات کو قبول فرماتے ہوئے اُنھیں اعلیٰ علیین میں اپنا قربِ خاص نصیب فرمائیں۔ اُن کے والدین، بیوی، بچے، اعزہ اور احباب ورفقاء جو ان کی رحلت کے صدمے سے ابھی تک سوگوار واشکبار ہیں، کو صبر جمیل عطا فرمائیں۔ بالخصوص ان کے والد محترم سید محمد وکیل شاہ بخاری اور والدہ محترمہ اس ضعیف العمری میں صالح وسعادت مند بیٹے کی جدائی پر جس صدمے سے دوچار ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کا اجر جزیل عطا فرمائیں۔ علاوہ ازیں پیر جی سید حافظ عطاء المہیمن بخاری (ماموں وسسر)، برادرِ محترم سید محمد کفیل بخاری (بڑے بھائی)، سید محمد معاویہ بخاری اور دیگر اعزہ ورفقاء بھی تعزیت کے مستحق ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ مرحوم کی اہلیہ اور دو معصوم بیٹوں کی خصوصی کفالت فرمائیں اور دنیا و آخرت میں اِس صدمہ کا بدلہ اپنی رضا اور عنایات کی صورت میں نصیب فرمائیں۔ آمین۔

(ماہنامہ الخیر ملتان، محرم الحرام ۱۴۳۱ھ؛ روزنامہ اسلام ۲۳/نومبر ۲۰۰۹ء)

خانوادۂ بخاری کا تابندہ گوہر

مولانا حبیب الرحمٰن ہاشمی

لو خانوادۂ بخاریؒ کا چشم و چراغ بلکہ روشن چراغ جس نے مہِ کامل بننا تھا، داغِ مفارقت دے گیا، اِک دِیا اور بجھا اور بڑھی تاریکی......ع خوش درخشید و لے دولتِ مستعجل بود۔

الیاس میراں پوری نے کپکپاتی آواز میں سید ذوالکفل بخاری کی مرگِ ناگہانی کی خبر دی۔ دیر تک تاسف وحزن میں دل ڈوبا رہا۔ پھر قدرے اطمینان ہوا کہ سید کو (جو نجیب ولبیب ہی نہیں بلکہ حبیب بھی تھا) خاکِ حرم نے اپنی آغوش میں لے لیا اور وہ نانی اماں کی گود یا قدموں میں جا سویا۔ اب صبحِ قیامت ان صحابہ، صلحاء وشہداء کے جھرمٹ میں اُٹھیں گے جو وہاں آسودۂ خاک ہیں۔ یہ نصیب! اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے۔ اِسے کہتے ہیں پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

شب بھر نیند نہیں آئی، ان کی یادوں کی بارات ہجوم کیے رہی، ان حسین اور ذہین چہرہ نگاہوں میں گھومتا رہا میری اشک بار آنکھیں اسے چومتی رہیں۔ گفتگو بڑی شاندار اور جاندار کرتے تھے، گھنٹوں مسلسل کسی بھی موضوع پر بولتے چلے جاتے، فصاحت و بلاغت شیرِ مادر کا اثر تھا۔ زبان کی طلاقت کیساتھ، چشم و ابرو، ہاتھوں کی حرکات سے سامعین کو مسحور کر لیتے بلبل کی طرح چہکتے، شاخِ گل کی طرح لچکتے۔

پکے دیوبندی بلکہ ''احراری'' مگر تعصب یا تنگ نظری، عبوست و یبوست علمی پندار، ہمہ دانی کا زعم، خاندانی نخوت و غرور اور صاحبزادگی کے روگ سے کوسوں دور بلکہ نفور تھے۔ شوخی وظرافت علمی تفوق کے باوجود، عجز وانکسار کا پیکرِ جمیل تھے۔

کتاب دوست، علم پرور، دوست نواز بلکہ دشمن نواز تھے۔ ہمدرد غمگسار بلکہ سارے جہاں کا درد اپنے جگر میں رکھتے۔ دوست بنانا دوستی نبھانا اور دوستوں کی دلچسپیوں اور مرغوبات کا لحاظ خیال شاہ جی فرض سمجھتے اور قرض کی طرح اس کو چکاتے۔ شاہ جی کو دل گداز، چشم پاک بین و پاک باز اور عجز و نیاز حضرتِ حق سے عنایت ہوا حلقۂ یاراں میں ابریشم کی طرح نرم تھے۔ کون تھا جو ان کی زلف گرہ گیر کا اسیر اور ان کی دل ربا اداؤں پہ فریفتہ نہ تھا۔ اب کہاں سے لاؤں تجھ سا کہیں جسے

مشہور ہے کہ حضرت شاہ جیؒ جب چاہتے اپنے سامعین کو رلا دیتے جب چاہتے ہنسا دیتے مگر ہمارا سید رلاتا نہیں ہنساتا تھا۔ ان کے مخزن میں لطائف وظرائف کا انبار تھا۔ جدت اور تنوع برمحل بھی ہوتے۔ ان کے ترکش میں طنز و تعریض کے تیر بھی رہتے تھے جو مناسب موقعوں پر استعمال کرتے اور خوب کرتے۔ حاضر دماغ حاضر جواب۔

دوستوں کی ہر طرح کی مدد کرتے، مالی بھی اور جانی بھی۔ سفارش کرنے میں بخل نہیں تھا۔ کہا کرتے سفارش تعلقات کی زکوٰۃ ہے قاریوں اور لکھاریوں کی مدد کرتے۔ کہاں سے کیا مواد دستیاب ہوسکتا ہے ''تابعدار جن'' کی طرح پلک

جھکتے شاہ جی وہ مواد یا کتاب مہیا فرما دیتے۔ اس علمی تعاون یا قلمی مدد پر ایک عجیب کیف و سرور ان کے چہرے پر جھلکتا بلکہ چھلکتا مگر اس احسان کو کبھی زبان پر نہ لاتے بلکہ احسان مندی کے ذکر سے محجوب ہوتے۔

مطالعہ وسیع، عمیق، متنوع اور سریع تھا یوں لگتا کتاب پڑھتے نہیں سونگھتے ہیں۔ کالم لکھے اور خوب لکھے تقاریظ اور تبصرے بھی جاندار ہوتے، لگی لپٹی نہ رکھتے کتاب یا مضمون کا جو درجہ ہوتا وہی اس کو ملتا۔

تجدُّد مآب، اباحیت زدہ، دشمنانِ دین وطن کی طرف سے جب کلوخ اندازی ہوتی تو شاہ جی کا قلم شمشیر بے نیام ہو جاتا۔ حریف کو لاجواب کرنا بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ کیسا ہی سورما ہوتا، شاہ جی اڑنگے میں لاکر یوں پٹخنی دیتے کہ حریف چاروں شانے چت ہوتا۔ علم، استدلال، زورِ قوت، برجستگی، بے ساختگی، روانی جولانی اور طنز و ظرافت ان کی تحریر کا خاصہ۔ مبدءِ فیض سے شعر و ادب کا پاکیزہ ذوق بھی ملا تھا۔ شعر کہتے تھے مگر آزاد۔ شاید وہ اپنے فکرِ آزاد کو بحور میں مقید نہیں کرنا چاہتے تھے۔

اساتذہ کے سیکڑوں اشعار نوکِ زبان تھے۔ موقع محل کی مناسبت سے یوں جڑتے جیسے انگشتری میں نگینہ۔ پھر اپنی ذہین و چمکدار نگاہیں مخاطب پر گاڑ دیتے اور داد طلب ہوتے۔ ان کی معیت میں دسیوں سفر ہوئے۔ اس بار خانقاہ سراجیہ ہم دونوں گئے تمام راستے مختلف موضوعات پر بات ہوتی رہی، وہاں مخدوم زادہ گرامی مولانا عزیز احمد سے طویل گفتگو ہوئی، خوب مجلس جمی۔ یہاں یہ بلبلِ ہزار داستان طوطی شیریں مقال احتیاط و احترام کے دائرے میں محصور ہو جاتا۔ صاحبزادگان بھی بہت احترام سے پیش آتے، بڑی قدر فرماتے۔ حضرت والا کی مجلس میں تمام تر توجہ سمیٹ لیتے، حضرت کی نگاہِ التفات شاہ جی پر پڑتی اور خوب پڑتی، حاضرین کو رشک آتا۔ اس آخری سفر میں مجھ سے فرمایا۔ ''آپ سے دعاؤں کی درخواست ہے'' میں نے کہا شاہ جی کمال کرتے ہیں کیا پدی کی پدی کا شوربا! فرمانے لگے۔ ''میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کو ہمارے خاندان سے تعلق ہے۔ صبیح الحسن پروان چڑھے اور علمی کام مضبوط بنیادوں پر کرلے۔ دار بنی ہاشم میں ایک شاندار منتخب و مرتب لائبریری قائم ہو۔ میں نے عرض کیا اللہ کرے کہ صبیح الحسن آپ کی توقعات سے کہیں بڑھ کر کامران و فیض رساں بنے۔ آمین۔

خانوادۂ امیر شریعت کی نیک اور سچی یادگار بھی ہماری نظروں سے روپوش ہوگئی۔ سدا رہے نام اللہ کا ہم فرقت کے ماروں کا دل سوگوار ہے۔ آنکھ اشک بار ہے مگر زباں وہی بولے گی جس کی تعلیم اللہ کے آخری نبی نے دی:

وللّٰہ ما اخذ ولہ مااعطیٰ وکل شیٔ عندہ باجل مسمی

میرا کوتاہ قلم ان کی صفات و کمالات اور خدمات کا احاطہ نہ کرسکا بلکہ کچھ بھی بیان نہ کرسکا۔ البتہ میں نے تعمیل حکم میں کوتاہی نہ کی یوں کفیل شاہ جی اور مرحوم کی روح سے شرمندہ ہونے سے بچ گیا۔

دارِ بنی ہاشم سے احاطۂ بنی ہاشم تک

محمد احمد حافظ

باور نہیں آتا کہ وہ جو خزاں رُت میں بھی بہاروں کے لب و لہجے میں بات کرتا تھا، یوں اچانک ہمیں چھوڑ کر چل دے گا۔ دماغ نے تو تسلیم کر لیا ہے، مگر دل کا کیا کیجیے کہ وہ ابھی تک مان کر نہیں دے رہا کہ بنی ہاشم کا وہ لعلِ جہاں تاب اس دارِ فنا کو چھوڑ کر دارِ بقا کو سدھار گیا ہے۔ دنیا اُسے سید ذوالکفل بخاری کے نام سے جانتی تھی۔ والدین کا انتالیس سال کی عمر میں بھی ''مُنّا'' تھا۔ گھریلو ماحول میں اُسے ''مُنّے شاہ'' کے نام سے پکارا جاتا۔ ہمارے عزیز دوست اور بھائی عابد مسعود نے فون پر اُن کے انتقال کی اطلاع دی تو جانے کتنی دیر تک سکتے کی کیفیت رہی۔ بہت کوشش کی کہ ہمت پکڑ کے جناب سید کفیل بخاری صاحب سے تعزیت کروں، مگر ناکام رہا۔ اور جو کی بھی تو صدمے کی حالت میں الفاظ نے زبان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ تعزیت تو تسلی دینے اور اللہ کی رضا میں راضی رہنے کے لیے کی جاتی ہے۔ اور یہاں کیفیت یہ کہ خود تسلی کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

ظالم نے موت کا کس خوبصورتی سے استقبال کیا، بس یہ سن کر دل کو جیسے قرار آ گیا، حوصلہ مل گیا اور اُس کے وصول بحق ہونے کا یقین ہو گیا۔ سید ذوالکفل بخاری (اللہ اُن کی قبر پر کھربوں رحمتیں تا قیامت برسائے) پچھلے سات آٹھ سال سے بسلسلۂ تدریس سعودیہ میں مقیم تھے۔ پہلے پہل منطقۂ تبوک کے شہر املج میں قیام تھا اور وہاں ننھے مُنّے عربی بچوں کو انگریزی پڑھاتے رہے۔ قریبًا ایک سال قبل ہی ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ میں اُن کا تقرر ہوا تھا۔ گزشتہ اتوار کی سہ پہر یونیورسٹی سے اپنی گاڑی میں واپس آ رہے تھے کہ مخالف سائیڈ سے آنے والی گاڑی نے زوردار ٹکر ماردی۔ اُن کی گاڑی قلابازیاں کھاتی ہوئی دور جا کر رکی۔ خوفناک حادثہ تھا، اور سوار کا بچ جانا ناممکن نظر آتا تھا۔ موقع پر موجود شُرطوں نے آخری لمحات کی جو تفصیل بتائی وہ حیران کن تو ہے ہی، ایمان افروز بھی ہے۔ اُنھوں نے بتایا کہ گاڑی قلابازیاں کھا کر جوں ہی رکی، اللہ کے اِس بندے نے فوراً بآوازِ بلند کلمۂ شہادت پڑھا، انگشتِ شہادت آسمان کی طرف بلند کی اور یہ تب ہی ڈھلکی جب روح قفسِ عنصری کو چھوڑ کر بلندیوں اور رفعتوں کی طرف پرواز کر گئی۔ یہ بھی مرنے کی خوب صورت ادا ٹھہری!

ایامِ حج کی وجہ سے حجاج کا خوب رش تھا اور اسی رش کی وجہ سے بعض اوقات تغسیل و تکفین میں دو تین دن تک کی تاخیر بھی ہو جاتی ہے۔ مگر اللہ پاک کا کرم ہوا کہ اگلے دن پیر کی صبح حرم میں نمازِ جنازہ ادا کی گئی جس میں پوری دنیا سے آئے ہوئے لاکھوں حجاج کرام نے شرکت کی۔ یوں اُن کی نمازِ جنازہ میں دنیا کے ہر خطے کی نمائندگی ہو گئی۔ اور اللہ کا کرم بالائے کرم یہ ہوا کہ جنت المعلیٰ کے احاطۂ بنی ہاشم میں تدفین عمل میں آئی۔ یہاں بھی سید ذوالکفل بخاری کی خوش بختی کام آئی کہ جنت المعلیٰ کے اِس حصے میں تدفین پر پابندی ہے، مگر اُن کا نصیب کس قدر بلند تھا کہ اِس پابندی کے باوجود حضرت ام المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے قدموں میں جگہ مل گئی۔ یوں لعلِ بنی ہاشم دارِ بنی ہاشم سے طویل سفر کے بعد جنت المعلیٰ کے احاطۂ بنی ہاشم میں آسودۂ خاک ہو گیا۔ یہ سب کیسے ہوا؟ کیوں ہوا...... تو اِس کا ایک ہی جواب سمجھ میں آتا ہے کہ جسے اللہ تعالیٰ خود وصول

کرنے والے ہوں، اُس کے لیے سعادت وخوش بختی کے دروازے یوں ہی کھلا کرتے ہیں۔

راقم اُن کے انتقال کی خبر سن کر بہت دیر تک یادوں کے محل میں کھویا رہا۔ ۱۹۹۱ء میں جب خیرالمدارس میں بغرضِ تعلیم داخلہ لیا تو جمعہ کی جمعہ دارِ بنی ہاشم میں حاضری ہونے لگی۔ حضرت پیر جی عطاء المہیمن بخاری اور جناب سید کفیل بخاری صاحب سے پہلے سے شناسائی تھی، اِنہی ہفتہ واری ملاقاتوں میں ذوالکفل بخاری صاحب سے بھی شناسائی ہوگئی۔ پہلے قدرے تکلف رہا مگر ہم عمری نے یہ فاصلے پاٹ دیے۔ تب حضرت امیرِ شریعت رحمہ اللہ کے بڑے فرزند گرامی سید ابومعاویہ ابوذر بخاری رحمہ اللہ اور حضرت سید عطاء الحسن بخاری رحمہ اللہ حیات تھے۔ راقم کی کوشش ہوتی تھی مدرسے سے فرصت ہو تو اِن حضرات کی مجلسوں میں حاضری دی جائے۔ حقیقت ہے کہ یہ مجلسیں ''دارِمعاویہ'' کی ہوں یا ''دارِبنی ہاشم'' کی، بہت یادگار ہوتی تھیں۔ علم، ادب، تحقیق، تاریخ، تنقید، سیاسیات، سماجیات، اخلاقیات، غرض کیا کچھ نہ ہوتا اِن مجلسوں میں۔ اب جس بندے کی آنکھ ہی اِس ماحول میں کھلی ہو وہ خود کیا کچھ نہ ہوگا۔ معروف معنوں میں دیکھا جائے تو ذوالکفل بخاری کوئی مستند مولوی نہ تھے، کالج یونیورسٹی میں پڑھا، آئندہ زندگی بھی اسی سے وابستہ رہی۔ مگر آپ ذرا اُن کے قریب بیٹھیے اور ان کی ذات کی پرتیں کھولنے کی کوشش کیجیے تو ایک نیا جہان دریافت ہوگا۔ علم وادب کا کون سا موضوع تھا جس میں کبھی اُن کی طبیعت بند رہی ہو۔ اللہ پاک نے اُنھیں ذہانت وفطانت، نکتہ رسی اور معاملہ فہمی سے خوب نوازا تھا۔ بہت سے معاملات میں اُن کی رائے حرفِ آخر سمجھی جاتی۔ یوں اگر اُن کی شخصیت کا پورا خاکہ اور تانا بانا سمجھنا ہو تو آپ مشاہداتِ قادیان میں حضرت سید ابومعاویہ ابوذر بخاری رحمہ اللہ کے مقدمے کا خاص وہ حصہ پڑھ لیجیے جو اُن کی ذات سے متعلق ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

> ......سید محمد ذوالکفل حسینی بخاری سلمۂ الباری تمام بھائی بہنوں کے مقابلہ میں اپنی درویشانہ سادہ شکل وصورت اور باوجود بہ ظاہر بالکل غیر ذہانت آمیز وضع قطع کے ابتدائی چند سالہ زندگی کے سوا چشمِ بددور کم از کم میرے لیے تو بالکل اور اپنے والدین اور بھائی بہنوں کے لیے بھی کافی حد تک غیر متوقع اور حیرت انگیز طور پر بے حد ذہین وفطین، بیدار دل و دماغ اور غور وفکر کی خوگر طبیعت کے ساتھ ہی بڑے ہی حوصلہ افزا اور مستقبل میں بہت سی علمی اور دینی ترقیات کے ضامن اندازِ تعلیم وتقریر وتحریر کے ساتھ اُبھرا ہے۔......

حضرت نے اُن کے متعلق جن توقعات اور تمناؤں کا اظہار کیا تھا کچھ ایسا ہی خیال دوست احباب کا بھی تھا۔ اُنھوں نے جس تیزی کے ساتھ تعلیمی اور علمی مدارج طے کیے وہ ایک علیحدہ موضوع ہے۔ وہ ملتان ہی میں رہ کر اپنا کیریئر بنانا چاہتے تو کچھ ایسی رکاوٹ نہ تھی۔ تدریس کی لائن میں وہ بہت سے کہنہ مشق استادوں سے آگے تھے۔ لیکن وہ کس طرح سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سعودی عرب کے ایک دورافتادہ شہر ''اُملج'' گئے، ایک عرصے تک وہاں چھوٹے بچوں کو انگریزی پڑھاتے رہے، پھر ایک سال قبل ہی ام القریٰ میں اُن کی تقرری ہوئی تھی، اِس سارے عمل کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے لاشعور میں کوئی بات ضرور کلک ہورہی تھی کہ مکہ مکرمہ جلد پہنچنا ہے، کہ نصیبہ وہیں کا تھا۔

سید ذوالکفل بخاری مقرر، ادیب اور شاعر کی خوبیوں سے بھی متصف تھے۔ راقم کا ایک طرف جہاں برادرانہ اور دوستانہ تعلق تھا، وہیں استادی شاگردی کا تعلق بھی تھا۔ ''لکھنا پڑھنا'' اُنہی سے سیکھا۔ اِس ضمن میں جناب سید کفیل بخاری بھی میرے استاد ہیں، مگر ذوالکفل بخاری وہ تھے جنھیں بھائی جان بھی ''استاذ'' ہی کہتے۔ آپ اُن کی تحریروں کو اٹھا کر دیکھ لیجیے، موتیوں کی مالا معلوم ہوگی۔ الفاظ کی نشست وبرخاست، برموقع برمحل اور برجستہ......گاہ گاہ راہ چلتے بے ضرر سی چٹکی بھی خوب مزا

دے جاتی۔ یہی تو خوبی ہوتی ہے تحریر کی۔ پھر چاشنی، رچاؤ، روانی...... اُنھوں نے بہت کم لکھا، لیکن جولکھا اُس کا حق ادا کردیا۔ شاید وہ اِس سلسلے میں مختار مسعود اور مشتاق احمد یوسفی کے مقلد تھے، کہ کم لکھو مگر لکھو تو اُس کا حق ادا کردو۔ اُن کی بعض تحریریں بڑے معرکے کی ہیں۔ نقیبِ ختم نبوت میں زیادہ تر اُن کے کتابوں پر تبصرے شائع ہوئے ہیں۔ یہ تبصرے ہی اِس پائے کے ہیں کہ انھیں علیحدہ مرتب ہونا چاہیے۔ اگر وہ اِسے تھوڑا مزید پھیلا لیتے اور اپنے قلم کو صرف اسی سے وابستہ کر لیتے تو ''حضرتِ خامہ بگوش'' کو اپنے مرنے کی تسلی ضرور رہتی۔ اُن کی بعض بعض تحریریں بہت یادگار ہیں۔ حضرت سید ابو معاویہ ابوذر بخاری رحمہ اللہ کا انتقال ہوا تو ہمارے ایک بزرگ نے شاہ جی کا مسلک و مشرب اپنے تئیں متعین فرمانے کی کوشش کی۔ اِس کوشش میں ''دارِ معاویہ'' اور ''دارِ بنی ہاشم'' کو الگ الگ بلکہ ایک دوسرے کے مخالف خانوں میں دیکھنے کی تمنا زیادہ کارفرما تھی۔ اِس موقع پر ذوالکفل بخاری صاحب نے ''جانشینِ امیر شریعت کا مسلک'' (مطبوعہ نقیبِ ختم نبوت دسمبر ۱۹۹۵ء) کے عنوان سے مسکت جواب لکھا۔ اِسی طرح الطاف گوہر کی ایک گوہر افشانی کے جواب میں ''جبر کی سائنس سے صبر کی سائنس تک'' والا مضمون خاصے کی چیز ہے۔

اُن کی ابتدائی دور کی تحریریں بھی نہایت پختہ رنگ لیے ہوئے ہیں۔ مثلاً مشاہداتِ قادیان میں ''داستان کہتے کہتے'' سید نبیل بخاری کے نام سے اور آتشِ ایران کا مقدمہ علامہ سید نقیب الحسینی کے نام سے...... یہ تحریریں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ یاد ہے ایک مرتبہ ہمارے قیامِ ملتان کے زمانے میں شہدائے بالاکوٹ کا یومِ شہادت، قمری اور عیسوی تاریخیں اور دن تمام یکجا ہو رہے تھے۔ یہ خاص موقع واقعۂ بالاکوٹ کے بعد پہلی مرتبہ آ رہا تھا تقویم کے اعتبار سے۔ آئندہ نجانے کب آئے۔ بہرحال اُس دن ہم نے تحریکِ طلبۂ اسلام کی جانب سے تقریب کا اہتمام کیا اور راقم نے شہدائے بالاکوٹ خصوصاً امیر المؤمنین سید احمد شہید پر ایک مضمون بھی لکھا۔ مضمون لکھنے کو لکھ تو لیا، مگر تمہید کوئی ایسی جاندار نہ تھی۔ ذوالکفل بھائی کو توجہ دلائی تو اُنھوں نے تھوڑی ہی دیر میں ابتدائی دو پیراگراف لکھ دیے۔ اور یقین جانیے کہ مضمون میں جان پڑ گئی۔ حضرت سید عطاء المحسن بخاری نقیبِ ختمِ نبوت کے لیے گاہے بگاہے ایک رواں دواں کالم لکھ دیا کرتے تھے۔ راقم نے ایک مرتبہ اُن کا کالم صاف انداز میں لکھ کر خبریں میں بھجوا دیا۔ تب خبریں کا اسلوب قدرے جارحانہ ہوتا تھا۔ چناں چہ شاہ جی کا کالم ہاتھوں ہاتھ لیا گیا اور آئندہ بھی لکھتے رہنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا۔ اِس کے بعد کافی عرصے تک شاہ جی کے کالم ''دل کی بات'' کے نام سے خبریں میں چھپتے رہے۔

سید عطاء المحسن بخاری رحمہ اللہ کا اسلوب نہایت شستہ، رواں اور سلیس ہوتا تھا۔ وہاں آورد نہیں آمد ہوتی تھی۔ اور شاہ جی کو ہم نے کئی مرتبہ دیکھا کہ دارِ بنی ہاشم کے صحن میں لسوڑے کے نیچے چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ اچانک آمد ہوئی اور بآوازِ بلند کہا: ''یار! کاغذ قلم پھڑ کے لیائیں!'' اور اِس کے بعد دس بیس منٹ میں ایک پھڑ پھڑاتا کالم عدم سے وجود میں آ چکتا تھا۔ مگر بایں صورت کہ بہت سے الفاظ کے نقطے، شوشے، کومے اور فل اسٹاپ وغیرہ اشہبِ قلم کی تیز رفتاری کا ساتھ نہ دے پاتے اور راستے میں ہی کہیں غائب ہو جاتے۔ اِس کالم کو بعد میں ''استاذ'' کے پاس ''آخری ٹچ'' دینے کے لیے بھیج دیا جاتا۔ استاذ کی ٹکسال میں ڈھل کر یہ کالم باہر آتا تو اِس کی آب ہی کچھ اور ہوتی۔ کاش کہ جناب سید کفیل شاہ صاحب تھوڑا کڑوا گھونٹ بھر کے اِن کالموں کا مجموعہ شائع کر دیں تو اردو کے ادبِ عالیہ میں ایک بہترین اضافہ ہوگا۔ یوں بھی اِن کا شائع ہونا ضروری ہے تا کہ اب جو ''اسلامی صحافیوں اور کالم نگاروں'' کی ایک نئی کھیپ تیار ہو رہی ہے اُسے اندازہ ہو کہ نظریاتی اور مزاحمتی کالم نگاری کا اسلوبِ نگارش کیا ہوتا ہے۔

پارسال ذوالکفل بخاری کی والدہ ماجدہ اور حضرت امیرِ شریعت رحمہ اللہ کی قابلِ فخر صاحبزادی کی کتاب سیدی و

اَبی منظرِ عام پر آئی تھی۔ واقفانِ حال جانتے ہیں کہ اِس کتاب کا کتنا انتظار کیا گیا۔ راقم کا جب بھی اِس سلسلے میں جناب کفیل شاہ صاحب سے رابطہ ہوتا تو فرماتے کہ مسودہ ذوالکفل کے پاس ہے۔ وہ اُس کی نوک پلک درست کر رہے ہیں...... آئندہ سال آیا تو معلوم ہوا کہ بقول ذوالکفل کے، اِس میں مزید اضافوں اور تشریحی نوٹس کی ضرورت ہے...... سات آٹھ ماہ بعد پھر پوچھا تو جواب ملا کہ بس مقدمہ لکھنا رہ گیا ہے...... اگلے کئی ماہ بعد معلوم کیا تو پتہ چلا کہ کتاب تیار ہے، بس پریس جانے کی دیر ہے...... پھر کئی ماہ کے انتظار کے بعد پوچھا جناب! کیا اب اِس کتاب کے لیے پریس بھی نیا قائم کرنا ہوگا؟...... کہا نہیں۔ بس وہ ذوالکفل نے کچھ نئی باتیں بتائیں۔ اِس لیے خیال ہوا کہ انھیں بھی شامل کرلیا جائے۔ بالآخر وہ روزِ سعید بھی آپہنچا جب مارچ-اپریل ۲۰۰۸ء میں کتاب منظرِ عام پر آہی گئی۔ سیدی و اَبی صرف ایک سوانح نہیں، ایک عہد کی تاریخ ہے، اور وہ عہد امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہیں۔ یہ کتاب صرف ایک مضمون کی صورت ''تری حیات ہے قندیل، رہ دکھاتی ہے'' کے عنوان سے نقیبِ ختمِ نبوت کے اولین امیرِ شریعت نمبر میں چھپی تھی تو لوگ آنسوؤں کی سوغات دیے بغیر نہیں پڑھ پائے۔ عظیم المرتبت باپ کی خدمت میں ایک پاکباز بیٹی کا سوز وگداز میں ڈوبا ہوا اسلوبِ نگارش اللہ کی عطا ہے۔

یادوں کے اِس محل میں گم ہوا ہوں تو کئی باتیں یاد آرہی ہیں۔ ایک زمانے میں ہمیں مشترکہ طور پر عملیات سیکھنے کا شوق بھی رہا۔ اِس مقصد کے لیے استاذِ محترم اور راقم الحروف لیاقت پور قاری ظہورالرحیم صاحب کے پاس متعدد مرتبہ حاضر ہوئے۔ لیکن بعد میں اُن کا رجحان تبدیل ہوگیا اور وہ حضرت خواجہ خان محمد صاحب دامت برکاتہم سے باقاعدہ بیعت ہوکر اوراد واشغال میں مصروف ہوگئے۔ تصوف تو اُن کے گھر کی سوغات ہے۔ اِس سے اُن کے خصوصی لگاؤ نے اُن کی شخصیت میں عجیب کشش اور رعنائی پیدا کردی تھی۔

ذوقِ سلیم کے مالک تھے، اور اللہ تعالیٰ کی عنایات بھی اُن پر پیہم رہیں، ورنہ آج کے دور میں کسی نوجوان کو ذہانت وفطانت اور بلند پایہ خاندانی نام ونسب مل جائے تو فتنہ گر بننے میں دیر نہیں لگتی۔ یوں اگر وہ اپنی کوئی الگ راہ نکالنا چاہتے تو کم از کم ''حلقۂ ذوالکفلیہ'' وجود میں آہی جاتا، مگر یہاں ایسی کوئی بات نہ تھی۔ اسلاف کے مسلک اور اعلیٰ خاندانی روایات کے ساتھ تمسک اُن کا وطیرہ تھا۔

سالِ گزشتہ اُن کی آمد ہوئی تو ملاقات کے لیے ملتان حاضر ہوا۔ دورانِ ملاقات بعض مسائل پر گفتگو کچھ تندی کا رخ اختیار کرگئی۔ راقم کو افسوس ہوا اور واپسی پر عتاب آمیز خط دونوں بھائیوں کو لکھ مارا۔ جانے مجھ سے ایسا کیوں سرزد ہوا۔ اب سوچتا ہوں تو بہت ندامت ہوتی ہے۔ اِس کے بعد خط کا جو جواب آیا، اُس نے مجھے شرم سے پانی پانی کردیا۔ میں نے کیا خیال کیا تھا، اور اُدھر کیا کیا محبتیں نچھاور ہورہی تھیں۔ وہ خط محفوظ ہے۔ اور میرے لیے تو اب بہت بیش قیمت ہوگیا ہے۔ کریم لوگوں کی یہی تو نشانیاں ہوتی ہیں جو لوگوں کو اُن کا بے پناہ گرویدہ کردیتی ہیں۔

ذوالکفل بخاری کیا تھے؟ میرے ایسا ہیچ مدان کیا نقشہ گری کرے گا۔ ہاں حافظ صفوان محمد قلم اُٹھائیں گے تو کچھ اندازہ ہوپائے گا، یا اُن کے دیگر اہلِ قلم دوست۔ بہرحال یہ کہنا تو بے جا ہوگا، اور تقدیر سے گلہ بھی، کہ اُن کی موت بے وقت ہوئی۔ کوئی موت بے وقت نہیں ہوتی۔ ہاں یہ حسرت ضرور رہے گی کہ وہ کچھ دن اور جی لیتے اور مہر ومحبت کے پیکر اِس انسان سے ہم لوگ مزید فیضیاب ہولیتے! اِتنی مختصر سی رفاقت پر یہی کہا جاسکتا ہے کہ: ؎

حیف! در چشمِ زدن صحبت یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

گلستانِ علم وادب

محمد اورنگ زیب اعوان

مسلمانان پاکستان کی بدقسمتی کہ گزشتہ چند سالوں میں علم وعمل کے کئی آفتاب و ماہتاب زیرزمین چلے گئے ایک کی جدائی کا غم ہلکا ہوتا نہیں کہ دوسرے کی جدائی کی خبروحشت اثر مل جاتی ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ اب بچھڑنے والوں کی یاد میں آنسو بہانا ہی مقدر ٹھہرا۔

زندگی جن کے تصور سے جلا پاتی تھی
ہائے کیا لوگ تھے جو دامِ اجل میں آئے

ابھی بچھڑنے والوں کی یاد میں بہنے والے آنسو ہی تھمے نہیں تھے کہ مجلس احرار اسلام کے مرکزی جنرل سیکرٹری محترم جناب عبداللطیف خالد چیمہ نے یہ اندوہناک، المناک اور روح فرسا خبر سنائی کہ نواسۂ امیرشریعت سید ذوالکفل بخاری مکہ مکرمہ میں اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کر چکے ہیں۔ ہائے اوموت تجھے موت ہی آئی ہوتی

ایک دم آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا، دماغ ماؤف ہوگیا، زبان گنگ ہوگئی — سمجھ ہی نہیں آرہی تھی کہ چیمہ صاحب نے کیا خبر سنا دی، چند لمحے سکتے کی سی کیفیت طاری رہی۔ ہوش وحواس کو مجتمع کرنے میں کامیابی ہوئی تو آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے جو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے اور زبان پر انا للہ وانا الیہ راجعون کا پیغامِ صبر جاری تھا۔

گزرتے جا رہے ہیں حادثوں پہ حادثے پیہم　　قلم قاصر ہے کیونکر داستانِ ابتلا لکھوں
فضا مغموم، طائر مضطرب، شاخیں خزاں دیدہ　　سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اس حالت میں کیا لکھوں
چلے جاتے ہیں یارانِ سرِ پُل خُلد کی جانب　　کسے غم خوار ٹھہراؤں کسے درد آشنا لکھوں

تھوڑی دیر بعد لرزتے ہاتھوں مخدوم مکرم جناب سید محمد کفیل بخاری کا موبائل نمبر ملایا، تھرتھراتی زبان سے انا للہ وانا الیہ راجعون ہی کہہ سکا کہ پھر ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا اور یوں ان سے زیادہ بات نہ ہوسکی — پیرجی سید عطاء المہیمن بخاری سے تو بات کرنے کی ہمت ہی نہ بندھ سکی۔

کئی دن اسی حزن وملال کی المناک کیفیت میں گزر گئے۔ باوجود ہمت اور کوشش کے اپنی ذہنی وقلبی کیفیات کو الفاظ کا جامہ نہ پہنا سکا۔

تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

سید ذوالکفل بخاری سے وابستہ یادیں گزشتہ اٹھارہ برس پر محیط ہیں جنھیں ایک مختصر سے مضمون میں سمیٹ لینا مشکل

ہی نہیں ناممکن بھی نظر آتا ہے۔

ان سے پہلی ملاقات یکم مئی ۱۹۹۱ء کو دارِ بنی ہاشم ملتان میں ہوئی۔

پھر تو رابطے بڑھتے ہی گئے عمر رواں کے ساتھ ساتھ

جن دنوں میں عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کا مبلغ تھا تو ہر تین ماہ بعد ملتان دفتر مرکزیہ میں مبلغین کا اجلاس ہوتا۔ اجلاس میں شرکت کے لیے ملتان کا سفر ہوتا تو امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے مزار اور دار بنی ہاشم بھی حاضری ضرور ہوتی۔ ابن امیر شریعت سید عطاء المحسن بخاریؒ، محترم سید محمد وکیل بخاری، سید محمد کفیل بخاری اور سید ذوالکفل بخاریؒ سے ملاقات ہوتی، علمی، ادبی اور تاریخی حوالہ سے یہ یادگار ملاقاتیں تھیں جو ۱۹۹۷ء تک جاری رہیں۔

سید محمد ذوالکفل بخاری جن دنوں NUML اسلام آباد میں انگلش لینگویج کی کلاسیں لے رہے تھے تو میں روزنامہ اوصاف میں صحافتی خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ محترم عمر فاروق (تلہ گنگ) نے بتایا کہ شاہ جی NUML میں ہیں تو پھر ہر دوسرے دن ان کی خدمت میں حاضری ہوتی اور علم و ادب کے موتی سمیٹ کے میں واپس ہوتا۔

انہی دنوں جمعیت علماء اسلام کی میزبانی میں علماء دیوبند سے وابستہ جماعتوں کے اتحاد کے حوالہ سے جامع مسجد دارلسلام G-6-2 میں اجلاس تھا۔ پیر جی سید عطاء المہیمن بخاری، سید محمد کفیل بخاری اور محترم عبداللطیف خالد چیمہ بھی شریکِ اجلاس تھے۔ اجلاس کے بعد میں ہی ان کو لے کر NUML کے ہاسٹل گیا۔

وہاں سے پتہ چلا کہ ذوالکفل بخاری نماز پڑھنے مسجد گئے ہوئے ہیں تو ہم ہاسٹل کی مسجد میں پہنچے باجماعت نمازِ عصر ادا کی۔ شاہ جی سے ملاقات ہوئی پھر ان کے کمرے میں آ گئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ ان کے ہمراہ گزرا اور ہم نے بھی گرمیٔ احرار کا لطف اٹھایا، یہ ایک یادگار اور ناقابل فراموش روحانی اور علمی و ادبی مجلس تھی۔

سید ذوالکفل بخاری ایک بہترین انشا پرداز اور مؤرخ تھے۔ عربی ادب، اردو ادب اور انگریزی ادب پر ان کی گہری دسترس تھی۔ وہ ایک علمی، ادبی، تاریخی اور تحقیقی انسان تھے، وہ علم و ادب کا خوشنما پیکر تھے۔ وہ نہایت خوش مزاج، خوش طبع، باوقار، بلند اخلاق اور فراخ حوصلہ شخصیت کے مالک تھے۔ دھیما، باوقار اور خوداعتمادی سے بھرپور ان کا لہجہ تھا۔

سید ذوالکفل بخاری شعروشاعری کا عمدہ ذوق رکھتے تھے‘ خود بھی شاعر تھے اور جدید و قدیم شعراء کے بے شمار اشعار انھیں ازبر تھے، ذہین و فطین اور قوی حافظہ کے مالک تھے۔ شاہ جی بہت ہی متقی اور پرہیزگار انسان تھے، نوجوانی ہی میں ان کا زہد و ورع قابل رشک اور لائق تقلید تھا، نماز میں ان کا خشوع و خضوع دیدنی اور اپنی مثال آپ ہوتا تھا۔ وہ نیکی اور پرہیزگاری کا ڈھنڈورا پیٹنے کے عادی نہ تھے۔ وہ خلوص و محبت کا پیکرِ حسین تھے۔ ان کا مسکراتا باوقار چہرہ اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔

دلوں میں درد کی شمعیں جلا کے چھوڑ گیا
وہ اک جہاں کو اپنا بنا کے چھوڑ گیا

شاہ جی کو مرحوم لکھتے ہوئے ہاتھ لرزتا اور قلم کا کلیجہ شق ہوتا ہے، لیکن اس کا کیا کیجیے کہ زمانے کا دستور ہمیشہ سے یہی

چلا آرہا ہے۔ موت و حیات اس کے لازمی اجزاء ہیں آج ان کی باری تھی تو کل ہماری آنے والی ہے۔

اس سے کسی کو مفر نہیں کہ موت سے کس کو رستگاری ہے۔ انسان کہیں چلا جائے موت اس کے تعاقب میں رہتی ہے۔ یہ مقدر ہی کے تو فیصلے تھے کہ وہ ملتان سے بسلسلۂ ملازمت سعودیہ پہنچے۔ پہلے وہ تبوک کے نواحی شہر اُملج میں پڑھاتے رہے پھر ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ میں تقرری ہوگئی چند ہی ماہ گزرے تھے کہ وقت اجل آ پہنچا، یونیورسٹی سے واپسی پر وہ جان کی بازی ہار گئے۔

موت چھین لیتی ہے اچھے لوگ
یہ کتنی مردم شناس ہوتی ہے

شاہ جی کی یوں اچانک جدائی سے جو صدمہ پہنچا ہے دل کی اس کیفیت کا اظہار قلم کی زبان سے ممکن نہیں نہ الفاظ ساتھ دیتے ہیں اور نہ قلم میں اتنا حوصلہ ہے کہ دلِ پاش پاش کی کربناک کیفیت کو سینۂ قرطاس کی نذر کر سکے۔

عربی کے کسی شاعر نے کہا ہے کہ

رحلت و خلقت القلوب جریحہ
تذوب و جیش الصبر قد قل جندہ

یعنی تم تو رحلت کر چکے مگر ہمارے دلوں کو زخمی کر گئے تمھارے بعد دل پگھل رہے ہیں حال یہ ہے کہ
صبر کا لشکر مسلسل اپنے فوجیوں سے محروم ہوتا جا رہا ہے

سید ذوالکفل بخاری اپنی ذات میں گلستانِ علم و کمال اور گلشنِ شعر و ادب تھے۔ وہ متعدد اصنافِ علم کا خزینہ اور گنجینہ تھے۔ علمی اور فکری اعتبار سے ان میں بڑی جامعیت پائی جاتی تھے۔ میری ان سے آخری ملاقات ۸/ مارچ ۲۰۰۹ء بروز اتوار ہوئی۔ وہ برادرم ڈاکٹر حافظ صفوان محمد چوہان صاحب کے گھر ٹی اینڈ ٹی کالونی ہری پور آئے ہوئے تھے۔ خود فون کر کے مجھے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ میں برادرم قاضی فہیم احمد قریشی کے ہمراہ ملاقات کے لیے حاضر ہوا۔ تقریباً دو اڑھائی گھنٹے علمی و ادبی محفل بپا رہی۔

مجھے ان دنوں یورک ایسڈ کے باعث پاؤں میں شدید درد تھا اور چلنے میں بڑی تکلیف ہوتی تھی تو انھوں نے ایک آزمودہ گھریلو ٹوٹکہ بتا دیا جس کے استعمال سے الحمدللہ مجھے بڑا افاقہ ہوا۔ یہی میری شاہ جی سے آخری ملاقات تھی۔

تیری یاد سے دل فروزاں کریں گے
پھر اس غم کدے میں چراغاں کریں گے

وہ ذی قدر میرا بھی ہم نشیں رہا

عرفان احمد عمرانی

معروف دانشور اور محقق پروفیسر سید ذوالکفل شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ میرے بچپن کے دوست اور کلاس فیلو تھے۔ وہ ۱۹۷۰ء کو حسنی حسینی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ وہ برصغیر کی آزادی کے سرخیل حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے، پروفیسر سید محمد وکیل شاہ کے لختِ جگر، سید محمد کفیل بخاری کے چھوٹے بھائی اور مجلس احرار اسلام کے امیر مرکزیہ پیر جی سید عطاء المہیمن بخاری کے داماد تھے۔ اُنھوں نے ایک ایسے علمی، ادبی اور مذہبی گھرانے میں آنکھ کھولی کہ جہاں ہمہ وقت دین و دانش کا چرچا تھا۔ آپ نے اپنے بڑے ماموں جانشین امیر شریعت مولانا سید ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا سید عطاء المحسن بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت میں رہ کر علم و ادب میں بلند مقام حاصل کر لیا۔ بڑے بڑے لوگ آپ سے تعلق رکھنے اور آپ سے کچھ حاصل کرنے میں اپنی خوش بختی سمجھتے تھے تعلیم سے فراغت کے بعد ملتان میں ایم اے انگلش کے پروفیسر تعینات ہوئے۔ اسی دوران عرب کے شہر املج میں قائم سرکاری سکول بطور انگلش استاد تعیناتی ہوگئی۔ تقریباً چھے سال املج میں رہنے کے بعد گزشتہ سال جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ میں تعیناتی ہوگئی جس پر آپ بہت خوش تھے۔ املج قیام کے دوران آپ کی بہت خواہش تھی کہ سعودی عرب میں مکہ مکرمہ یا مدینہ منورہ میں ہی رہنا چاہیے اللہ پاک نے آپ کی یہ خواہش بھی پوری کر دی۔ جامعہ خیر المدارس کے احاطہ میں جب آپ کی رہائش گاہ تھی تو روز کا ملنا معمول تھا۔ جب ہم کم عمری میں تھے تو خیر المدارس میں ہی کھیلا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ۱۹۸۵ء میں جامعہ خیر المدارس کے جلسہ میں مجھے جب سند ملی تو سب سے پہلے انھوں نے گلاب کے پھولوں کا ہار پہنایا اور مبارکباد دی۔ وہ ۲ سال قبل روزنامہ ''اسلام'' کے دفتر آئے اور مجھے دیکھ کر بہت خوشی کا اظہار کیا اور میرا دل بڑھانے کی باتیں کرتے رہے۔ بخاری صاحب نے مجھے عوامی مسائل کی خبروں کو نمایاں کوریج دینے، مظلوم، متاثرین کی فریادیں بھی لازمی شائع کرنے کی تلقین کی۔

شاہ جی بڑے قلم کار تھے ان کا قلم ادب، صحافت کے میدان کا شہ سوار تھا آپ کی تحریروں میں اسلام کی سربلندی کے لیے تڑپ نظر آتی تھی۔ موجودہ حالات میں وہ پاکستان کی سلامتی کے حوالے سے فکر مند نظر آتے تھے۔ آپ اسلام کے سچے فرزند اور سچے پاکستانی تھے۔ ۳ ماہ قبل جب وہ پاکستان آئے ہوئے تھے تو شرف ملاقات کے لیے سادات نگر دار بنی ہاشم جا پہنچا، دونوں شاہ جی برادران نے مجھ غریب کو عزت و تکریم سے نوازا چند گھڑی کی صحبت ملی اس دوران حالات پر بھی دردمندانہ تبصرہ کیا۔

ایک ایسا نوجوان جو چھوٹی سی عمر میں مکہ مکرمہ کے عظیم ادارے ام القریٰ یونیورسٹی کا پروفیسر بن گیا۔ مذہبی اور سید گھرانے کا چشم و چراغ اندرون ملک تو کیا عرب کی سرزمین میں بھی سب کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔ نہ جانے کتنے لوگوں کا روحانی باپ تھا کتنے نوجوانوں کو تدریس کے ذریعے سیدھی راہ دکھائی۔ اردو، عربی کے علاوہ انگریزی میں بھی نوجوانوں کو معاشرے کا بہترین فرد بننے کے گر سکھائے۔ اور پھر ۱۵/ نومبر کو سب کو روتا ہوا چھوڑ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ شاہ جی کی تمام باتیں ہمیشہ یاد رہیں گی اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند فرمائے۔ آمین (روزنامہ اسلام ملتان ۲۱/ نومبر ۲۰۰۹ء)

تھوڑی عمر، بڑی کمائی

عامر شہزاد

سید محمد ذوالکفل بخاری جو آج ہم میں نہیں ہیں اور جنت المعلیٰ میں آرام فرما ہیں۔ ایک صالح مسلمان بھائی اور خانوادۂ امیرِ شریعت کے فردِ فرید ہونے کی نسبت سے اُن سے دلی محبت تھی۔ مجلس احرار اسلام سے میرے تعلق کو تقریباً گیارہ سال ہونے کو ہیں۔ اکابرِ احرار اور احبابِ احرار میں اُٹھنے بیٹھنے سے اچھی تحریریں پڑھنے کا ذوق پیدا ہوا۔ جن احباب کی زندگیوں نے مجھے متاثر کیا، سید محمد ذوالکفل بخاریؒ اُن میں سے ایک تھے۔ وہ ایک نفیس طبع، منکسر المزاج، وسیع المطالعہ اور اعلیٰ نثر نگار تھے۔

میں قریباً سات آٹھ سال سے سعودی عرب میں بغرض ملازمت مقیم ہوں اور سید ذوالکفل شاہ جیؒ بھی کئی سالوں سے مملکت میں انگریزی کے استاد کی حیثیت سے یہاں قیام پذیر تھے۔ پہلے وہ تبوک کے قصبے املج کے ایک سکول میں استاد تھے۔ پھر اُم القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ میں انگریزی کے استاد ہوگئے۔ وہ کافی عرصے سے اس کوشش میں تھے کہ اللہ تعالیٰ اُنھیں مدینہ منورہ یا مکہ مکرمہ میں سکونت کا شرف عطا فرمادیں۔ مجھے انتہائی خوشی ہوئی کہ اب ان سے مکہ مکرمہ میں ملاقات کا شرف مل جایا کرے گا۔ میرا اکثر ان سے فون پر رابطہ رہتا۔ مطالعے میں آنے والی کتابوں پر اکثر تبصرے ہوتے۔ جماعت کی تاریخ اور خاص کر مسجد احرار چناب نگر کی تاریخ کے بارے میں بات چیت ہوتی کہ اس مسجد کی تاریخ نئے سرے سے آج کے لوگوں کے سامنے تفصیل کے ساتھ ایک اچھی کتاب کی شکل میں آنی چاہیے۔ شاہ جی میری اس بات پر بہت خوش ہوتے۔ میں ان سے عرض کرتا کہ میرے پاس نہ وہ قلم ہے کہ میں اس تاریخ کو مرتب کرسکوں اور نہ میں نے وہ دور دیکھا ہے۔ یہ کام آپ جیسے بزرگ ہی کرسکتے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے لکھنے کی صلاحیت دی ہے۔ سید ذوالکفل شاہ جیؒ، حضرت شیخ سید عطاء المہیمن بخاری مدظلہ کے داماد بھی تھے۔ اور میرا اصلاحی و روحانی تعلق حضرت شیخ سے ہے۔ اِس لیے اُن کے ساتھ قرابت داری اور کچھ بے تکلفی بھی تھی اور کبھی کبھی مزاح وغیرہ بھی کرتے تھے۔ ردِ قادیانیت میرا خاص موضوع ہے۔ اِس عنوان کی کتب کا مطالعہ اور مرزائی و قادیانی انٹرنیٹ کی دنیا میں کیا کام کر رہے ہیں ان پر نظر رکھنا میرا شوق ہے۔

انتقال سے ایک دن قبل میرا فون پر رابطہ ہوا۔ اچھی گپ شپ ہوئی۔ مجھے کہنے لگے کہ رات کو میرے ہاں حج پر آئے ہوئے لاہور کے خاص دو دوست ملک محمد یوسف صاحب اور ڈاکٹر شاہد کاشمیری صاحب دعوت پر موجود تھے۔ لمبی گفتگو ہوئی اور تمہارے بارے میں بھی کافی معلومات ملی ہیں یعنی احقر کے بارے میں۔ میں حیران ہوگیا کہ کیا معلومات ملی ہیں ذرا مجھے بھی

بتایئے۔ فرمانے لگے انٹرنیٹ پر کام کا شوق رکھتے ہو، مرزائی ویب سائیٹس کے بارے میں تمھیں کافی معلومات ہیں۔ میں نے کہا بس تھوڑی بہت معلومات ہیں۔ کہنے لگے یہ کہاں سے حاصل کیں۔ میں نے کہا کچھ خود تلاش کیں، کچھ شیخ راحیل احمد صاحب (مرحوم)، سابق قادیانی، سے کافی معلومات ملی ہیں۔ ان سے تقریباً ہر روز شام کو نیٹ پر آن لائن ہوکر دو تین گھنٹے معلومات لیتا رہتا تھا۔ تقریباً ستر اَسی کے قریب قادیانی و لاہوری مرزائیوں کی سائیٹس ہیں جو مختلف زبانوں میں کام کر رہی ہیں۔ فرمانے لگے میں جلدی نیٹ کنکشن لے لوں تو آپ نے اِن تمام کا لنک مجھے بھیجنا ہوگا۔ میں نے کہا کیوں نہیں۔ میں تو ہر لمحہ اس کام کے لیے تیار رہتا ہوں۔

پر کسے معلوم تھا کہ ایک روز بعد وہ اللہ تعالیٰ کو پیارے ہوجائیں گے۔ جس دن میری ان سے فون پر بات چیت ہوئی، اس سے اگلے دن صبح سویرے پاکستان سے میرے محترم بزرگ عبداللطیف خالد چیمہ صاحب کا فون آیا۔ سلام دعا کے بعد یہ خبر ملی کہ سید ذوالکفل بخاریؒ کا مکہ مکرمہ میں ایک حادثہ میں انتقال ہوگیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں یہ خبر سنتے ہی سکتے میں آ گیا اور اس خبر کی تصدیق چاہنے کے لیے ملک محمد یوسف صاحب اور ڈاکٹر شاہد کاشمیری صاحب کو فون کیا تو انھوں نے اس خبر کی تصدیق کر دی اور میری آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہوگئے۔ جب میں نے ملک محمد یوسف صاحب کو فون کیا تو وہ اور ڈاکٹر شاہد صاحب جنت المعلیٰ میں حضرت شاہ جی کو قبر میں اتار رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت شاہ جی کی حسبِ منشا اُنھیں جگہ بھی مکہ مکرمہ میں عطا فرمائی۔ ان کی یہ وصیت تھی کہ اگر یہاں موت آ گئی تو مجھے پاکستان نہ لے جایا جائے بلکہ یہیں مکہ مکرمہ میں یا مدینہ منورہ میں دفن کر دیا جائے۔ اِس قبرستان کی فضیلت ہر مسلمان جانتا ہے۔ سب سے بڑی فضیلت یہ ہوئی کہ ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی قبر کے قریب انھیں جگہ ملی۔ یہ ان کا نصیب ہے۔ بہت چھوٹی زندگی میں بہت بڑی کمائی انھوں نے کی۔ اُن کی زندگی قابلِ رشک تھی۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔

کچھ ایسے بھی اُٹھ جائیں گے اِس بزم سے جن کو
تم ڈھونڈنے نکلو گے مگر پا نہ سکو گے

احسانِ محسن

محمد یاسین شاد

فرمانِ ختم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم ہے **من لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ.** (رواہ مسند احمد، ترمذی)

ترجمہ: جس نے لوگوں کا شکریہ ادا نہ کیا اس نے اللہ تعالیٰ کا بھی شکریہ ادا نہ کیا۔

مجلس احرار اسلام کے بانی وسربراہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری نور اللہ مرقدہ کے نواسے پروفیسر سید محمد ذوالکفل بخاری شہید کے احسان کا مختصر تذکرہ ہے۔ خاکسار راقم الحروف ۱۹۹۶ء کے آخر میں عارضہ قلب کی وجہ سے طبی بنیاد پر سرکاری ملازمت سے از خود ریٹائرڈ ہوا تھا۔ سرکاری ملازمین جو معذوری کی بنیاد پر ریٹائرمنٹ لیتے ہیں۔ حکومت ماہانہ پنشن کے علاوہ بہبودی فنڈ ملازمین کی تنخواہوں سے لازمی کٹوتی کرتی ہے۔ اس سے صوبائی ملازمین کو ۱۵ سال تک ماہانہ گرانٹ ملتی ہے۔ جب کہ وفاقی حکومت کے ملازمین کو تاحیات ملتی ہے۔ احقر نے حصول کے لیے درخواست دی۔ متعلقہ محکمہ کے افیسران وکلیریکل عملہ نے ادائیگی سے انکار کر دیا۔ میں نے لاہور ہائی کورٹ ملتان بینچ میں داد رسی کے لیے درخواست دائر کر دی۔ عدالت عالیہ نے ڈائریکشن دی کہ متعلقہ محکمہ ایک ماہ میں حق بحق دار رسید کے تحت فیصلہ کرے طویل عرصہ تک کوئی فیصلہ نہ کیا۔ متعلقہ آفیسر نے فیصلہ خلاف ہونے کے باوجود اس کی نقل نہ دی۔ میں اسی پریشانی واذیت میں مبتلا تھا۔ جناب سید محمد ذوالکفل بخاری گورنمنٹ کالج آف ٹیکنالوجی ملتان میں شعبہ انگلش میں پروفیسر تھے۔ اثنائے ملاقات معاملہ کی مشکلات کا ذکر کیا۔ محکمہ بہبود فنڈ ملتان کمشنر آفس کے بار بار چکر کاٹنے کے بعد بھی فیصلہ کی نقل نہیں دے رہا تھا۔

بھائی پروفیسر محمد ذوالکفل بخاری شہید نے تعاون کا وعدہ کر کے حوصلہ بڑھایا چند دنوں بعد اپنے دوست ومہربان حکیم محمود خان ایڈووکیٹ کے توسط سے فیصلہ کی نقل فراہم کر دی پھر عدالت عالیہ سے رجوع کیا۔ ایک نیک صاحب کردار منصف کی انصاف پروری نے فیصلہ کر دیا۔ متعلقہ محکمہ کی بیوروکریسی نے عدالت علیا میں فیصلے کے خلاف اپیلیں کیں جو الحمد للہ خارج ہوئیں۔ حق بحق دار رسید، یہ خاکسار فائز المرام ہوا۔ اس فیصلہ کی تفصیل ذوالکفل بھائی کو بتائی تو بڑے خوش ہوئے اور ڈھیر ساری دعائیں دیں۔

سید ذوالکفل بخاری دوستوں سے حسنِ سلوک کرنے والے اور مظلوموں کا ساتھ دینے والے انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہی بے پناہ علمی وادبی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ (آمین)

شمعِ محفل

حفیظ خان

گزشتہ شوال کے ابتدائی دنوں کی ایک شام دارِ بنی ہاشم میں ماہنامہ نقیبِ ختم نبوت کے دفتر میں موجود مجھ سمیت کسی بھی شخص کے گمان میں نہ تھا کہ اُن کے درمیان فرش پر دوزانو بیٹھا کھلکھلاتا ہوا ایک سادہ پوش مگر وجیہہ و دانا نوجوان پھر کبھی اُن کے ہمراہ یوں کسی محفل میں شریک نہیں ہو سکے گا۔ اس روشن اور مسکراتی آنکھوں والے نوجوان کا نام ذوالکفل بخاری تھا۔ پس منظر اِس احوال کا یوں ہے کہ آج سے بائیس تیئس برس قبل جب ذوالفقار علی بھٹی نے نایاب کمپیوٹر گرافکس کے نام سے ملتان کے احمد آرکیڈ میں کمپیوٹر کمپوزنگ کی طرح ڈالی تو ہم چاروں دوستوں یعنی کفیل بخاری، جاوید اختر بھٹی، ذوالفقار علی بھٹی اور اِس خاکسار کو مل بیٹھنے کا ٹھکانہ میسر آ گیا۔ اُن دنوں کفیل بخاری کا نقیبِ ختم نبوت جاوید اختر بھٹی کا انشعاب اور اِس خاکسار کا TheCompetitor نایاب ہی سے کمپوز ہوا کرتے تھے۔ پھر جوں جوں ''ہر بوالہوس نے عاشقی شعار کی'' اور کمپیوٹر کمپوزنگ ذوالفقار بھٹی جیسے وضع دار لوگوں کے ''آستانوں'' سے نکل کر مارکیٹیوں کے ہاں ٹکے دھڑی ہونے لگی تو نایاب کا دفتر تو اُجڑا سو اُجڑا، ہم چاروں کی محفلیں بھی اُجڑ گئیں۔ یہ اُن صحبتوں کی تاثیر تھی یا دوریوں کا ملال کہ گزشتہ عید الفطر پر میں نے محترم جاوید بھٹی سے ہم چاروں کے پھر کہیں مل بیٹھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ محترم کفیل شاہ صاحب تک بات پہنچی تو اُنھوں نے دارِ بنی ہاشم ہی میں مدعو کر لیا۔ یوں پھر سے ہم چاروں ایک ہی چھت تلے اکٹھے ہو گئے۔

ہمارے درمیان ابھی دوریوں کے احوال کا سلسلہ شروع ہونے ہی پایا تھا کہ تین نوجوانوں نے اپنی غیر متوقع آمد سے نہ صرف محفل پر ''خوش کلامی'' کا ہلہ بول دیا بلکہ اپنی فکری توانائیوں کے محض ڈھکے چھپے اظہار سے ہم چاروں کو دیوار سے لگنے پر مجبور کر دیا۔ یہ تینوں نوجوان ذوالکفل بخاری، حافظ صفوان محمد اور شعیب ودود تھے۔ شعیب ودود تو ہم ایسے بزرگوں کے سامنے غالباً احتراماً خاموش رہا۔ مگر ذوالکفل مرحوم نے ''شمعِ محفل'' خود ہی اُٹھا کر اپنے سامنے دھر دی کہ مبادا کوئی لے اُڑے۔ اور پھر جب سلسلۂ تکلم شروع ہوا تو وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہا۔ میں خانوادۂ امیر شریعت کے اِس روشن چراغ کی قادر الکلامی پر حیرت زدہ نہ تھا کہ ''قدرتِ اظہار'' تو اِن کے لہو کی گردش میں شامل رہی ہے، میں جس بات پر انگشت بدنداں تھا وہ اُن کی بذلہ سنجی، علمیت کے تنوع، افکار کی ہمہ گیری اور زمین کے اندر اُتر جانے والی عاجزی سے عبارت تھی۔ ذوالکفل مرحوم نے اپنی گفتگو سے کچھ اِس قسم کا سماں باندھا کہ ہم میں سے ہر شخص اُس کے لفظوں کی تاثیر میں ڈوبتا چلا گیا۔ میں اُس نوجوان کو پوری توجہ سے سننے پر مجبور تھا کہ جسے چند برس پہلے تک محض اپنے دوست کفیل صاحب کا برادرِ خورد ہی سمجھتا رہا تھا، اِس سے زیادہ کچھ نہیں۔

اِسی مجلس میں حافظ صفوان محمد اور ذوالکفل بخاری کا ایک اور کارنامہ میرے سامنے آیا؛ یعنی بول چال کی بنیاد پر

ترتیب دی گئی ذولسانی (اردو-انگریزی) لغت کی تالیف۔ میں نے بے اختیار اپنے ساتھ بیٹھے حافظ صفوان سے کہا: ’’آپ دونوں نے میرے یقین کو بنیاد فراہم کردی ہے کہ ہماری نئی نسل ہم سے زیادہ سنجیدہ، بالغ نظر اور فکری لحاظ سے ارفع درجات کی حامل ہے، جس کے ہاں کام کرنے کا جذبہ فراواں اور بلا کسی غیر ضروری چرچے کے ہے۔‘‘ میرے رشک اور کلمۂ تحسین کا سبب محض ایک ذولسانی لغت کی تالیف ہی نہ تھا بلکہ اِن نوجوانوں کی اُن جہات تک رسائی تھی کہ جن کو احاطۂ تحقیق میں لا کر corpus سازی کو پہلی بار ایک مخصوص عمر اور درجے (ثانوی) کے طالب علموں کے واسطے اردو انگریزی لغت نویسی کی بنیاد کے طور پر برتا گیا تھا۔ محفل میں اس لغت کا تذکرہ ہوا تو محترم کفیل بخاری مجھے ذوالکفل بخاری اور حافظ صفوان کے دیگر علمی اور تحقیقی پراجیکٹس کے بارے میں بتانے لگے۔ مگر ادب کے ایک طالبِ علم اور لغت نویسی کے شائق ہونے کے سبب میں اِس لغت کے سحر سے باہر ہی نہ نکل سکا۔ میری ورق گردانی کے دوران حافظ صفوان اور ذوالکفل مرحوم مجھے اُن چیدہ چیدہ الفاظ کی موجودگی کا حوالہ دینے لگے کہ جو ابھی اردو زبان کی بول چال میں متعارف ہونا شروع ہی ہوئے تھے مگر اُنھیں اِس کرنٹ لغت میں محفوظ کرلیا گیا تھا۔ میرے لیے حیرت کا ایک اور سبب ذوالکفل مرحوم اور حافظ صفوان محمد کی عاجزی تھی کیونکہ تمام تر توصیفی کلمات کے باوجود اُنھوں نے چہرے کے کسی رنگ یا آنکھوں کی روشنی سے محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ اپنے اِس علمی کارنامے پر اُنھیں کس قدر نازاں ہونا چاہیے۔

مجلس برخاست ہونے لگی تو ہوتے ہوتے ہی ہوئی کیونکہ ذوالکفل بخاری دارِ بنی ہاشم کے صدر دروازے تک سلسلۂ تکلم جاری رکھے ہوئے تھے۔ باتوں کے موتی تھے یا کھلتے ہوئے شگوفے، کچھ یاد نہیں۔ ہاں اِتنا یاد ہے کہ خوشبو تھی، جو مشامِ جاں کو معطر کیے جارہی تھی، رنگ تھے جو دید کو خیرہ کرنے کی بجائے دیدہ وری کی جانب کھینچا کیے جارہے تھے۔ ذوالفقار بھٹی کی گاڑی میں بیٹھتے ہوئے ذوالکفل مرحوم نے میرے قریب آ کر احتراماً جیپ کا دروازہ بند کرتے ہوئے ہولے سے کچھ کہا مگر میں نہیں سن پایا۔ دارِ بنی ہاشم سے باہر آتے ہوئے میں نے ذوالفقار بھٹی سے کہا کہ آج تو ذوالکفل کا ایک نیا روپ میرے سامنے آیا ہے۔ کیا کوئی شخص اپنے عالمِ شباب میں بھی علمیت اور تدبر کے ساتھ ساتھ خوش مزاجی اور عاجزی کے اِس درجے پر فائز ہوسکتا ہے۔ وہ پہلے تو ایسا نہ تھا۔ ذوالفقار بھٹی مسکرا دیے اور بولے: ’’وہ بچپن ہی سے ایسا ہے، تم اُسے زیادہ ملے جو نہیں۔‘‘

’’لیکن اب ملاقات ہوتی رہے گی‘‘......

’’کیسے ہوگی......وہ تو اگلے چند دنوں میں سعودیہ جارہا ہے، کافی عرصے کے لیے۔‘‘......بھٹی گویا ہوا۔

’’مگر کیوں‘‘......میں نے حیرت سے پوچھا۔

’’یار تمھیں بتا تو رہا تھا، جیپ کا دروازہ بند کرتے ہوئے‘‘......

اوہ......اچھا تو ذوالکفل مجھ سے یہ بات کہہ رہا تھا۔ مگر اُس وقت مجھ پر عدیم ہاشمی مرحوم کے اِس شعر کے معنی یوں نہ کھلے تھے کہ

بہت نزدیک آتے جا رہے ہو
بچھڑنے کا ارادہ کرلیا کیا؟

(۱۹/جنوری ۲۰۱۰ء)

ذوالکفل بخاری کی نظم نگاری

ڈاکٹر مزمل حسین ☆

شعروادب کی بحث میں جب ہم انفرادیت کے معاییر مقرر کرنے لگتے ہیں تو ایک پہلو مرکزِ نگاہ ٹھہرتا ہے۔ وہ پہلو جدتِ ادااور ندرتِ خیال سے تشکیل پاتا ہے۔ جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے تصورات کو جتنا بیسوی صدی کے نصفِ دوم میں رگڑا گیا ہے، شاید ہی کوئی اور تصور اتنا زیرِ بحث رہا ہو۔ ''جدیدیت'' ادب کے ہر عہد میں جدید ہی ہوتی ہے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا یہ جدیدیت مختلف تخلیق کاروں کے بیان جمالیاتی قدروں کے ساتھ قائم رہتی ہے یا ہنگامی نوعیت کے موضوعات اور افکار کو بیان کرتے ہی دم توڑ دیتی ہے۔ اگر جدیدیت کو قائم رکھنا ہے اور اسے ادب میں آفاقیت کے مقام تک لانا ہے تو پھر اس کی بنیاد ادبی روایت پر قائم کرنا ہوگی۔

روایت میں ڈکشن، ہستی نظام، استعاراتی پیرایہ، کلچر اور تہذیب کے کائناتی حوالے اور سدا قائم رہنے والی وہ تخلیقی شناخت ہے جو کسی بھی زبان کے شعروادب کا خاصہ ہوتی ہے، تمام ہمہ جہتی پہلو موجود ہوتے ہیں۔ ہمارا یہاں المیہ یہ رہا ہے کہ ہمارے جدید اور نوجوان شعراء بالخصوص خود کو اپنی شعری روایت سے وابستہ نہیں رکھتے اور نتیجے میں لمحاتی تاثر کے حامل شاعری کر کے ہمیشہ کے لیے مرجاتے ہیں۔ باشعور فنکار جہاں نئی ڈکشن، ہستی تجربے اور اپنا استعاراتی نظام متعارف کراتا ہے وہاں وہ متنوع افکار کے ذریعے نئے مباحث کا آغاز بھی کرتا ہے۔ ذوالکفل بخاری کی نثری نظموں میں کچھ ایسی ہی تخلیقی فضا ہے جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔

ذوالکفل بخاری کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو سب سے پہلے جو خیال ذہن میں ابھرے گا وہ ان کی شعری زبان کی سادگی۔ کسی اعلیٰ اور گہرے خیال کو نہایت سادگی سے آسان زبان میں بیان کرنا، ذوالکفل بخاری کی نظموں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ انھوں نے کئی دیگر نوجوان شعرا کی طرح استاد شعرا کی لغت پر انحصار کرنے کے بجائے عصری دور کی مروج زبان میں اپنے افکار کو پیش کیا ہے۔ انھوں نے نئے استعارے، تشبیہات اور تراکیب استعمال کی ہیں۔ وہ اس خیال کے حامی ہیں کہ شاعر کو نئے دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہوکر اپنے خیالات کو بیان کرنا چاہیے اور انھوں نے اپنا یہی شعری نظریہ برقرار رکھا ہے۔ اس تناظر میں چند مصرعے دیکھیے:

ع　　مرے پاکیزہ طینت، پاک دامن، پاک زاد و پاک نفس و پاک بیں مولا!

ع　　مجھے سچوں، بھلوں، پاکیزہ تر لوگوں کے قدموں میں جگہ دیجیے

☆ شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج لیہ

ع   ہست و بود اک اور شے ہے، نیست و نابود اور؟

ع   مسافر سوچتے ہیں، ساکنانِ شہر کو شاید؟

ع   اک عمر اب بھی انت کو آواز دیتی ہے

ع   ناکشودہ منظروں کے کھوج میں محوِ سفر

ع   سکھ بنسریا کیوں بج رہی ہے؟

ذوالکفل بخاری کی نظمیں تہہ در تہہ فکر کی حامل ہیں۔ وہ لایعنی قسم کی لفاظی اور رنگینی کو آگے بڑھانے کی بجائے چند سوالوں کے جوابوں کے متلاشی ہیں۔ اس پس منظر میں وہ ایک عجیب طرح کا استفہامیہ انداز اختیار کیے ہوئے ہیں۔ وہ کبھی خود سے، کبھی اپنے رب سے اور کبھی سماج سے سوال پوچھتے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو ہمارا ''آج'' مختلف سوالوں سے اٹا، کرب کی وادیوں میں کہیں گم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ طرح طرح کے سوال ہیں، جن کا جواب چاہیے۔ ذوالکفل بخاری اسی آج کا سوچنے والا دماغ ہے جسے کئی سوالوں کا سامنا ہے۔

شاعر، آرٹسٹ، دانشور، صوفی، سب ایک سے ہوتے ہیں۔ کائناتی محبت، امن و آشتی، رواداری، احترامِ آدمیت، سکھ، نرم دلی، بلند حوصلگی، سیر چشمی، الفت و موانست اور تعصّبات سے ماورا معاشرے ان سب کا آئیڈیلز ہوتے ہیں۔ اور جب یہ قدریں ڈوبنے لگتی ہیں، تو سوال جنم لیتے ہیں، ایسے ہی چند سوال بخاری کے پیشِ نظر بھی ہیں:

ع   مسافر سوچتے ہیں، ساکنانِ شہر کو شاید؟

ع   امن شگوفے کیوں کھل رہے ہیں؟

ع   سکون، راحت، یہ پیار، الفت؟

ع   سرور و فرحت یہ شادمانی؟

ذوالکفل بخاری کی نثری نظموں نے اردو کی مروج نثری نظم نگاروں میں جس شے کا اضافہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے اس صنف کے عشقیہ مزاج سے اجتناب کرتے ہوئے اسے ایک فکری جہت سے ہم آہنگ کیا ہے۔ اگر چہ ان میں کہیں شعریت کا عنصر کم دکھائی دیتا ہے مگر حساس قاری کے لیے لحہ فکریہ کا سامان ضرور پیدا ہوتا ہے۔ ویسے بھی اگر دیکھا جائے تو استفہامیہ انداز اختیار کرنے والا ذہن بنیادی طور پر فلسفیانہ اپروچ کا حامل ہوتا ہے، ایسا ذہن معاشرے میں تبدیلی کا خواہاں ہوتا ہے اور وہ ان سطحی اور سفلی جذبوں کو ناگواری سے جھٹک دیتا ہے جو تہذیب کے ارتقاء میں بڑی رکاوٹ ہوتے ہیں۔

آج کی نثری اردو نظم جدیدیت کی اعلیٰ ترین مثال تصور ہوتی ہے، انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں کی شاعری نے جس قدر آج کی اردو شاعری کو متاثر کیا ہے شاید گزشتہ ڈیڑھ صدی میں ایسا پہلے نہیں ہوا، یقیناً اس کی بڑی وجہ الیکٹرانک میڈیا، پرنٹ میڈیا اور جدید تعلیم کا عام پھیلاؤ ہے، لیکن ہم اس مطالعاتی جستجو کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے جس کی تحصیل نے آج کے نوجوان شعراء کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔ آج کی نثری اردو نظم میں جو شعری آہنگ دکھائی دے رہا ہے وہ واضح طور پر مغربی شعری

اسالیب سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے، اگر ایسے ماحول میں اردو نثری نظم نے زندہ رہنا ہے تو اسے کسی نہ کسی مقام پر اردو کی شعری روایت کے ساتھ بھی ضرور جوڑنا ہوگا۔ ذوالکفل بخاری کے یہاں اس روایت کا شعور بڑی حد تک محسوس ہوتا ہے۔ بطور خاص جب وہ لسانیاتی سطح پر جا کر ترکیب سازی کرتے ہیں، تشبیہات، اشارے، کنائے اور مجاز مرسل کو ایک سلیقے سے استعمال میں لاتے ہیں تو اجنبیت محسوس نہیں ہوتی۔ مترادفات، تکرار لفظی اور تجانیس کے استعمال نے ان کے فنی شعور پر مہر ثبت کر دی ہے۔

ایک عام خیال یہ ہے کہ نثری نظم میں ''آمد'' کا عنصر کم ہوتا ہے اور شعراء آورد کو اختیار کر کے برجستگی اور فطری اظہار کو مجروح کر دیتے ہیں۔ بڑی حد تک یہ بات صحیح ہے کہ نثری نظموں میں یہ خامی محسوس ہوتی ہے لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ذوالکفل بخاری نے حساس سے حساس موضوع کو نہایت سہولت اور برجستہ پیرائے میں بیان کر کے قاری کے لیے ایک ترفع کا سامان پیدا کیا ہے۔

گھڑیاں، لمحے، پل، دقیقے، قرن، صدی اور جگ
لحظے، ساعت اور سمے
انجانے میں بیت گئے
اور بیت بیت کے جیت رہے
کس سے جیتے، کیسے جیتے کون ہزیم تھا ٹھہرا
مت پوچھو جی ایسی باتیں، ایک زعیم نہ ٹھہرا
جی چاہے اک ایک سے پوچھوں کیا کھویا کیا پایا
حال، مقام، مکان، زبان، کچھ بھی ہاتھ نہ آیا
رنگ، خیال، مُدوّر رستے، ان بوجھی تحریک
قفس کرشموں کے میتوں کو وقت کرے تو کیوں مہمیز؟

(حکایت جو درمیاں سے سنی)

گلاب لمحوں کا ساتھی

پروفیسر منیر احمد ابنِ رزمی ☆

برگد کے نیچے عموماً کچھ نہیں اُگتا۔ اِسی طرح بڑے نامور لوگوں کے خاندان میں پھر کوئی نامور جنم نہیں لیتا۔ اکثر چھوٹے رہ جانے والے اپنے بزرگوں کی قد آوری کی بیساکھیوں سے ''بڑا'' دکھائی دینے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں مگر بنتے نہیں، بلکہ زینہ زینہ وقت کی تہہ میں اُتر جاتے ہیں۔

برصغیر پاک و ہند کے نامور لوگوں کو دیکھ لیں تو پتا چلتا ہے کہ امام الہند ابوالکلام آزاد کے بعد اُن کے خاندان سے پھر کوئی قد آور اور سربلند نام جنم نہ لے سکا۔ اُن کے معنوی شاگرد آغا شورش کاشمیری کو لیجیے، اُن کی اولاد کا پتا ہی نہیں چلتا۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی اولاد بھی علمی و ادبی حوالے سے کسی شمار میں نہیں۔ علامہ عنایت اللہ مشرقی کے ساتھ بھی یہی حادثہ ہوا۔ مفکرِ احرار چودھری افضل حق کے ایک فرزند کے ساتھ پروفیسر کا لاحقہ تو لگا لیکن پھر سابقے کا پتا ہی نہیں چلا۔ اللہ نے اپنی کریمی سے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو فی الوقت استثنا کر دیا ہے۔ اُن کے بیٹے سید ابوذر بخاری علم و ادب کی جوئے کوہسار تھے، اگرچہ وہ اُس طرح سے معروف نہ ہوئے جیسا مقام شاہ جی کو ملا۔

لیکن خطابت و سیادت میں وہ شاہ جی کے وارث ثابت ہوئے۔ اب اِسی خاندان سے سید ذوالکفل بخاری نے جنم لیا جو میرے ہم عمر تو نہ تھے لیکن وہ تو ہم عصروں سے بھی آگے نکل گئے۔ سید ذوالکفل بخاری کے بڑے بھائی سید محمد کفیل بخاری ہمارے زمانۂ طالب علمی کے ساتھی ہیں، لیکن اُن سے زیادہ ہمارا ساتھ ذوالکفل بخاری سے تھا۔ ایک ہمہ جہت نوجوان شخصیت جو نِرا مولوی نہیں تھا، بلکہ اس کے اندر علم و ادب کا ایک دریا بہہ رہا تھا۔ مجھے اُن سے ادبی حوالے سے زیادہ لگاؤ ہے۔ نئی نسل کے قلم کار ٹھوس مطالعے کے عادی نہیں، سطحی علم دو تین ملاقاتوں کے بعد واضح نظر آتا ہے۔ لیکن یہ سیدزادہ کم آمیز اور کم سخن ضرور تھا، مگر جب گفتگو کرتا تھا تو یقین ہوتا تھا کہ وہ کثیر الجہت، وسیع المطالعہ اور ٹھوس علمی گرفت رکھتے ہوئے موضوع کی گہرائی اور گیرائی سے بات کو سند اور جواز عطا کرتا ہے۔ وہ صالح فکر کا ایک ایسا نوجوان تھا جس نے ادب کو اباحیت اور ژولیدہ فکری سے نجات دلانے کی بھرپور کوشش کی۔ کم لکھا لیکن جو لکھا، خوب لکھا۔ بلکہ لکھنے کا حق ادا کر دیا۔ قضا و قدر نے زیادہ لکھنے کا وقت ہی نہیں دیا ورنہ بڑے بڑوں کے چراغ گل ہو جاتے۔ الفاظ کا دروبست برموقع، برمحل اور برجستہ، گویا موتیوں کی مالا تیار کر دی ہو۔ نئی نسل کے قلم کاروں کو اسلام دوستی سے جوڑا اور اس لحاظ سے اسلامی ادب کو ثروت مند بنانے کے لیے بند راستوں کو کھولا۔

موت امرِ ربی ہے اور ہر موت کا دکھ کچھ اپنی جگہ پر ہوتا ہے لیکن سید ذوالکفل بخاری کی موت ادبی حلقوں کے لیے ایک المیے سے کم نہیں۔ اس نے موت کے لیے بھی ایک ایسے راستے کو چُنا جس نے اُسے دنیا میں بھی سربلندی کا راستہ دکھایا۔ وہ ہم سے بچھڑ گیا ہے لیکن اس کے بچھڑنے کا غم نوکِ سوزن کی طرح ہمیشہ میٹھا میٹھا درد دیتا رہے گا۔ خاندانِ بنو ہاشم کا یہ چراغ بظاہر بجھ گیا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ اس کی لَو سے کوئی اور چراغ ضرور روشن ہوگا جو لالۂ صحرائی بن کر ادبی دنیا کو بھی گل و گلزار بنا دے گا۔

خیالِ یار ترے سلسلے نشوں کی رُتیں　　جمالِ یار تری نکہتیں گلاب کے پھول
کٹی ہے عمر بہاروں کے سوگ میں امجدؔ　　تری لحد پہ کِھلیں جاوداں گلاب کے پھول

☆ پرنسپل گورنمنٹ کالج مخدوم رشید (ملتان)

معلمِ ذی وقار

مشتاق احمد چنیوٹی

۱۶/ نومبر ۲۰۰۹ء کی صبح نمازِ فجر سے فراغت کے بعد موبائل فون اٹھایا تو محترم مولانا بلال احمد کا ایک پیغام میرا منتظر تھا۔ پیغام یہ تھا کہ سید محمد کفیل شاہ بخاری کے بھائی مکہ مکرمہ میں ایک اندوہناک حادثہ میں جاں بحق ہوگئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ خبر پر یقین نہ آیا۔ مولانا محمد مغیرہ خطیب مسجد احرار چناب نگر کو فون کیا تو اُنھوں نے خبر کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا کہ میں تعزیت کے لیے ملتان پہنچ چکا ہوں۔ کئی گھنٹے تک ذہن پر سکتہ کی سی کیفیت طاری رہی۔ بہت صدمہ ہوا۔ تقدیرِ الٰہی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ پنجابی کی ایک کہاوت کا مفہوم یہ ہے کہ یہ مالک کی مرضی ہوتی ہے، وہ چاہے تو اپنی فصل کچی کاٹ لے چاہے تو پکنے کی مہلت دے۔ اِس کہاوت سے تقدیرِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہیں تو انسان کو جوانی کی موت دے دیں، چاہیں تو ادھیڑ عمری یا بڑھاپے تک پہنچانے کے بعد اپنی طرف بلائیں۔

المیہ صرف یہ نہیں کہ سید ذوالکفل شاہ بخاری جواں مرگی کا شکار ہوئے ہیں۔ صدمہ صرف اِس کا نہیں کہ وہ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے نواسے ہیں۔ المیہ اور صدمہ یہ بھی ہے کہ وہ بہت ذہین، تعلیم یافتہ اور دینی و دنیوی علوم کی گہری بصیرت رکھنے والی شخصیت تھے۔ اُن جیسے صاحبِ نظر افراد روز بروز کم ہوتے جارہے ہیں۔ ایسی ہی شخصیت کے انتقال پر کہا گیا تھا:

ہائے او موت تجھے ہی موت آئی ہوتی

بہرحال یہ ایک شاعرانہ تخیل تھا۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق مردِ مومن کے لیے رضا بالقضا ضروری ہے۔ تقدیر پر یقین رکھے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔

سید محمد ذوالکفل شاہ بخاری اصطلاحی معنوں میں عالم نہ ہونے کے باوجود دینی علوم پر خاصی دسترس رکھتے تھے۔ ادبی ذوق تو اس خانوادہ کی گھٹی میں داخل ہے۔ حضرت امیر شریعتؒ، مولانا سید ابوذر بخاریؒ اور مولانا سید عطاء المحسن شاہ بخاریؒ کا ادبی ذوق تو اِتنا بلند تھا کہ اس پر ایک مستقل کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ نواسۂ امیر شریعت سید محمد کفیل بخاری بھی علمی، دینی و ادبی موضوعات پر گہری نظر رکھتے ہیں لیکن اُنھیں جماعتی مصروفیات کے باعث لکھنے کا کم موقعہ ملتا ہے۔ یہی ادبی ذوق انھیں وراثت میں ملا تھا۔ وہ صرف ادب شناس ہی نہیں، اچھے شاعر بھی تھے۔ ان کے علمی، ادبی اور اصلاحی مضامین ماہنامہ نقیب ختم نبوت ملتان اور قومی اخبارات کی زینت بنتے رہتے تھے۔ یہ سلسلہ کئی برسوں سے جاری تھا۔ محترم سید محمد کفیل شاہ بخاری راوی ہیں کہ مرحوم معروف ادیب مشفق خواجہ سے تعارف اور خط کتابت رکھتے تھے۔ ان کی خط کتابت اتنے اعلیٰ معیار کی ہوتی تھی کہ مشفق خواجہ بے ساختہ اُن سے ملنے کے لیے دارِ بنی ہاشم ملتان پہنچ گئے۔ انھوں نے اپنے ذہن میں ذوالکفل شاہ بخاری کا جو پیکر تراش رکھا تھا، اُنھیں اُس سے مختلف پایا۔ وہ شاہ صاحب کی رہن سہن کی سادگی دیکھ کر حیران رہ گئے۔

احقر نے ۲۰۰۸ء میں مولانا عبدالحفیظ مکی مدظلہٗ کے حکم پر تحفظ ختم نبوت کی صد سالہ تاریخ تحریر کی جو کہ انٹرنیشنل ختم نبوت موومنٹ پاکستان کی طرف سے شائع ہوئی۔ احقر نے یہ کتاب کئی اہلِ علم کی خدمت میں پیش کی اور اُن

سے طبعِ ثانی کے لیے رہنمائی کی درخواست کی۔ افسوس سے یہ لکھنا پڑ رہا ہے کہ تحفظِ ختمِ نبوت کے سلسلہ سے منسلک بعض حضرات نے اِس سلسلہ میں انتہائی بخل سے کام لیا جو کہ اُن کے شایانِ شان نہ تھا۔ بہرحال احقر نے سید ذوالکفل شاہ بخاری سے بھی طبعِ ثانی کے لیے رہنمائی طلب کی تو انھوں نے کہا کہ کتاب اچھی ہے۔ البتہ ایک چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ مرزا قادیانی نے اپنے مخالف جن علما و مشائخ کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور ان کے خلاف سب و شتم کا طوفان برپا کیا ہے، مرزائی لٹریچر کی رو سے انھیں یکجا کرنا ضروری ہے۔ یہ صائب مشورہ احقر کو بہت پسند آیا۔ دراصل مذکورہ کتاب کی تحریر، کمپوزنگ اور طباعت تین ماہ کے قلیل وقت میں مکمل ہوئی۔ آٹھ صد صفحات پر مشتمل سو سالہ تاریخ اتنے کم وقت میں لکھنا محض اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہی ممکن ہوا۔ بعض افراد اور واقعات کا تذکرہ نہ ہونے کے باوجود الحمدللہ یہ کتاب اپنے موضوع پر پہلی کتاب ہونے کا اعزاز رکھتی ہے۔ طبع ثانی میں انشاءاللہ تمام کمزوریوں کو دور کر دیا جائے گا۔

تقریباً دس بارہ سال قبل وزارتِ تعلیم کے شعبۂ نصاب کے زیرِ اہتمام دینی مدارس کے اساتذہ کرام کو جدید علوم کے مبادیات اور جدید طریقہ ہائے تدریس سے روشناس کرانے کے لیے مختلف مقامات پر تربیتی کورسز منعقد کیے جاتے تھے۔ ان کورسز کے روحِ رواں محترم ڈاکٹر محمد حنیف صاحب ہوتے تھے۔ ملتان میں منعقد ہونے والے ایک ایسے کورس میں محترم مولانا محمد الیاس چنیوٹی اور راقم الحروف شریک ہوئے۔ اس ہفت روزہ پروگرام میں مختلف اہلِ علم کے لیکچرز ہوئے جن میں سے پروفیسر شیخ رشید احمد صاحب کا ریاضی پر اور سید ذوالکفل شاہ صاحب کا انگریزی پر لیکچرز ایک یادگار حیثیت رکھتے تھے۔ علمی کمال اور فنِ خطابت کا حسین امتزاج ذوالکفل شاہ صاحب کے لیکچرز کی بنیادی خصوصیت تھی اور یہ احقر کا ان سے پہلا تعارف تھا۔

سید محمد ذوالکفل بخاری نے انگلش اور اردو میں ایم اے کیا ہوا تھا۔ اور وہ ملتان کے ایک کالج میں انگلش لیکچرار تھے۔ چند سال پہلے حکومت سعودیہ نے پاکستان سے اڑھائی سو انگلش ٹیچر طلب کیے جو کہ سعودی بچوں کو انگریزی کی تعلیم دیں۔ اس سلسلہ میں وہ بھی منتخب ہو کر سعودی عرب چلے گئے۔ وہاں ان کا تقرر تبوک کے نواحی علاقہ میں کیا گیا اور وہ خدمات سرانجام دیتے رہے۔ تقریباً ایک سال پہلے یہ خوش آئند خبر سنی کہ وہ ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ میں انگلش لیکچرار کی حیثیت سے منتخب ہوئے ہیں۔ وہ یکسوئی سے بیٹھنے والے نہ تھے۔ سعودی عرب میں علمی و ادبی شخصیات سے مسلسل رابطہ میں رہتے تھے اور علمی و ادبی تقریبات میں گرم جوشی سے حصہ لیتے تھے۔ اپنے ذوق کی تکمیل کے لیے وہ ادبی و علمی کتب کے حصول کے لیے سرگرداں رہتے تھے۔ کئی علمی، تاریخی، ادبی، تحقیقاتی کام ان کے پیشِ نظر تھے۔ بعض موضوعات پر وہ لکھ رہے تھے اور بعض پر لکھنے کا ارادہ تھا۔

لیکن اللہ تعالیٰ کو ان کے ارادوں کی تکمیل منظور نہ تھی۔ ۱۵/نومبر وہ مکہ مکرمہ میں ایک ٹریفک حادثہ میں اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہو گئے۔ خالق کی مصلحتیں سمجھنا مخلوق کے لیے ناممکن ہے۔ بہرحال یہ حادثہ ایک تڑپا دینے والا حادثہ تھا۔ جس نے بھی سنا، دل تھام کر رہ گیا۔ بے شمار افراد تعزیت کے لیے دارِ بنی ہاشم ملتان گئے۔ احقر نے بھی حاضری دی۔ آفرین ہے پیر جی سید عطاء المہیمن شاہ بخاری، سید محمد کفیل شاہ بخاری ان کے والدین اور دیگر اعزہ پر کہ انھوں نے کمال صبر سے اِس صدمہ کو برداشت کیا اور **الصبر عند الصدمة الاولیٰ** کے فرمانِ نبوی پر عمل پیرا ہوئے۔

سید ذوالکفل بخاری مرحوم اس لحاظ سے بھی خوش قسمت تھے کہ حرم شریف میں ان کی نماز جنازہ ادا کی گئی جس میں ایامِ حج کی وجہ سے لاکھوں افراد شریک ہوئے، اور انھیں جنت المعلیٰ میں ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے قدموں میں جگہ ملی۔

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

وضعدار انسان

میاں حیات سرگانہ (ملتان)

حضرت امیر شریعت عطاء اللہ شاہ بخاریؒ برِصغیر کی وہ اہم شخصیت ہیں جن کا مقام تاجِ برطانیہ کو بھی معلوم تھا اور ہندوستانی مسلمان بھی برابر قدر کیا کرتے تھے۔ اس خاندان سے سرگانہ خاندان کا تعلق ایک صدی پر محیط ہے۔ اِس تعلق میں نیازمندی بھی تھی، دوستی اور خانہ واحدی بھی۔

خانقاہ سراجیہ کے بھائی حامد سراج نے اچانک فون پر یہ جانکاہ خبر دی کہ ہمارے پیارے دوست جناب ذوالکفل بخاری مکہ مکرمہ میں ایک حادثے میں اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔خبر کیا تھی، ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔فوراً اور بے اختیار زبان پر انا للہ وانا الیہ راجعون کی آیت جاری ہوگئی۔ قضا سے کسی کو مفر نہیں، یہ قانونِ فطرت ہے۔مگر آغاز وابتدائے جوانی کا یہ حادثہ والدین،عزیز واقارب اور یار دوستوں کے لیے ایک امتحان ہوا کرتا ہے۔ بیوی بچے تو اِس امتحان کے قابل ہی نہیں ہوا کرتے۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں اپنی حفظ وامان میں رکھے اور ہمارے پیارے دوست کی قبر کو جنت کا باغ بنائے۔آمین۔

جناب ذوالکفل بخاری درس وتدریس سے وابستہ ہونے کے ناتے تعمیرِ انسانیت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ علم بانٹنا اور تعمیرِ قوم وملت سے وابستگی اُن کا خاندانی وصف اور عطا تھی۔ مجھے اُن سے دوستی پر دوطرح سے ناز تھا۔ایک طرف وہ حضرت امیر شریعت عطاء اللہ بخاریؒ کے نواسے تھے،اور دوسری طرف ماہرِ تعلیم اور علم وادب کے شہسوار تھے۔ وہ اپنے دوستوں کی محفل کی جان ہوا کرتے تھے۔نوجوانی میں حلم، بردباری، فصاحت و بلاغت اُن کا طرۂ امتیاز اور ہنسی مذاق میں اُن کا منفرد انداز تھا۔ یہ صفات خاص ہستیوں میں ہی ہوا کرتی ہیں۔ یاروں کے یار ہونے کے ناتے اکثر دوستوں کو دارِ بنی ہاشم میں پرتکلف ناشتہ پر اکٹھا کرنا اُن کا معمول ہوا کرتا تھا۔ دائمی مسکراہٹ، پرتپاک معانقہ اور خلوص سے دوستوں کی تکریم اُن کی شخصیت کا امتیاز تھا۔ وہ تصنع اور بناوٹ سے کوسوں دور ایک وضع دار انسان تھے۔المناک خبر پا کر میں فوراً دارِ بنی ہاشم پہنچا۔ میں حواس باختہ حالت میں جب اُن کے والدِ محترم سید محمد وکیل شاہ صاحب سے تعزیت کے لیے گلے ملا تو بے اختیار رونا آگیا۔حضرت پیر جی سید عطاء المہیمن بخاری اور جناب کفیل بخاری جنھیں دلاسہ دینے کے لیے عزیز واقارب، یار دوست اور عقیدت مند جمع ہورہے تھے۔ یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ وہ آنے والوں کو دلاسے دے رہے تھے اور صبر کی تلقین کررہے تھے۔اُن کا حوصلہ اور صبر دیکھ کر میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ بنو ہاشم اور حسینی ایسے ہی ہوتے ہیں۔اللہ رب العزت بھائی ذوالکفل کو جنت الفردوس میں خوش وخرم رکھے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

پروفیسر سید ذوالکفل بخاری

مولانا سعید احمد جلالپوری

۲۶/ ذوالقعدہ ۱۴۳۰ھ مطابق ۱۵/ نومبر ۲۰۰۹ء بروز اتوار سعودی وقت کے مطابق دوپہر ایک بج کر بیس منٹ، امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے سبطِ اصغر، سید وکیل شاہ صاحب کے لختِ جگر، امیرِ احرار پیرجی سید عطاء المہیمن بخاری کے داماد، برادرم سید کفیل شاہ بخاری کے برادرِ خورد، جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ کے شعبہ انگلش کے استاد، خواجۂ خواجگان حضرت مولانا خواجہ خان محمد دامت برکاتہم کے مرید و مسترشد اور صالح و متقی نوجوان جناب پروفیسر سید ذوالکفل شاہ بخاری ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ سے پڑھا کر واپس آتے ہوئے روڈ ایکسیڈنٹ میں شہید ہوگئے۔ انا للّٰہ وانا الیہ راجعون. ان للّٰہ ما اَخذ ولہ ما اعطی و کلُ شیٌ عندہ باَجَلٍ مُّسَمًّی.

خانوادۂ بخاری، دارِبنی ہاشم او رماہنامہ نقیبِ ختمِ نبوت ملتان سے منسلک حضرات کے لیے پروفیسر سید ذوالکفل شاہ بخاری کا نامِ نامی اور اسمِ گرامی، اجنبی اور نامانوس نہیں ہوگا اور وہ اُن کے شعر و ادب اور تحریر و انشا کی صلاحیتوں سے بھی ناآشنا نہ ہوں گے۔

اے کاش کہ یہ روسیاہ اُن کی زیارت و مخاطبت کے اعزاز سے بہرہ ور نہ ہوسکا، لیکن بعد از شہادت سعودی اور پاکستانی اخبارات میں اُن کے وقیع تذکروں سے اُن کی جلالتِ قدر اور خداداد صلاحیتوں کا کسی قدر اندازہ ہوا۔

اُن کو سعودی عرب گئے ہوئے کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا، یہی کوئی سات آٹھ سال ہوئے تھے۔ اور وہ بھی کسی مرکزی شہر میں نہیں بلکہ سعودی عرب کے ایک دور افتادہ شہر اُملج میں اُن کا قیام تھا۔ اور اُن کو جامعہ ام القریٰ منتقل ہوئے ابھی ایک سال بھی نہ ہوا تھا، مگر بایں ہمہ اردو نیوز جدہ نے اُن پر جس قدر مقالات و مضامین اور تفصیلی بلکہ خصوصی فیچر اور صفحات شائع کیے، اُنھیں دیکھ اور پڑھ کر اندازہ ہوا کہ اُنھوں نے اپنے مختصر قیامِ سعودی عرب میں اپنا کتنا بڑا حلقہ بنالیا تھا اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے اِس جدید طبقہ کو کس قدر اپنا گرویدہ بنالیا تھا، اور اخباری برادری سے اپنی خداداد صلاحیتوں کا کس طور پر لوہا منوالیا تھا۔

برادرِ عزیز جناب مولانا احمد عبدالقیوم گلگتی متعلم جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ نے بتلایا کہ موصوف ایک فرشتہ صفت انسان تھے۔ عام طور پر انگلش پڑھے لکھے لوگ حاملین دین و مذہب کو خاطر میں نہیں لاتے اور اُن کی اپنی ایک دنیا ہوتی ہے، مگر موصوف نے جامعہ ام القریٰ کے انگلش استادوں کو اصلاح وارشاد کی ایک لڑی میں پرو رکھا تھا اور پوری جامعہ کے اساتذہ اُن کو عزت واحترام کی نگاہ

سے دیکھتے تھے اور ان کی صحبت کی برکت سے بہت سوں کے قبلے درست ہوگئے تھے۔ اِسی طرح جدہ کی مجلسِ علم وادب اور شعر وانشا میں اُن کا ایک خاص وزن تھا، چنانچہ وہ چھٹی کے دنوں میں اپنے حلقۂ احباب کو روحانی خوراک پہنچانے کے لیے جدہ کا سفر فرماتے تھے اور اُن کے خوابیدہ اور ٹھنڈے جذبات اور پژمردہ روح کو گرما آتے۔

ان کے تفصیلی احوال کے لیے تو ماہنامہ نقیبِ ختمِ نبوت دسمبر ۲۰۰۹ء کا شمارہ دیکھا جائے۔ لیکن بہرحال ان کے حالات وکمالات اور استعداد وصلاحیتوں اور جلد دنیا سے رخصت ہوجانے سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تیزی دراصل اِسی وجہ سے تھی کہ اُن کو تھوڑے دنوں میں زیادہ کام کرنا تھا۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ جب بعض حضرات کی حیاتِ مستعار کسی قدر قلیل اور محدود ہو اور اُن کے کرنے کے کام زیادہ ہوں تو غیر اختیاری طور پر اُن کی رفتارِ کار میں تیزی آجاتی ہے۔ چنانچہ وہ سالوں کا کام مہینوں اور مہینوں کا ہفتوں اور ہفتوں کا دنوں میں کرلیتے ہیں اور اپنے حصے کا کام جلدی جلدی نمٹا کر آناً فاناً جانبِ منزل رختِ سفر باندھ لیتے ہیں۔

دیکھا جائے تو جناب پروفیسر سید ذوالکفل شاہ بخاری شہید کا معاملہ بھی کچھ اسی طرح کا تھا کہ اُنھوں نے اپنی زندگی اور حیاتِ مستعار کی صرف چالیس بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ وہ شہرت وناموری کی اُس بام پر پہنچ گئے جہاں عام طور پر لوگ ساری زندگی محنت کرکے بھی نہیں پہنچ پاتے۔ بلاشبہ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا گیا ہے:

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

مخدوم ومکرم جناب پروفیسر ذوالکفل شاہ بخاریؒ کی رحلت خاندانِ بخاری کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے، اور بطورِ خاص بوڑھے والدین اور اُن کی بیوہ اور معصوم بچوں کے لیے بہت بڑا حادثہ ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق نصیب فرمائے اور اُن کے معصوم بچوں کی کفایت وکفالت فرمائے۔

بایں ہمہ یہ امر لائقِ صد رشک ہے کہ اُن کی خواہش وآرزو کے عین مطابق اُنھیں حدودِ حرم میں موت آئی اور وہ بھی شہادت کی۔ مولانا احمد عبدالقیوم گلگتی صاحب کا بیان ہے کہ بوقتِ وفات اُن کی اُٹھی ہوئی شہادت کی انگلی اُن کے کلمۂ شہادت اور اعلانِ توحید کی واضح علامت تھی اور اُن کے چہرے کا اطمینان وسکون اور چہرے سے پھوٹتا ہوا نور اُن کی سعادت کی علامات تھیں۔ پھر حرمِ مکہ اور مسجد الحرام میں قریب قریب پندرہ بیس لاکھ کے اجتماع اور دنیا بھر کے اقطاب وابدال کا اُن کی نمازِ جنازہ پڑھنا اور احاطۂ بنی ہاشم اور اپنی دادی حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے قدموں میں تدفین کی سعادت کا اعزاز حاصل ہونا بھی اُن کے طِبْتَ حيًا وَ طِبْتَ ميتًا کی کھلی شہادت ہے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے اور اُن کے خاندان کو اِس سانحہ کے سہارنے کی ہمت نصیب فرمائے۔ آمین۔ ادارۂ بینات اور جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے اساتذہ اور کارکنان اس سانحہ کو اپنا ذاتی سانحہ سمجھتے ہوئے خاندانِ بخاری کے غم واندوہ میں برابر کے شریک ہیں۔ الٰہم اغفر له وارحمه واعف عنه واكرم نزله۔ قارئینِ بینات سے درخواست ہے کہ مرحوم کو اپنی دعاؤں اور ایصالِ ثواب میں فراموش نہ فرمائیں۔

رجل صالح

پروفیسر قاضی محمد طاہر علی الہاشمی

ذاتی طور پر متعارف شخصیات کے حالات زندگی پر قلم اٹھانا نسبتاً آسان ہے مگر جن شخصیات سے زندگی بھر ملاقات ہی نہ ہوئی ہو ان کے متعلق کچھ لکھنا یقیناً ایک مشکل امر ہے۔ آئندہ سطور ایک ایسی شخصیت کے متعلق ہدیہ قارئین کی جارہی ہیں جس سے دفتر احرار لاہور اور چناب نگر میں متعدد مرتبہ حاضری کے باوجود بالمشافہ ملاقات تو نہ ہوسکی البتہ اس سے روحانی، علمی و ادبی تعلق ضرور رہا ہے۔

ایک مرتبہ نقیب ختم نبوت میں ان کے دورۂ بالاکوٹ سے متعلق روداد پڑھی تو اس بات پر سخت افسوس ہوا کہ اُن کے راستے میں ہونے کے باوجود آتے جاتے ہوئے ''میزبانی'' کے شرف سے کیوں محروم کیا گیا؟ جس پر بھائی سید محمد کفیل بخاری سے ٹیلی فون پر باقاعدہ ''احتجاج'' بھی کیا گیا۔ اس طرح ملاقات کا ایک آسان موقع بھی نصیب نہ ہوسکا۔

۱۶/ نومبر ۲۰۰۹ء کو موبائل پر خود بھائی محمد کفیل بخاری کی طرف سے پروفیسر ذوالکفل بخاری کے حادثۂ ارتحال سے متعلق ایک روح فرسا پیغام موصول ہوا تو دل مسوس کر رہ گیا اور دیر تک کلمۂ ''استرجاع'' کا ورد جاری رہا۔ بعد میں اسی دن فون پر ان سے تعزیت کر دی پھر ۲۰/ نومبر کو خطبۂ جمعہ میں مرحوم کے واقعۂ شہادت اور سفر آخرت کی کچھ تفصیل بیان کر کے ان کے درجات کی بلندی کے لیے اجتماعی دعا کرائی۔ اس کارروائی سے ایک گونہ اطمینان ہو گیا اور کچھ لکھنے کا خیال ترک کر دیا۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ شہید کی یاد میں ادارہ نقیب ختم نبوت ایک خصوصی اشاعت کا اہتمام کر رہا ہے تو ان کی یاد تو کیا خود اپنی ''یاد'' کو محفوظ بنانے کے لیے قلم اٹھا لیا کہ کہیں یہ سنہری موقع بھی ضائع نہ ہو جائے۔ شمسی کیلنڈر کے اعتبار سے شہید کی کتاب حیات (از ۱۰/ دسمبر ۱۹۶۹ء تا ۱۵/ نومبر ۲۰۰۹ء) پچیس دن کم چالیس بہاروں پر مشتمل ہے۔ جب کہ اسلامی کیلنڈر کی رو سے اکتالیس بہاریں شمار ہوتی ہیں۔ یقیناً ان میں کچھ ''خزاؤں'' کی بھی آمیزش ہوگی جو اہلِ حق کا سرمایۂ حیات متصور ہوتی ہیں۔

موصوف عمر کے لحاظ سے قرآنی اصطلاح میں ''اشُدّ'' (۳۰ تا ۴۰ سال) کی حد کو عبور کر چکے تھے جسے مفسرین و محدثین نے کمال عقل و کمال قوت وتمیز کی عمر قرار دیا ہے مگر پروفیسر سید محمد وکیل شاہ صاحب بخاری زید مجدہ نے تو شہید کی ولادت کے بعد ایک پیغمبر کے اسم گرامی پر ''ذوالکفل'' نام تجویز کیا تھا۔ قرآن عزیز میں یہ نام دو مرتبہ (سورۃ الانبیاء آیت ۸۵ سورۃ ص آیت ۴۸ میں) آیا ہے۔ موخرالذکر آیت میں یہ حکم دیا گیا کہ: **وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَالْكِفْلِ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَار** (اور یاد کرو اسمٰعیل، الیسع اور ذوالکفل (کے واقعات) کو، اور یہ سب بہترین لوگوں میں سے ہیں۔) اور عجیب اتفاق ہے کہ سورۃ ص کی موجودہ اور نزولی ترتیب کا نمبر ۳۸ ہے (یہ ملحوظ رہے کہ سورۃ نوح ۷۱ اور سورۃ الانفطار ۸۲ کی ترتیب بھی ایک جیسی ہے) جس کا عدد موصوف کی عمر کے قریب قریب ہے۔ اکثر علمائے تفسیر کے نزدیک ذوالکفل ایک پیغمبر کا نام ہے جب کہ بعض کے نزدیک وہ پیغمبر نہیں تھے بلکہ ایک مردِ صالح تھے۔ قرآنِ عزیز نے بھی اُنھیں جہاں **كُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَار** کہا وہاں اُنھیں **انهم من الصّٰلحين** بھی قرار دیا۔ (سورۃ الانبیاء آیت ۸۶)

شہید کے ماموں اور خسر پیرجی سید عطاء المہیمن بخاری نے بھی برموقعِ تعزیت فرمایا کہ اپنی عمر کے اعتبار سے ہمارے خاندان کا وہ صالح ترین نوجوان تھا۔ (نقیب ختم نبوت ص ۲۶، دسمبر ۲۰۰۹ء) گویا قرآنِ عزیز نے ذوالکفل پیغمبر کو صالح کہا اور اُن کے نام پر جس کا نام رکھا گیا اُسے سب سے زیادہ قریب سے جاننے والے نے بھی ''صالح ترین'' ہی قرار دیا۔ موصوفؒ کے آئینۂ اخلاق میں امانت و دیانت، اخلاص وخشیت، عفو و درگزر، تواضع و فیاضی، حمیتِ دینی اور مہمان نوازی کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ اس لیے ان کے نام کی مماثلت و برکت، حالات زندگی، حضرت پیرجی کی شہادت اور سب سے بڑھ کر ان کے حسن انجام کے پیش نظر اپنے تاثرات قلمبند کرنے کے لیے ''رجل صالح'' کے عنوان کو ہی ترجیح دی گئی۔

لغت میں اگرچہ ''الکفل'' کے بہت سے معانی ہیں لیکن حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے ذوالکفل پیغمبر کے حالات میں بحوالۂ ابنِ کثیر ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے آخر میں لفظ ''ذوالکفل'' کے متعلق لکھا ہے کہ: ''ایسا شخص جو اپنے عہد اور ذمہ داری کو پورا کرے۔'' (معارف القرآن جلد ۶ ص ۲۱۹) اِس توجیہہ کے اعتبار سے بھی موصوفؒ اسمِ با مسمیٰ تھے۔ انھوں نے اپنے عہد اور ذمہ داری کو خوب نبھایا۔

نام کی تاثیر سے انکار ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''ذوالکفل'' نام نے اُن کی شخصیت کے ہر ہر پہلو پر اپنا اثر دکھایا ہے۔ بالخصوص ذہانت و فطانت کی صفت ایسی تھی کہ اپنے پرائے سبھی اس کے قائل ومعترف تھے۔ ان کی غیرمعمولی ذہانت و فطانت کا اظہار کرتے ہوئے جانشینِ امیر شریعت حضرت ابومعاویہ ابوذر سید عطاء المنعم شاہ بخاریؒ کے نوکِ قلم پر ''چشمِ بددور'' کے الفاظ آ گئے (تحت مقدمہ۔ مشاہداتِ قادیان)

پروفیسر ذوالکفل بخاریؒ پر ان کے نام کا ایک اثر یہ بھی مرتب ہوا کہ وہ ''نکتہ نواز، نکتہ پرور، نکتہ سنج، نکتہ داں، نکتہ شناس اور نکتہ رس'' ثابت ہوئے۔

۱۹۹۶ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت میں جہانگیر بدر کے پاس وزارتِ مذہبی امور کا قلمدان تھا۔ میاں نواز شریف ان دنوں اپوزیشن لیڈر کی حیثیت سے حکومت کے خلاف احتجاجی ریلیاں نکالنے میں مصروف تھے۔ جہانگیر بدر نے دھمکی دیتے ہوئے جواباً کہا کہ ''ہم ریلیوں سے ڈرنے والے نہیں ہیں۔ میں تو ''ریلی'' میں ہی پیدا ہوا ہوں۔'' اِس پر جو نکتہ رسی پروفیسر موصوفؒ نے کی وہ کسی کے حاشیۂ ذہن میں بھی نہیں آسکتی تھی۔ چنانچہ اُنھوں نے اِس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ:

> میدانِ جنگ میں پیدا ہونے والے کو ہندی میں ''رن جن'' کہتے ہیں۔ جہانگیر بدر وزیرِ مذہبی امور نے اعتراف کیا ہے کہ وہ ''ریلی'' میں پیدا ہوا۔ اِس طرح وہ ''ریلی جن'' ہوگیا۔ انگریزی میں یہ لفظ مذہب کے ہم معنی ہے۔ اِس طرح وزارتِ مذہبی امور اس کا پیدائشی حق ہوگیا ہے۔ اب اس پر کسی کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ (روزنامہ نوائے وقت ۳۰/اکتوبر ۱۹۹۶ء، تحت کالم سرِ راہے زیرِ عنوان ''رن جن'')

پروفیسر ذوالکفل بخاریؒ اگرچہ ضابطے کے عالم نہ تھے مگر بقول مولانا محمد ازہر وہ ''حقیقتاً'' عالم تھے۔ وہ ایم اے انگریزی، ایم اے اردو، بی ایڈ، ایل ایل بی، نمل یونیورسٹی اسلام آباد سے انگلش لینگویج اور علامہ اقبال یونیورسٹی سے TEFL کی اسناد کے حامل اور ممتاز ادیب، مقرر، شاعر، دانشور، فلسفی، لغت نویس اور ایک مشفق و قابل استاد تھے۔ موصوفؒ نے راقم الحروف کی دو کتابوں (اہلِ بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کون؟ اور تذکرہ خلیفۂ راشد امیرالمؤمنین سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ) پر ایسے جان دار تبصرے لکھے ہیں جن سے ان کی علمی وسعت، عقیدے کی پختگی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بالخصوص سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایسی والہانہ محبت وعقیدت کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے جس کی توقع کسی دیوبندی

عالم (الا ماشاءاللہ) سے بھی نہیں رکھی جاسکتی۔ یقیناً یہ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کا اثر ہے جو لسانِ نبوت سے سے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کے لیے کی گئی تھی: **ان ابنی هذا سید لعل الله ان یصلح به بین فئتین عظیمتین من المسلمین. (صحیح بخاری، کتاب الصلح، باب قول النبی للحسن بن علی رضی الله عنها ......)** میرا یہ بیٹا (نواسہ) سید ہے۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس کے ذریعے مسلمانوں کے دو بڑے گروہوں میں صلح کرادے گا۔ جس طرح اس وقت صلح حسن رضی اللہ عنہ سے یہودیوں، مجوسیوں، منافقوں، تفرقہ بازوں، ابنِ اُبَیّ اور ابنِ سبا کے تربیت یافتہ مفسدوں کی امیدوں پر اوس پڑ گئی تھی اسی طرح آج ذریتِ حسن رضی اللہ عنہ میں خانوادہ امیر شریعتؒ کے ہر ہر فرد نے دفاعِ معاویہ رضی اللہ عنہ کا فریضہ سرانجام دے کر دشمنانِ صحابہ رضی اللہ عنہم کو مایوس ہی نہیں کیا بلکہ ان کے ''کس بل'' بھی نکال دیے۔

پروفیسر ذوالکفل بخاری کتاب وسنت کی روشنی میں صحابہ رضی اللہ عنہم کا مقام بیان کرنے کے بعد کس جرات و بے باکی کے ساتھ لکھتے ہیں:

> حیف! صد حیف! کہ آج بڑے بڑے مدعیانِ اسلام پر بے توفیقی غالب آرہی ہے۔ ''سبّ'' کا ارتکاب ہو رہا ہے۔ ''غلو'' کا اظہار ہو رہا ہے اور کوئی پوچھنے والا نہیں...... مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟ ایسے ماحول میں فاضلِ اجل محترم قاضی محمد طاہر علی الہاشمی کی یہ تازہ تالیف غیرتِ ایمانی کا ایسا اظہار ہے جس میں دانشِ نورانی اور دانشِ برہانی بکمال وتمام موجود ہیں۔ ایسی کتاب کی تحسین کا حق چند سطروں بلکہ چند صفحوں میں بھی ادا نہیں ہوسکتا۔ اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ قاضی صاحب زید مجدہم یقیناً صاحبِ توفیق بزرگ ہیں۔ ان کے توفق میں اور ان کے موفق ہونے میں کوئی خارجی، ناصبی اور سبائی ہی کلام کرسکتا ہے۔ اور اُسے ایسا کرنا بھی چاہیے کیونکہ اسے تو امیر المومنین سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافتِ راشدہ میں رکنیتِ غیر راشدہ اور ان کے تفقہ و اجتہاد میں خطاءِ اجتہادی یا خطاءِ عنادی نظر آتی ہے، کبھی صورتاً اور کبھی حقیتاً۔ کتاب علمی اور تحقیقی ہے۔ ابن امیر شریعت سید عطاء المحسن بخاری مدظلہ نے نہایت اصولی مقدمہ لکھ کر اس کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ زبان شستہ و رفتہ ہے۔ (ماہنامہ نقیبِ ختمِ نبوت ص ۵۷، ۵۸؛ جنوری ۱۹۹۶ء)

موصوفؒ ۱۹۹۴ء میں اہلِ بیتِ رسول صلی اللّٰہ علیہ وسلم کون؟ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> اِس کتاب کے سرورق پر ایک چھوٹی سے سطر، کچھ غیر نمایاں سی، کچھ دبی ہوئی اور کچھ بھنچے ہوئے اندازِ کتابت کے ساتھ چھپی ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یہ ایک سطر کتاب کے لیے تعارف ہی نہیں ''تبصرے'' کا بھی کام دے رہی ہے۔ لکھا ہے کہ ''ایک منفرد، تاریخی، علمی اور تحقیقی شاہکار'' آج جب کہ تاریخ، علم اور تحقیق سے انصاف کرنے والے لوگوں کا دور گویا لد چکا ہے اور پروپیگنڈہ کی ''چمک'' کا شکار ہونے والے خیرہ چشموں کی تعداد روز افزوں ہے کوئی کتاب محنت، لگن، اخلاص اور دیانت سے لکھی جائے تو یہ غنیمت نہیں بسا غنیمت ہے اور ایسی کتاب کہیں دکھائی دے بلکہ نظر نواز ہو تو یوں لگتا ہے......
>
> جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
> جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
> جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

محترم قاضی محمد طاہر علی الہاشمی ایک کالج میں پروفیسر ہیں، ایک مسجد میں خطیب ہیں ایک سے زائد کتب کے

مؤلف ہیں (اب الحمدللہ مختلف موضوعات پر تبصرہ کتب شائع ہوچکی ہیں) بیک وقت مؤرخ، معلم اور محقق ہیں۔
ہر جگہ کامیاب، ہر جگہ ارجمند۔

ہاشمی صاحب نے روانی، سلاست اور متانت کے ساتھ پوری کتاب میں حقائق کو الم نشرح کیا ہے۔ انھوں نے تفسیر، لغت، حدیث، سیرت، عقائد واسماء الرجال، فقہ اور سیر الصحابہ رضی اللہ عنہم کے حوالے سے تقریباً ایک سو کتب کھنگالنے کے بعد قلم اٹھایا تو ایک ایک ابہام کو ختم کرتے، اشکال کو رفع کرتے، الجھن کو سلجھاتے اور اپنے موقف کو محکم کرتے چلے گئے۔ ان کا طرزِ فکر، طرزِ تحقیق، طرزِ استدلال اور طرزِ تحریر سب ہی راستی اور راست روی سے عبارت ہیں۔ نتیجتاً انھیں سبائیوں کی تلبیسات، بریلویوں کے تضادات اور دیوبندیوں کے تسامحات پر گرفت کرنے میں میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔

اصلاحِ عقائد بہت نازک مگر بہت اہم کام ہے اور یہ بات باعثِ مسرت ہی نہیں بلکہ قابلِ رشک بھی ہے کہ ہمارے ممدوح مولف نے اہلِ بیتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم جیسے اہم عنوان پر اصول وعقائد کی بنیاد پر جو گفتگو کی ہے اُس میں مسلّمات اور مسلّمہ تصریحات کو کمال عمدگی سے بے غبار کیا ہے۔

کتاب کا مقدمہ مولانا محمد سعید الرحمٰن علویؒ کے قلم سے ہے، اور یہ شاید اُن کی آخری تحریر ہے۔ (موصوف ۲۰/ اکتوبر ۱۹۹۴ء کو وفات پاگئے۔) آہ یہ اسلوب اب کہیں دیکھنے کو نہ ملے گا...... اِک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے۔ یہ کتاب ہر اعتبار سے یادگار ہے اور ہر لحاظ سے شاہکار۔

(ماہنامہ نقیبِ ختمِ نبوت ملتان، ص ۵۵، ۵۶۔ دسمبر ۱۹۹۴ء)

جی چاہتا ہے کہ موصوف کے وہ ریمارکس جو اُنھوں نے علامہ سعید الرحمٰن علویؒ کے اسلوب پر دیے تھے، خود اُن ہی کی طرف لوٹا دیے جائیں کیونکہ وہ بجا طور پر خود اِن ریمارکس کے مستحق ہیں اور اِسی سفر پر روانہ بھی ہوچکے ہیں۔ ''اِک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے۔''

راقم الحروف نے کافی عرصہ پہلے بھائی محمد کفیل بخاری سے درخواست کی تھی کہ ماہنامہ نقیبِ ختمِ نبوت میں شائع ہونے والے اداریے اِس عنوان (یعنی دل کی بات) سے ہی کتابی صورت میں شائع کردیے جائیں۔ انھوں نے وعدہ بھی فرمایا تھا مگر وہ اپنی دیگر مصروفیات کی وجہ سے اس طرف توجہ نہ دے سکے۔ اب اُن سے یہ اضافی استدعا ہے کہ پروفیسر ذوالکفل بخاری شہید کی جملہ تحریری کاوشیں بالخصوص مختلف کتب پر ان کے تبصرے علیحدہ کتابی صورت میں شائع کردیے جائیں۔

جناب سید محمد کفیل بخاری نے لکھا ہے: والد ماجد مدظلہ نے بڑی چاہت اور محبت سے ان کا نام اللہ تعالیٰ کے ایک پیغمبر حضرت ذوالکفل علیہ السلام کے نام پر رکھا۔ اللہ تعالیٰ کو اُن کی چاہت اور محبت ایسی پسند آئی کہ اُس نے نہ صرف نام کی معنوی مناسبتیں عطا کیں بلکہ حسنِ انجام کے اعتبار سے اس عظیم نعمت سے بھی نواز دیا جس سے حضرت اسماعیل، ادریس اور ذوالکفل علیہم السلام کو نوازا تھا۔ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِدْرِیْسَ وَذَاالْکِفْلِ کُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیْنَo وَاَدْخَلْنٰھُمْ فِیْ رَحْمَتِنَا اِنَّھُمْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ (الانبیا: ۸۵، ۸۶) اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل علیہم السلام یہ سب صابر لوگ تھے۔ ہم نے اِنھیں اپنی رحمت میں داخل کرلیا۔ یہ سب لوگ نیک تھے۔

پروفیسر ذوالکفل بخاری صابر اور صالح تھے اور اللہ تعالیٰ نے بھی اُنھیں اپنی رحمت میں داخل کرلیا۔ اُملج سے جامعہ ام القریٰ میں تقرری ہی ''رحمت'' میں داخل ہونے کی نوید تھی۔ اِس نام کی یونیورسٹی اگر کسی اور شہر میں بھی واقع ہوتی تو محض ''نسبت'' بھی سعادت تھی، لیکن اِس یونیورسٹی کا نام بھی ام القریٰ تھا اور واقع بھی ام القریٰ ہی میں تھی۔

قرآن مجید میں اِس شہر کے جہاں دوسرے نام (البلد، البلدة، بلدالامین، بیت العتیق، بیت الحرام، حرم آمن، وادی غیر ذی ذرع، معاد، قریۃ، المسجد الحرام، مکۃ، بکۃ) آئے ہیں وہاں اِسے ام القریٰ سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۃ الانعام، آیت ۹۲؛ سورۃ الشوریٰ، آیت ۷۔

موصوف اگر وہاں دورانِ درس وتدریس طبعی طور پر رحلت کرجاتے تو بھی اُنھیں دوہری شہادت نصیب ہوتی کیونکہ آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ دین حاصل کرنے والا طالب علم یا حالتِ سفر میں وفات پاجانے والا مسافر بھی شہید کا درجہ پائے گا۔ لیکن حادثہ کی موت سے اُنھیں تہری شہادت نصیب ہوئی ہے۔

بوقتِ شہادت، انگشتِ شہادت آسمان کی طرف بلند کرکے کلمۂ شہادت کی تلاوت اِس پکارِ الٰہی کا جواب ہے کہ: **یا یتھا النفس المطمئنة ارجعی الیٰ ربک راضیة مرضیة فادخلی فی عبٰدی وادخلی جنتی** (سورۃ الفجر، آیت ۲۷-۳۰) اے نفس مطمئن واپس چلو اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تو اس سے راضی (اور) وہ تجھ سے راضی۔ پس شامل ہوجاؤ میرے (خاص) بندوں میں اور داخل ہوجاؤ میری جنت میں۔

موصوف ان لوگوں میں شامل ہوگئے ہیں جن کے متعلق کہا گیا کہ: **عاشَ سعیداً وَّماتَ شَھیداً**۔

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم کہ بہار آخر شد

یہ کیا کم خوش نصیبی ہے کہ جہاں موصوف زندگی میں بوقتِ تہجد کعبہ معظّمہ کے سامنے بیٹھ کر نماز کے لیے انتظار کرتے تھے وہاں ۱۶/ نومبر ۲۰۰۹ء کو اُن کا جسدِ خاکی تہجد کے وقت سے ہی نمازِ جنازہ کا منتظر ہے۔ نمازِ فجر کی ادائیگی کے فوراً بعد الصلوٰة علی المیت کے اعلان کے ساتھ ہی تقریباً بیس لاکھ فرزندانِ توحید نے نمازِ جنازہ ادا کی۔ نمازِ جنازہ کے بعد جسدِ خاکی کو تدفین کے لیے جنت المعلیٰ لایا گیا جو ام القریٰ دو احاطوں پر مشتمل بڑا اور قدیمی قبرستان ہے۔ چونکہ یہ قبرستان ام القریٰ کے محلّہ ''المعلاۃ'' میں واقع ہے اس لیے اِسے جنت المعلیٰ کہا جاتا ہے۔ اِس قبرستان میں ام القریٰ میں وفات پانے والے عہدِ اوّل سے آج تک مدفون ہیں جن میں اہلِ بیت (ام المومنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا، سید قاسم، سید عبداللہ رضی اللہ عنہما، صحابہ رضی اللہ عنہم، تابعین اور ہزاروں اولیاء وصلحاء شامل ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس قبرستان کے متعلق ارشاد فرمایا کہ ''یہ قبرستان کیا ہی اچھا ہے۔'' (مسند احمد، مجمع الزوائد)۔ موصوف کی تدفین بھی اِسی قبرستان کے احاطۂ بنی ہاشم میں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے قدمین میں عمل میں آئی۔ ذوالکفل نام نے کیا کیا رحمتیں اور برکتیں سمیٹی ہیں، اِس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔

ذیقعد میں شہادت کے مرتبہ پر فائز ہونے والے ذوالکفل نے اِس مہینے کے ساتھ ایک گونہ معنوی مناسبت قائم

کرلی۔ یہ اسلامی سال کا گیارھواں قمری مہینہ ہے۔ اِس کے لغوی معنی بیٹھنے والے کے ہیں۔ چونکہ عرب اس مہینے میں اِس کے اشہرِ حرم میں سے ہونے کی وجہ سے اپنے تمام تنازعات اور مناقشات ختم کرکے اپنے گھروں میں بیٹھ جایا کرتے تھے اِس لیے اِس کو ذیقعد کہہ دیا گیا۔ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چار میں سے تین عمروں کا احرام اسی مہینہ میں باندھا۔ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ حج کی فرضیت کے بعد بحکمِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیتِ امیرِ حج اِسی مہینہ میں روانہ ہوئے اور اگلے سال ۱۰ھ میں ایک روایت کے مطابق ۲۶/ ذیقعد کو خود نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پہلے اور آخری حج کی ادائیگی کے لیے روانہ ہوئے۔ پروفیسر ذوالکفل بخاری بھی اِسی اشہرِ حرام (ذیقعد) اور بلدالحرام میں تمام امور سے دست بردار ہوکر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بیٹھ گئے اور بمصداق کل شیءٍ یرجع الیٰ اصلہٖ وہ اپنی اصل کی طرف لوٹ گئے۔ ع پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

یہ صدا کتنی سچی ثابت ہوئی کہ: **یا دنیا اسمعی یا اھل موقف عرفة اشھدوا...... حبی لمکه لا ینقطع وتعظیمی لمکة موصول مادامت الروح لم تبلغ الحلقوم...... مکة اسم خالد فی قلبی**۔ اے دنیا تو سن لے، اے میدانِ عرفات میں وقوف کرنے والو، گواہ ہوجاؤ، مکہ مکرمہ سے میری محبت ختم نہیں ہوسکتی اور میرا مکہ مکرمہ کی تعظیم بجا لانا روح کے حلق سے پرواز کرنے تک باقی ہے۔ مکہ مکرمہ میرے دل میں ہمیشہ باقی رہنے والا ایک نام ہے۔ آج وہی مکہ مکرمہ موصوف کی آخری آرام گاہ بن گیا۔ اُن کی روح یہ کہہ رہی ہے کہ: **جسدی خالد فی مکة المکرمة...... من اسعد منی فی الدنیا**۔ میرا جسم مکہ مکرمہ میں ہمیشہ رہنے والا ہے۔ دنیا میں مجھ سے زیادہ سعادت مند کون ہے؟

موصوف تو ضیوف الرحمٰن میں سے ایک ضیف تھے۔ رحمٰن نے اپنے مہمان کے ساتھ نہایت ہی کریمانہ سلوک کیا اور اُنھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی رحمت میں داخل کرلیا۔ جس مہمان کے ساتھ اللہ تعالیٰ اِس قدر اکرام کے ساتھ پیش آئے تو اُسے صبیح الحسن وغیرہ کے مستقبل کی کیا فکر ہوسکتی ہے؟ اُس مہمان کا تو عقیدہ ہی یہ تھا کہ اللہ ہی وکیل وکفیل ہے۔ ویسے بھی اہلِ حرم کی زبان پر بالخصوص خرید وفروخت اور کسی معاہدے کے وقت اللہ وکیل اور اللہ کفیل کے الفاظ جاری رہتے ہیں۔ پھر مرتبۂ شہادت پر فائز ہونے والے کے لیے اِس عالمِ اسباب میں یہ بات بھی باعثِ اطمینان تھی کہ اُس کے والد وکیل ہیں، بڑے بھائی کفیل، اور اِن امور پر نگرانی کے فرائض سرانجام دینے والے المہیمن کی عطاء ہیں۔ عطاء المکرِم اور عطاء المنعم جس کی بھی کفالت میں جائیں گے تو یقیناً خیر المکفولین ہی کہلائیں گے۔

یوں بھی کفیل کے ایک معنی حصہ کے ہیں، اور ذوالکفل صاحبِ حصہ ہوئے۔ جب کہ کفیل کے معنی ضامن کے ہیں۔ پھر جس ذوالکفل کے ضامن خود کفیل ہوں تو عطاء المکرِم اور عطاء المنعم کو کیا پریشانی لاحق ہوسکتی ہے۔ حدیث میں کفل کے معنی اجر کے بھی آئے ہیں۔ اِس طرح کفیل تو کفلین (دواجروں) کے مستحق ہوگئے (**فبذلک فلیفرحوا**)۔ اور خود ذوالکفل کے حق میں دائمی اجر ثابت ہوگیا کیونکہ جنت المعلیٰ ایک ایسا مقام ہے جہاں بلامبالغہ روزانہ سیکڑوں مومنین بنفسِ نفیس خود حاضر ہوکر اِس کے ساکنین کے درجات کی بلندی کے لیے دعائیں کرتے ہیں۔ جب کہ دعاؤں کی غائبانہ سوغاتیں اِس کے علاوہ ہیں۔

منفرد اور برگزیدہ آدمی

مولانا مجاہد الحسینی

خاندانِ امیرِ شریعت کے نوجوانوں میں جس کے علم کا، جس کے تقوے کا، جس کی صلاحیت کا میرے دل میں اِک خاص نقش تھا وہ ذوالکفل تھا۔ میں اُس میں غیر معمولی صلاحیتیں اور منفرد انداز دیکھتا تھا۔ میں اُس سے اِتنا متاثر تھا کہ اُس کی شخصیت اور علم کے حوالے دیا کرتا تھا۔ دوستوں سے کہتا کہ اِس آدمی کی سادگی کو مت دیکھو، بلکہ اِس کی تحریر پڑھو، جس میں عمر کے لحاظ سے کسی برگزیدہ آدمی کی پختگی ہے۔ خون کا بھی تو اثر ہوتا ہے۔ ماں کی طرف سے اللہ تعالی نے صلاحیتیں بخشیں۔ باپ میں بھی میں نے وہ صلاحیتیں دیکھیں جو شاہ جی کے بیٹوں میں ہیں۔ ذوالکفل کی تربیت میں مولانا سید ابوذر بخاری کا بھی بہت حصہ ہے۔ اِن عوامل کے اثرات تو ہوتے ہیں، جو اُن کی شخصیت میں نمایاں تھے۔ اُس کے یوں اچانک چلے جانے سے بڑا علمی خلا پیدا ہو گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُس کے دونوں بیٹوں کو سلامت رکھے اور نعم البدل بنادے۔

ذوالکفل سے میری آخری ملاقات دارِ بنی ہاشم ملتان میں منعقدہ سالانہ ختمِ نبوت کورس میں ہوئی جس میں اُنھوں نے بھی لیکچر دیا۔ میں نے دیکھا جو انداز مولانا علی میاں کا تھا یا قاری طیب صاحب کا، بالکل وہی انداز تھا گفتگو کا، استدلال کا۔ بہت ہی پیارا انداز تھا۔ اِن تین چار آدمیوں مزاج ہی الگ تھا، گفتگو کا طریقۂ کار اور تقریر کا انداز بالکل منفرد تھا۔ قاری طیب صاحب، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا احمد سعید دہلوی کو میں نے زیادہ سنا ہے۔ اِن (ذوالکفل) کا انداز بالکل اُنہی کی طرح کا تھا۔ گویا ایک تسلسل تھا جس طرح آبشار کا بہاؤ ہوتا ہے۔

سید ذوالکفل کی شہادت کی خبر عشا کے بعد ٹی وی پر نشر ہوئی تو سن کر مجھے سخت صدمہ پہنچا اور مجھ پر گریہ طاری ہو گیا۔ کفیل شاہ سے فون پر اظہارِ تعزیت کیا تو بڑے حوصلے سے بات کی۔ میں نے تدفین کے متعلق پوچھا تو کہنے لگے کہ ان شاء اللہ جنت المعلیٰ مکہ مکرمہ میں ہی ہوگی۔ میں نے کہا کہ میں آنا چاہتا ہوں۔ کہنے لگا کہ آپ کی صحت سفر کے قابل نہیں۔ بس آپ دعا کریں، آنے کی زحمت نہ اُٹھائیں۔ اللہ تعالیٰ شہید کے درجات بلند فرمائے۔ آمین۔

المملكة العربية السعودية
وزارة التعليم العالي
جامعة أم القرى

مركز اللغة الإنجليزية

{إنا لله وإنا إليه راجعون}

إلى أسرة الأخ الفقيد والعزيز على قلوبنا سيد ذو الكفل بخاري　　رحمه الله تعالى

السلام عليكم ورحمة الله تعالى وبركاته، أما بعد

ببالغ الأسى والحزن تنعى إليكم أسرة مركز اللغة الإنجليزية بجامعة أم القرى بمكة المكرمة وفاة أخانا العزيز ذو المحيا الطلق والابتسامة الدائمة والظل الخفيف، الذي وبالرغم من قصر فترة بقائه بيننا بمكة إلا أنه قد ترك خلفه إخوة له أحبوه في الله يتذكرون إطلالته البهية وابتسامته المطمئنة وقد تأثروا بنبأ وفاته وفجائية مفارقته لهم ولسان حالهم يلهث بالدعاء له بالرحمة والمغفرة وسؤال الله جلت قدرته أن يتغمده بواسع مغفرته وأن يسكنه فسيح جناته وإنا لله وإنا إليه راجعون.

عسى الله أن ينزل عليكم الصبر والسلوان وأن يخلفكم بعده خيراً وأن يبارك لكم في ذريته وأهله وإخوانه وما ترك وأن يجمعنا به في جنة الفردوس الأعلى مع النبيين والصديقين والشهداء وحسن أولئك رفيقا.

نيابة عن أعضاء هيئة التدريس

مدير مركز اللغة الإنجليزية

د. سامي بن محمد غالب عطرجي

كلية العلوم الاجتماعية
مركز اللغة الإنجليزية

الرقم ...... التاريخ ...... المشفوعات ......

المملکۃ العربیۃ السعودیہ
وزارت التعلیم العالی
جامعہ ام القریٰ، مرکز اللغۃ الانجلیزیہ

انا للّٰہ و انا الیہ راجعون

دولتِ گم گشتہ، برادرِ عزیز سید محمد ذوالکفل بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کے خاندان کے نام

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، اما بعد۔

انتہائی افسوس اور رنج کے ساتھ، مرکزِ انگریزی زبان جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ کے رفقا، آپ کی خدمت میں اپنے عزیز بھائی کی وفات پر تعزیت و غمخواری کے جذبات پیش کرتے ہیں۔

ہمارے اِن بھائی کا طرزِ حیات بہت فراخ دلانہ اور کشادہ روتھا۔ دائمی مسکراہٹ اُن کی شخصیت کی پہچان تھی، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کبھی کسی کو اُن کی موجودگی گراں محسوس نہیں ہوئی۔ وہ تھے ہی ایسے، ہلکے پھلکے، ہنستے مسکراتے۔ اگرچہ مکہ میں ہمارا اُن کا ساتھ کچھ زیادہ نہیں رہا لیکن اُنھوں نے اپنے پیچھے ایسے دوستوں کو چھوڑا ہے جنھیں اُن سے اللہ واسطے کی محبت ہے۔ سب لوگ (مجالس ومحافل میں) اُن کی شاندار اور رونق وتازگی سے معمور آمد اور پُر اطمینان مسکراہٹ کو ہمیشہ یاد کرتے رہتے ہیں۔

اُن کی وفات کی خبر اور بے موقع اچانک رفاقت ٹوٹ جانے سے سب دوست بہت زیادہ متاثر ہوئے۔ ہم سب کی بے تابی گویا زبانِ حال سے اُن کے لیے رحمت ومغفرت کی دعا ہے۔ اللہ جل مجدہ سے التجا ہے کہ وہ اُنھیں اپنی کشادہ جنّات میں ٹھکانہ عطا فرمائیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ ہی آپ پر اپنی جانب سے صبر اور تسلی نازل فرمائیں گے اور اُن کے بعد آپ حضرات کو اُن کا بہترین قائم مقام عطا فرمائیں گے۔ حضرتِ حق جلّ مجدہٗ اُن کے بچوں، اہلِ خانہ، برادران واَحِبّا میں ہی آپ کے لیے برکت پیدا فرمادیں، اور ہم سب کو جنت الفردوس الاعلیٰ میں انبیا، صدیقین اور شہداء کی معیت میں بھائی سید ذوالکفل بخاری کے ساتھ اکٹھا کردیں، کہ رفاقت اور ساتھ تو وہی ہے اور وہیں کا ہے۔

مجلسِ اساتذہ کی طرف سے نیابتًا
ڈاکٹر سامی بن محمد غالب عطرجی
مدیر مرکز انگریزی زبان
۱۲/صفر ۱۴۳۱ھ
(عربی سے ترجمہ: سید صبیح الحسن ہمدانی)

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ والصّلوٰۃ والسّلام علیٰ رسول اللّٰہ وبعد

لقد عرفت الأخ ذوالکفل بخاری لفترۃ وجیزۃ لاتتجاوز عدۃ أسابیع ولکن استطعت خلالھا ان أکون فکرۃ کاملۃ عن حیاۃ واخلاق ھذا الرجل المسلم الحق. انما عرفتہ عن ھذا الرجل یمکن تلخیصہ وتحدیدہ فی نقطتین.

(۱)　لایمکن لأی شخص یقابلہ لاول مرہ الا ویحبہ من اعماق القلب.

(۲)　ذوالکفل من الاشخاص الذین اذا رایتھم ذکرت اللّٰہ.

لقد کان لی شرف معرفتہ وصحبتہ ومحبتہ فی اللّٰہ، واسال اللّٰہ ان یجمعنا بہ فی جنات عدن مع الذین انعم اللّٰہ علیھم من النبیین والصدیقین والشھداء والصالحین وحسن اولئک رفیقا.

د. عبد اللّٰہ المطرفی
مرکز اللّغۃ الانجلیزیہ
جامعہ ام القریٰ مکۃ المکرمہ

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

اللہ تبارک وتعالیٰ کی حمد وستائش اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجنے کے بعد۔

بھائی ذوالکفل بخاری کو مجھ سے متعارف ہوئے ابھی کچھ عرصہ ہی ہوا تھا جو گنتی کے چند ہفتوں سے متجاوز نہ ہوگا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں اُس جامع الصفات شخصیت کی حیات واخلاق کے بارے میں رائے دوں جو بہرحال ایک سچا مسلمان تھا۔ اُن کی شخصیت سے میری شناسائی اور واقفیت کا خلاصہ دو جملوں میں بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱)　کسی بھی شخص کے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ پہلی ملاقات میں ہی اُن کی محبت میں دل کی گہرائیوں سے گرفتار نہ ہوجائے۔

(۲)　ذوالکفل اُن لوگوں میں سے تھے جن کو دیکھنے سے اللہ کی یاد آجاتی ہے۔

بلاشبہ میرے لیے اُن سے شناسائی، اُن کی صحبت اور اللہ کے لیے اُن سے محبت کرنا باعثِ اعزاز وافتخار ہے۔ میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے جنت میں اُن کی معیت وصحبت کا سوال کرتا ہوں۔ انبیا، صدیقین اور شہداء یعنی اُن لوگوں کے ساتھ کہ جن پر اللہ جل شانہ نے انعام فرمایا، کہ ساتھ تو اُنھی کا ایسا ہے جس کو دعاؤں میں مانگا جائے۔

ڈاکٹر عبداللہ المطرفی
مرکز انگریزی زبان
جامعہ ام القریٰ، مکہ مکرّمہ
(عربی سے ترجمہ: سید عطاء المنان بخاری)

بخاری کی شام

پروفیسر محمد سلیم

عصر کی نماز کے بعد سیدھا مسجد سے گھر آیا۔ تھوڑی سی جلدی کی۔ اِسی انتظار میں کہ دوست آئیں گے۔ بخاری کی باتیں ہوں گی۔ گھر کی خواتین تو ظہر سے ہی تیاری میں مصروف تھیں۔ تقریباً سارے پاکستانی پروفیسر حضرات تشریف لائے۔ ایک قرآنِ پاک ختم ہوا۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ لب پھر کانپ سے گئے۔ دو دن سے آنسوؤں کا عمل کچھ سست تھا۔ دنیا کے جوکھوں میں کھو جانا بھی فطری عمل ہے۔ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ایک ہی آواز بلند ہوئی ...... خدا شاہ کی ہڈی ہڈی، بال بال، خلیہ خلیہ کو سکھ عطا کرے۔ ایسا سکھ جو کبھی ختم نہ ہو۔ مغرب کی نماز کے بعد چائے وغیرہ کا پروگرام تھا۔ شاہ جی کے دو چچا جو کہ حج پر تشریف لائے تھے، مدعو تھے اور شریک محفل تھے۔ مدرسہ صولتیہ سے ڈاکٹر سعید صاحب بھی شوق سے آئے۔ بعد ازاں شاہ جی کی باتیں شروع ہوگئیں۔ میری باری پہلی تھی۔ باتیں تھیں کہ ختم نہیں ہونے پاتیں۔ شاہ جی کی ایک ایک بات، ایک ایک ادا ہمیں رہ رہ کر یاد آ رہی تھی۔ وہ مسکراتا ہوا چہرہ، وہ دھیما سا لہجہ، وہ ادائیں...... شاہ جی سب کچھ ساتھ لے کر چلا گیا۔ وہ ہمیں کبھی نہیں بھولے گا۔ ایسے شخص کا ساتھ میرے لیے اعزاز کی بات تھی۔ لیکن یہ اعزاز زیادہ عرصہ نصیب نہ ہوا۔ وہ آیا بھی نہ تھا اور چلا بھی گیا۔ ہر ایک دوست شاہ جی کی خوبیوں کا معترف تھا۔ ہم نے تو شاہ جی کے ساتھ اچھا بھلا وقت گزارا تھا، یہاں صرف ایک ملاقات والے بھی اُسے بھول نہیں پا رہے۔ شاہ جی کو میں نے کبھی غصے میں نہیں دیکھا۔ ہمیشہ دھیما لہجہ اور نرم طبیعت۔ ہم چوبیس گھنٹے میں کئی بار ناراض ہوتے ہیں۔ کبھی آگ بگولا ہو جاتے ہیں۔ لیکن وہ کیا شخص تھا۔ کبھی پریشان تو نظر آیا ہو، کبھی کوئی کڑوی بات کی ہو، نہیں کبھی نہیں۔ حلفاً کہہ سکتا ہوں کہ اِس سارے عرصے میں شاہ جی کے منہ سے کوئی ایسی بات نہیں نکلی جس سے مجھے کوئی تکلیف پہنچی ہو یا کوئی طنز کا پہلو نمایاں ہو۔ اللہ نے اُنھیں بے شمار شخصی صفات سے نوازا تھا۔ شاید ہی زندگی میں ایسا دوست پھر کبھی مل سکے۔ شاید کبھی نہیں......

شاہ جی مارچ میں مکہ مکرمہ تشریف لائے۔ ایک طویل انتظار تھا۔ پہلے ویزا لیٹ ہوگیا۔ بعد میں کچھ اور یونیورسٹی کے انتظامی مسائل درپیش آئے۔ اکتوبر میں آنے کے بجائے چھے مہینے بعد آخرِ کار شاہ جی آ ہی گئے۔ بہت ساری توقعات اور منصوبے ہمارے سامنے تھے۔ اُن میں سے ایک ذمہ داری شاہ جی کو یہ دی گئی کہ میری اہلیہ جو کہ ایم اے سالِ اول (انگریزی) کی طالبہ تھی، کو لسانیات کا مضمون پڑھانا تھا۔ شاہ جی کو یہ کام کچھ مشکل سا لگا۔ شاید تقاضائے دوستی میں انکار نہیں کر سکے۔ چنانچہ دو ہفتہ کے انتظار کے بعد اُنھوں نے رضامندی کا اظہار کیا۔ میں اپنی اہلیہ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اُس شخص کی

نظروں کو دیکھا۔ نگاہ نیچی رکھے بات کر رہے تھے۔ مذاق تو ہمارا تھا ہی، جی چاہا کہ کوئی جملہ فٹ کردوں۔ مگر اُن کی طالبہ سامنے تھی۔ مختصر سے تعارف کے بعد میں کمرے سے چلا آیا۔ میری اہلیہ کا کہنا ہے کہ اِس دوران شاہ جی نے کبھی بھی آنکھ اُٹھا کر اوپر نہیں دیکھا۔ صرف آٹھ کے لگ بھگ کلاسز لیں۔ یہ تھا شاہ جی کے حیا کا عالم......

میں نے شاہ جی کو بہت مذاق کرتے دیکھا۔ ہم تینوں (سجاد، شاہ جی، میں) جب ساتھ بیٹھتے تو کئی گھنٹے خوش گپیاں چلتیں۔ لیکن کبھی بھی مجھے یہ محسوس نہیں ہوا کہ مذاق اب بیہودہ شکل اختیار کر گیا ہے یا شاہ جی نے کوئی ایسی بات کی ہو جس میں کوئی جنسی یا نسوانی لذت کا پہلو ہو۔ ہمیشہ مذاق کو مذاق کی حد کے اندر رکھنا شاہ جی کی ہی مہارت تھی۔ نہ تو وہ کسی کو بلاواسطہ تنقید کا نشانہ بناتے تھے اور نہ ہی کسی کی غیبت کرتے۔ اِس کے باوجود اُن کے ساتھ گھنٹوں بیٹھنے والے بھی کبھی تنگ نہیں ہوتے تھے۔ میں پاکستان پہلے چلا گیا تھا۔ وہ تقریباً ۳ ہفتے بعد میں گئے۔ جانے کے دوسرے دن ایک لطیفہ ارسال کیا۔ ساتھ یہ بھی لکھا کہ آپ لوگوں کو مجھ سے لطیفے سننے کی عادت تھی، سو کہیں عادت ختم نہ ہو جائے۔

آج شاہ جی ایک قصۂ پارینہ ہے۔ شاہ جی کے لیے دل خون کے آنسو روتا ہے۔ شاہ جی کی رفاقت کا ارمان قبر تک ساتھ جائے گا۔ اللہ اُسے جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

ایسی ہیں جیسے خواب کی باتیں!

پروفیسر محمد سلیم

آج ۱۵/ نومبر ۲۰۰۹ء ہے۔ میری کلاس آج دس بجے تھی۔ میں تھورا سا لیٹ تھا۔ جلدی جلدی گاڑی سٹارٹ کی۔ صبح یاد نہیں پڑتا لیکن گمان غالب ہے کہ ذوالکفل بخاری المعروف شاہ جی مجھ سے پہلے ہی اپنی گاڑی میں جا چکے تھے۔ گرمی کی چھٹیوں سے پہلے اُنھوں نے سرخ رنگ کی ۱۹۹۸ء ماڈل کرولا لی تھی۔ اچھی گاڑی تھی۔ مجھے یاد ہے جب پہلی دفعہ میں اور سجاد صاحب شاہ جی کے ساتھ حرم گئے تو ہم دونوں نے شاہ جی سے کہا کہ ابھی آپ کی ڈرائیونگ اِتنی اچھی نہیں لہٰذا ہجوم میں اور بڑی سڑکوں پر آپ گاڑی نہیں چلائیں گے۔ اِس کے بعد متعدد بار جدہ یا طائف جانا ہوا۔ کبھی میں جب کہ زیادہ تر سجاد صاحب شاہ جی کے ساتھ گاڑی چلا کر لے جاتے۔ شاید ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ ہم نے شاہ جی کو اکیلا جدہ بھیجا ہو۔ ہاں البتہ یونیورسٹی تک کئی دفعہ یا تو وہ اکیلے جاتے یا ہم میں سے کوئی ایک ساتھ ہوتا۔

آج اُن کے اکیلے جانے کی وجہ یہ بھی تھی کہ بعض پروفیسر حضرات کی کلاسز میں طلبہ تھے جب کہ زیادہ تر بچے حج کے رش کی وجہ سے آخری ہفتے غائب ہوجاتے ہیں۔ میں نے اگلے دن کہا تھا کہ میرے طلبہ کل آرہے ہیں۔ المختصر میں یونیورسٹی چلا گیا۔ میرے طلبہ کا اصرار تھا کہ ۱ تا ۳ بجے والی کلاس کو شارٹ کرکے ۱۲ سے ۱:۳۰ تک ختم کردوں تا کہ دور دراز کے طلبہ اپنے گھروں کو واپس جاسکیں۔ بظاہر یہ ان کا چھٹیوں سے پہلے آخری دن تھا، حالانکہ ابھی ہفتہ کے ختم ہونے میں تین دن باقی تھے۔ میں نے بریک دیے بغیر کلاس جاری رکھی۔ ہاں، اِس دوران میں کافی کا ایک کپ لیے سٹاف روم تک آیا۔ میں نے دیکھا کہ شاہ جی وہیں دوسرے پروفیسر حضرات کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میں چونکہ جلدی میں تھا اور وہ بھی مصروف تھے، چنانچہ ہمارا صرف مسکراہٹوں کا ہی تبادلہ ہوا اور میں کافی لے کر واپس اپنی کلاس میں چلا گیا۔ البتہ پروفیسر نثار احمد نے کہا کہ ہم بیٹھے ہیں۔ جلدی کلاس ختم کرکے آجانا، تھوڑا گپ شپ ہوگی۔ میں نے ۱:۳۰ کی بجائے ۱:۲۰ پہ کلاس ختم کی۔ سٹاف روم آیا تو سارے لوگ جاچکے تھے۔ جلدی جلدی بچوں کے ساتھ ہی نمازِ ظہر ادا کی اور گھر واپسی کا راستہ لیا۔ یونیورسٹی سے تقریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر ہم یوٹرن لے کر عزیزیہ کی سڑک پر آتے ہیں۔ یہ وہ ڈبل روڈ ہے کہ اگر اِس پر سیدھے جائیں تو عرفات پہنچ جائیں۔ چنانچہ تھوڑا سا متوازی چل کے یوٹرن سے واپس ہوتے ہیں۔ میں اسی سڑک پر آرہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ آج مجھے کوئی کال نہیں آئی۔ میں نے اپنا موبائل نکالا تو وہ رات کا ہی بند پڑا تھا۔ مصروفیت میں مجھے اِسے کھولنا یاد ہی نہیں رہا تھا۔ میں نے موبائل آن کیا۔ جونہی میں دائیں طرف مڑا، سامنے میری نظر ایک ہجوم پر پڑی جہاں بہت ساری پولیس کی گاڑیاں اور لوگوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ تھوڑا قریب گیا تو ایسا لگا جیسے کوئی حادثہ ہوا ہے۔ قریب میں کھڑے ایک پاکستانی سے پوچھنے پر

معلوم ہوا کہ کسی پاکستانی کا پولیس کی گاڑی کے ساتھ شدید حادثہ ہوا ہے۔ میں صرف یہ سوچ کر گاڑی سے نیچے اترا کہ شاید میں اپنے پاکستانی بھائی کی کوئی مدد کر سکوں، ہسپتال جانا ہو یا خون وغیرہ دینا ہو۔ قریب گیا تو پولیس کی جیپ کو دفاعِ مدنی (شہری دفاع) کا لفٹر اُٹھا رہا تھا۔ اِس سے پہلے کہ میں کسی سے کچھ پوچھتا، میری نظر دوسری گاڑی پر پڑی۔ میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ گاڑی بری طرح تباہ ہو چکی تھی۔ پولیس کی گاڑی نے کراس کرتی ہوئی اِس گاڑی کو ڈرائیور والی سائیڈ سے ٹکر ماری تھی اور تقریباً ۴۰ میٹر تک گھسیٹتے ہوئے لے گئی تھی۔ مجھے ایک پل کو اپنا دماغ سُن ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ یہ گاڑی کسی اور کی نہیں تھی بلکہ ہمارے انتہائی قریبی اور پیارے دوست شاہ جی کی گاڑی تھی۔ گاڑی کو دیکھ کر مجھ پر عجیب خوف کی کیفیت طاری ہوگئی۔ کچھ ہمت کر کے میں نے پاس کھڑے پولیس آفیسر کو بتایا کہ یہ گاڑی میرے دوست کی ہے۔ اُس نے مجھ سے نام پوچھا۔ میرے نام بتانے پر اُس نے شاہ جی کا اقامہ دکھایا اور پوچھا کہ یہی تمھارا دوست ہے۔ میں نے ہنکارا بھرتے ہوئے جلدی سے پوچھا اُس کی حالت کیسی ہے؟ اُسے کسی ہسپتال میں لے کر گئے ہیں؟ میرے چہرے پر تشویش کو شاید وہ سمجھ گیا تھا۔ دھیمے سے جواب دیا کہ تم اُس کے لیے دعا کرو۔ اللہ اُس پر اپنی رحمت کرے۔ اُس نے جو کہنا تھا، کہہ چکا تھا۔ میری عربی بھی اتنی کمزور نہیں کہ میں سمجھ نہ سکتا۔ لیکن میں نے اُس کی بات پر یقین نہیں کیا۔ میں لاشعوری طور پر خود فریبی کا شکار ہو رہا تھا۔ میں ایسی خبر پر یقین کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ میں اپنے شاہ جی کو ہر صورت میں زندہ دیکھنا چاہتا تھا، چاہے وہ زخمی ہی کیوں نہ ہو۔

میری حالت عجیب ہو رہی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ میں اپنے انگلش لینگویج سنٹر کے ڈائریکٹر کو فون کروں۔ حادثے کا بتاؤں تا کہ وہ بھی ہسپتال فون وغیرہ کریں، کہ شاہ جی کو بہتر کیئر مل سکے۔ میں نے اُن کا نمبر ڈائل کیا۔ میرے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ جب میں نے اُنھیں حادثے کا بتایا تو اُنھوں نے پوچھا تم کہاں ہو۔ میں نے مزید کچھ بتائے بغیر فون پولیس آفیسر کو دے دیا۔ وہ مجھ سے دو قدم دور کو ہو گیا۔ لیکن میں اب جان چکا تھا۔ اُس نے ہمارے ڈائریکٹر کو بتایا کہ وہ موقع پر ہی فوت ہو گئے تھے۔ اِس کے باوجود میں نے موبائل فون واپس لیتے ہوئے آفیسر سے پوچھا تو اُس نے کہا کہ احتمال ہے کہ وہ بچ جائیں۔ لیکن اب شاید مجھے اُس کی بات کا یقین نہیں آ رہا تھا۔ اُس نے تو میری حالت دیکھ کر صرف بات بنائی تھی۔ میں بار بار اللہ اکبر، اللہ اکبر کہہ رہا تھا اور گم سم کھڑا تھا۔ یہ کیا ہو گیا! ایک ایسی خبر جس نے مجھے بالکل confuse کر دیا تھا۔ مجھے کچھ ہوش نہیں آ رہی تھی۔ ایک ایسا صدمہ جس سے میرے ہاتھ کانپنے شروع ہو گئے۔ میرا منہ سوکھ رہا تھا۔ پھر اچانک ایک خیال اور آیا کہ شاہ جی اکیلے نہیں آیا کرتے تھے بلکہ اُن کے ساتھ سجاد بھی ہوتا تھا۔ اِس خیال سے حالت کچھ اور بھی عجیب ہو گئی۔ یہ دونوں میرے عزیز ترین دوست ہیں۔ اب مجھ میں اِتنی ہمت نہیں تھی کہ میں نمبر ڈائل کر سکتا۔ speed dial کا بٹن دبایا۔ نمبر بند آ رہا تھا۔ فوراً ہی اپنی اہلیہ کا نمبر جو دوسرے speed dial پہ تھا، دبایا۔ یاد رہے کہ میں اور سجاد صاحب ایک لمبے عرصہ سے ساتھ رہ رہے ہیں۔ میں نے اُن کی بیگم سے صرف اِتنا پوچھا کہ سجاد بھائی کہاں ہیں؟ اُس نے کہا بتایا کہ وہ تو آج یونیورسٹی نہیں گیا کیونکہ اُس کی کلاس نہیں تھی۔ میں نے موبائل سجاد صاحب کو دینے کا کہا۔ میں کم از کم اُس کی آواز سننا چاہتا تھا۔ میرے پاس ایک بُری خبر بھی تھی جو میں نے ایک ہی سانس میں بتادی اور کہا کہ میں آ رہا ہوں، سڑک پر میرا انتظار کرو تا کہ ہم ہسپتال جا سکیں۔ واپس گاڑی میں بیٹھا۔ اُس وقت شہری دفاع کے اہلکار شاہ جی کی بدقسمت گاڑی کو لفٹر سے اُٹھا رہے تھے۔ میں کچھ

وقت گاڑی میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ میں نے تو اناللہ تک نہیں پڑھا تھا، اور نہ ہی میرے آنسو نکلے تھے۔ صرف ایک غم اور افراتفری کی کیفیت تھی۔ وہاں سے ہمارے گھر تک تقریباً دس منٹ لگتے ہیں۔

اب میں گاڑی میں اکیلا تھا۔ اچانک میرے ذہن میں ماضی کی فلم چلنی شروع ہوگئی۔ شاہ جی اب ماضی تھا، ایک قصۂ پارینہ بن چکا تھا۔ مجھے اُس کی ایک ایک ادا یاد آرہی تھی۔ میرے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ میری آنکھیں بارش کی طرح برس رہی تھیں۔ اب میں ذہنی طور پر تسلیم کر رہا تھا کہ میرا دوست مجھ سے بچھڑ چکا ہے۔ اُسے اللہ نے اپنے پاس واپس بلالیا ہے۔ اِنہی سوچوں میں گم تھا کہ عزیز یہ میں گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ سجاد صاحب انتظار اور تشویش کے عالم میں مضطرب کھڑے تھے۔ وہ بھی حساس آدمی ہیں۔ اور بخاری اُن کا بھی اُتنا ہی عزیز تھا جتنا کہ میرا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی کہنے لگے یہ کیا ہوگیا سلیم۔ میں نے صرف سر ہلایا۔ پھر پوچھا یہ سب کچھ کیسے ہوگیا۔ مجھ میں جواب دینے کی ہمت نہیں تھی۔ میں نے اشارے سے خاموشی اختیار کرنے کو کہا۔ ہمارے گھر سے تقریباً دس منٹ شاہ فیصل ہسپتال تک لگتے ہیں۔ ہم جلدی جلدی ہسپتال پہنچے۔ ایمرجنسی میں بغیر اجازت ہی داخل ہوگئے۔ نرس نے بتایا کہ یہاں ذوالکفل نام کا کوئی مریض نہیں ہے۔ CPR روم میں پتہ کریں۔ سیکورٹی گارڈ سے دریافت کیا۔ اُس نے پہلے تو اندر جانے سے منع کردیا۔ پھر ہمارے اصرار پر جانے دیا۔ داخل ہوتے ہی دوسرے بیڈ پر ہمارے دوست کا جسدِ خاکی پڑا تھا۔ اوپر سفید چادر۔ شاید ہی میں زندگی میں یہ لمحہ بھول سکوں۔ شاہ جی سویا ہوا تھا، ابدی نیند سویا ہوا تھا۔ چہرے پر ایک دو خراشوں کے علاوہ کوئی گہرا زخم نہیں تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ سر کی پچھلی جانب چوٹ آئی ہے کیونکہ مسلسل خون رِس رہا تھا۔ گردن بائیں طرف ڈھلکی ہوئی تھی۔ شاید اِسی طرف سے گاڑی آرہی تھی جس کو دیکھتے دیکھتے شاہ جی کو دوبارہ مڑنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ ماتھے پر البتہ گاڑی کے سٹیرنگ کا نشان پڑا تھا۔ ہم دونوں شاہ جی کے سرہانے کھڑے ایسے بچوں کی طرح رو رہے تھے جن کی ماں اُنھیں اچانک چھوڑ کر چلی گئی ہو۔ شاہ جی کے چہرے پر ہلکی سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ شاید ہم اداس تھے اِس لیے ہمیں ایسا لگا ہو۔ ایک گھنٹہ پہلے میں اُن کو سٹاف روم میں مسکراتے چھوڑ کر گیا تھا۔ اب کی دنیا بالکل بدل چکی تھی۔ ہم کبھی شاہ جی کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے تو کبھی ڈاڑھی پر۔ خوب جی بھر کے رونے کے بعد دوستوں کو فون کیا۔ جدہ میں اُن کے کزن ہیں حُسنی مبارک، اُن کو فون کیا۔ اب ہم نارمل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہمیں احساس تھا کہ آگے کی ساری ذمہ داریاں اب ہم پر ہیں، سب کچھ ہم نے ہی کرنا ہے۔ حُسنی مبارک جدہ سے نکل آئے تھے۔ یونیورسٹی کے دوست تیزی سے جمع ہو رہے تھے۔ اب ہمارے لیے اگلا مسئلہ یہ تھا کہ شاہ جی کی اہلیہ کو کیسے بتایا جائے، کس وقت بتایا جائے۔ حسنی مبارک نے کہا کہ اُن کو میرے آنے تک نہ بتایا جائے۔ وہ آکر خود صورتِ حال کو سنبھال لیں گے۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا تو اُس نے کہا کہ تھوڑی دیر میں شاہ جی کو کولڈ سٹور میں منتقل کرنا ہوگا کیونکہ یہاں وہ زیادہ دیر تک نہیں رکھ سکتے۔ اور بہتر یہی ہے کہ شاہ جی کی اہلیہ کو یہیں بلاکر جسدِ خاکی دکھادیں۔ میں نے سجاد صاحب سے پوچھا۔ اُن کو بھی یہ کام بہت مشکل لگا۔ بہرحال میں نرس سے دس منٹ لے کر ہسپتال سے نکل آیا۔ سجاد صاحب پولیس سٹیشن سے گھر واپس آرہے تھے۔ میں گھر کے نیچے پہنچا تو سجاد صاحب میرے انتظار میں تھے۔ میں نے اُنھیں کہا کہ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ ہم کب تک اِس بات کو چھپا کر رکھ سکتے ہیں۔ آخر کار یہ حقیقت پتہ تو چلے گی۔ ہماری ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ہم نے اپنی خواتین کو شاہ جی کے گھر جانے کا بہت پہلے سے کہہ دیا تھا۔ جونہی ہم اوپر آئے تو ہماری خواتین نے بتایا کہ شاہ جی اہلیہ کو پاکستان سے شاہ جی کی وفات کی خبر آچکی ہے۔ اب

میں نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں کی۔ اپنی اہلیہ سے کہا کہ دونوں خواتین تیار ہو کر نیچے گاڑی میں آ جائیں۔ بچوں کو میں نہیں لے جانا چاہتا تھا، لیکن کس میں یہ ہمت تھی کہ اُنھیں وہیں روکتا۔ میں نے گاڑی سٹارٹ کی اور صرف دو تین باتیں کیں۔ اِس سے پہلے میری دعا سلام کے علاوہ کبھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے صرف اِتنا کہا کہ میں آپ لوگوں کو ہسپتال لے جانا چاہتا ہوں۔ المختصر ہم ہسپتال پہنچ گئے۔ تقریباً تمام پروفیسر صاحبان پہلے ہی سے وہاں موجود تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں حسنی مبارک صاحب جدہ سے چند دوسرے احباب کے ساتھ پہنچ گئے۔ میں شاہ جی کی اہلیہ اور اپنی بیوی کو واپس گھر چھوڑ گیا۔ اُس وقت تک بخاری صاحب کے بھائی کفیل شاہ صاحب سے تدفین مکہ مکرمہ میں ہی کرنے کی اجازت مل چکی تھی۔ اسی دوران سجاد صاحب پولیس سٹیشن چلے گئے اور حادثہ کی ابتدائی رپورٹ لے آئے۔ مغرب کی نماز تمام حضرات نے ہسپتال کی مسجد ہی میں پڑھی۔ اب تدفین کی باتیں شروع ہوئیں۔ مجھے غم تھوڑا بھول سا گیا اور اگلی مصروفیات شروع ہو گئیں۔ میرا دل چاہتا تھا کہ جنازہ صبح کی نماز کے ساتھ ہو جائے۔ یہ بظاہر اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور نظر آ رہا تھا۔ دوسری خواہش تھی کہ بخاری صاحب کو جنت المعلیٰ نصیب ہو۔ ہم ہسپتال میں کھڑے اِنہی موضوعات پر باتیں کر رہے تھے کہ مولانا سیف الرحمٰن صاحب مدرس مدرسہ صولتیہ کے فرزند عبدالمالک صاحب جن سے شاہ جی کے خاندان کے دیرینہ تعلقات ہیں، پہنچ گئے۔ مغرب کے بعد ایک ٹیم جو حسنی مبارک اور عبدالمالک صاحب پر مبنی تھی، کو سفارت خانے کا کام سونپا گیا جب کہ میں اور سجاد صاحب واپس گھر چلے گئے کیونکہ دوستوں کی ایک بڑی تعداد گھر پہنچ چکی تھی۔ جدہ سے ایک معروف صحافی رؤف طاہر، مولانا اکرم صاحب، مدینہ سے شاہ جی کے چچا سید غلام مصطفیٰ شاہ صاحب، مدرسہ صولتیہ سے ڈاکٹر سعید صاحب، عشا تک یہ سارے حضرات شاہ جی کے گھر پہنچ چکے تھے۔ ہمارا گھر کافی بڑا ہے۔ ایک فلیٹ صرف خواتین کے لیے مختص کر دیا گیا جب کہ دوسرا حصہ جو کہ چار کمروں کا تھا، مرد حضرات کے لیے مختص ہوا۔ مجھے اب یہ فکر کہ جنت المعلیٰ کا اجازت نامہ کیسے حاصل کیا جائے۔ بظاہر یہ ایک مشکل امر ہوتا ہے۔ ہمارے ایک دیرینہ دوست ہیں جو ہمارے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں، ڈاکٹر عبداللہ مطرفی۔ یہ قبیلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے مکہ کے قرب و جوار میں آباد ہے۔ کھلے دل کے لوگ ہیں۔ مختصر سے وقت میں یہ مطرفی صاحب میرے بہت اچھے دوست بن گئے تھے۔ وہ بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔ جنت المعلیٰ میں اجازت نامے کا معاملہ اُن کے سامنے رکھا۔ شاید وہ اِسی انتظار میں تھے کہ شاہ جی کے لیے کچھ کر سکیں۔ وہ شخص رات بھر نہیں سویا۔ ہر گھنٹے آدھے گھنٹے میں میرے ساتھ فون پر رابطہ رکھا، بلکہ اِتنا خیال پردیس میں شاید اپنے بھی نہ کر پائیں۔ اللہ اُسے جزائے خیر عطا فرمائے۔ رات کے 9 بج چکے تھے۔ عبدالمالک صاحب کے پاس سب سے مشکل کام ہے جس کے لیے عام طور پر کم از کم چوبیس گھنٹے درکار ہوتے ہیں۔ پولیس اسٹیشن سے حادثہ کی ابتدائی رپورٹ لے کر اُس کو پاکستانی سفارت خانہ جدہ سے تصدیق کروانے کے ساتھ دو تین اور کاغذات بنوانے تھے۔ ہمارا بخاری شہید تھا۔ بس اللہ ہی اُس کے لیے ہر کام کو اِتنا آسان بناتا چلا گیا۔ سفارت خانے والا کام صرف دو گھنٹے ہی میں مکمل ہو گیا۔ بارہ بجے رات کے لگ بھگ میں نے یونیورسٹی کے تمام دوستوں کو اطلاع دی کہ اِن شاء اللہ نمازِ فجر کے ساتھ بخاری کا جنازہ حرم میں پڑھا جائے گا۔ دوسری طرف عبداللہ مطرفی رابطے میں تھے۔ اُنھوں نے جنت المعلی میں تدفین کے سارے انتظامات مکمل کروا لیے تھے۔ رات ڈھائی بجے کے لگ بھگ ہم اپنے دوست کے جسدِ خاکی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھے مسجدِ رُسیفہ جا رہے تھے۔ اب کچھ اور کیفیت تھی۔ بخاری ہم سے جدا ہو چکا تھا، لیکن ایک احساس تھا اُس کی موجودگی کا، اگرچہ زندہ نہ

سہی۔ ملک فیصل ہسپتال سے مسجد تک تقریباً بیس منٹ لگے۔ یہاں جنازے کو غسل مساجد سے ملحقہ مغلسوں میں دیا جاتا ہے۔ عموماً یہاں دو سے تین آدمیوں کو ساتھ جانے کی اجازت ہوتی ہے۔لیکن اب کی بار تو چھے سات لوگ اندر موجود تھے۔ بخاری کے دوست اُسے اُس کے خالقِ حقیقی کے سامنے پیش کرنے کے لیے یوں تیار کررہے تھے جیسے دولھے کو اُس کے دوست تیار کرتے ہیں۔خوشبو لگائی جارہی تھی۔کفن پہنایا جارہا تھا۔ ہمارا بخاری مسکرارہا تھا۔ چہرہ پرسکون تھا۔ بالکل اِس طرح جیسے کوئی آدمی کوئی بہت بڑی ذمہ داری پوری کرنے کے بعد مطمئن نظر آتا ہے۔اُس طمانیت میں خوشی بھی ہوتی ہے اور اعتماد بھی۔ہم نے حقیقتاً یہی کیفیت دیکھی۔کفن پہنانے کے بعد جب چہرہ دوبارہ کھولا گیا تو سب دوستوں نے بخاری کا ماتھا چوما۔ میں نے تو ڈاڑھی بھی چوم لی۔ایک بار پھر آنکھیں برس پڑیں۔ بخاری بہت جلدی چلا گیا تھا۔اُس کی رفاقت ہمیں زیادہ دنوں کے لیے نصیب نہ ہوسکی۔ وہ سب کو چھوڑ گیا۔آج دوپہر کے وقت تو ہم ساتھ تھے، پھر یہ کیا ہوا؟

اللہ کی شان،حرم میں سب سے پہلے داخل ہونے والا جنازہ بخاری کا تھا حالانکہ ہم سوچ رہے تھے کہ ہم لیٹ ہوگئے ہیں۔ خانہ کعبہ کے سامنے رکنِ یمانی اور حجرِ اسود سے متصل بخاری دونئی سفید چادروں میں لپٹا ہوا رکھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ شاید موت بھی اُس کی قسمت پر رشک کررہی ہے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے بارہ (۱۲) مزید جنازے آئے۔لیکن سب سے پہلے چونکہ بخاری کا جنازہ تھا سو امام صاحب نے بخاری کے بالکل پاس کھڑے ہوکر جنازہ پڑھایا۔ بخاری کے چاہنے والوں کی ایک بڑی تعداد جنازے کو کندھا دینے کے لیے بے تاب تھی۔عبداللہ مطرفی نے میرے ساتھ کھڑے ہوکر جنازہ پڑھا۔ہم جنازہ لے کر دوبارہ گاڑی میں بیٹھے۔ جنت المعلیٰ کے گیٹ سے گاڑی تھوڑی دور روکی۔ میں اور عبداللہ مطرفی گیٹ پر گئے اور بلدیہ کے مدیر کا حوالہ دیا کہ رات کو اُس سے اجازت لے لی گئی تھی۔ ہمارا بخاری اُس قبرستان میں جارہا تھا جس کو پانے کے لیے لوگ زندگی بھر دعائیں مانگتے ہیں۔ جی ہاں، بخاری جنت المعلیٰ میں جارہا تھا۔ قبر نمبر ۵/ ۱۷۸ تیار تھی۔بھیگی پلکوں اور کانپتے ہونٹوں کے ساتھ کلمۂ شہادت کا وِرد ہورہا تھا۔صبح کی روشنی ابھی پھیلی نہیں تھی۔موسم میں ہلکی سی خنکی تھی۔ سامنے کی جانب کعبۃ اللہ تھا۔ تھوڑا سا ہٹ کے ام المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا روضۂ مبارک ہے، اور دوسرے کئی جید صحابہ بھی اِس قبرستان میں آرام فرمارہے ہیں۔ واہ بخاری تیری قسمت......

اِس شوق میں کہ میں اپنے دوست کو خود رخصت کروں، میں کسی کا انتظار کیے بغیر حسنی مبارک صاحب کے ساتھ قبر میں اُترا۔لیکن عبدالمالک صاحب کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے دوبارہ اوپر آگیا۔ یوں عبدالمالک اور حسنی مبارک نے بخاری کو آخری کاندھا دیا اور قبر میں اتارا۔ مجھ سے اب برداشت نہیں ہورہا تھا۔ جونہی عبدالمالک صاحب اوپر آئے، میں ایک دم سے دوبارہ قبر میں اتر گیا۔ میں اپنے بخاری کو الوداعی سلام کرنا چاہتا تھا۔ایسے لمحوں میں انسان سب کچھ بھول جاتا ہے۔سو میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ مجھے آج بھی میرا دوست وہاں نظر آرہا ہے۔ میں اِن آخری لمحوں کو کبھی نہیں بھولنا چاہتا۔

صبح کافی روشن ہوگئی تھی۔ دور کہیں پہاڑوں پر سورج کی کرنیں پڑ چکی تھیں۔ ہم سب سر جھکائے قبرستان سے واپس آرہے تھے۔ جاتے ہوئے بخاری ہمارے ساتھ تھا۔اب ہم اکیلے تھے۔ مجھے بخاری جیسا دوست اور بھائی زندگی میں کبھی ملے گا؟

بخاری کی شخصیت

پروفیسر محمد سلیم

حج کی چھٹیوں کے بعد یونیورسٹی آج دوبارہ کھل رہی تھی۔ میں حسب معمول ۷:۳۰ بجے گھر سے نکلا۔ گاڑی سٹارٹ کی اور عرفات روڈ پر ہولیا۔ ہماری یونیورسٹی میدانِ عرفات کے بالکل ساتھ ہے جب کہ ہم عرفات کی آٹھویں دائری روڈ سے یونیورسٹی جاتے ہیں۔ میری طبیعت بوجھل سی تھی۔ آج اس سڑک پر رش بالکل نہیں تھا۔ شاید میں تھوڑا جلدی نکل آیا تھا۔ سڑک ویران نظر آ رہی تھی۔ ایک عجیب سی ویرانی...... یہ ویرانی دل کے اندر بھی موجود تھی۔ تقریباً چھ کلومیٹر چلنے کے بعد میں اُس جگہ پہنچ گیا جہاں حج سے کچھ دن پہلے ہمارے عزیز ترین دوست کا حادثہ ہوا تھا۔ سید محمد ذوالکفل بخاری صاحب، ایک ایسے دوست جن کا نعم البدل کبھی نہیں ملنے والا۔ دماغ میں ایک بار پھر وہ ساری فلم گھوم گئی۔ یہ پراسرار سی سڑک جو بستی سے باہر نکلتی ہوئی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے ہو کر عرفات کے میدان تک پہنچ جاتی ہے، اپنے اندر عجیب سی خاموشی لیے ہوئے تھی۔ کافی دنوں کے بعد میری آنکھیں پھر نم ہو رہی تھیں۔ مجھے میرا دوست یاد آ رہا تھا۔ ایک ایسا دوست جو کہ ایک مثالی انسان تھا۔

درویش صفت، سادہ لباس، ڈھیلی سی چال والا یہ شخص اپنے اندر ایک سمندر تھا۔ میں نے بخاری جتنا نرم مزاج انسان کبھی زندگی میں نہیں دیکھا۔ غصہ تو کبھی آتا نہیں تھا۔ کسی کا برا کرنا کبھی اچھا ہی نہیں لگا۔ مہمان نوازی تو خاندانی تربیت سے ملی تھی۔ موضوع دنیوی ہو یا دینی، جب بخاری بولتا تھا تو پھر کسی کے بولنے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ کچھ دنوں پہلے طائف جانا ہوا۔ میرے دوست سجاد صاحب بھی ساتھ تھے۔ وہاں ایک جلسہ تھا۔ ہمیں یہ پتہ نہیں تھا کہ اُس دن کا سپیکر کون ہے۔ نہ بخاری نے ذکر کیا۔ تقریب کا آغاز ہوا۔ تلاوت کے بعد بخاری کو دعوتِ خطاب دی گئی۔ اُس دن مجھے اُس شخص کی خداداد صلاحیتوں کا اندازہ ہوا۔ بغیر رکے ایک گھنٹہ فی البدیہہ تقریر کی۔ کچھ ایسی باتیں بھی کر گئے جو صرف اہل دانش ہی سمجھ سکتے ہیں۔

انسان بڑا لالچی ہوتا ہے۔ ہماری نظروں سے بخاری اِس امتحان میں بھی بدرجۂ امتیاز پاس ہوا۔ درویشی طبیعت تھی۔ دولت کو کبھی خاطر میں بھی نہیں لایا۔ مہمان کے لیے سب کچھ لٹانے کو تیار ہوتے تھے۔ محدود سے وقت میں مکہ مکرمہ میں چاہنے والوں کی تعداد سیکڑوں میں ہوگئی۔ ہمارا ایک سعودی دوست ہے، عبداللہ مطرفی، ہمارے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھاتا ہے۔ کہنے لگا مکہ کی سرزمین جس سے محبت کرتی ہے اُس کو کھینچ کر لاتی ہے اور پھر اُسے کبھی نہیں جانے دیتی۔ یہی ہمارے دوست کے ساتھ ہوا۔ انتہائی مختصر وقت گزارا۔ مکہ نے اپنا مہمان بنا کر بلایا، اور پھر واپس کبھی نہ جانے دیا۔

انتہا درجہ صفائی پسند تھے۔ کچھ عرصہ فیملی کے بغیر تھے۔ ہم تین دوست ساتھ رہے۔ تقریباً روزانہ کچھ نہ کچھ دھلائی کا

کام ہوتا رہتا۔حرم ہمیشہ نئے کپڑے پہن کر جاتے۔ پینٹ شرٹ کبھی اچھی نہیں لگی۔ مجھے یاد ہے کہ پچھلے سال جب ام القریٰ یونیورسٹی میں انٹرویو دینے آرہے تھے تو میں نے سختی سے کہا کہ بخاری پینٹ شرٹ پہن کر آنا۔ کہنے لگے اگر ضروری ہے تو کچھ انتظام ہوجائے گا۔ ویسے میرے پاس پینٹ شرٹ نہیں ہے۔

کسی کو بات سمجھانا بخاری پر ختم تھا۔ انتہائی دھیما لہجہ اور موثر گفتگو بخاری کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ اگر دوسرے لوگ باتوں سے لوگوں کو زخم لگاتے تھے تو بخاری کی گفتگو اُن زخموں پہ مرہم کا کام کرتی تھی۔ وفات کے بعد احمد باجوہ نامی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کہنے لگے:

> اُس شخص میں کوئی خاص بات تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر کبھی پریشانی و ناراضگی نہیں دیکھی وہ ہر وقت مسکراتا رہتا تھا۔

کمال کی ذہانت اللہ کی طرف سے تحفہ تھا۔ لطیفے اِتنے یاد تھے کہ روزمرہ زندگی کے قدم قدم کی مخصوص صورتِ حال کے لیے مخصوص لطیفہ سنانا بخاری ہی کا کام تھا۔

بخاری آج ہم میں نہیں۔ لیکن اُس کی یادیں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گی۔ یہ بخاری کی محبت تھی کہ ہم اُسے کوشش کے باوجود نہیں بھول پا رہے۔ ہم اپنی دعاؤں میں بخاری کو کبھی نہیں بھولتے۔ وہ ہمارے بہت نزدیک ہے۔ ہمارے دلوں میں بخاری زندہ ہے۔ جنت المعلیٰ میرے گھر سے صرف چند منٹوں کے فاصلے پر ہے جہاں بخاری ابدی نیند سو رہا ہے۔ اللہ اُسے اپنی رحمت کے سائے میں رکھے۔

بخاری بھائی!

اہلیہ پروفیسر محمد سلیم

میں ایم اے انگریزی سالِ اوّل کی تیاری کر رہی تھی۔ میرے خاوند محمد سلیم جو ام القریٰ یونیورسٹی میں انگریزی کے استاد ہیں، میری مدد کر رہے تھے۔ لیکن ایک مضمون سے اُنھیں چڑ تھی اور وہ تھا لسانیات۔ جب بھی اس کی باری آتی تو کہتے کہ ''میرے ایک دوست نے پاکستان سے آنا ہے۔ یہ مضمون میں نے پہلے ہی اُس کے ذمہ کر دیا ہے۔'' آخر کار وہ دوست آ ہی گئے، بخاری بھائی جن کو نام سے ہم سب جانتے تھے۔ پہلا ایک ہفتہ تو میں نے انتظار کیا۔ اس کے بعد میں نے اپنے میاں سے کہا کہ بخاری بھائی سے کہیں کہ وہ مجھے اس پیپر کی تیاری کروا دیں۔ مجھے یقین ہے کہ اُن سے اگر کوئی اور کہتا تو کبھی نہ پڑھاتے، لیکن میرے میاں چونکہ اُن کے بہت قریبی دوست تھے اِس لیے وہ انکار نہ کر سکے۔ اگرچہ وہ زیادہ وقت نہ دے پائے لیکن پھر بھی اُنھوں نے اِتنا پڑھا دیا کہ مجھے اس پیپر کا عمومی اندازہ ہو گیا۔ میرے میاں اکثر مذاق کرتے کہ یہ پیپر کبھی پاس نہیں ہونے والا، تو اِس موقع پر بخاری بھائی ہمیشہ یہی کہتے کہ ''جی! باقی پاس ہوں نہ ہوں یہ ضرور پاس ہو جائے گا۔'' مجھے بخاری بھائی جیسے بھائی اور استاد پر فخر ہے۔ میں یہ کہہ سکتی ہوں کہ بخاری بھائی نے جتنے دن بھی مجھے پڑھایا کبھی نظر اوپر نہیں اٹھائی۔ انھوں نے مجھے پڑھنے کا ایک نیا حوصلہ دیا۔ وہ ہمیشہ تعلیم کو قدر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ایک دن میں نے کہا کہ ''بھائی! گھریلو زندگی کے ساتھ ایم اے انگریزی کرنا میرے بس کا کام نہیں۔'' تو کہنے لگے کہ دو سال میں نہیں تو تین سال میں ہو جائے گا، لیکن تعلیم کا سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ ایم اے کی ڈگری کسی وقت بھی کام آ سکتی ہے۔ اُن کے پڑھانے کا انداز اپنا ہی تھا۔ بڑی خوبی یہ تھی کہ موضوع سے دور ہو کر بھی تشریح کرتے تو طالب علم کنفیوز نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ اصل موضوع سے سلسلہ جوڑ کر رکھتے تھے۔ جب کوئی ایسا نکتہ سمجھا رہے ہوتے جو کہ طالب علم کے لیے اہم ہوتا تو ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگتے۔ کبھی موضوع کا خلاصہ دیے بغیر کلاس ختم نہیں کرتے تھے۔ پاکستان جانے سے پہلے میں نے کہا کہ بھائی آپ نے میرے لیے دعا کرنی ہے کہ میرے پیپر اچھے ہو جائیں تو کہنے لگے کہ ''اللہ آپ کی مدد کریں گے اور ہم بھی دعا کریں گے۔''

آج بخاری بھائی ہم میں نہیں ہیں۔ لیکن جب دروازے پر بیل ہوتی ہے تو میرا چھوٹا بیٹا دوڑتا ہوا جاتا ہے اور یہی کہتا ہے کہ مما بقالی چھاب (بخاری صاحب) آ گئے۔ اصل میں یہ بخاری بھائی سے بہت مانوس تھا۔ اب بھی وہ اکثر یاد کرتا ہے کہ ہم بخاری انکل سے باتیں کیا کرتے تھے اور وہ ہمیں مزے مزے کی کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ ہم نے اُس دن اُن کو بہت miss کیا جس دن میرا یعنی بقول اُن کے، اُن کی نام نہاد طالب علم کا نتیجہ آیا۔ میں بہت خوش تھی۔ میں نے سالِ اوّل کا امتحان

پاس کرلیا تھا۔ میرے میاں کہنے لگے کہ آج بخاری ہوتے تو کتنا خوش ہوتے۔ خصوصاً اِس وجہ سے کہ اُن کا پیپر بھی پاس ہوگیا۔

میں جانتی ہوں کہ میرے میاں کو جتنا دکھ بخاری بھائی کی وفات کا ہوا ہے اُتنا اپنے والد کے علاوہ شاید ہی کسی کا ہوا ہو۔ اب بھی ہمارے گھر میں شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہوگا کہ بخاری بھائی کا ذکر نہ ہو۔ میرے میاں کہتے ہیں کہ ''میرا ایک دوست ہی تو نہیں جدا ہوا، وہ تو ایک استاد تھا جس سے ہم زندہ رہنے کا فلسفہ سیکھ رہے تھے۔''

مجھے یاد ہے جس دن بخاری بھائی نے پاکستان سے آنا تھا اُس سے تین چار دن پہلے میرے میاں کہنے لگے ''اب ہم کبھی بور (bore) نہیں ہوں گے کیونکہ ہمارا دوست بخاری آرہا ہے۔'' میرے میاں کی اُن کے ساتھ بہت بنتی تھی۔ بخاری بھائی آئے تو ان کا زیادہ وقت ان ہی کے ساتھ گزرتا تھا۔ پھر جب بخاری بھائی نے فیملی لانے کی بات کی تو ہم سب بہت خوش ہوئے۔ خوش قسمتی سے ہمیں تین گھر ایک ساتھ مل گئے، تیسرا سجاد بھائی کے لیے۔ وہ مہینہ بلکہ پچیس دن بہت مزے میں گزرے۔ ہم سب لوگ ایک خاندان کی طرح رہنے لگے۔ ایک گھر میں جو کچھ پک رہا تھا وہ تینوں گھروں میں جارہا تھا۔ ہم خواتین کا وقت اکثر اکٹھے گزرتا، خوب گپ شپ ہوتی۔ وقت پر لگا کر اُڑ رہا تھا کہ اچانک اِن خوشیوں کو کسی کی نظر لگ گئی اور ایک ہنستا بستا خاندان اپنے ایک عزیز اور خیر خواہ کو کھو بیٹھا، جس کا غم شاید بلکہ یقیناً عمر بھر ساتھ رہے گا۔ زندگی کے ہر موڑ پر ہم بخاری بھائی کو اِسی طرح یاد کرتے رہیں گے کہ جیسے وہ اب بھی اِسی دنیا میں ہیں۔ میری اپنے پروردگار سے دعا ہے کہ بخاری بھائی کے دونوں صاحبزادوں (عطاء المکرم اور عطاء المنعم) کو اُن کی شخصیت کا پرتو بنائے اور وہ اپنے والد کے ہر خواب کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں۔ آمین۔

ابھی دو دن پہلے میں دیکھ رہی تھی کہ میرا بیٹا معاذ جو بمشکل چار سال کا ہے، دو کھلونا گاڑیاں لے کر دوسرے بھائی کو بتا رہا ہے کہ یہ بخاری انکل کی گاڑی ہے ریڈ (Red) والی، اور یہ دوسری گاڑی ہے گندے شرطے والی۔ اُس کی گاڑی نے انکل کی گاڑی کو ایسے ٹکر ماری اور بخاری انکل اللہ میاں کے پاس چلے گئے۔ اِس سے زیادہ شاید میں اب کچھ بھی نہ لکھ پاؤں گی۔ اللہ اُن کو جنت الفردوس میں اعلیٰ ارفع مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

یادوں کے دریچے

پروفیسر سجاد حسین

انسان فطری اعتبار سے ناسٹلجک ہے۔ ماضی کی باتیں، قصے، کہانیاں اور واقعات کو یاد کر کے کبھی خوش ہوتا ہے اور کبھی غمگین ہوتا ہے۔ لیکن اِس غم کے اندر بھی ایک طرح کی طمانیت ہوتی ہے۔ یاد کتنی ہی تکلیف دہ کیوں نہ ہو، مگر پھر بھی اُس کے اندر ایک چھپی ہوئی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ میں بھی آج ایسی ہی یادوں کو قلم کی نذر کر رہا ہوں اور یہ یادیں ہیں بخاری کی، یہ یادیں ہیں اُس کی شیریں گفتگو کی، یہ یادیں ہیں اُس کے ساتھ گزرے چند مہینوں کی، اُن کھکھلاتی محفلوں کی جس میں بخاری کے پرلطف لطیفے سننے کو ملتے تھے۔ یہ یادیں ہیں اُس کے بے انتہا صبر کی اور افسوس صد افسوس یہ یاد بخاری کی المناک موت کی بھی ہے کہ جس نے بالآخر داغِ مفارقت دے کر ہماری ساعتوں کو بے رونق اور ہماری چاہتوں کو رسوا کر دیا۔

بخاری کے ساتھ میرا تعلق تو ایک لمبے عرصے پر محیط ہے لیکن پچھلے سات ماہ سے یہ قربت اِتنی رہی کہ ہمارا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا اور رہنا سہنا تک ساتھ رہا۔ اور بڑی خوش قسمتی رہی کہ جیسا امیج اُس کا ہمارے ذہن میں بنا ہوا تھا، وہ اُس نے اپنے عمل سے ثابت کر دکھایا۔

ہم ۲۰۰۲ء میں سعودی عرب میں ملازمت کے سلسلے میں آئے۔ میں یہ وضاحت کرتا چلوں کہ ہم سے مراد ہم تین دوست یعنی محمد سلیم، ذوالکفل بخاری اور میں۔ ہماری ملازمت وزارتِ تعلیم میں تھی۔ میں اور سلیم صاحب باقی ساتھیوں سے دو ہفتے بعد سعودی عرب میں پہنچے۔ ہماری تعیناتی تبوک میں ہوئی۔ اُسی دن سے ذوالکفل بخاری کا غائبانہ تعارف کرایا گیا۔ جن دوستوں کے ساتھ وہ کچھ دن تبوک شہر میں رہے اُنھوں نے بخاری کی زندہ دلی، وسعتِ قلبی اور طنز و مزاح کی اعلیٰ استعداد جیسی صفات کے ساتھ اُن کا تعارف کرایا اور اُن کے چند ایک لطیفے بھی سنائے۔ دل میں حسرت ابھرتی رہی کہ کب اِس شخص سے ملاقات نصیب ہوگی۔ لیکن یہ وقت اِتنا جلدی نہیں آیا۔ ملاقات کی وہ خواہش وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی۔ ٹیلی فون نے اِس حسرت کی ایک جھلک دکھلائی اور بخاری صاحب نے کسی کام کے سلسلے میں میرے ہر دلعزیز دوست محمد سلیم سے رابطہ کیا جو اُس وقت منطقہ تبوک کے سپروائزر تھے۔ میں اور سلیم صاحب ایک عرصہ سے ساتھ ہیں۔ پھر ملاقاتوں کا یہ سلسلہ جاری رہا اور خصوصاً جب چھٹیوں میں پاکستان گئے تو بخاری نے ملتان سے مانسہرہ آم بھجوا کر پیامِ محبت کی شیرینی اور ثبت کر دیا۔

ہماری پہلی بالمشافہہ ملاقات پانچ سال کے بعد املج میں ہوئی جب ہم عمرہ کرنے کی نیت سے تبوک سے نکلے اور بخاری کے دیرینہ اسرار کو ہم نے حقیقت کے روپ میں دیکھا۔ پہلی ملاقات میں بخاری مرحوم نے ہمارے دلوں میں گھر کر لیے۔ ہم اُن کی اس سادگی، حقیقت پسندی، اعلیٰ ظرفی، مہمان نوازی اور دریا دلی کو کبھی نہیں بھول سکتے۔ ان کا وہ اخلاص، تکریم اور بڑا پن ہمیں گرویدہ کر گیا۔ اِسی سال ہی ایک بار پھر ہمیں املج میں، کہ بخاری مرحوم کا شہر تھا، رکنا پڑا۔ ہم مکہ کی طرف آ رہے تھے اور ہماری گاڑی کی شافٹ ٹوٹ گئی۔ مجبوراً ہم نے بخاری کو فون کیا۔ بخاری اُس وقت املج میں نہیں تھے لیکن اِس کے باوجود انھوں نے اپنے املج کے دوستوں کو بتایا کہ میرے دوست مشکل میں ہیں، لیکن اِن کو میری غیر موجودگی کا احساس تک نہیں ہونا چاہیے۔ اور پھر میں کیا بتاؤں کہ کس اخلاص اور محبت کے ساتھ اُن کے دوست ہمارے ساتھ پیش آئے۔ میرے پاس وہ الفاظ

نہیں کہ میں اُن کے اخلاص و محبت کو قلم کی نذر کروں۔ کہا جاتا ہے:Man is known by the company he keeps
بخاری مرحوم کے دوستوں سے اندازہ ہوا کہ بخاری کی عدم موجودگی میں اخلاص و محبت کا یہ تقاضا ہے تو موجودگی میں کیا ہوتا۔ یہ بخاری کی شخصیت اور اس کے ایک اچھے دوست اور انسان ہونے کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

سال ۲۰۰۷ء میں میری اور سلیم صاحب کی سلیکشن ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ میں ہوگئی۔ اور یہ بات میں فخر سے لکھتا ہوں کہ ہم دونوں نے سلیکشن لیٹر لیتے ہی سب سے پہلے بخاری ہی کو بتایا کہ وہ بھی کل آ کر Dean سے ملے اور انٹرویو دے۔ اُس وقت تو یہ ممکن نہ ہوسکا لیکن یہ ہم دونوں دوستوں کی خواہش تھی کہ ہم بخاری کو اپنے ساتھ لے آئیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ہم نے بخاری کے کاغذات جمع کروائے اور پھر ٹیسٹ و انٹرویو دِلوایا۔ اور پھر ظاہر ہے ذہانت میں اور لیاقت میں بخاری مرحوم اپنی مثال آپ تھے، ان کی سلیکشن ہوگئی۔ مکہ میں آنے کی بخاری کو بڑی تڑپ تھی اور بالآخر وہ ''مکاوی'' بن گیا۔

موت برحق ہے اور ذی روح نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ بخاری کی موت کی یاد ضرور دل کو اداس کرتی ہے لیکن اِن اداس لمحوں میں بھی ایک طمانیت کا احساس ضرور ہے۔ ایسی موت خدا ہر ایک کو نصیب کرے۔ شہادت کی موت، حدودِ حرم میں موت، اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی کے بعد کی موت اور سب سے بڑھ کر شہادت کی انگلی فضا میں بلند اور کلمۂ شہادت کے ورد میں موت کسی اعزاز سے کم نہیں۔ اور یہ بات اُس عسکری نے ہمیں بتائی جو سب سے پہلے جائے حادثہ پر پہنچا اور بخاری کو کلمۂ شہادت پڑھتے دیکھا۔ کتنے نصیب کی بات ہے کہ حرم میں نماز جنازہ، اور جنازے میں دس لاکھ سے زیادہ حجاج کا مجمع اور جنت المعلیٰ میں تدفین۔ اِس سے بھی بڑھ کر یہ کہ مکہ مکرمہ نے بخاری کو قبول لیا۔ حادثے سے لے کر اُس کی تدفین تک ۱۴ سے ۱۵ گھنٹے لگے، حالانکہ یہ وہ امور ہیں جن کو کرنے میں عموماً ہفتے بیت جاتے ہیں۔ اِس سے بھی بڑھ کر ایمان والی موت جس کی ان کی خواہش تھی اور مرنے سے چند دن پہلے وہ اس کا اظہار بھی کر چکے تھے۔ ایک دن وہ اور سلیم صاحب حرم کی طرف حاجیوں کے کپڑے لے کر نکلے اور نماز کا وقت ہوگیا۔ سلیم صاحب نے بخاری صاحب کے ذمہ کپڑے سنبھالنے کی ذمہ داری سونپی جو بخاری صاحب نے حسبِ معمول بڑی چاہت سے اور مسکراہٹوں میں قبول کی۔ اِس انداز پر سلیم صاحب نے بخاری سے عرض کیا کہ بخاری آپ کے لیے کیا دعا کروں تو بخاری صاحب کے لفظ تھے: ''ایمان کے ساتھ موت۔'' سلیم صاحب نے ازراہِ مذاق عرض کیا کہ کب؟ بخاری صاحب بولے: ''جتنا جلدی ہوسکے۔ میں گناہوں کا بوجھ مزید نہیں سہار سکتا۔''...... اللہ اللہ یہ ایمان والوں کی موت ہوتی ہے۔

بخاری صاحب اتوار والے دن یعنی ۲۷/ ذیقعدہ کو رخصت ہوئے۔ دو دن پہلے جمعہ کے دن جب ہم تینوں حرم کی طرف نمازِ جمعہ ادا کرنے نکلے تو مجھے کچھ تاخیر ہوئی۔ جب میں گاڑی میں بیٹھا تو انتہائی پیارے انداز میں میری طرف مڑ کر کہا کہ: ''کیا جمعہ پڑھنے کے لیے ڈاڑھی منڈوانا ضروری ہوتا ہے؟'' ہم اُن کا یہ سبق آموز طنز کبھی نہیں بھول سکتے۔ ہمارے اصرار پر بخاری مرحوم نے ڈاڑھی کے حوالے سے چند احادیث بیان کیں۔ ان کی بیان کردہ دلیلوں میں سے ایک کا مفہوم بیان کرتا ہوں، کہ قیامت کے دن محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے امتیوں کو ڈاڑھی سے پہچانیں گے اور جن کی ڈاڑھی نہیں ہوگی اُن سے منہ پھیر لیں گے۔ اس کے ساتھ ہمیں ڈاڑھی رکھنے کی تلقین کی اور الحمدللہ ہم دونوں نے اُسی دن ڈاڑھیاں رکھ لیں کیونکہ دو دن بعد بخاری اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

ذوالکفل بخاری کی یادوں کے اتنے واقعات ہیں کہ میں لکھتا رہوں تو شاید ہی ختم ہوں۔ لیکن وقت کی کمی آڑے آ رہی ہے۔ بخاری ہم سے دور ہوگیا لیکن اس کی یادوں کے دیے ہمارے دلوں میں ہمیشہ سلگتے رہیں گے۔ ہمارے گھروں میں شاید ہی کوئی ایسا دن ہوگا جب ہم بخاری کو کسی حوالے سے یاد نہ کریں، ہماری شاید ہی ایسی نماز ہوگی جس میں ہم بخاری کے لیے ہاتھ نہ اٹھائیں۔ بخاری ہماری نظروں سے تو اوجھل ہوگیا لیکن ہمارے دلوں میں گھر کر گیا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ اس کو جنتِ فردوس میں جگہ دے اور لواحقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

سید ذوالکفل بخاری میری نظر میں

پروفیسر سجاد حسین

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

جس طرح قطرے کو گوہر ہونے تک عرصۂ دراز درکار ہوتا ہے یا کسی چمن میں دیدہ ور کے پیدا ہونے تک کافی عرصہ لگ جاتا ہے یا ہزاروں سیکڑوں سال کے بعد ایک پتھر عقیق کی شکل اختیار کرتا ہے بالکل اسی طرح قوموں کی زندگی میں بھی کسی تابناک شخص کے پیدا ہونے میں صدیاں بیت جاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح ہمارے نہایت ہی محترم ساتھی سید محمد ذوالکفل بھی ان چیدہ چیدہ شخصیات میں سے ایک تھے۔

میں پورے وثوق کے ساتھ بغیر کسی مبالغہ آرائی سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنی اس زندگی میں اتنا عظیم شخص نہیں دیکھا۔ ہر شخص کا عظمت ماپنے کا پیمانہ شاید مختلف ہوتا ہے ہو لیکن بخاری کی شخصیت اس پائے کی تھی کہ جس نے بھی ان کے ساتھ چند لمحات بھی گزارے ہوں وہ اُن کا گرویدہ بنا۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی اگر میں یہ کہوں کہ بخاری کے دشمن بھی اگر ہوتے تو اس کے لیے وہ بھی دعا کرتے۔ وہ ایسا بے ضرر شخص تھا کہ شاید ہو کوئی ایسا شخص ہو جسے ان سے گلہ ہو۔ وہ ہر ایک شخص کی ذرا ذرا سی تمنا سنبھال رکھتا تھا۔ اس کے سینے میں انسانیت بھرا دل، اس کے احساسات میں محبت، گفتگو میں مٹھاس، اس کی نظروں میں حیا، اس کی دوستی میں الفت و یگانگت، اس کی عبادت میں اخلاص، اس کے لباس میں سادگی، اس کی چال میں انکساری، اس کے جذبات میں صبر حتیٰ کہ اس کی ہر ادا میں وہ حسن تھا کہ شاید میرے کلمات تو ختم ہو جائیں گے لیکن اس کی تابناک شخصیت کا احاطہ نہ ہو سکے گا۔

دنیا میں ذہین ہونا، چالاک ہونا، اپنے مفادات کو حاصل کرنے کے لیے عقلمند ہونا اور اپنی زبان کی تاثیر سے شہرت کی بلندیوں کو چھو لینا اور وقت کی مناسبت سے کارڈ کھیلنا۔ عظمت نہیں ہوتی۔ عظمت تو درحقیقت وہ گوہر نایاب ہے جو اخلاص سے، فقیری سے، دردِ دل سے، عجز و انکساری سے اور اپنے آپ کو صحیح معنوں میں دوسروں کے لیے وقف کر لینے سے ملتا ہے۔

یہ گوہر نہیں ملتا بادشاہوں کے خزینوں سے

اپنے لیے دنیا میں ہر کوئی جیتا ہے لیکن اوروں کے لیے جیے جانا ہی زندگی ہے۔ اور یہ ساری خوبیاں میرے ذوالکفل میں بدرجہ اتم پائی جاتیں تھیں۔ شاید ہم بدنصیب تھے کہ یہ انمول ہیرا ہمیں تراشے بغیر ہم کو داغِ مفارقت دے گیا۔ اگر کچھ عرصہ

اور ہم اس کی صحبت میں رہتے تو شاید کچھ نہ کچھ رنگ ہمارے اوپر بھی چڑھ جاتا۔

بخاری صاحب نہایت ہی صاف گو، دیانت داری میں اپنی مثال آپ، جذبۂ انسانیت سے سرشار اور ایک باعمل مسلمان تھے۔ انھیں کبھی مال و متاع سے لگاؤ نہیں رہا۔ انھیں کبھی VIP بننے کی حسرت نہیں رہی۔ ہائے افسوس! میں کبھی کبھار اپنے دوستوں میں ان کا تعارف عطاء اللہ شاہ بخاری کے حوالے سے کرواتا تو مجھے کہتے کہ برائے مہربانی مجھے اُن سے منسوب نہ کیا کریں۔ میں کہاں اور وہ کہاں۔

بخاری صاحب ایک حقیقت پسند شخص تھے۔ وہ کبھی اپنی بات دوسروں پر نہیں تھونپتے تھے بلکہ دوسروں کی سن کر چلتے تھے۔ کئی بار ہم نے ان کی مرضی اور شان کے خلاف بھی کام کیے جس میں وہ زندہ دلی اور ہنسی خوشی سے شریک ہوجاتے تاکہ ہماری دل آزاری نہ ہو۔ اور یہی وجہ تھی ان کی موت کی خبر سن کر ہر آنکھ اشک بار تھی اور اب بھی جب ان کا نام آتا ہے تو دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ یارب بخاری کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے۔

جدائی ہی پہ قائم ہے نظام زندگانی بھی
بچھڑ جاتا ہے انساں، سے گلے مل مل کے پانی بھی

دنیا کا نظام جدائی پر قائم ہے۔ اور ہم سب نے بالآخر ایک دوسرے سے جدا ہونا ہے۔ یہی قانونِ فطرت ہے اور یہی ایک تلخ حقیقت بھی۔ لیکن ہم بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ بخاری شان سے جیا اور ایمان لے کر مرا۔ اللہ تعالیٰ اُس کے جیسی موت ہر ایک کو نصیب فرمائے۔ (آمین)

لبیک

اس سال کے حج کی سب سے اہم خبر یہ تھی کہ لوگ امن اور سلامتی والے ان مہینوں، دنوں اور مقامات سے بالکل امن وسلامتی سے گزرے اور وہ جو جان سے گزرے وہ بھی بحفظ وامان گزرے۔ آسودہ، آمادہ، تیار، لبیک کہتے ہوئے، راضی برضا، جو تیرا حکم، جو تیری رضا، جو تو چاہے، ''حاضر ہیں، ہم حاضر ہیں'' پکارتے ہوئے۔ کسی نے در پر، کسی نے چوکھٹ پر اور کسی نے رہگزر میں آخری لبیک کہی۔ جس نے بھی دل نذر کیا اور جس نے بھی جاں واری، یہی کہتے ہوئے کہ:

تیرا آستاں جو نہ مل سکا، تیری رہگزر پہ جبیں سہی
ہمیں سجدہ کرنے سے کام ہے جو وہاں نہیں تو یہیں سہی

ذوالکفل بخاری

(اُملج، سعودی عرب، فروری ۲۰۰۸ء)

بارات

پروفیسر نوید احمد قریشی

قیامت کے اس دل دہلا دینے والے آخری زلزلے سے پہلے جب ہر طرف چھوٹی بڑی قیامتیں برپا ہوں، جب عام انسانوں کی حیثیت حشرات کے برابر رہ جائے، جب زندگیوں کا تلف کرنا معمول بن جائے، جب عزتیں لوٹنا مشغلہ بن جائے، جب غنڈوں، بدمعاشوں اور لٹیروں کی سرداری قبول کرنا مجبوری ٹھہرے، جب عریانی، بے حیائی اور بے غیرتی روشن خیالی کی علامتیں تصور کی جانے لگیں، جب مظلوموں کی بستیوں میں بیٹھ کر قہقہے بلند کرنا زندہ دلی گردانی جانے لگے، جب دین سے لگاؤ رکھنے والوں کو فرقہ واریت میں پھنسا کر فساد کا بازار گرم کر دیا جائے، جب چمن کے ہر درخت پر الو اور الٹی لٹکتی خونی چمگادڑیں بسیرا ڈال لیں، جب بہار کے گیت اور خوشی کے نغمے سنانے والی بلبلیں سہم کر خزاں رسیدہ جھاڑیوں میں پناہ لینے لگیں اور جب اندھیری رات کی سیاہی سانپ کی طرح پھنکارتی ہوئی اس ستم رسیدہ دنیا کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے بڑھنے لگے.....
کیا اہل دل اس حال میں بھی اس دنیا سے دل لگی کر سکتے ہیں۔ سید محمد ذوالکفل بخاریؒ اس چمن کی ایک دلفریب اور خوبصورت بلبل تھے۔ صاحبِ فراست اور اہلِ دل میں سے تھے۔ انتقال سے چند روز پہلے اپنے دوستوں سے فرمایا ''اس دنیا میں جینا دوبھر ہو گیا ہے.....میں ایمان کی سلامتی کے ساتھ جلد سے جلد رخصت ہو جانا چاہتا ہوں''

''عزیزیہ'' سے ''عرفات'' جانے والی شاہراہ اپنے اندر ایک پُراسرار خاموشی لیے ہوئے ہے۔ اُمّ القریٰ یونیورسٹی کے ''عابدیہ'' کیمپس جانے والے رش سے محفوظ رہنے کے لیے اکثر اِسی شاہراہ کا انتخاب کرتے ہیں۔ لیکن کس کو معلوم تھا کہ حاجیوں کو عرفات کے عظیم میدان میں لے جانے والی یہ مقدس شاہراہ چھپ کر کسی سوار سے محبت بھی کرتی ہے۔ بخاری صاحب یونیورسٹی کے لیکچرز سے فارغ ہو کر دوپہر کے وقت اپنی سرخ رنگ کی خوبصورت دلہن جیسی گاڑی میں اِسی شاہراہ میں داخل ہو رہے تھے جب یہ واقعہ پیش آیا۔ اہلِ نظر اور اہلِ عقل شاید اِسے حادثہ سمجھیں، لیکن حقیقت میں یہ ایک واقعہ تھا۔ جو چیز دو چاہنے والوں کو ہمیشہ کے لیے اکٹھا کر دے، وہ حادثہ نہیں کہلاتی۔ اس سوار نے اس مقام کی کتنی تمنا کی تھی، کتنا تڑپا تھا، اور اِس مقدّس مقام کی زمین نے محبّت کی جانچ کے لیے اسے کتنی آزمائشوں سے گزارا تھا۔ دونوں ہی حقیقت میں ایک دوسرے کے طالب اور مشتاق تھے۔ جب محبت سچی اور گہری ہو تو حجاب اٹھ جاتے ہیں اور فاصلے مٹ جاتے ہیں۔ چاہنے والا اپنے محبوب کی آغوش میں چلا گیا۔

مکہ مکرمہ کی نورانی فضائیں تھیں، حرم کی پاکیزہ ہوائیں تھیں، پیر کی سہانی صبح کی مبارک ساعتیں تھیں جب عقیدت

مندوں کا ایک قافلہ والہانہ انداز میں سفید لباس میں ملبوس شہزادے کو تخت پر اٹھائے تیز قدموں کے ساتھ حرم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ فجر کی اذان ہونے میں ابھی خاصی دیر باقی تھی لیکن حرم میں تل دھرنے کی جگہ باقی نہ تھی۔ لاکھوں حاجی صفیں بنائے عبادت میں مصروف تھے۔ لیکن اس قافلہ کو کچھ فکر نہ تھی۔ اس شہزادے کا احترام ہی ایسا تھا کہ نگاہ پڑتے ہی لوگ احترام سے پیچھے سمٹ جاتے اور راستہ صاف ہوجاتا، یہاں تک کہ حرم میں پہنچ کر انتہائی احترام سے اس تخت کو عقیدت مندوں کے کندھوں سے اتار کر مقدس فرش پر رکھ دیا گیا۔ نمازِ فجر کے بعد نمازِ جنازہ کا اعلان ہوا۔ لاکھوں فرزندانِ اسلام اس شہزادے کے حق میں دعا کرنے اور اسے دل کی گہرائیوں سے خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے اپنے رب کے حضور ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوگئے۔ وہ لمحات کیا تھے جب حرم کی حدود کا ذرہ ذرہ اس رخصت ہوتے ہوئے شہزادے کی شان پر رشک کر رہا تھا۔ دوستوں کے لیے یہ نماز ماضی کی حسین یادوں، پر کیف جذبات اور جُدائی کے احساسات میں ڈوبی ہوئی تھی۔ نماز کے بعد مسجد میں موجود ہر شخص شہزادے کی سواری کو اپنے کندھے پر اٹھانے کے لیے بے قرار تھا، جب کہ یہ شہزادہ دولھا کی طرح چہرہ چھپائے ہمیشہ جیسی میٹھی اور دھیمی مسکراہٹ لیے اپنی آخری آرام گاہ کی طرف سفر شروع کر چکا تھا۔ حرم کی وہ ہوائیں جو روز خانۂ کعبہ کا طواف کرتی تھیں، وہ اُس کے سفید پاکیزہ لباس کے بوسے لے رہی تھیں جیسے اس خوش نصیب کو الوداع کہہ رہی ہوں۔ جنت المعلیٰ کی عظیم آرام گاہ، جہاں اُس کی پھولوں کی سیج جیسی لحد تیار تھی، مرحبا مرحبا یا سید!! کہہ کر پکار رہی تھی۔

ڈاکٹر عبداللہ مطرفی، ایک سعودی پروفیسر اس مقام پر کہتے ہیں:

’’بخاری میرے لیے قابل رشک ہے یہ مکہ سے محبت کرتا تھا اور مکہ اس سے۔ کیونکہ مکہ جس سے محبت نہ کرے وہ یہاں دفن نہیں ہوسکتا۔ کاش میرا جینا اور مرنا بخاری جیسا ہو۔‘‘

میرے اُستاد — میرے رہبر

''تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے''

الیاس میراں پوری☆

ہر انسان کی زندگی میں کچھ لمحے، کچھ پل اور کچھ گھڑیاں ایسی ضرور آتی ہیں جو اس کے لوحِ دل پر رقم ہو کر زندگی میں کچھ کر گزرنے کا حوصلہ دیتی ہیں۔ یہ حوصلہ اور یہ جرات ہی ہوتی ہے جو انسان کو لایعنی مقاصد سے مجتنب اور محترز رکھتی ہے۔ مادیت پرست عصر حاضر میں انسانیت سے مملو نمود ونمائش کی آلائش سے کنارہ کش، فکر ونظر کی پاکیزگی، خیالات کی شفافیت اور اُجلا پن اور نرگسیت پسندی سے کوسوں دور رہنے والی شخصیات کے ساتھ ماضی میں گزرا ایک ایک لمحہ اتنا خوشگوار، خوبصورت، دلکش اور ناقابل فراموش ہوتا ہے کہ انسان کی تنہائی کا رفیق بن کر اُسے تنہا نہیں ہونے دیتا، لیکن کیا کیا جائے کہ ان خوبصورت لمحوں کے حصے میں بہت کم وقت آتا ہے اور بعض اوقات یہ قلیل وقت بھی پوری زندگی کے لیے کافی ہوتا ہے۔ وہ پھر ان یادوں کے سہارے زندگی کو دھکیلتا رہتا ہے۔

کیا ۱۵/ نومبر ۲۰۰۹ء کا سورج اس لیے طلوع ہوا تھا کہ اُسے خود تو غروب ہونا ہی تھا اور جاتے جاتے ہماری ساری خوشیوں، ساری راحتوں اور ساری امیدوں کو بھی غروب کر کے لامتناہی اندوہ ناک اور غم آلود لمحات دے جائے گا۔ یہ کیا ہوا اور اتنی جلدی کیوں ہوا۔ وہ غم اور وہ دکھ کیا تھا؟ ایک اندوہ ناک اور وحشت اثر خبر تھی، جس نے دل کو دہلا اور دماغ کو لرزا دیا۔ آنکھوں سے بے ساختہ آنسو جاری ہو گئے۔

اُس دن میرے مشفق، میرے مہربان، میرے محسن، میرے مربی، میرے استاد، میرے رہبر...... ذوالکفل بخاری عقبیٰ کو سدھار گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی اچانک رحلت سے صاحبانِ علم ودانش اور اہلِ فکر ونظر میں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ یہ صرف کسی ایک انسان کی موت نہیں بلکہ ایک ایسے ادارے کی موت ہے جس نے ہر مکتبہ فکر اور شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے ہر اُس انسان کو صدمے سے دوچار کیا جو شعور وآگہی کا شناور ہے۔ ہم ایسے کم نصیبوں کی زندگی میں ایسا دن بھی آنا تھا کہ بہار جاتے جاتے دلوں کو خزاں آشنا کر جائے گی۔ خوشیاں روٹھ جائیں گی اور غم مسکراتا رہے گا۔ قلب وجگر کا وہ کونسا گوشہ ہے جو اس کرب واذیت سے واقف نہیں ہوا۔ یہ ہمارے درمیان سے کون چلا گیا کہ اکابر واصاغر مغموم اور ملول ہیں۔ اس موقع پر استاد جی کی نظم ایسے نہ کیا کرو کی چند لائنیں ذہن میں آ رہی ہیں:

☆ لیکچرار شعبہ اردو، گورنمنٹ کالج مخدوم رشید (ملتان)

ایسے نہ کیا کرو
بیٹھے بٹھائے یاد آجاتے ہو
بالکل!
ایک دم!
جی تو اکثر اداس رہتا ہے
رات بے خواب سی گزرتی ہے
اور دن میں
اگلے پچھلے خواب ٹوٹا کرتے ہیں

وہ خوبصورت اور خوب سیرت شخصیت کے مالک تھے۔حسن وخوبی کا کیا شاندار امتزاج تھا اور وہ اس میں یکتائے روزگار تھے۔

محبت، مودّت، انس، الفت، وابستگی، دلبستگی اور شگفتگی، وضعداری اور خلوص وشفقت کو اگر آپ کوئی نام دیں تو وہ ذوالکفل بخاری ہوگا۔لیکن ان کی شخصیت ان کیفیات سے کہیں زیادہ ارفع واعلیٰ تھی۔حدِ وہم وایقان سے پرے، احساس و وجدان سے دور۔اپنی الگ دنیا میں مصروف۔خوشگوار اور ہنستی مسکراتی دنیا۔وہ صرف ایک شخصیت نہ تھے بلکہ کئی شخصیات کا مجموعہ۔کثیر الجہت، نجیب الطرفین، نابغۂ روزگار اور عبقری انسان۔اُن کا نام آتے ہی میری آنکھیں اور دل احترام سے جھک جاتے ہیں۔میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا۔میرے لفظوں کو انھوں نے ہی انگلیاں پکڑ کر چلنا، بکھرے حروف کو الفاظ کے قالب میں ڈھالنے اور قرطاس کے مقدس چہرے پر سجانے کا درس دیا۔سچی بات تو یہ ہے کہ آج میں جو کچھ ہوں اُنھی کی بدولت ہوں۔انھوں نے زندگی کے ہر موڑ پر میری رہنمائی کی۔نہ صرف رہنمائی کی بلکہ ایک نصب العین دیا۔میرا دل ہمیشہ ان کا شکر گزار رہے گا۔

میں نے استاد جی کی رہنمائی میں ہی اپنی تعلیم مکمل کی۔ایف اے کرنے کے بعد میں تعلیم چھوڑ چکا تھا۔جب استاد جی کو پتا چلا تو سخت ناراض ہوئے اور کہا کہ بی اے کی تیاری شروع کرو۔میں نے بہت عذر تراشے......لیکن اُن کا مربیّانہ اصرار میرے بہانوں پر غالب آگئی اور میں نے بی اے کی تیاری شروع کر دی۔گرامی قدر پروفیسر سید محمد وکیل شاہ صاحب بی اے میں ایک مضمون سیرتِ طیبہ میں میرے ٹیوٹر تھے جبکہ استاد جی نے مجھے انگریزی، اردو اور اقبالیات کی تیاری کرائی۔انھوں نے اس سلسلے میں بڑی محبت، محنت اور شفقت سے مجھے پڑھایا۔نتیجتاً میری بی اے میں فرسٹ ڈویژن آئی۔اب انھوں نے مجھے ایم اے اردو کرانے کے لیے استادِ گرامی پروفیسر محمود الحسن قریشی مرحوم کی ''تحویل'' میں دے دیا۔یہاں بھی وہ میری تعلیم کے لیے فکر مند رہے اور گاہے گاہے محمود صاحب مرحوم سے رپورٹ لیا کرتے تھے۔میں نے ایم اے اردو کا امتحان پاس کیا تو بہت خوش ہوئے اور کہا کہ کچھ لکھنے لکھانے اور پڑھنے پڑھانے کی طرف توجہ دو۔میں نے جب بھی کوئی مضمون لکھا اُنھی سے

تصحیح کراتا۔ وہ مضمون کی قطع و برید کے بعد مجھے سمجھاتے کہ کون سا جملہ اور کون سا لفظ، کس ادا کے ساتھ، کہاں آئے گا۔ اُن کی محنت رنگ لائی اور پنجاب پبلک سروس کمیشن کے ذریعے بطور اردو لیکچرار میری تقرری ہوگئی۔ وہ اس وقت بیت اللہ میں تھے۔ میں نے فون پر اطلاع دی تو انھوں نے جس خوشی اور محبت کا اظہار کیا وہ میں زندگی بھر کیسے بھول سکتا ہوں! اُس میں خلوص اور شفقت کی لذت آمیز چاشنی تھی۔ استاد جی پاکستان آئے۔ مجھے گلے لگایا، مبارکباد دی اور کہا کہ میری خواہش پوری ہوگئی۔ درس و تدریس کے بارے میں مفید معلومات دیں۔ کالج میں پہلے روز کی ''کارروائی'' کے بارے میں دریافت کیا اور مزید ہدایات سے فیض یاب کیا۔ کالج کے پرنسپل جناب پروفیسر منیر احمد ابن رزمی سے مرحوم کی کافی موانست تھی اور اس تعلق کو انھوں نے تادم واپسیں خوب نبھایا۔ پھر مجھ سے ایک طویل مجلس میں گفتگو کرتے رہے۔ اُس نشست میں انھوں نے اپنے تدریسی تجربات و مشاہدات سے مستفید کیا۔ کچھ آپ بیتی کا تذکرہ اور کچھ جگ بیتی کا۔ اس ملاقات میں وہ جس طرح موتی رولتے رہے، میرا دامن تنگ تھا، لیکن اس تنگیٔ داماں کے باوجود میں نے بہت کچھ سمیٹا۔ کالج میں لیکچر کے دوران میری کوشش ہوتی ہے کہ استاد جی کا کوئی نہ کوئی قول، کوئی نہ کوئی شعر، کوئی نہ کوئی بات ضرور سناتا ہوں، اور آج ان کے بچھڑنے کے بعد صورتحال یہ ہے کہ اُن کا ذکر آتے ہی زبان ساتھ نہیں دیتی۔ الفاظ فضا میں کہیں معلق رہ جاتے ہیں اور

''اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے''

میں جب ماضی کے دریچوں کو وا کرتا ہوں تو یادوں کی ایک خوبصورت کہکشاں نظر آتی ہے، جس میں روشن ستارے جگمگا کر دل و دماغ کو روشن کرتے ہیں۔ ان کی ایک ایک یاد اور ایک ایک بات میری زندگی کا ایسا سرمایہ ہے جو مجھے کبھی مفلس نہیں ہونے دے گی۔ آج جب وہ ہم میں موجود نہیں (ہائے الفاظ کی کم مائیگی) ان کے خوبصورت خیالات میرے قلب وجگر کو گرما رہے ہیں۔ میں جب بھی کسی الجھن میں الجھتا ہوں، انھیں یاد کرتا ہوں، اسی وقت ان کی باتیں دل کے نہاں خانوں سے ظاہر ہوتی ہیں اور میرا مسئلہ سلجھ جاتا ہے۔ لیکن اس الجھن اور سلجھن کی کشمکش میں، میری کیفیت اُس بچے کی طرح ہوتی ہے جو بے یار و مددگار رہو۔ گویا نظیر اکبر آبادی کے اس شعر کے مطابق:

باغ میں لگتا نہیں صحرا میں گھبراتا ہے دل
اب کہاں لے جاکے بیٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

آج سے قریباً پندرہ سال قبل ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو انھوں نے مجھے اپنا گرویدہ بنالیا۔ اپنے دل موہ لینے والے انداز سے، گفتگو کے قرینے اور سلیقے سے۔ کبھی نہ ختم ہونے والی مسکراہٹ سے (جو مرنے کے بعد تک اُن کے چہرے پر رہی)۔ ان کے چہرے پر شادابی اور طمانیت تھی۔ آنکھوں پر چشمہ لگائے عالم استغراق میں کتاب کی ورق گردانی میں مصروف۔ میں عالم استعجاب میں انھیں دیکھتا رہا۔ اس دوران اُن کی نظر اچانک مجھ پر پڑی۔ تعارف کرایا۔ انھوں نے جب مجھے اپنا نام بتایا تو میں کافی دیر تک اُن کا نام یاد کرتا رہا اور آخر کار کامیاب ہوگیا۔ یہ دسمبر کی ایک سرد شام تھی۔ میں دارِ بنی ہاشم پہنچا تو سب سے پہلے جس شخصیت سے میری ملاقات ہوئی وہ استادِ جی ہی تھے۔ انھوں نے جس طرح مجھ سے کمال شفقت کا مظاہرہ کیا وہ

نا قابل فراموش ہے۔ ان کی محفل میں گھنٹوں بیٹھنے والوں کو بھی بوریت یا تکان کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ گفتگو کا سیلاب ہوتا جو بہتا جاتا۔ برجستہ اشعار، ضرب الامثال، روزمرہ ومحاورہ، مذہب، سیاست، ادب، سماج، تصوف، عالمی منظر نامہ غرض زندگی کا وہ کون سا ایسا گوشہ ہے جو ان سے مخفی تھا۔ وہ جس موضوع پر بھی بولتے دلائل کے انبار لگا دیتے۔ تہہ در تہہ اور معنی در معنی باتیں نکلتی جاتیں اور ان باتوں سے بکھری خوشبو گرد وپیش کو معطر کیے دیتی۔ ان کی محفل میں ہر عمر اور ہر طبقہ کے لوگوں کی تسکین کے لیے وافر مواد ہوتا۔ بچوں میں ایسے گھل مل جاتے گویا اپنے بچپن میں واپس لوٹ گئے ہوں۔ نوجوانوں میں بیٹھے ہیں تو پورے فکری اور ذہنی شباب کے ساتھ۔ بزرگوں کے ساتھ نشست ہے تو ''بزرگی'' عود کر آتی تھی۔ ہر شخص سے اُس کی ذہنی سطح کے مطابق گفتگو کر کے اُسے قائل کر لیتے۔ اُن کی ایک نمایاں خوبی (جو لوگوں میں خال خال ہی ہوتی ہے) یہ تھی کہ دوسروں کے مسائل کے حل کے لیے ذاتی دلچسپی لیتے اور اسے اس وقت تک سر پر سوار رکھتے جب تک کہ وہ مسئلہ حل نہ ہو جاتا۔ مجھے ڈھونڈے سے بھی ایسا شخص نہیں ملتا، جس کو استاد جی کے وجود سے کوئی تکلیف پہنچی ہو۔ ہر ایک سے اخلاص بھرا تعلق تھا جو انمٹ اور لازوال رشتہ ہے۔ اس خوبی کو انھوں نے بطور خاص اپنی ذات کا حصہ بنالیا تھا۔ وہ تو گلاب کا ایسا پھول تھے جس کا مقصد صرف مہکنا ہے، یا ایسا سورج جس کی روشنی سب کو اُجالتی ہے۔ وہ خود دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ مخلص تھے تو کوئی کیسے اُن کے ساتھ مخلص نہ ہوتا۔ میں جب بھی تنہا ہوتا ہوں، وہ میرے پاس ہوتے ہیں، میں اُن سے باتیں کرتا ہوں اور اُن سے رہنمائی لیتا ہوں۔ مجھے یقین ہی نہیں آتا کہ جس شخص کا نصب العین ہی خوشیاں اور مسکراہٹیں بکھیرنا ہو وہ سب کو دکھ کے پاتال میں کیسے اتار گیا۔ خود تو خلد مکیں ہو گئے لیکن اپنے محبت کرنے والوں کو اندوہ گیں کر گئے۔ لوگ جب بھی اُن کا ذکر کرتے ہیں تو میر تقی میرؔ کے الفاظ میں:

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

استاد جی نے صرف ۴۰ سال عمر پائی۔ لیکن اس کم عمری میں انھوں نے کیا کچھ نہیں کیا۔ شاعری کی تو بڑے بڑوں کو حیرانی (اِسے ''پریشانی'' بھی کہہ سکتے ہیں) میں مبتلا کر دیا۔ نثر لکھی تو صاحبِ طرز ادیب کے معیار پر پورے اترے۔ تدریس کی تو کامیاب استاد ٹھہرے۔ کالم لکھے (اگرچہ بہت ہی کم لکھے) تو اس میں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی۔ صحافت کی تو نام پایا۔ روزنامہ خبریں کے ادبی صفحہ کے انچارج ہوں یا ہفت روزہ چٹان لاہور کے بیورو چیف، ٹیکنالوجی کالج ملتان کے مجلّہ صناع کے ایڈیٹر انچارج ہوں یا پھر سول لائنز اور ایمرسن کالج کے جرائد کی ادارت۔ انھوں نے ہر موقع پر اپنی الگ شناخت بنائی۔ وہ ویسے بھی معاصرانہ چشمک سے دور رہتے ہوئے اپنی دنیا میں مگن رہتے تھے۔ دوست بنائے تو اس میں بھی انھوں نے اپنا معیار قائم رکھا۔ سب سے منفرد اور سب سے جدا۔ استاد جی کے دوستوں میں ''بزرگ'' بھی ہیں اور ''غیر بزرگ'' بھی۔ پروفیسر عابد صدیق، ڈاکٹر اسلم انصاری، ڈاکٹر تاثیر وجدان، پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان، شیخ حبیب الرحمٰن بٹالوی، مولانا حبیب الرحمٰن ہاشمی، خالد مسعود خان، رؤف کلاسرا، ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان، مختار پارس، ڈاکٹر عبدالرب نیاز، شعیب ودود، ڈاکٹر حافظ صفوان محمد چوہان، محمد حامد سراج، قاسم بنگیال، چودھری عبدالرؤف، سجاد جہانیہ اور جمشید رضوانی اُن کے معروف دوستوں میں ہیں۔ آج یہ سب بے کراں اداسی اور بے کنار حزن وملال میں گرفتار ہیں۔ استاد جی اپنے دوستوں کے پاس بیٹھتے تو بعض اوقات پوری محفل

ہی ان کی سامع ہوتی۔ ان کے بعد جب ان کے دوستوں کی محفل جمتی ہوگی تو کتنی سونی، کتنی اداس اور کتنی ادھوری ہوگی۔ ان کے دوست اپنے اندر بہت بڑا خلا محسوس کرتے ہیں۔ ان کے دل فسردہ اور چہرے پژمردہ ہیں کہ اپنے عزیز ترین دوست کے بغیر زندگی کیسے گزاریں۔ انھوں نے سب کے غم بانٹے اور سب کو خوشی فراہم کی۔ اب ان کے مذکورہ دوستوں کے زخموں پر مرہم کون رکھے گا۔ کون ان کے دکھ درد بڑے غور اور بھرپور توجہ سے سنے گا۔ اور اب وہ کس سے مشورہ طلب کریں گے۔ ان کے دوستدارانِ عزیز جب بھی ان کا نام لیتے ہیں ان کی آنکھیں نمناک ہوجاتی ہیں۔ میر یاد آئے:

جب نام ترا لیجے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

اُنھوں نے میرے نام کے ساتھ ''میراں پوری'' کا لاحقہ لگایا۔ وہ کبھی کبھار مجھے ''علامہ میراں پوری'' بھی کہتے تھے۔ جب پہلی دفعہ حجاز مقدس گئے تو مجھے خوشی بھی ہوئی اور غم بھی۔ اُن کے جانے کے بعد دل بہت غمزدہ تھا۔ اسی کیفیت میں، میں نے انھیں خط لکھا۔ عقیدت میں لکھے گئے بے ربط اور غیر موزوں الفاظ...... کچھ دنوں بعد اُس وقت میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا جب اُن کا مکتوب آیا۔ انھوں نے جس محبت کا اظہار کیا تھا وہ میں زندگی بھر نہیں بھول سکتا۔ اسی طرح ایک اور خط میں، میں نے اپنے دستخط ''ایجاد'' کرنے کے لیے درخواست کی تو فوراً جواب دیا اور دستخط سکھانے کے لیے انھوں نے پوری تفصیل اور نقشہ کے ساتھ سمجھایا۔ دستخط کے لیے کل ۱۷ مراحل بتائے۔ جب دستخط مکمل تیار ہوگئے تو آخر میں لکھا ''لیجیے میرے نزدیک ''محمد الیاس'' مکمل ہے۔'' خط کتابت کے علاوہ اُن سے اکثر بذریعہ ای میل بھی رابطہ رہا۔ ۱۶/مئی ۲۰۰۹ء کو اُنھوں نے مجھے ''دعائیہ ای میل'' بھیجی جو قبولیت کا درجہ اختیار کرگئی۔ ای میل کے الفاظ کچھ یوں تھے:

"May Allah make u a Professor soon."

وہ چونکہ ایک صاحبِ مطالعہ انسان تھے، اس لیے ان کے مطالعے کی وسعت تحریر اور تقریر ہر دو صورتوں میں عیاں تھی۔ ادب پر گفتگو ہو رہی ہے تو کلاسیکی ادب سے جدید ادب تک، مشرقی شعریات سے مغربی شعریات تک، اور یونانی فلسفہ سے عہدِ جدید کے فلسفیانہ افکار و خیالات اُن کے زبان سے تواتر سے جاری ہیں۔ مذہب زیرِ بحث ہے تو اس میں بھی بھرپور علمیت کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ فقہی مسائل کو اس انداز سے بیان کررہے ہیں کہ سامع کو کسی بہت بڑے عالم دین سے ہم کلام ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ سیاست پر بات ہو رہی ہے تو دلائل و براہین سے پاکستان کی بنیادوں کو کمزور کرنے والے سیاست دانوں کے ڈھنڈورے کھولتے جارہے ہیں۔ وہ اس وقت کسی بڑے تجزیہ نگار اور تیز نگاہ مبصر سے کسی طور کم نظر نہیں آرہے۔

قدرت نے ایک عبقری انسان کی مانند اُستاد جی کی طبیعت میں بھی شگفتگی، تروتازگی اور بذلہ سنجی بھی خوب خوب پیدا کی تھی۔ وہ بات سے بات نکالتے اور اسے لطیف وظریف انداز میں پیش کرکے اس میں مزاح کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکال لیتے تھے۔ ایک مرتبہ کسی کتاب کا ذکر ہو رہا تھا۔

میں نے کہا: ''کتاب اچھی طبع ہوئی ہے۔''

کہنے لگے: ''ہاں! اچھی تباہ ہوئی ہے۔''

اُستاد جی کو معروف نقاد اور محقق، مشفق خواجہ مرحوم سے قلبی تعلق تھا۔ وہ ان کے کالم ''خامہ بگوش کے قلم سے'' کے مستقل قاری تھے۔ ان کے درمیان کافی عرصہ مراسلت رہی۔ مشفق خواجہ نے جب ان کی کثیر الجہتی کو دیکھا تو ایک مرتبہ جب وہ جھنڈیر لائبریری (میلسی) میں تشریف آئے تو لائبریری کے مالکان میاں مسعود جھنڈیر اور میاں محمود جھنڈیر سے کہا کہ مجھے ذوالکفل بخاری سے ملاؤ۔ میاں برادران، خواجہ صاحب کو استاد جی سے ملانے دارِ بنی ہاشم آئے تو خواجہ صاحب ان کی تنقیدی بصیرت، شعری اُپج اور وسعتِ مطالعہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ خواجہ صاحب زندگی بھر بہت کم لوگوں سے متاثر ہوئے، استاد جی کا شمار انہی لوگوں میں تھا۔ میں نے اُن کے اور خواجہ صاحب کے درمیان ہونے والی مراسلت کے خطوط برائے مطالعہ مانگے۔ وہ چونکہ نام ونمود سے کوسوں دور رہتے تھے، فرمایا کہ کیا فائدہ؟ اس میں کوئی خاص چیز نہیں۔ میرے اصرار (......یا پھر ضد) پر انھوں نے یہ خطوط منگوا کر عنایت فرمادیے۔ استاد جی سے اجازت لے کر میں نے اپنے لیے مکاتیب کی عکسی نقول محفوظ کرلیں۔ میں ''بخاری وخواجہ مراسلت'' کو گاہے گاہے پڑھ کر اُن کی منفرد و دلچسپ نثر سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔ لیکن اس دوران ضبط کے سارے بندھن ٹوٹ جاتے ہیں۔ لیکن کیا کیجیے کہ ''جانے والوں کو کہاں روک سکا ہے کوئی''

ان تاریخی نوادر میں سے کچھ قارئین کے لیے:

> تین دن پہلے آپ کا گرامی نامہ ملا۔ ''کھولا، دیکھا، پہچانا، اللہ اکبر! مولانا؟'' جی بہت خوش ہوا۔ ایک دم خوش! حضرت! یہ ہمیں خوب معلوم ہے کہ ''ہم کہاں کے دانا ہیں، کس ہنر میں یکتا ہیں؟'' لیکن یہ جو مکتوب نگاری ہے، ہم واقعہ میں اسے بائیں ہاتھ کا کھیل سمجھا کیے۔ اور کبھی کبھار، بائیں کا نہیں تو دائیں کا سہی! اپنے تئیں ہم ادھر، بعض بندوں بلکہ بھائی بندوں کے وہ ناطقے بند کیے کہ انہیں پکارتے ہی بنی:
>
> گر فکرِ زخم کی تو خطا وار ہیں کہ ہم
> کیوں محوِ مدحِ خوبیِ تیغِ ادا نہ تھے
>
> (ذوالکفل بخاری ۲۴/ نومبر ۱۹۹۳ء)

> ملتان کے پچھلے سفر میں آپ کی دل نوازی کا علم ہوا تھا اور اب کے یہ معلوم ہوا کہ آپ مسافرنواز بھی ہیں۔ آپ نے اپنا اتنا قیمتی وقت میرے ساتھ صرف کیا کہ آپ کے اس التفات کو میں اپنا حاصلِ سفر سمجھتا ہوں۔ آپ کے والد محترم اور برادرِ گرامی سے ملاقات کرکے دلی مسرت حاصل ہوئی۔ میں نے آپ کو کچھ غیر طلبیدہ مشورے دیے۔ خدا کرے آپ پر اُن کا مثبت اثر ہو...... یہاں سے روانہ ہوتے وقت لوگوں نے مجھے ملتان کی گرمی سے بہت ڈرایا تھا، مگر آپ لوگوں کی وجہ سے اس شہرِ گرد و گرما میں خلوص کی ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔
>
> (مشفق خواجہ، ۲۷/ اپریل ۲۰۰۰ء)

مجھے نہ صرف اُن کی شخصیت نے متاثر کیا بلکہ اُن کی تخلیقات نے بھی مجھ پر خوشگوار اثر چھوڑا۔ ہمیشہ سے میری کوشش رہی ہے کہ اُن کی تخلیقات محفوظ ہوجائیں۔ اور میں آئے روز اپنی اس کوشش کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف بھی رہتا ہوں۔ اس

مرتبہ تعطیلات میں پاکستان آئے تو میں نے ان کی نظمیں کمپوز کر کے یک جا کر دیں۔ جنھیں دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے:

''کیا ارادہ ہے؟''

میں نے عرض کیا:

''اسے کتابی صورت میں دیکھنے کی خواہش ہے۔''

یہ سن کر ہنس پڑے۔ مجھے جب بھی وہ خوشگوار مسکراہٹ یاد آتی ہے تو دل خون کے آنسو روتا ہے اور بے چین و بے قرار رہتا ہے۔ بے سکونی، بے یقینی اور بے چینی ہے کہ ختم ہونے میں نہیں آ رہی۔ بہادر شاہ ظفر نے شاید اسی موقع کے لیے کہا ہوگا۔

لے گیا چھین کے کون آج ترا صبر و قرار
بے قراری تجھے اے دل کبھی ایسی تو نہ تھی

اُنھوں نے مزید کئی نظمیں ''اوراقِ گم گشتہ'' میں سے ڈھونڈ نکالیں۔ میں نے یہ نظمیں بھی کمپوز کر لیں۔ اسی طرح میں اُن کے نثر پارے بھی محفوظ کرتا رہتا ہوں۔ چاہے وہ نقیبِ ختم نبوت میں مضامین ہوں، تبصرے یا دیگر رسائل و جرائد میں اُن کی تحریریں۔ میں ان کی تخلیقات کو کسی گوہر پارے سے کم نہیں سمجھتا، اور اس میں کوئی مبالغہ بھی نہیں۔

ایک مرتبہ میں نے اُن سے آٹو گراف کے لیے درخواست کی تو انھوں نے فرمایا:

''آٹو گراف کسی اہم شخصیت کا لیا جاتا ہے۔ میں کس شمار میں ہوں۔''

میں نے گزارش کی کہ میرے لیے آپ ہی اہم ہیں۔ کافی اصرار اور طویل انتظار کے بعد انھوں نے ۱۳/ اپریل ۱۹۹۹ء میں درج ذیل آٹو گراف مرحمت فرما دیا۔

> کامیاب آدمی وہ ہے کہ جو کوئی بھی کام کرنے سے پہلے، ایک لمحہ رُک کر، یہ سوچے کہ اس کام میں دین کا یا دنیا کا کیا فائدہ ہے۔ اگر کوئی فائدہ نظر نہ آئے یا کسی حقیر اور عارضی فائدے کی خاطر وقت، مال اور جان کی قربانی زیادہ محسوس ہو تو اُس کام کو فوراً ترک کر دے۔ اس کو ''ترکِ لایعنی'' کہتے ہیں۔ ''ترکِ لایعنی'' دنیا و دین کی کامیابی کا راز ہے۔

استاد جی کو حجازِ مقدس سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ پہلی مرتبہ اُن کا تقرر جب اُملج (منطقہ تبوک) ہوا تو انھیں زیادہ خوشی نہ ہوئی۔ انھوں نے اس موقع پر فرمایا کہ میری خواہش تھی کہ حرمین شریفین کی ہمسائیگی نصیب ہو جاتی تو زندگی کا مقصد پورا ہو جاتا۔ اس کے باوجود بھی وہ سیکڑوں میل کی مسافت طے کر کے جمعۃ المبارک حرم میں ادا کرتے۔ اُن کے دل میں عشقِ رسالت (صلی اللہ علیہ وسلم) اور عشقِ الٰہی ٹھاٹھیں مارتا رہا۔ پیاسا کنویں کے پاس آنے کے لیے تڑپتا رہا۔ تشنگی بڑھتی رہی اور تشنہ لب کنویں کے قریب آتے گئے۔ اس دوران جب اُن کا تقرر حرم سے صرف پانچ سات منٹ کی مسافت پر اُم القریٰ یونیورسٹی میں ہوا تو اُن کی خوشی دیدنی تھی۔ انھوں نے جہاں بھر کی مسکراہٹوں اور پھولوں سے اپنا دامن بھر لیا۔ اس لیے وہ ہر

وقت خوش رہنے لگے تھے۔ ان کی خوشی پر ہزاروں خوشیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔ ان کا خمیر چونکہ اسی مٹی سے اٹھایا گیا تھا، اس لیے اسی مٹی میں واپس مل گیا۔

گویا جہاندار شاہ کے الفاظ میں

آخر گِل اپنی صرفِ درِ میکدہ ہوئی
پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

۱۶/ نومبر ۲۰۰۹ء پیر کا دن ہے۔ دارِ بنی ہاشم میں ایک عجیب سا ماحول ہے۔ ہر طرف ایک پرسکون اداسی ہے۔ ہر آنکھ اشکبار اور ہر چہرہ افسردہ اور پوری فضا سوگوار ہے۔ یہ ساری کیفیت آنسوؤں میں ڈھل گئی ہے۔ پسماندگان صبر کا پہاڑ دکھائی دیتے ہیں اور چپکے چپکے آنسو بہا رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد استاد جی کے بزرگ دوست محترم ڈاکٹر اسلم انصاری تشریف لاتے ہیں۔ وہ شدید صدمے سے دوچار ہیں۔ بیس سالہ رفاقت اچانک ختم ہونے پر نوحہ کناں ہیں۔ کہتے ہیں میں وہ الفاظ کہاں سے لاؤں جو تعزیت کے لیے مخصوص ہیں۔ میری ہمت اور حوصلہ جواب دے گئے ہیں۔ میں جو پر امید تھا کہ علم و ادب کو ذوالکفل کی شکل میں ایک اچھا تخلیق کار مل گیا ہے۔ لیکن اب ......کاش کاش اور صرف کاش...... ایسے شہ دماغ، مائیں خال خال جنتی ہیں۔ یہ کہتے ہوئے انصاری صاحب فضا میں گھورنا شروع کردیتے ہیں، یادوں کو تازہ کررہے ہیں اور یادیں دل کو کچوکے لگا رہی ہیں۔

اُستاد جی پر اُن کے چاہنے والے بہت کچھ لکھ رہے ہیں اور مزید لکھا جائے گا۔ میری یادیں محدود اور لفظ محدود تر ہیں۔ اُن کی ہستی کو چند لفظوں میں نہیں سمیٹا جاسکتا۔ میں اور کیا لکھوں۔ یادوں کا ایک سمندر ہے جو بہے جارہا ہے۔ آنسو ہیں جو تھمنے میں نہیں آرہے۔ میں نے یہ مضمون دل گرفتگی کی کیفیت میں لکھا ہے۔ میں نے جب بھی کچھ لکھنے کی کوشش کی ہمیشہ ہمت ہار بیٹھا، الفاظ تتلیاں بن کر اُڑ گئے اور قلم کا ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ مضمون اُن کے شایانِ شان نہیں۔ یہ تو محبت کا ایک خوش نما رنگ ہے۔ یہ جو کچھ لکھا ہے آنسو ہیں جو الفاظ کی شکل میں قلم سے نکل کر قرطاس پر منتقل ہوگئے ہیں۔ میں پہروں ان کی یاد میں کھویا رہتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ جو گھڑیاں مجھے اُستاد جی کی صحبت میں میسر آئیں، وہ اتنی مختصر کیوں نکلیں؟ اور پھر جواب میں از خود غالبؔ کا وہی شکستہ شعر دہراتا ہوں کہ

ڈھونڈے ہے اس مغنیٔ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو شعلۂ برقِ فنا مجھے

چارۂ دل سوائے صبر نہیں......!

محمد نعمان سنجرانی

میری عمر چار سال تھی جب میرے والد صاحب نے مجھے قرآن کریم پڑھنے کے لیے قریبی مدرسہ میں داخل کرادیا۔ میں مدرسہ میں قاری صاحب کے پاس پڑھنے کے لیے جاتا رہا۔ میں اس بات پر بضد تھا کہ میں نے قاری صاحب کے پاس نہیں پڑھنا۔ میری والدہ صاحبہ نے کہا کہ میں اسے اماں جی کے ہاں لے جاؤں گی۔ میں بہت خوش ہوا کہ چلو اب قاری صاحب کے پاس نہیں جانا پڑے گا۔ میری یہ خوشی، میرے لیے خوش بختی ثابت ہوئی۔ اگلی صبح والدہ صاحبہ مجھے مدرسہ کے احاطہ میں واقع ایک گھر میں لے گئیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس سادہ سے گھر کے برآمدہ میں ایک شفیق، پرسکون اور نورانی چہرے والی محترم خاتون چارپائی پر بیٹھی تھیں۔ میری والدہ صاحبہ نے سلام دعا کے بعد کہا کہ یہ میرا بیٹا نعمان ہے آپ اسے قرآن کریم پڑھادیں۔ اماں جی نے کہا کہ میں تو بہت ضعیف ہوچکی ہوں اور اب میں کسی بچے کو پڑھاتی بھی نہیں۔ والدہ صاحبہ نے خوب اصرار کیا اور کہا کہ اسے باہر مدرسہ میں داخل کرایا تھا لیکن یہ قاری صاحب کے پاس نہیں پڑھتا اس لیے میں اس کو آپ کے پاس لے آئی ہوں۔ اماں جی نے کہا کہ میں پڑھاتی تو نہیں لیکن آپ کے اصرار پر اس کو اپنے پاس پڑھانے کے لیے بٹھا لیتی ہوں۔

اماں جی مجھے بیٹا کہہ کر بلایا کرتی تھیں۔ الحمدللہ مجھے اس عظیم ماں کی بساط بھر خدمت کرنے کا بھرپور موقع ملا۔ اماں جی کا معمول کچھ یوں تھا کہ فجر کی نماز کے بعد سارے مسنون اعمال مکمل کرتیں۔ ابا جی صبح جلدی ناشتہ کرکے دفتر چلے جاتے اور بڑے بھائی جان (سید محمد کفیل بخاری) زیادہ تر ماہنامہ نقیب ختم نبوت کے دفتر میں محسنِ احرار ابنِ امیر شریعت سید عطاء المحسن بخاریؒ کے ساتھ یا پھر مجلسِ احرارِ اسلام کی تنظیمی و تبلیغی سرگرمیوں مشغول رہتے جب کہ منے شاہ جی کسی کالج میں پڑھانے جایا کرتے تھے۔ منے شاہ جی گھر کے سارے بیرونی کام کیا کرتے تھے۔ سودا سلف لانا، بیمار کی دوائی لانا وغیرہ۔ وہ بہت زندہ دل انسان تھے، ہر ایک کو خوش رکھتے چاہے کوئی بڑا ہو یا بچہ۔ بچوں میں پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا کرنا گویا اُن کا نصب العین تھا۔ ان سے گپ شپ کرتے اور ان کو دلچسپ اور سبق آموز واقعات سناتے۔

منے شاہ جی بہت ہی نرم دل اور نرم گفتار تھے، ہمیشہ ہر ایک سے مسکراتے چہرے اور کشادہ دلی سے ملتے۔ اپنے ہوں یا پرائے وہ ہر ایک کی حتی الوسع مدد کیا کرتے۔ شاہ جی بہت ہی مہمان نواز تھے وہ اپنے دوستوں کو اکثر اوقات اپنے گھر دعوت پر مدعو کیا کرتے۔ ان کا دسترخوان بہت وسیع ہوتا، متنوع قسم کے لوازمات دسترخوان پر چن دیتے، مہمان اس سوچ میں پڑ جاتے کہ کیا کیا کھایا جائے۔ وہ مہمانوں کی ضیافت کا سارا سامان خود بازار سے خرید کر لاتے اور اس انداز سے مہمان نوازی کرتے کہ دسترخوان پر کسی چیز کی کمی نہ رہتی۔ اور ہم (صبیح، عطاء، راقم) ان کے ساتھ دسترخوان پر کھانا لگانے میں ان کا ہاتھ بٹاتے۔ جب کھانے کی تمام اقسام دسترخوان پر لگا دی جاتیں تو اس کے بعد بھی شاہ جی کی یہی کوشش ہوتی کہ ہر ایک مہمان کو اپنے ہاتھوں سے کھانا پیش کریں۔ ان کے اخلاقِ حمیدہ کی وجہ سے ان کے حلقۂ عقیدت وارادت میں تمام مکاتب فکر کے افراد شامل تھے۔

ایک دن پتا چلا کہ منے شاہ جی سعودی عرب پڑھانے کے لیے جارہے ہیں۔ یہ ۲۰۰۲ء کی بات ہے ان دنوں ہم مدرسہ معمورہ دارِ بنی ہاشم میں درجہ رابعہ کے طالب علم تھے۔ وقت کا پہیہ تیز رفتاری سے چلتا رہا، ہم ۲۰۰۷ء میں جامعہ اشرفیہ لاہور

میں دورہ حدیث میں شریک تھے۔ منے شاہ جی ان دنوں چھٹیوں پر پاکستان آئے ہوئے تھے، کسی کام کے سلسلے میں انھیں لاہور آنا پڑا، ہم (صبیح، عطاء، طیب، سلیمان یمنی، عبدالباسط اور راقم) ابھی مجلس احرار کے دفتر لاہور ہی میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ معلوم ہوا کہ منے شاہ جی نے آج لاہور آنا ہے۔ ہم لوگ بہت خوش تھے کہ ہم دورہ حدیث میں میں شریک ہو لیے، چلو ایک طرف کی رسمی تعلیم تو کسی کنارے پہنچی۔ عشاء کی نماز کے قریب منے شاہ جی تشریف لائے، ہر ایک ان سے بڑے تپاک سے ملا۔ بڑے بھائی جان بھی لاہور ہی میں تھے، کچھ دیر حال احوال پوچھنے کے بعد ہم نے ان کے لیے دسترخوان لگایا سب نے مل کر کھانا کھایا۔ گرمی کا موسم تھا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد ہم سب باہر صحن میں آ گئے۔ تب شاہ جی کے ساتھ خوب طویل نشست ہوئی، شاہ جی نے ہر ایک سے اس کے اگلے لائحہ عمل کے بارے میں استفسار کیا اور ہر ایک کی علمی اور عملی رہنمائی کی۔ اس محفل میں شاہ جی کے ساتھ ہر موضوع پر گفتگو ہوئی۔ شاہ جی نے مجھے کہا کہ اب کی بار تم جب گھر جانا تو میٹرک کے امتحان کی تیاری کرنا، اور تعلیمی سلسلہ کو جاری رکھنا۔ اس کے بعد شاہ جی نے کہا کہ اب آپ لوگ سو جائیں۔ صبح اٹھ کر نماز پڑھنی ہے۔ شاہ جی اگلی صبح ملتان واپس چلے گئے۔

سالانہ امتحان سے فراغت کے بعد میرا دل چاہ رہا تھا کہ اب فوراً گھر (ملتان) واپس چلیں اور اس خواہش کا اظہار میں نے اپنے ہم وطن طلباء سے بھی کیا لیکن انھوں نے کہا کہ اب آخری بار ہی ہم لوگ میں اکٹھے ہیں پھر نہ جانے کب ہم سب دوست اکٹھے ہوں اس لیے ایک دن ٹھہر کر گھر جائیں گے۔ بالآخر سب دوستوں کی خواہش کے احترام میں ان کی بات ماننی پڑی اور مزید ایک دن اور گزارنے کے لیے وہیں ٹھہر گئے۔ اس دن حضرت پیر جی سید عطاء المہیمن بخاری مدظلہ العالی بھی لاہور تشریف لائے ہوئے تھے۔ اگلی صبح ایک بہت ہی افسوس ناک سانحہ ہوا کہ میرے والد صاحب (سیف الرحمٰن سنجرانی) خالق حقیقی سے جا ملے۔ دوستوں نے یہ سوچتے ہوئے مجھے اِس سے مطلع نہ کیا کہ یہ ہولناک اطلاع اس کو کیسے دی جائے کہ اس کے والد اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ رات کو نائٹ کوچ جو کہ لاہور سے ملتان کو جاتی ہے اس سے سفر کریں گے۔ اور ابھی میں فجر کی نماز پڑھ کر لیٹا ہی تھا کہ کسی دوست نے آ کر مجھے جگایا اور کہا کہ اٹھو ہم گھر چلیں، میں حیران تھا کہ اچانک یہ پروگرام کیسے تبدیل ہو گیا۔ بہر حال میں جلدی سے کپڑے تبدیل کر کے آ گیا اور ہم بس کے ذریعے ملتان کے لیے روانہ ہوئے۔ جب ہم ملتان مدرسہ معمورہ پہنچے اور میں رکشہ سے سامان اتارنے لگا تو مجھے عطاء المنان نے کہا کہ سامان کو چھوڑ دو اور گھر چلو، تمھارے والد صاحب فوت ہو گئے ہیں۔ اس خبر کو سننے کے بعد مجھے سارے عالم میں سناٹے کا گمان ہوا، میرے ذہن میں دھماکے ہونے لگے اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ایسا اندھیرا کہ جو چمکتے سورج کی روشنی سے بھی ختم نہ ہو سکا اور نہ ہی ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ بڑے بھائی جان جناب سید محمد کفیل بخاری مدظلہ نے مجھے اپنے سینے سے لگا کر مجھے دلاسہ دیا جس سے مجھے کچھ سہارا ملا۔

اسی دن بعد نماز عصر میرے والد صاحب کا نماز جنازہ تھا۔ نماز جنازہ مدرسہ معمورہ دار بنی ہاشم میں ادا کی گئی۔ نماز جنازہ کے بعد ہم لوگ قبرستان روانہ ہوئے۔ ہمارے پہنچنے سے قبل ہی منے شاہ جی وہاں موجود تھے۔ تدفین کا عمل بوجوہ تھوڑا موخر تھا۔ کچھ لوگ اس دیر کی وجہ سے لوٹ گئے لیکن منے شاہ جی انتظار کرتے رہے اور اس وقت تک واپس نہیں گئے جب تک کہ ہم تدفین سے فارغ نہ ہو گئے اور اس کے بعد میں نے سر کی طرف کھڑا ہو کر سورہ بقرہ کا پہلا رکوع تلاوت کیا، منے شاہ جی نے پائینتی کی جانب کھڑے ہو کر آخری رکوع تلاوت کیا۔

کچھ دنوں بعد شاہ جی سعودی عرب لوٹ گئے اور جاتے جاتے مجھے اس بات کی تلقین کہ اپنی تعلیم پر مکمل توجہ دو اور اپنا وقت ادھر ادھر پھرنے میں مت ضائع کرو۔ میں نے کچھ عرصہ بعد میٹرک کے امتحان کی تیاری شروع کر دی، اور کچھ ماہ بعد ہی میٹرک کے امتحانات شروع ہو گئے اور میں نے سارے پرچے دیے لیکن ریاضی کا پرچہ اچھا نہ ہوا۔ جب نتیجہ آیا تو میں ریاضی کے علاوہ باقی مضامین میں پاس ہو گیا۔ شاہ جی ایک بار پھر چھٹیوں پر پاکستان آئے اور مجھ سے دریافت کیا کہ تمھارے میٹرک کا

کیا بنا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا کہ میٹرک میں فرسٹ ڈویژن بن گئی ہے لیکن ریاضی کے پرچے میں رہ گیا ہوں، انھوں نے مجھے ڈانٹا نہیں بلکہ مجھ سے کہا کہ نعمان تم نے قرآن کریم حفظ کرلیا ہے اور تم ریاضی میں رہ گئے ہو؟ وجہ کیا ہے؟ میں نے کہا کہ میں نے ابتدائی کتب نہیں پڑھیں اس لیے ریاضی سمجھنے میں کافی پریشانی ہوتی ہے۔ کہنے لگے کہ اب تم جس ٹیچر کے پاس پڑھنے کے لیے جانا پہلے اس سے ریاضی کی ابتدائی کتب پڑھنا، اس کے بعد میٹرک کی ریاضی پڑھنا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد وہ مجھ سے اکثر پوچھتے کہ اب ریاضی سمجھ آرہی ہے اور میں کہہ دیتا کہ جی پہلے سے تو کچھ بہتر ہے، وہ مجھے بار بار پڑھنے کی تلقین کرتے اور کہتے کہ ان دنوں میں ریاضی کو خوب پڑھ لوتا کہ اس بار امتحان میں نہ رہ جاؤ۔

کچھ دنوں کے بعد ضمنی امتحانات کے لیے داخلہ فارم بھرنے کی آخری تاریخ تھی اور میں ضروریات کا بندوبست نہیں کرسکا تھا۔ منے شاہ جی کے علم میں یہ بات آئی، کہنے لگے کہ آج آخری تاریخ ہے اور تم نے ابھی تک داخلہ فارم نہیں بھرا۔ عجیب آدمی ہو! اگر کوئی مسئلہ تھا تو مجھ سے کہا ہوتا، شاہ جی فوراً مجھے بذاتِ خود بورڈ کے دفتر لے گئے اور وہاں سے داخلہ فارم لیا، خود ہی اس کے اندراجات کو مکمل کیا اور پوچھا کہ کیا تم نے تصویریں بنوالیں ہیں؟ میں نے کہا جی ہاں۔ شاہ جی نے مجھے داخلہ فیس دی اور میں وہ فیس جمع کروا کے آیا۔ اس کے بعد ہم مدرسے واپس آئے، میں نے داخلہ فارم پر تصاویر چسپاں کیں اور داخلہ فارم اُن کو تھما دیا۔ وہ نامعلوم اتنا دن ڈھلنے کے باوجود کہاں سے داخلہ فارم تصدیق کروا کے لائے اور مجھے کہا کہ جاؤ اب یہ بورڈ کے دفتر جمع کروا دو۔ میں نے ریاضی کا پرچہ دیا اور میں کامیاب ہوگیا شاہ جی کو معلوم ہوا تو بہت خوش ہوئے، میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اللہ کا بھی کہ میں کامیاب ہوگیا۔

منے شاہ جی سے ابھی نئے تعلیمی سال کے مضامین بارے مشورہ کرنا تھا لیکن ان سے ابھی یہ پوچھ نہیں سکا تھا کہ وہ آخری بار پھر سعودی عرب چلے گئے۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ ان کو بیت اللہ کا قرب مل جائے ان کی یہ خواہش پوری ہوگئی تھی اور وہ بہت خوش تھے۔ جمعۃ المبارک کو منے شاہ جی نے سعودی عرب کے لیے روانہ ہونا تھا، جمعہ کے بعد جب باہر آیا تو دیکھا کہ وہ لوگوں کو مل رہے تھے۔ اور پھر وہ چلے گئے۔

جب ۱۵ نومبر کی ایک خون آلود شام کو ایک جانکاہ حادثہ رونما ہوا، جب منے شاہ جی یونیورسٹی سے پڑھا کر اپنی گاڑی پر گھر واپس جارہے تھے اور ان کی گاڑی کا شدید ایکسیڈنٹ ہوا اور وہ اس حادثے میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ یہ حادثہ ظہر کے بعد پیش آیا اور اس کی اطلاع ہمیں بعد نماز مغرب ملی، جب بڑے بھائی جان نے کہا کہ منے شاہ جی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ اللہ رحم و کرم کا معاملہ فرمائے۔ مغرب کی نماز کے فوراً بعد حضرت پیر جی سید عطاء المہیمن بخاری کے ساتھ ایک جماعتی کارکن محمد مہربان کے گھر تعزیت کے گئے، تعزیت کر کے واپس لوٹے، ابھی گاڑی سے نکلے ہی تھے کہ گھر سے مرتضیٰ شاہ جی آئے اور کہنے لگے کہ استاد جی اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ بالکل ویسا ہی منظر تھا کہ جب مجھے عطاء المنان نے کہا کہ تمھارے والد صاحب اس دنیا میں نہیں رہے۔ میں بالکل ساکت اور بے جان وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا، ایک بار پھر مجھے سارے عالم میں سناٹے کا گمان ہوا، میرے ذہن میں دھماکے ہونے لگے اور میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ایسا اندھیرا جو آئندہ دنوں کے چمکتے سورج کی روشنی سے بھی ختم نہ ہوسکا اور نہ ہی ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس بار بھی بڑے بھائی جان سید محمد کفیل بخاری مدظلہ میرے پاس آئے ویسے ہی مجھے دلاسہ دیا اور صبر کرنے کی تلقین کی اور دفتر کے باہر بچھی چارپائی پر لاکر بٹھایا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا کہ یہ اچانک کیا ہوگیا۔

موت کا ذائقہ تو ہر ذی روح کو چکھنا ہے، لیکن ایسی ناگہانی موت ......جس پر ہر ایک حواس باختہ تھا۔ موت کیسے کیسے عزیز چہروں کو اچک لیتی ہے

کئی دماغوں کا ایک انساں......!

حافظ اخلاق احمد

ایک ہمہ جہت شخصیت، ایک شفیق استاد، نامور ادیب اور محقق جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ کے پروفیسر سید محمد ذوالکفل بخاری بے شمار خفیہ اور ظاہری خوبیوں کے مالک تھے۔ ۱۵/نومبر ۲۰۰۹ء کی شام وہ ہم سب کو افسردہ چھوڑ گئے۔ اللہ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی آخرت کو ان کی دنیا سے بھی کئی گنا بہتر فرمائے اور انھیں اپنے جوار میں اعلیٰ علّیین میں مقام عطا فرمائے۔ آمین۔

آج میں جب ان کی شخصیت پر لکھنے کے لیے قلم تھامے بیٹھا ہوں تو ایک سرخ سپید چہرہ، سر پر ہمہ وقت ٹوپی، کشادہ پیشانی، عینک کے پیچھے ہنستی مسکراتی اور چمک دار آنکھیں، ذہانت کی غمازی کرتی ہوئیں، تکلم کے وقت ہنستا مسکراتا چہرہ، باتوں میں گہرائی اور ٹھہراؤ کے ساتھ شگفتگی، الفاظ کے استعمال میں مہارت رکھنے والا، سنجیدہ اوقات میں بھی تلخاب حیات سے مکدّر نہ ہونے والا جامِ اخلاق، حلقہ یاراں میں بریشم، علم کے بحر بیکراں، تحریر کا ایک ایک حرف اپنی جگہ ایسا سجا دیتے گویا ایک بہترین صنّاع نے تراش خراش کے تمام تقاضے پورے کر کے ہر پتھر کو مناسب جگہ دی ہو، ایسی عظیم ہستی کا چہرہ میرے سامنے سے ہٹتا ہی نہیں۔

ان کی وفات سے اعلائے کلمۃ اللہ کی جدوجہد میں مشغول افراد کی صفوں میں جو خلا پیدا ہوا ہے، اس کو آنے والے وقت میں پُر کرنا اتنا آسان نہ ہوگا۔ ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے، ذوالکفل شاہ جی کا شمار ایسے لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے تحقیق ومطالعہ کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا اور عشق کی حد تک اس سے وابستگی اختیار کی تھی، قدرت نے شاہ جی کو زرخیز ذہن دے کر بھیجا تھا جس کا اندازہ ان کی تحاریر سے بخوبی معلوم ہوتا ہے۔

شاہ جی کی طبع میں لطافت کے ساتھ متانت اور سنجیدگی بھی بہت تھی۔ وہ تہذیب اور شائستگی کے پیکر تھے۔ ان کی شخصیت میں ایسی جاذبیت اور سحر تھا جو اوروں کو ان کی طرف متوجّہ ہونے پر مجبور کر دیتا۔ شاہ جی کے شبانہ روز مطالعہ اور مشاہدے کی اعلیٰ صلاحیتوں نے انھیں اپنے ہم عصروں سے یگانہ اور منفرد بنا دیا تھا۔ ان کی قابلیت اور علمیت دوسروں پر اثر چھوڑتی تھی۔ باتوں باتوں میں مشکل عقدے حل کرنے کا ان کو فن آتا تھا۔ وہ لمبی لمبی باتوں اور تمہید سے احتراز کرتے ہوئے اختصار کو اپناتے اور اپنا مدعا بیان کرنے میں ایسی مہارتِ تامہ رکھتے تھے کہ سننے والوں کو کہیں بھی تشنگی کا احساس نہ ہوتا۔ مزید برآں شاہ جی کے لطیف فکاہاتی ذوق نے ان کی مجلس کی رونق میں حد درجہ اضافہ کیا ہوا تھا۔ یہ ان کی شخصیت کی ایک نمایاں خوبی تھی۔ وہ زاہد خشک نہ تھے، بلکہ ہنسنے ہنسانے والے اور باتوں کو لطیف پیرائے میں بیان کرنے والے شخص تھے۔ اُنھیں برجستہ جواب دینے اور پھبتی کسنے کا ہنر بھی خوب آتا تھا، لیکن یہ پھبتی پھکڑ بازی نہ ہوتی تھی اور نہ ہی تہذیب سے گری ہوئی نہ ہوتی تھی۔ نہ ہی اس کا مقصد اوروں کی تضحیک و تذلیل ہوتا تھا، بلکہ ان کا مقصد اول و آخر طبیعت میں بشاشت پیدا کر کے لطیف طریقے سے اپنی حالت کی طرف توجہ دلانا ہوتا تھا، اور وہ اس میں پوری طرح کامیاب رہتے تھے۔

شاہ جی کے اخلاق حسنہ نے اوروں کے دلوں کو تسخیر کرنے اور ان کو اپنا بنانے میں ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ ان کے اندر پائی جانے والی فطری ہمدردی، انس اور پیار نے بھی ایک عالم کو ان کے قریب کر دیا تھا۔ شاہ جی کی انھی خصوصیات نے

زندگی کے اس سفر میں ہر مکتبِ فکر کے لوگوں کو متاثر کیا اور ان کے دلوں پر باقی رہنے والے اچھے اثر چھوڑے۔ اُن کے طرزِ زیست کا اصل الاصول یہ رویّہ تھا کہ زندگی کا ہر پل اور ہر لمحہ قیمتی ہے، اس کو کسی نہ کسی کام میں صرف کیا جائے اور زندگی کو لایعنی سرگرمیوں سے دور رکھا جائے۔

شاہ جی کو تمام مکاتبِ فکر، نظریے، عقائد اور نقطۂ نظر کے حامل لوگوں سے قربت حاصل تھی۔ اس ضمن میں ان کا دل ہر قسم کی کدورتوں، نفرتوں اور کینہ وحسد سے پاک تھا۔ وہ انسان کی بحیثیت انسان، تکریم کے بھی قائل تھے۔ انھوں نے اپنے دل میں کبھی کسی کے لیے کھوٹ اور میل نہیں رکھا۔ اسی وجہ سے تمام لوگ شاہ جی کا ہمیشہ احترام کرتے تھے۔

شاہ جی کی شائع شدہ تحریرات میں بلا کی شگفتگی کے ساتھ ساتھ روانی اور بہاؤ محسوس ہوتا ہے۔ اُن کا اسلوب دلنشیں اور قلوب کو بہا جانے والا ہے۔ شاہ جی ایک محقق، اور مفکر کے ساتھ ساتھ ایک بہترین شاعر بھی تھے، جس کا اندازہ آپ ان کی نظمیں پڑھ کر بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں خصوصاً شاہ جی کی وہ نظم جو کتبہ کے نام سے موسوم ہے۔

وہ جب بھی پاکستان آتے اور اپنے محبین سے فرصت پا کر کبھی دار بنی ہاشم کے صحن میں بیٹھتے تو ہماری کوشش ہوتی کہ جتنا ہو سکے شاہ جی کی صحبت اختیار کریں۔ ہم سب دوست ایک ساتھ شاہ جی کی مجلس میں بیٹھتے اور شاہ جی کی باتوں سے خوب مستفید ہوتے۔ ہم دوستوں کی ایک مختصری جماعت الیاس میراں پوری، سید صبیح الحسن ہمدانی، سید عطاء المنان بخاری، علی مردان قریشی، نعمان احمد سنجرانی، محمد طیب معاویہ، عبدالباسط، سراقہ قریشی، محمد طارق اور محمد سلیمان یمنی پر مشتمل ہوتی۔ اور ہم میں سے ہر ایک شاہ جی سے گفتگو کرنے میں خوب اشتیاق رکھتا تھا۔ یہ گفتگو کسی ایک موضوع پر منحصر نہ ہوتی بلکہ مختلف موضوعات پر مبنی ہوتی جن میں ''فقہ، تصوّف، فلسفہ، ادب، منطق، جغرافیہ، معاشیات'' وغیرہ شامل ہوتے۔ اگرچہ ہر نشست کا لبِّ لباب یہ ہوتا کہ وہ ہم سب کو کشاکشِ حیات میں آگے اور بالاتر دیکھنا چاہتے ہیں۔ شاہ جی ہر موضوع پر اس طرح گفتگو فرماتے گویا کہ ہمیں کتاب پڑھ کے سنا رہے ہوں۔ شاہ جی کی یہ گفتگو ہر دوست کے ساتھ اسی کی طبعیت کے موافق اور اکثر اُس کی علاقائی زبان میں ہوتی تھی۔

شاہ جی کے ساتھ گزری ہوئی وہ مجالس اور شاہ جی کے سنائے ہوئے اشعار اب بھی میرے ذہن میں موجود ہیں اس عاجز نے شاہ جی سے شرفِ تلمذ بھی حاصل کیا اور نیاز مندوں جیسی عقیدت رکھتے ہوئے دوستوں جیسی توجہ اور نوازشات بھی حاصل کیں۔ ان کی اقتدا میں نماز جیسا اہم فریضہ ادا کرنے کا موقع بھی ملا اور ان تمام مقامات میں اُن کی انفرادیت واضح طور پر نظر آئی۔

شورش کاشمیری مرحوم نے مولانا ابوالکلام آزاد کی قبر پر جو تاریخی مرثیہ پڑھا اس کا مصداق ہر وہ شخص ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد جیسی خوبیوں سے آراستہ ہو اور شاہ جی کے لیے ہمارے ذہنوں میں سوائے مولانا ابوالکلام آزاد کے کوئی تشبیہ نہیں ہے۔

عجب قیامت کا حادثہ ہے، کہ اشک ہیں آستیں نہیں ہے
زمیں کی رونق چلی گئی ہے، اُفق پہ مِہرِ مُبیں نہیں ہے
کئی دماغوں کا ایک انساں، میں سوچتا ہوں کہاں گیا ہے
قلم کی عظمت اجڑ گئی ہے، زباں سے زورِ بیاں گیا ہے
اتر گئے منزلوں کے چہرے، امیر کیا کارواں گیا ہے

تری جُدائی میں مرنے والے، وہ کون ہے جو حزیں نہیں ہے
مگر تری مرگِ ناگہاں کا مجھے ابھی تک یقیں نہیں ہے

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

حافظ حمود الرحمٰن

۱۵/نومبر ۲۰۰۹ء کی وہ کیسی خون آلود شام تھی جب حضرت سید ذوالکفل بخاری کی وفاتِ ناگہانی کی اندوہناک خبر ملی اور آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے اور حضرت کے ساتھ جو چند لمحات بیتے تھے ساتھ ہی ذہن میں گردش کرنے لگے۔ بچپن سے لے کر اب تک ہر موقع کی ان کی یاد میرے ساتھ ہے۔ حضرت استادِ محترم سید ذوالکفل شاہ صاحب نے بچپن میں راقم کو ایک کتاب اپنی لائبریری سے عنایت کی تھی: زمین کی تہہ میں۔ ادارۂ ہمدرد کی اِس کتاب میں ایک ناول کی شکل میں زمین کی اندرونی ساخت بتائی گئی تھی۔ ایک تو کتاب پُراثر اور دلچسپ اور پھر کتاب عطا کرنے والی مردم ساز شخصیت، دونوں کی تاثیر نے ایک کھلنڈرے بچے کو کسی حد تک مطالعہ کا شوق ڈال دیا۔ اور آج کتاب بیزاری کے اس عمومی ماحول میں میرا کتاب بیزار نہ ہونا اُن کا ہی صدقہ ہے۔ اور آج جو میرے ہاتھ میں قلم ہے اور اِس قلم سے میں اُن کے متعلق اظہارِ جذبات پر قادر ہوں، یہ استاذی حضرت ذوالکفل شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ہی فیضان اور ان کی توجہات کا نتیجہ ہے۔ بلاشبہ وہ ایک بہترین مربی تھے۔

سیدی حضرت شاہ صاحبؒ کی زیارت قلب ونظر کی تسکین کا باعث تھی۔ شعبان ۱۴۲۷ھ-۲۰۰۶ء میں جب دارِ بنی ہاشم میں ختم نبوت کورس کا آغاز ہوا تو راقم بھی شریک کورس تھا اور چند دن حضرت استاد صاحبؒ کی تسلسل کے ساتھ رفاقت وزیارت حاصل زیست ہے۔ اور ان صفحات پر اکثر وہی یادیں ہی ہیں۔ البتہ سادات کی غلامی کا تعلق حضرت دادا جان مدظلہ (مولانا محمد یاسین صاحب خادم خاص حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ) کی طرف سے منتقل ہوا ہے (بفضل اللہ) ایک مرتبہ دادا جان نے چچا جی کو نہایت بھرپور طریقے سے ان کی نسبت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یاد دلایا تھا جب وہ غالی فرقہ کے ایک نام نہاد سائیں بابا کے ہتھے چڑھ رہے تھے کہ پتر! توں جتھے مرضی چلا ون، تیرا پیو سیداں دا غلام ہے۔ تو وی سیداں دا غلام رہسیں۔ (بیٹا تو جہاں بھی چلا جا لیکن تیرا باپ سادات کا غلام رہا ہے، اور تو بھی اِنہی کا غلام رہے گا) انشاء اللہ۔ یہی تعلق ہی ہمارا فخر اور ورثہ ہے اور یقیناً نجات کا ذریعہ بھی۔

ختم نبوت کورس میں شرکت سے حضرت سید شاہ صاحبؒ سے براہ راست شرف تلمذ حاصل ہوا جو انشاء اللہ تا دم آخر فخر وانبساط کے طور پر ساتھ رہے گا۔

یہ فخر تو حاصل ہے برے ہیں کہ بھلے ہیں
دو چار قدم ہم بھی تیرے ساتھ چلے ہیں

اللہ نے استاد صاحبؒ کو تمام اوصافِ حمیدہ سے وافر حصہ عنایت فرمایا تھا۔ ان کی ذات کا مشاہدہ کریں تو ہر وصف نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود تواضع تو ان میں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی جس کا اس عاجز نے ہر ملاقات میں اثر لیا اور ساتھ ہی یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ ہر پھلدار شاخ جھکی ہوتی ہے۔ حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عین مطابق من تواضع للّٰہ رفعه اللّٰہ جس نے اللہ کے لیے تواضع اختیار کی اللہ نے اس کو بلند (رفیع الشان) کر دیا اور یہ بلندی ورفعت ان کی زندگی

میں قدم قدم پر دکھائی دیتی ہے۔ سب سے بڑھ کر علم کی رفعت جوان کے سامنے چند گھڑیاں گزارنے والے کو بھی محسوس ہوتی تھی میرے خیال میں ان کے پاس بیٹھنے والا کوئی بھی شخص ان کی ذات سے محروم اور بے فائدہ اٹھ کر کبھی نہیں گیا۔ علمی لحاظ سے ان کی مثال اس عطار کی سی تھی جس کے پاس بیٹھنے والا بغیر ارادہ کے بھی اس کی خوشبو سے فائدہ اٹھاتا رہتا ہے حتیٰ کہ محض گزرنے والا بھی۔ وہ ہمہ وقت جستجو اور مطالعہ میں منہمک رہتے تھے۔ دوسروں کی بلاتفریق علمی رہنمائی کرنا اپنا فریضہ سمجھتے اور اس فریضے کی ادائیگی کے بعد دلی خوشی اور اطمینان محسوس کرتے تھے۔

رات دن جس کو اس جہاں میں کام تھا　　ہر گھڑی جہد و مشقت جس کا شغل عام تھا
زندگی میں اپنی جو وقف غم و آلام تھا　　چین سے سوتا نہ تھا بیگانۂ آرام تھا
وہ گیا ہے عالم برزخ میں سونے کے لیے　　رہ گئے ہم اس جہاں میں رونے کے لیے

یہ علمی رفعت کی کیا کم دلیل ہے کہ وہ ام القریٰ یونیورسٹی مکۃ المکرمہ کے استاد تھے اور ملک و بیرون ملک سے بڑے بڑے نامور ادباء اور اہلِ علم اُن کے حلقہ کی زینت تھے جوان سے تعلق کو فخر گردانتے تھے۔ اور یہ بھی علم ہی تھا جس کی وجہ سے انھیں تقوی کی رفعت نصیب تھی (انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء) کبھی بھی انھیں کسی عمل میں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برعکس کرتے ہوئے نہیں دیکھا حتی کہ ہنسی مزاح میں بھی (سنت کے مطابق) تبسم فرماتے تھے لطیفے سنانے کے بعد سننے والوں کی ہنسی اور خوشی سے نسبتاً زیادہ لطف اندوز ہوتے تھے۔ سر پر ہمیشہ ٹوپی رکھتے اور ڈاڑھی ماشاء اللہ سنت کے بالکل مطابق تھی۔ مجھے تو یقین ہے کہ اللہ نے علم و تقوی کی اسی صلاحیت (میرٹ) کو دیکھتے ہوئے اپنے حرم کے قرب میں جگہ دی اور درس و تدریس میں ایسے عظیم منصب کے لیے منتخب کیا اور یوں حضرت استاد صاحبؒ کو دنیا بھر سے آئے ہوئے طالبان علم کی تشنگی کے لیے سیرابی کا سامان بنا دیا۔

اللہ رب العزت کی طرف سے حضرت استاد صاحبؒ کو ایسی قبولیت عامہ اور مقبولیت تامہ نصیب تھی کہ چھوٹا بڑا بوڑھا جوان جو کوئی بھی استاد صاحبؒ سے ایک دفعہ مل گیا پھر استاد صاحبؒ اس کی لوح خیال سے محو نہ ہو سکے۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

اس نعمت کو تو بڑے لوگ ترستے ہیں اور کسی کسی کے نصیب میں یہ خصوصیت آتی ہے اور وہ بھی عمر کا ایک قابل ذکر حصہ گزارنے کے بعد مگر حضرت استاذ صاحبؒ جوانی میں ہی بفضل اللہ اس دولت سے سرفراز ہو چکے تھے اور ان شاء اللہ تا قیامت رہیں گے۔ اور کیوں نہ ہوں وہ تو حسن خلق کی بلندی کا نمونہ، شائستگی کے پیکر، اعلی ظرفی کی اعلی مثال اور بے لوث ہمدردی کے امین گویا مخزن اخلاق تھے۔

کورس کا جب اختتام ہوا تو اس عاجز نے تمام اساتذہ سے نصائح کی درخواست کی جب حضرت شاہ صاحبؒ سے عرض کیا تو فرمانے لگے کہ نصیحت تو بڑوں سے لکھوائی جاتی ہے۔ میں نے کہا آپ بھی تو ہمارے لیے بڑے ہیں ساتھ ہی کاپی پر ایک شعر لکھ دیا کچھ دیر بعد میں نے یہی کاپی بنت امیر شریعتؒ سیدہ نانی جان دامت برکاتہن سے نصیحت لکھوانے کے لیے عطاء المنان بھائی کے ذریعے جب گھر بھیجی تو حضرت استاد صاحبؒ میری کاپی خود لے کر باہر آئے اور مزاح کے انداز میں فرمانے لگے کہ آپ نے اپنے بارے میں بتایا ہی نہیں میں تو آپ کو پورے کورس میں سمجھتا رہا کہ شاید حضرت تھانویؒ کے سلسلے کے کوئی بزرگ ہیں (گول شیشوں والا چشمہ اور عمامہ کی وجہ سے) پھر بیٹھک میں قریباً ایک گھنٹہ تک مجھے لے کر بیٹھے رہے اور فضولیات سنتے رہے۔ آج جب یہ سوچتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ اتنا عظیم انسان اس ناکارہ کی بے کار گفتگو کتنی ہی دیر تک

سنتا رہا۔ لا ریب اُن کی ہر ادا دل میں گھر کر جانے والی تھی۔

کتنے حسین لوگ تھے مل کرکے ایک بار
آنکھوں میں بس گئے دل وجاں میں سما گئے

یہ ہے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی کامل اتباع اور یہ عشق رسول صلی اللہ علیہ کے بغیر ناممکن ہے۔ بلا شبہ وہ ایک عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے یہی وجہ تھی کہ یہاں ان کا دل ہی نہیں لگتا تھا۔ ہمیشہ وہ حجاز مقدس جانے پر مصر رہتے تھے۔ اور فرماتے تھے کہ مجھے وہاں کی مٹی اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اور واقعی ان کے لیے اس مٹی کی کشش غیر معمولی تھی۔ اور آج اسی مبارک مٹی کی چادر اوڑھے وہ اپنے کریم رب کے ہاں محو استراحت ہیں۔

اس عاجز کو جو اُنھوں نے نصیحت کے طور پر شعر لکھ کر دیا تھا وہ بھی عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں گندھا ہوا اور ان کے عاشق صادق ہونے پر دال ہے۔ پڑھیے اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نور محسوس کیجیے۔

کار زارِ دہر میں وجہِ ظفر وجہِ سکوں
عرصۂ محشر میں وجہِ درگزر خیر البشرؐ

محبوبِ ربِ کائنات سے یہی عشق و محبت ہی ان کے حسن خاتمہ کا سبب بنا۔ سبحان اللہ زندگی تو مثالی تھی ہی سہی موت بھی قابل رشک، ایسی سعید موت کی تمنا کون نہ کرے گا۔ گویا موت پر بھی رفعتوں کا تسلسل نہیں ٹوٹا بلکہ رفعتوں کی ایک داستان ہے جو دار بنی ہاشم سے احاطہ بنی ہاشم تک پھیلی ہوئی ہے۔ **ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء** افسوس! رفعتوں، عظمتوں اور بلندیوں کا فخر ہم سے چلا گیا۔ اور ہم اللہ کی اس مبارک نعمت سے کوئی قابل قدر استفادہ نہ کر سکے اور شاید افسوس کی تلافی کی یہ ایک بے معنی سی کوشش کامیاب ہو جائے کہ ان کی یاد میں چند بے ربط جملے لکھ دئے ہیں۔

لیکن اگر مصر کی بڑھیا ایک سوت کی اَٹی لے کر یوسف علیہ السلام کی خریدار ہونے کی نسبت حاصل کرنے کی کوشش کر سکتی ہے تو میرے قلم کی یہ جنبش بھی حضرت استاد صاحبؒ کی مدح سرائی کی نسبت حاصل کرنے کی ایک سعی ہے۔ اور ممدوح شخصیت کی مدح تو بذاتِ خود ایک سعادت ہے اور اس سے نہ صرف حصولِ سعادت ہے بلکہ ان کے مشن کا پیروکار بننے کا عزم بھی ان شاء اللہ سرمایۂ زیست ہے۔

تو میرے سامنے نہیں ہے میرے رہبر حیات
لیکن تیری بتائی ہوئی رہ گزر تو ہے

برکت کے لیے دادا جان مدظلہ کے سنائے ہوئے اس شعر پر بات مکمل کرتا ہوں جو شورش کاشمیریؒ نے حضرت امیرِ شریعت کی وفات پر ایک تعزیتی جلسہ میں پڑھا تھا۔

رات دن زیرِ زمین لوگ چلے جاتے ہیں
خدا معلوم تہہِ خاک تماشا کیا ہے

اللھم جعلنا من السعداءِ وعبادک الصالحین الذین لاخوف علیھم ولاھم یحزنون (آمین)

نابغۂ عصر ذوالکفل بخاری

مولانا فیصل متین سرگانہ☆

خانوادۂ امیر شریعت سے میرا تعلق موروثی ہے۔ میرے دادا مہر حاجی شوق محمد مرحوم، امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمتہ اللہ علیہ کے قدیم رفقاء میں سے تھے۔ شاہ جی جب بھی ہمارے گاؤں ''باگڑ سرگانہ'' (ضلع خانیوال) آتے تو ہمارے ہاں ہی قیام فرماتے اور وہ اسے اپنا دوسرا گھر قرار دیتے تھے۔ شاہ جی کی اس شفقت اور خلوص کو دیکھتے ہوئے وہاں کے لوگ اُن سے عقیدت کے مضبوط رشتے میں استوار ہوگئے جو آج تک قائم ہے۔ میرے دادا مرحوم نے ۱۹۳۷ء میں اس علاقہ کی سب سے پہلی احرار تبلیغ کانفرنس منعقد کی۔ اس کانفرنس کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے میرے دادا مرحوم نے بھرپور محنت کی۔ ہندوستان بھر سے احرار رضا کاروں کے قافلے جوق در جوق شریک ہوئے۔ مجلس احرار اسلام کی مرکزی قیادت میں سے رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، ماسٹر تاج الدین انصاری، قاضی احسان احمد شجاع آبادی، صاحبزادہ فیض الحسن اور مولانا مظہر علی اظہر کے علاوہ دیگر اکابر بھی تشریف لائے۔ یہ کانفرنس تین روز تک جاری رہی اور بہت کامیاب ہوئی۔ جس کے اثرات اس علاقے میں آج بھی موجود ہیں۔

یہ تو تھی میری اس عظیم خاندان سے تعلق کی ہلکی سی جھلک!

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں سیکنڈ ائیر کا طالب علم تھا۔ معروف افسانہ اور ناول نگار، بھائی حامد سراج خانقاہ سراجیہ (کندیاں) سے میرے گھر (ملتان) تشریف لائے۔ انھوں نے مجھے کہا:

> فیصل! آج تمھیں میں ایسے لوگوں سے ملانے جا رہا ہوں کہ ان جیسے لوگ اگر چراغ لے کر بھی ڈھونڈو گے تو ملنا محال ہے۔ میں تمھیں دارِ بنی ہاشم لے کر جانا چاہتا ہوں جہاں ہم ابن امیر شریعت سید عطاء المحسن بخاری اور ذوالکفل بخاری سے ملیں گے اور ڈھیروں باتیں کریں گے۔

میں اُس وقت پہلی مرتبہ دارِ بنی ہاشم گیا تھا۔ میرے ذہن میں ایک عجیب طرح کا ہیولا سا بنا ہوا تھا کہ امیر شریعت جیسے عظیم انسان کے فرزندان کی رہائش بڑی شاندار اور پُرکشش ہوگی۔ لیکن وہاں تو منظر اور ہی کچھ تھا۔ ایک چار دیواری میں ''پُرشکوہ عمارت'' کی بجائے سادہ سا مکان اور مدرسہ......یہی شاہ جیؒ کے بیٹوں کی کل کائنات تھی۔ اس پر مستزاد یہ کہ شاہ جیؒ کے چھوٹے نواسے، سید ذوالکفل بخاری علیہ الرحمتہ کی سادہ پوشاک، خوش گفتاری، خوش مزاجی، بذلہ سنجی، نکتہ آفرینی، خاندانی رکھ رکھاؤ، علم و ادب سے گہرا لگاؤ ایسی صفات نے مجھ پر خوشگوار تاثر چھوڑا۔ گفتگو کے قرینے اور سلیقے نے مجھ پر ایک عجیب سحر سا طاری کر دیا۔ ایک ایسا جادو، جس کے حصار سے آج تک نہیں نکل سکا۔ اگر نکلنا بھی چاہوں تو نہیں نکل سکتا۔ یہ ممکن بھی نہیں۔

☆ مدرس مدرسہ معمورہ، ملتان

اس ملاقات کے بعد بھائی حامد سراج نے کہا کہ ان لوگوں سے کسبِ فیض کیا کرو کہ یہ ہمارے گناہوں کے لیے کفارہ ہیں۔

بھائی ذوالکفل سے میری ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ میں ہر جمعرات اُن کی محبتوں کو اپنے دامن میں بھرنے کے لیے وہاں چل نکلتا۔ وہاں مجھے ایک عجیب سی مانوسیت اور روحانی سکون حاصل ہوتا۔ بھائی حامد جب بھی خانقاہ سے ملتان تشریف لاتے تو حسبِ معمول ہمارا ناشتہ بھائی ذوالکفل کے ہاں ہوتا۔ وہ کیسے شاندار دن تھے اور اُن سے وابستہ خوشگوار یادیں کتنی راحت افزا ہیں۔ اُن کے ساتھ گزرے لمحات کو کبھی نہیں بھول پاؤں گا۔

نابغۂ روزگار سے کچھ خوبیاں ایسی وابستہ ہوجاتی ہیں جو انھیں دیگر افراد سے ممتاز و ممیّز کرتی ہیں۔ بھائی جان سے میرا تعلق کچھ اسی نوعیت کا تھا۔ ان کا پیکر خلوص وللّٰہیت اور اُنس والفت میں گُندھا ہوا تھا۔ میں نے انھیں کبھی جھوٹ بولتے اور کسی کی غیبت کرتے نہیں دیکھا۔ میری اُن سے سینکڑوں ملاقاتیں ہیں۔ یہ ملاقاتیں یادگار اور ناقابل فراموش ہیں۔ میں نے ہر ملاقات میں ان کی شخصیت کے مختلف رنگ دیکھے اور اُن سے بہت کچھ سیکھا۔

میں بی اے کی تیاری کر رہا تھا تو بھائی ذوالکفل کے پاس انگلش کی تیاری کے لیے جاتا تھا۔ وہ پڑھانے کے ساتھ ساتھ چائے بھی پلاتے۔ اتنی محبت سے پڑھاتے کہ مشکل سے مشکل مقام بھی بڑی آسانی سے طے ہوجاتا۔ اُن کا طریقۂ تدریس اتنا شاندار تھا کہ انگلش، جسے میں بہت مشکل مضمون سمجھتا تھا اسے بڑی دلچسپی سے پڑھنے لگا۔ جب میرا نتیجہ آیا تو میں نے بہت اچھے نمبر لیے تھے۔ میں فوراً مٹھائی لے کر بھائی ذوالکفل کے پاس گیا۔ انھیں رزلٹ بتایا تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اصل محنت تو تمہاری ہے۔ میں نے تو صرف پڑھنے کا طریقہ بتایا ہے۔ حالانکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ اگر یہ میری رہنمائی نہ فرماتے تو میں بی اے نہ کرسکتا۔ اس حوالے سے بھائی جان ذوالکفل بخاری میرے استادِ محترم بھی ہیں۔

بی اے کرنے کے بعد میں نے دینی تعلیم کے حصول کے لیے جامعہ خیرالمدارس میں داخلہ لے لیا۔ ایک سال کے بعد میں مدرسہ عربیہ سعدیہ خانقاہ سراجیہ کندیاں شریف چلا گیا۔ وہاں بھی بھائی ذوالکفل سے اکثر ملاقاتیں رہتیں۔ اُنھیں حضرت مولانا خواجہ خان محمد صاحب سے گہری عقیدت تھی۔ بھائی جان جب بھی خانقاہ آتے تو بھائی حامد سراج کے گھر طویل نشستیں ہوتیں۔ یہ نشستیں بھرپور علمی نوعیت کی تھیں اور ان محفلوں میں بھائی جان اپنی علمیت کے جادو جگاتے نظر آتے۔ موضوع کوئی بھی ہو وہ اس روانی سے بولتے جیسے یہ اُن کا خاص موضوع ہے۔ ہر موقع پر انھوں نے اپنے بھرپور مطالعے کی وسعت کے نشان چھوڑے۔

ایک مرتبہ بھائی حامد کے گھر محفل گرم تھی۔ میں اندر سے چائے لے کر آیا تو بھائی جان نے بتایا کہ خانقاہ کی چائے سے مجھے خصوصی شغف ہے۔ چائے پیتے جارہے تھے اور تعریف کرتے جارہے تھے۔ چائے کا موضوع جاری ہے۔ اسی دوران انھوں نے دہلی جیل میں حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات کا حال سنایا کہ شاہ جی اور مولانا آزاد دونوں قید تھے۔ مولانا نے چائے پیش کی اور شاہ جی سے پوچھا کہ چائے کیسی ہے؟ شاہ جی نے فرمایا کہ چائے تو بہت اچھی ہے لیکن! مولانا نے حیرت سے شاہ جی سے پوچھا۔ کیسے؟ شاہ جی نے فرمایا: اس میں اگر تھوڑا سا زعفران بھی ہوتا تو کیا بات تھی؟ تو مولانا نے شاہ جی کے ذوق کی داد دیتے ہوئے فرمایا کہ ہاں میرے بھائی۔

ایک مرتبہ بھائی ذوالکفل کے ساتھ خانقاہ سراجیہ کے لیے سفر کیا۔ نمازِ مغرب سے پہلے پہنچے۔ وضو کرکے حضرت کے انتظار میں تھے۔ حضرت تشریف لائے تو رک کر بھائی ذوالکفل سے خیریت دریافت کی۔ میں نے بھائی جان سے پوچھا:

حضرت نے آپ کو ملتے ہی پہچان لیا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔

بھائی جان نے فرمایا:

ایک مرتبہ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ میرے دل میں یہ خدشہ رہتا ہے کہ جب میں آپ سے ملوں گا تو کیا آپ مجھے پہچان لیں گے۔

حضرت نے فرمایا:

تم جب بھی مجھے ملتے ہو میں تمھیں فوراً پہچان لیتا ہوں۔

۲۰۰۶ء میں اللہ تعالیٰ نے مجھ پر خصوصی کرم فرماتے ہوئے رمضان المبارک میں عمرہ کی سعادت نصیب فرمائی۔ وہاں میں نے حرم پاک میں بھائی ذوالکفل کو دیکھا۔ میں نے اُن کے موبائل پر فون کیا اور کہا:

بھائی جان! میرا وجدان کہہ رہا ہے کہ آپ اس وقت حرم میں ہیں اور میں بھی عمرے میں آیا ہوا ہوں۔

انھوں نے فرمایا:

تمھارا وجدان بڑا تیز ہوگیا ہے۔

انھوں نے مجھے نمازِ مغرب کے بعد مکہ ٹاور آنے کو کہا۔ وہاں پہنچتے ہی میں نے کہا:

بھائی جان! اللہ تبارک وتعالیٰ کا کتنا بڑا احسان ہے کہ اُس نے اپنے گھر بلا کر آپ سے ملاقات کا شرف بخشا۔

آخری بار سعودی عرب جانے سے پہلے ایک رات بھائی جان سے سرسری ملاقات ہوئی۔ اُن کی یہ بات آج تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔

فیصل بھائی! آج کل تو لفٹ ہی نہیں ہے۔

میں نے ہنس کر کہا:

نہیں بھائی جان ایسی بات نہیں۔ آپ حکم فرمائیں۔

میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ میری اُن سے آخری ملاقات ہوگی۔

۱۵/ نومبر ۲۰۰۹ء کو میں تبلیغی اجتماع رائے ونڈ سے واپس آرہا تھا کہ مولانا محمد اکمل کا فون آیا کہ ذوالکفل شاہ جی وفات پاگئے ہیں۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ میں سکتے کی کیفیت میں چلا گیا۔ بے یقینی کی کیفیت میں، میں بار بار یہ سوچتا رہا کہ اللہ کرے یہ خبر غلط ہو۔ میں نے دو تین بار مولانا اکمل کو فون کیا، انھوں نے ہر دفعہ تصدیق کی تو میری عجیب کیفیت ہوگئی۔ بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور دل غم کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔

جانے والوں کو نہ روکو کہ بھرم رہ جائے
تم پکارو گے بھی تو انھیں کب لوٹ آنا ہے

یہ کتنی بڑی سعادت ہے کہ ان کا خمیر جس پاکیزہ مٹی سے اٹھایا گیا تھا واپس اُسی مٹی میں مل گیا۔ اللہ تعالیٰ انھیں غریقِ رحمت کرے اور ہم سب کو صبر جمیل سے نوازے۔ (آمین)

جناب عینک فریمی

حافظ طاہر محمود

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہم لوگ ٹیلی کام سٹاف کالج کے فیملی ہاسٹل میں رہتے تھے (یعنی ۹۷-۱۹۹۶ء کی) کہ ہمارے پاس نقیبِ ختمِ نبوت آنا شروع ہوا۔ ہم پر یہ عنایت حافظ صفوان صاحب کی وجہ سے ہوئی۔ اِس رسالے سے صرف اسلام دشمنوں کی کارروائیوں کا ہی پتہ نہیں چلتا تھا بلکہ حالاتِ حاضرہ پر بہت اچھے مضامین، اچھی شاعری اور ادب بھی پڑھنے کو ملتا تھا۔ اور تو اور، اس میں حالاتِ حاضرہ پر ہلکے پھلکے انداز میں یک سطری تبصرے بھی ''عینک فریمی'' صاحب کرتے تھے۔ یہ صفحہ گویا رسالے کی جان ہوتا تھا جس میں لکھے جملے پورا مہینہ سنے جاتے تھے۔ ایک روز حافظ صاحب نے بتایا کہ جناب عینک فریمی تشریف لا رہے ہیں۔ ہم کئی دوست اُن سے ملنے کا شوق رکھتے تھے۔ حافظ صاحب نے ہمیں سسپنس میں رکھا کہ یہ کون شخصیت ہیں۔

ایک صبح حافظ صاحب کا فون آیا کہ آج کچھ مرغے آپ کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں۔ دوپہر کا کھانا ہمارے ہاں کھائیں۔ نمل میں پڑھنے والے ایک دوست کے اعزاز میں یہ کھانا تھا۔ اُنھیں ''شاہ جی'' کہا جا رہا تھا۔ کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ یہی شاہ جی دراصل عینک فریمی ہیں۔ بہت خوشی ہوئی۔ شاہ جی نے اپنی گفتگو سے رسالے کے جملے بھلا دیے اور بہت سے نئے فقرے زبان پر آ گئے۔ اُن دنوں کا ایک فقرہ تو ابھی تک یاد ہے: سی ٹی بی ٹی (چھوٹی ٹنڈ بڑی ٹنڈ)۔ (سی ٹی بی ٹی اصل میں مخفف تھا ایٹمی تابکاری کے پھیلاؤ کے خلاف کیے جانے والے ایک عالمی معاہدے کا، اور اُس وقت میاں شہباز شریف وزیرِ اعلیٰ پنجاب تھے اور میاں محمد نواز شریف وزیرِ اعظم پاکستان۔) پھر ذوالکفل شاہ جی کبھی کبھی آنے لگے۔ ہم ہر دفعہ اُن سے ملتے اور دنیا بھر کے موضوعات پر باتیں سنتے۔

ہم لوگ شاہ جی سے ہر قسم کے سوالات پوچھتے۔ نفسیاتی اُلجھنیں اور گھریلو مسائل کے حل بھی وہ ہمیں بتاتے۔ مارچ ۲۰۰۹ء میں شاہ جی ایک رات کے لیے ہری پور تشریف لائے تو میں اُن سے آخری بار ملا۔ سعودیہ میں اُن کے گروپ کے ساتھ گئے ہوئے ایک صاحب ٹی اینڈ ٹی کالونی کے بھی ہیں۔ شاہ جی بہت پُرامید تھے کہ اب کے وہ مکہ یونیورسٹی میں لیکچرر لگ جائیں گے۔ حسبِ معمول ہم کافی دیر تک اُن کے ساتھ بیٹھے رہے۔ پھر ایک روز حافظ صاحب نے بتایا کہ شاہ جی کو الحمدللہ مکہ یونیورسٹی میں لیکچرر شپ مل گئی ہے۔ میں نے اُنھیں مبارک باد دی۔ شاہ جی کے اِس بار آنے کے کچھ دن کے بعد حافظ صاحب کے بیٹے عکرمہ محمد چوہان کا حفظ مکمل ہوا۔ شاہ جی کے بڑے بھائی مولانا سید کفیل بخاری صاحب ختمِ قرآن کی تقریب کے لیے ہری پور آئے۔ میں اُن سے بھی ملا۔

۱۵/ نومبر ۲۰۰۹ء کو رات خبروں میں پٹی چلنے لگی کہ پروفیسر سید ذوالکفل بخاری مکہ مکرمہ میں ٹریفک حادثے میں جاں بحق ہو گئے ہیں۔ مجھے یقین ہی نہ آیا۔ فوراً حافظ صاحب کو فون کیا۔ معلوم ہوا کہ یہ قیامت گزر چکی ہے۔ حافظ صاحب کی طبیعت بھی بہت خراب تھی۔ اُنھوں نے کہا کہ بس آپ دعا کر دیں لیکن ابھی میرے گھر نہ آئیں۔ ہم فجر میں مل لیں گے۔

اللہ پاک شاہ جی کی دینی اور اصلاحی کوششوں کو قبول کرے اور اُن کے لیے آخرت میں بلندیِ درجات کا سبب بنائے۔ ہم اُن کے لیے دعا گو ہیں۔

دنیا والوں میں ایک اللہ والا

محمد شہزاد حنیف

جس طرح مجھے تاریخیں بالکل یاد نہیں رہتیں، بالکل اُسی طرح اوقات اور واقعات اور خبریں بھلائے نہیں بھولتیں۔ میں تو اِسے اپنی بد قسمتی ہی کہا کرتا ہوں، آپ جو مرضی کہہ لیں۔ مجھے آج بھی بہت اچھی طرح یاد ہے، رات کے ۱۱:۳۰ کا وقت تھا جب میرے موبائل کی گھنٹی بجی۔ دیکھا تو عمران (میرا چھوٹا بھائی، آج کل سعودیہ میں ہوتا ہے) کا نمبر آ رہا تھا۔ میں نے فوراً اٹینڈ کیا کہ خیر ہو، اِتنی رات گئے اُس کا فون نہیں آیا کرتا۔ دوسری طرف سے اُس کی وحشت بھری آواز آئی کہ یار شہزاد، ذوالکفل صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔

میں کچھ نہیں بول پایا۔ اُس نے بات جاری رکھی اور کہنے لگا کہ کل دوپہر یونیورسٹی سے واپس جاتے ہوئے راستے میں ایکسیڈنٹ ہوا اور اُن کی موقع پر ہی وفات ہوگئی۔

مجھے یہ بھی اچھی طرح یاد ہے کہ میں بس اتنا ہی کہہ پایا تھا: ''کیا کہہ رہے ہو یار۔'' اِس سے زیادہ مجھ میں نہ کچھ کہنے کی ہمت تھی اور نہ سننے کی۔ عمران کی کال بند ہوئی تو میں نے بغیر کچھ دیکھے اور سوچے کہ صفوان صاحب سو رہے ہیں یا جاگ رہے ہیں، صفوان صاحب کا نمبر ملا دیا تھا۔ اُنھوں نے کال اٹینڈ کر لی۔ مگر وہ آواز صفوان صاحب کی نہ تھی، عجیب دل شکستہ اور ٹوٹی ہوئی۔ میں نے اُن سے اِس اچانک خبر کا تذکرہ کیا تھا، شاید اِس امید پر کہ صفوان صاحب مجھے ڈانٹ کر کہہ دیں گے کہ کیا بات کرتے ہو یار۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ میری تو جو حالت تھی سو تھی۔

گو ٹیلی فونک گفتگو تو بہت بار ہوئی مگر میں ذوالکفل صاحب سے گن کے پانچ بار ملا ہوں۔ اور مجھے لگتا تھا کہ میرے بڑے بھائی کا انتقال ہوگیا ہے۔ مگر صفوان صاحب کی حالت کا اندازہ آپ یوں لگا لیجیے کہ جس شخص کا اُن سے برسوں کا یارانہ رہا ہو، ہم پیالہ ہم نوالہ رہے ہوں۔ میں نے تو اِنھیں جب بھی دیکھا دونوں کو اکٹھے دیکھا، یا اکٹھے ہوتے دیکھا، یا اکٹھے ہونے کا پروگرام بناتے دیکھا۔ اُن کی کیفیت کا اندازہ کوئی نہیں لگا سکتا، شاید صفوان صاحب بھی نہیں۔ مگر مجھے تو یہ لگتا ہے کہ صفوان (صاحب) اور ملتان کے بیچ اگر کچھ مشترک تھا، صفوان صاحب اگر ملتان کو کھنچے چلے آتے تھے، اگر کوئی ایسی قوت تھی جو اُنھیں ملتان کے محور کے گرد گردش میں رکھتی تھی تو وہ تھی بس ذوالکفل صاحب کی ذات...... صفوان صاحب اب جہاں بھی جائیں، کہیں بھی رہیں، مگر اب وہ ملتان کے محور سے نکل گئے ہیں...... واللہ اعلم۔

کہاں سے شروع کروں۔ اپنی بے ربط سوچوں اور خیالوں سے، جسے ذوالکفل صاحب خود بڑی محبت سے اچھی کوشش کہا کرتے تھے اور اعلان فرما دیتے کہ بھئی کرنٹ تو ہے، لکھتے رہیے۔ اور میں بس یہ کہہ کر اُٹھ جایا کرتا کہ چھوڑیں سر، جانے دیں، کوئی اور بات کرتے ہیں۔ ہری پور سے واپسی ہوئی تو صفوان صاحب سے ایسا تعلق بن چکا تھا کہ آج تک جڑا ہوا ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی رہے گا۔ کبھی ملاقات، کبھی فون پہ بات اور کبھی ای میل پر حالات۔ بے ربط اور بے جوڑ خیالات اور

ترتیب جسے خود مجھے بھی شاعری کہتے ہوئے شرم آتی تھی، پہلی بار صفوان صاحب کے کہنے پر میں نے اپنا وہ کلام ذوالکفل صاحب کو دکھایا۔ اور یہ ذوالکفل صاحب ہی تھے جنھوں نے بڑی شفقت سے رہنمائی بھی کی اور حوصلہ افزائی بھی۔ اور میں تھا کہ ڈرتا رہا اور یہی سوچتا رہا کہ میں اپنے کاغذات کا دفتر اُٹھائے جس شخص کے سامنے بیٹھا ہوں، وہ کوئی بھی ہو مگر ذوالکفل بخاری نہیں ہوسکتے کہ اُن کے پائے کی علمی اور ادبی شخصیت اور اِتنی حلیم اور متواضع، اِس قدر شفقت اور اپنائیت اور وہ بھی پہلی ملاقات میں......!! مگر مجھے اندازہ نہ تھا کہ اللہ والے تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔

میں اُن کے پاس سے اُٹھا تو اِس بات کا اندازہ تو بہرحال نہ تھا کہ آئندہ اگر کچھ لکھوں گا تو وہ کیسا ہوگا۔ مگر اِس بات کا اندازہ ہو چلا تھا کہ ذوالکفل صاحب سے ملاقات اور تعلق کے بغیر شاید نہیں رہا جائے گا۔ مگر میں اِسے اپنی کوتاہی گردانتا ہوں، سراسر اپنی کوتاہی...... کہ میں اِس ہستی کے اِتنے قریب رہ کر بھی بے فیض رہا۔ اُن کی شخصیت، اُن کی محبت اور خلوص کا بار ہی شاید اِتنا تھا کہ مجھ ایسا کم ظرف اُٹھانے سے ڈرتا رہا۔ یوں بھی تھا کہ لاشعوری طور پر یا شعوری طور پر ہم دنیادار لوگ اللہ سے اور اللہ والوں سے ایسے ہی ملا کرتے ہیں کہ جب کام پڑا تو تمام بھولے ہوئے تعلق اور ناتے ہمیں یاد بھی آجاتے ہیں اور اُتنی ہی شدت سے ہم پر سوار بھی ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم اپنی اِس گندی عادت سے مجبور ہیں تو اللہ اور اللہ والے بھی اپنی اِس عادت سے باز نہیں آتے کہ ہم مدتوں بعد بھی اُن کے در پہ چلے جائیں تو اُن کی محبت اور اپنائیت ویسی کی ویسی رہتی ہے، اُس میں ذرا بھی فرق نہیں آتا۔

میرے پاس کہنے کو اور کچھ بھی نہیں، سوائے گنتی کی اِن چند ملاقاتوں کے۔ اُن کے پاس جا بیٹھنا اور اُن سے مل لینا۔ کبھی اپنی شاعری کی اصلاح کے لیے تو کبھی اپنی اصلاح کے لیے۔ آخری بار عید الفطر پہ ملاقات ہوئی تھی۔ میرا چھوٹا بھائی سعودیہ جا رہا تھا۔ میں اُسے ملوانے لے گیا۔ صفوان صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ وہ ذوالکفل صاحب سے میری آخری ملاقات ثابت ہوئی۔ اُنھوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور ساتھ کے ساتھ بھائی کو مفید معلومات اور مشورے بھی دیے۔ اپنا فون نمبر بھی اُسے لکھوا دیا کہ کبھی کوئی مسئلہ ہو تو رابطے میں آسانی رہے۔ شاید عمران سے اُن کی کوئی ملاقات سعودیہ میں ہوئی ہو مگر اِتنا ضرور تھا کہ جب بھی عمران سے بات ہوتی، ذوالکفل صاحب کا ذکر ضرور ہوتا تھا کہ اُن سے رابطہ رہتا ہے اور وہ ہمیشہ رہنمائی کرتے رہتے ہیں۔

ذوالکفل صاحب اب ہم میں نہیں۔ سچی بات ہے تو یہ ہے کہ نہ وہ کبھی ہم میں تھے اور نہ ہی کبھی ہم میں سے تھے...... دنیا والوں میں کوئی اللہ والا کب تک رہ سکتا ہے؟ جتنا بھی ہوسکا، جیسے بھی ہوسکا...... اُنھوں نے صبر سے اِس دنیا میں گزارہ کیا...... مگر کب تک۔ اللہ والوں کا گزارہ اللہ کے بغیر ممکن نہیں ہوتا اور اللہ میاں جی بھی تو اپنے پیارے بندوں کو خوش دیکھنا پسند فرماتے ہیں۔ ایسا نہ ہوتا تو ذوالکفل صاحب کو ہمیں چھوڑ جانے کی اِتنی بھی کیا جلدی تھی۔ میرے سیل فون میں اُن کا نمبر آج بھی محفوظ ہے۔ ای میل پر بھی اُن کا آئی ڈی آج بھی اُسی طرح موجود ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اب اِس نمبر سے کبھی کال نہیں آئے گی، اُن کے ای میل سے اب کوئی میل نہیں آنی، نہ وہ کبھی آن لائن ہوں گے۔ مگر اُن کا نمبر اور ای میل میرے پاس ہمیشہ محفوظ رہیں گے، جیسے اُن کی یادیں رہتے دم تک میرے ساتھ رہیں گی۔ بحیثیت ایک دنیادار شخص کے مجھے اِتنا تو علم ہے کہ اب اِس دنیا میں اُن سے شاید ملاقات نہ ہوسکے، پر اگر آپ میں سے کوئی کبھی اُن سے مل پائے، خواب میں، اِس دنیا میں یا اُس دنیا میں، تو اُن سے کہہ دیجیے گا کہ ہم دنیادار اِس اللہ والے کو، ذوالکفل بخاری صاحب کو، آج بھی بہت یاد کرتے ہیں......

ع وہ مجھ سے دور سہی، پر مری نگاہ میں ہے

ایک پیارا آدمی

قاسم منصور جلالی ☆

انٹرنیٹ پر آوارہ گردی کرتے ہوئے فیس بک پر شیخ رشید احمد صاحب کے صفحہ پر جا پہنچا۔ وہاں پر ایک خبر پڑھنے کو ملی جس کا موضوع تھا: ''اور ذوالکفل بخاری بھی چلے گئے۔'' میں حیران و پریشان ہوگیا۔ یعنی وہ محبتوں بھرا آدمی جس کی میٹھی میٹھی باتیں انسان کو پہلی ہی ملاقات میں اُس کا دیوانہ بنا دیں، اب نہیں رہا۔

انسان اِس دنیا میں جانے کے لیے آیا ہے مگر اچانک اور ناگہانی حادثے میں چلے جانے پر پرائے بھی افسوس ہی کرتے ہیں۔ مگر ذوالکفل بخاری جیسا پیارا آدمی جو دھیمے دھیمے لہجے میں بات کرتا، آپ کو گھنٹوں مصروف رکھ سکتا تھا۔ اُن سے میری ملاقات بھی حافظ صفوان صاحب کی برکت سے ہوئی۔ الحمدللہ اپریل ۲۰۰۹ء میں عمرے کے لیے جا رہا تھا۔ حافظ صاحب نے حکم دیا کہ ''یار قاسم، ذوالکفل کے لیے تھوڑی سی کتابیں لے جانا۔'' میں نے ہامی بھر لی۔ مگر جب وہ ''تھوڑی'' سی کتابیں اُٹھائیں تو متردّد ہوا۔ مگر ذوالکفل بخاری سے مل کر حافظ صاحب کو دعائیں دیتا رہا کہ اگر وہ یہ بوجھ میرے حوالے نہ کرتے تو شاید میں ذوالکفل سے کبھی نہ مل پاتا۔

انتہائی مختصر وقت، دو تین گھنٹے کی ملاقات کے بعد میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ وہ انتہائی مہذب، مودب اور سلجھے ہوئے آدمی تھے۔ تقریباً تین گھنٹے ہم باتیں کرتے رہے مگر نہ مجھے تھکاوٹ کا احساس ہوا اور نہ اُکتاہٹ کا۔

وہ مکہ مکرمہ میں ملازمت ملنے پر انتہائی خوش تھے اور وہاں کے علما کے حلقے میں بیٹھتے تھے۔ اپنے نانا جان امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے۔ حرمین کے اماموں، وہاں کے نظام اور وہاں کے منتظمین کے بارے میں بتاتے رہے۔ انتہائی keen observer تھے اور دل موہ لینے والے انداز میں بات کرتے۔ میں اُن کے کسی شاگرد سے تو نہیں ملا مگر امید ہے کہ وہ اِسی دل موہ لینے والے انداز میں پڑھاتے ہوں گے۔

دعا ہے کہ اللہ پاک اُن کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اُن کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ اور لواحقین کو صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین، ثم آمین۔

☆ سینئر انسٹرکٹر پی ٹی سی ایل ٹریننگ کالج، پشاور

رہنمائی کے خوگر

ڈاکٹر ظہیر احمد ☆ zaheer.ahmad@surrey.edu.uk

بھائی ذوالکفل صاحب سے میرا غائبانہ تعارف حافظ صفوان بھائی کے واسطے سے کئی سالوں پر محیط رہا۔ پہلی مرتبہ اُن سے فون پر بات فروری ۲۰۰۹ء میں ہوئی۔ وہ ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ میں لیکچرر تھے اور مجھے جدہ میں شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی میں جاب شروع کرنا تھی۔ میں اُن سے مکہ مکرمہ میں زندگی کی مصروفیت اور وہاں کی تعلیم کے بارے میں معلومات پوچھتا رہا۔ اُنھوں نے نہایت دوستانہ انداز میں میری رہنمائی فرمائی۔ حرم شریف کی کیفیت پر بھی بات ہوئی اور میرے ارضِ مقدس پہنچنے کے شوق کو مہمیز ملی۔ میرے جدہ پہنچ جانے کے بعد اُن کی ای میل وصول ہوئی کہ وہ ۲۴/ مارچ کو اِن شاء اللہ مکہ مکرمہ پہنچ جائیں گے۔ میں نے اُن سے ملاقات کرنے کا دن مقرر کیا۔ شاہ عبدالعزیز یونیورسٹی میں مجھے کچھ مشکلات کا سامنا تھا اور میں اُن سے ذاتی ملاقات کا طلبگار تھا تاکہ ایک فیصلے پر پہنچا جائے۔ بدقسمتی سے اُن سے میری ملاقات بعض وجوہات کی بنا پر نہ ہوسکی، اور مجھے کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر واپس برطانیہ جانا پڑا۔ برطانیہ سے وقتاً فوقتاً اُن سے فون پر اور ای میل پر رابطہ رہا۔ ارضِ مقدس چھوٹ جانے کے غم کا ایک مرتبہ اُن سے تذکرہ کیا تو اُنھوں نے نہایت پیار سے فرمایا:

don't term ur going back to uk as expulsion. so many times in life, v take decisions under such compulsions. it's ur urge, intention n inner self which signifies.
may Allah make the things easier n manageable for u. may He b with u and b pleased with u (rather with all of us). aameen. "Enough is thy Lord For a Disposer of affairs." (Al-Quran)

پھر ۱۵/ نومبر کو حافظ صفوان بھائی کا جان سوز میسیج وصول ہوا کہ بھائی ذوالکفل اب دنیا میں نہیں رہے۔ بار بار میسیج پڑھا کہ شاید کچھ غلط نہ پڑھ رہا ہوں۔ مجھے ۱۶/ نومبر کی شام اللہ نے ایک بیٹی عطا کی۔ میں ہسپتال میں مصروف ہونے کی وجہ سے حافظ بھائی کو جلد فون بھی نہ کرسکا۔ ۱۸/ نومبر کو شام اُنھیں فون کیا تو یقین آیا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے بھائی ذوالکفل کو اپنے پاس واپس بلالیا ہے۔ مجھے یہ افسوس رہے گا کہ میں بھائی ذوالکفل سے ملاقات نہ کرسکا۔ اللہ اُن کی مغفرت کرے اور اعلیٰ درجات نصیب فرمائے۔ آمین۔

☆ سرے یونیورسٹی، برطانیہ

صبر و رضا کے پیکر

انجت رائد رانا

امتحان شروع ہونے میں چند ساعتیں باقی تھیں۔ میں نے ہاتھ میں پکڑی اشیا کو سنبھال کر ان کے پورے ہونے کا دوبارہ یقین کیا اور تیزی سے کمرۂ امتحان کی طرف جانے لگی کہ اچانک ایک ننھی سی آواز سماعت سے ٹکرائی ......''میری بہن آئی ہے!!''

آواز کی سمت نگاہیں دوڑائیں تو ننھا عطاء المکرم خوشی کے راگ الاپتا نظر آیا۔ اُس کے چہرے پر دنیا بھر کی مسرتوں کے رنگ کھلے ہوئے تھے، گویا خوشیوں کے خزانے کی چابی اُس کے ہاتھ آ گئی ہو۔ اپنے اِردگرد کھڑے افراد کو یقین دلانے والے انداز میں بتا رہا تھا کہ میری بہن آئی ہے۔ کچھ وقت کی کمی، اوپر سے پرچے کی گھبراہٹ ...... میں اُس کی بات سمجھ نہ پائی مگر اُس کے باوجود میرے دماغ نے اِس منظر کو محفوظ کرلیا......مفہوم میری سمجھ میں اُس وقت آیا جب پرچے کے اختتام پر ننھی ''مزملہ'' کی آمد کی خبر منہ میٹھا کرواکے دی گئی تو صبح کا واقعہ ذہن میں دوبارہ تازہ ہوگیا اور خوشی دوبالا ہوگئی۔

عطاء المکرم (امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کا پڑنواسہ) اپنی بہن کی آمد پر سب سے زیادہ خوش تھا۔ اُس کی باتوں میں اب اس کا ہی تذکرہ ہوتا۔ ہم لوگ بھی اِس بابرکت خاندان میں خوشگوار اضافے سے بہت خوش تھے۔ لیکن انسان کی خوشی اور اس کا غم سب ہی کچھ باری تعالیٰ کی مصلحتوں کا پابند ہے۔ کہاں اور کب کون سا پتا گرنا ہے اور کیوں گرنا ہے؟ سب کچھ اُس کے علم میں ہے۔ کس پودے کی آبیاری ہوگی اور کون سا درخت جڑ سے اکھڑ جائے گا یہ اس کے ہی علم میں ہے۔ بس اس کی رضا میں ہی راضی رہنا بندے کا اصل امتحان ہے۔ ننھی مزملہ کو اِس دنیا میں آئے ابھی کچھ عرصہ ہی ہوا تھا کہ وہ بیمار ہوگئی۔ دعاؤں اور دواؤں کی تمام تدبیروں پر اُس خالقِ دوجہاں کی تقدیر غالب آ گئی اور ننھی مزملہ ہم سے بہت دور چلی گئی۔ عطاء المکرم کی نگاہیں ہر وقت اُس کی تلاش میں رہتیں۔ اُسے زندگی اور موت کے فلسفے کی بھلا کیا خبر؟ اُسے تو اپنی بہن چاہیے تھی......اُس کو جنت کے بارے میں بتایا گیا۔ مزملہ کے وہاں شہزادیوں کی طرح رہنے کی یقین دہانی کروائی گئی۔ سارے گھر پر ننھی جان کے چلے جانے سے غم کی فضا طاری تھی۔ آنسو پر تو کس کا اختیار ہوتا ہے، مگر وہاں آہ و فغاں، واویلا اور پکار کا کوئی تصور نہیں تھا۔ تعزیت کے لیے جانے والی طالبات کو بھی جانے سے قبل تعزیت کے مسنون طریقے کی تربیت دی گئی۔

امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ نے ختم نبوت کے جس عظیم مشن کا بیڑا اُٹھایا تھا، اللہ پاک نے کچھ اِس طرح قبول کیا کہ اُن کی اولادوں کی اولاد کو بھی اپنے دین اور ختم نبوت کے عظیم مقصد کے لیے قبول فرمالیا۔ بلاشبہ آج کے دور میں یہ گھرانہ قرآن وسنت کی روشنی کو چہارسو پھیلانے کی کوشش میں پوری طرح سرگرم ہے۔ پیر جی عطاء المہیمن بخاری مدظلہ کے زیرِ سایہ پروان چڑھنے والا جامعہ بستانِ عائشہ کا پودا علم وعمل کی مہکتی کلیوں کو جنم دے رہا ہے، جن کی برکات سے کئی جگہ ظلمتوں کی شب کی جگہ نورِ ایمانی نے لے لی ہے۔ مزملہ کی وفات کو ایک برس بھی نہ ہوا تھا کہ اچانک ۱۵/ نومبر ۲۰۰۹ء کو مزملہ کے والد جناب ذوالکفل بخاری (پیر جی عطاء المہیمن بخاری مدظلہ کے داماد) جو مکہ میں اُم القریٰ یونیورسٹی میں درس وتدریس

کے فرائض انجام دے رہے تھے، گاڑی کے حادثے میں شہید ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

جائے حادثہ پر موجود عینی شاہد کے مطابق موت سے قبل بخاری صاحب نے کلمۂ شہادت پڑھا اور داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ آپ اعلیٰ پائے کی علمی اور ادبی شخصیت کے مالک تھے۔ ادبی ذوق آپ کو ورثے میں ملا تھا۔ آپ کا قلم للّٰہیت سے بھرپور اور تقویٰ سے مزین شخصیت کی عکاسی کرتا تھا۔ ان کی جواں سالہ موت کی خبر جلد ہی پاکستان آ گئی۔ آپ کی وصیت تھی کہ اگر میں یہاں فوت ہو جاؤں تو جنت المعلیٰ میں دفن کر دینا...... نہ جانے یہ بات اُنھوں نے کتنے خلوص سے کہی تھی کہ وہ اللہ جل شانہٗ کی بارگاہ میں قبول ہوگئی اور آپ کو اُم المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے قریب ہی جگہ ملی، جس پر خطیبِ حرم مولانا محمد خیر محمد مکی دامت برکاتہم نے فرمایا کہ نصیب والوں کو ہی ایسی جگہ ملا کرتی ہے۔

عطاء اللہ شاہ بخاری رحمہ اللہ کی دختر (ذوالکفل بخاری رحمہ اللہ کی والدہ) کے لیے پوتی کے بعد بیٹے کے چلے جانے کا غم یقیناً بے حساب ہے۔ جب نازک سا پودا شجرِ سایہ دار بن جائے اور اُس کی چھاؤں میں بیٹھنے کا وقت ہو اور پھر وہ اکھڑ جائے تو مالی پر کیا گزرتی ہے؟ یہ وہی جان سکتا ہے جو اس کٹھن مرحلے سے گزرا ہو۔ اور اولاد تو پھر ماں کے وجود کا حصہ ہوتی ہے۔ اس جانکاہ حادثے کے بعد ہر طرف تعزیت کے لیے آنے والوں کا ہجوم اُمڈ آیا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی، لیکن شاہ جی رحمہ اللہ کا گھرانہ صبر و استقامت کا اعلیٰ نمونہ بن کر سب کے لیے ایک بہترین مثال بنا رہا۔ بلاشبہ ذوالکفل بخاری رحمہ اللہ کی شخصیت جہاں ایک بہترین معلم کی تھی وہاں وہ حالات کو فہم و فراست کے سانچے میں ڈھال کر اپنے قلم سے ایسے فن پارے بکھیرنے کی خداداد صلاحیت کے حامل تھے جو قاری کے دل کو جا لگتے تھے اور یوں محسوس ہوتا کہ جذبات کو گویا زبان مل گئی ہے۔ ختم نبوت کا مشن آپ کو اپنے نانا سے ورثے میں ملا تھا۔ عقیدے کی پختگی، معاملات کی صفائی، شوقِ عبادت غرض زندگی ان سعادتوں سے بھری ہوئی تھی۔ مکہ یونیورسٹی میں پڑھانے کی خواہش کو جب اللہ نے پورا کیا تو وہ بہت مسرور ہوئے۔ این سعادت بزور بازو نیست۔ بیت اللہ شریف کے پاس رہنا یقیناً ہر صاحبِ دل کی اوّلین خواہش ہے مگر بات تو شرفِ قبولیت کی ہے نا۔ شاہ جی رحمہ اللہ کی وفات پر تمام خاندان اکٹھا ہوا۔ کسی کی زبان پر اُن کے خلاف حرفِ شکایت نہ تھا۔ ہر آنے والا شاہ جی کے کردار اور عمل کے بلند ہونے کی گواہی دے رہا تھا۔

آپ کی وفات سے کچھ عرصہ قبل ایک دوست حادثے کا شکار ہو کر زخمی ہوگئے۔ وفات سے ایک یوم قبل ایک دوست حرم شریف جا رہے تھے تو اس کو شاہ جی رحمہ اللہ نے حادثے کا شکار ہونے والے دوست کے لیے دعا کا کہا کہ اللہ ان کو صحت دے۔ جس پر وہ کہنے لگے: ''شاہ جی! آپ کے لیے کیا مانگوں؟'' فرمانے لگے: ''خاتمہ بالایمان......'' عرض کیا: ''جلد یا بدیر؟'' کہا: ''جلد ہی مانگ لو۔ زیادہ جی کر کیا کریں گے؟ گناہوں میں زیادتی ہی ہوگی۔''

اِس گفتگو کے اگلے ہی دن آپ اُس ذات کے حضور حاضر ہوگئے جس کے دربار میں حاضری سے کسی کو مفر نہیں۔ بلاشبہ وہ جہاں ایک فرماں بردار بیٹے تھے، وہاں ایک بے لوث محبت کرنے والے بھائی بھی تھے۔ جہاں ان کی ذات شریکِ حیات کے لیے بہترین ہمدم اور بے لوث رفیقِ زندگی کی تھی، وہاں مشفق و مربی باپ کا کردار ان کی ذات کا درخشاں پہلو تھا۔ چاند چہرے اور ستارہ آنکھوں والے عطاء المکرم اور عطاء المنعم کی زبان پر ہر وقت اپنے بابا کے بارے میں سوال ہوتا ہے۔ بی بی جی (سیدہ ام کفیل بخاری مدظلہا) کے غم کا اندازہ کرنے کے لیے پہاڑ کا کلیجہ چاہیے لیکن آفرین ہے اس تابعِ سنت و شریعت خاندان پر، اِن نازک لمحوں میں بھی کسی کے لب پر حرفِ شکایت نہ تھا۔ صبر و رضا کا درس کتابوں میں بہت پڑھا تھا لیکن اِس کا عملی نمونہ آج نظر آیا۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس کے بدلے میں مرحوم کو اپنی رضا اور جنت کے بلند درجات عطا فرمائے۔ آمین!

(ہفت روزہ خواتین کا اسلام کراچی، ۹/ دسمبر ۲۰۰۹ء)

''اک روشن دماغ تھا نہ رہا''

عابدہ بتول☆

سید ذوالکفل بخاری صاحب سے میرا پہلا تعارف اُن کی مرتب کردہ کرنٹ اردو-انگریزی ڈکشنری ہے جو اُنھوں نے اور حافظ صفوان محمد چوہان نے مل کر مرتب کی، کے حوالے سے ہوا۔ دوسرا تعارف ۱۷/ جنوری ۲۰۰۹ء ایکسپریس اخبار میں لکھے گئے امجد اسلام امجد کے کالم کے ذریعے۔ جہاں اُنھوں نے مختصر مگر جامع تعارفی سطریں لکھی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ......سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے نواسے سید محمد ذوالکفل بخاری اپنے خاندان کی اعلیٰ مذہبی روایات کے امین ہونے کے ساتھ ساتھ علمی، تعلیمی اور ادبی حوالوں سے بھی ایک غیر معمولی انسان تھے......ادب اور صحافت کے میدان میں بھی مختلف ادبی صفحوں کی ادارت کے ساتھ ساتھ کالم نگاری اور شاعری کی اصناف میں بھی نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔......

حافظ صفوان اور ذوالکفل بخاری نے جدید اردو وانگریزی زبان کی اِس لغت پر جس محنت اور ایمانداری سے کام کیا وہ اِس کے مطالعہ سے واضح ہے۔ اِن کا کام ہی اِن کا اصل تعارف ہے، جس سے اِن کا غیر معمولی ذہین ہونا عیاں ہے۔ ایک ایسے غیر معمولی انسان کا اچانک اِس دنیا سے چلے جانا ایک ناقابلِ تلافی نقصان تو ہے مگر اُن کا یہ عظیم کارنامہ اُنھیں ہمیشہ کی زندگی عطا کر گیا ہے۔ اور یہ زندگی ہر انسان کو نصیب نہیں ہوتی۔ مر کر زندہ رہنے کے لیے جن کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور محبت ومحنت کے نقطے کو اوپر، نیچے لانے کا فن اپنانا پڑتا ہے۔ سید ذوالکفل بخاری اس معیار پر کھرے اترتے ہیں۔ اِتنی کم عمری میں اِتنا عظیم کارنامہ ایک غیر معمولی انسان ہی انجام دے سکتا ہے۔ ہر مکتبۂ فکر کا قاری جس طرح قدر کی نگاہ سے اِس لغت کو دیکھ رہا ہے وہ سید ذوالکفل کی روح کی تسکین کا باعث ضرور بنے گا۔

عزیز رشتہ دار اور دوست جس طرح اُن کی صحبت اور محبت سے محروم ہوئے، اُسی طرح زبان وادب اور بالخصوص لغت کی دنیا بھی سوگوار ہے۔ اُن سے مزید استفادے کی خواہش ظاہر ہونے سے پہلے ہی اُس وقت دم توڑ گئی جب حافظ صفوان محمد نے نہایت حوصلے کا مظاہرہ کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کر یہ خبر سنائی کہ اُن کا یہ عزیز ترین دوست اب اِس دنیا میں نہیں رہا۔ ۱۵/ نومبر کی دوپہر وہ مکہ مکرمہ میں ایک ٹریفک حادثے میں جہانِ فانی سے رخصت ہو گیا۔ آہ......

☆ شعبۂ اُردو، ایف سی کالج لاہور

اِک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اِک چراغ تھا نہ رہا

سید ذوالکفل بخاری اور حافظ صفوان محمد چوہان نے جو کوشش کی ہے اور زبان کے جدید الفاظ جو لغت کی ضرورت تھے اُن کا لغت بنا کر جس قدر اہم کارنامہ سرانجام دیا ہے وہ جان ٹی پلیٹس کی اِس بات کو سچ ثابت کرتا ہے جو اُنھوں نے اپنی لغت (A Dictionary of Urdu, Classical Hindi & English) کے مقدمے میں ڈنکن فوربس کی لغت کو فرسودہ یعنی "Behind the age" قرار دے کر کہی ہے، کیونکہ اس لغت میں جدید الفاظ کی کمی تھی۔ ان کے نزدیک زبان میں جس قدر وسعت پیدا ہوگئی ہے اور کئی نئے الفاظ زبان میں شامل ہوگئے ہیں جو لغت کی زینت بننے چاہییں جو اس میں نظر نہیں آتے۔ جان ٹی پلیٹس کی اِس بات کو کرنٹ اردو-انگریزی ڈکشنری پر باقاعدہ تحقیقی وتنقیدی مطالعہ میں مکمل حوالے سے شامل کیا جائے گا۔ یہاں صرف سید ذوالکفل بخاری اور اُن کے اس عظیم کارنامے کا تعارف کرانا مقصود تھا جو اُنھوں نے اِتنی کم عمری میں انجام دیا۔ اُن کی مرتب کردہ لغت سے استفادہ براہِ راست سید ذوالکفل سے استفادہ ہے۔ مرحوم کے تمام اہلِ خانہ کے ساتھ اُن کی جدائی کے دکھ میں برابر شریک ہونا مقصد تھا۔ اُن کے علمی اور ادبی کارناموں پر مفصل تبصرہ ابھی قرض کی صورت باقی ہے جو ان شاء اللہ آئندہ کسی وقت ادا کیا جائے گا۔

آہ، از محفلِ ما یارِ طرحدار برفت

رِثاء بر رحلتِ سید ذوالکفل بخاریؒ

ڈاکٹر اسلم انصاری

آہ، از محفلِ ما یارِ طرحدار برفت
دوستان، چارۂ غم چیست کہ آن یار برفت

چہ توان کرد کہ آن نازشِ کردار بشُد
چہ توان گفت کہ آن مایۂ گفتار برفت

آن عزیزی کہ توان گفت عزیزِ دِلہا
چہ شد آخر کہ باین شیوۂ اغیار برفت

صد چمن منتظرِ لطفِ نگاہش بود است
بے نیازانہ چرا از سرِ گلزار برفت

قیمتِ علم و ہنر آہ، ز اندازہ فتاد
آن ہنر بین شد و آن صاحبِ معیار برفت

زانکہ کہ در سینہ نہان داشت جہانی ز وفا
می توان گفت کہ گنجینۂ اسرار برفت

آہ، ای جلوتیان! جلوۂ اظہار فسرد
آہ، ای خلوتیان! دولتِ بیدار برفت

پاکبازی کہ خوشش نامدہ جز عالمِ پاک
شاہبازی کہ بدین سنتِ احرار برفت

آہ، ذوالکفلؒ کہ بس حسنِ عمل دوست بداشت
سوئے فردوسِ برین از رہِ ابرار برفت

(۳۰/نومبر ۲۰۰۹ء)

ذوالکفلِ ہوش یار کا مرثیہ

پروفیسر اصغر علی شاہ

(۱)

ذوالکفلِ ہوش یار تھا اُستاد ذی وقار
اُم القریٰ اساتذہ، شاگرد سوگوار
احباب، والدین، اقارب ہیں اشکبار
اک اُس کی موت نے کیا کتنوں کو بے قرار
دو بچے، ایک زوجہ ہیں اب اُس کی یادگار

(۲)

دکھ بیوگی کا زوجہ کو، بچے ہوئے یتیم
والد وکیل شاہ کی خاطر المِ عظیم
مادر کے دل میں رنجِ پسر دائما مقیم
بھائی کفیل شاہ کو صدمہ یہی الیم
اور ماموؤں کے واسطے رنجیدگی عمیم

(۳)

اُمّ القریٰ کی جامعہ کو سانحہ غریب
روٹھا ہے اُن سے دائما انگلش ادب خطیب
اردو ادب میں نظمِ معرّیٰ کا وہ ادیب
اپنی مثال آپ تھا اس فن میں وہ نقیب
پُر از نجومِ چرخ میں یک ماہِ خوش نصیب

(۴)

کہتے ہیں لوگ اُٹھ گیا یکتا ادب شناس
نوحوں میں پیش کرتے ہیں شاعر اسے سپاس
لکھے گئے جو نثر میں، تخمینہ ہے پچاس
بکھرے ہیں ان مضامین میں اشعاری اقتباس
مقبولیت میں ہوگیا افزوں تر از قیاس

(۵)

فاران اکادمی کو سلیقہ سکھا دیا
ہر ہفتہ وار اس کا وظیفہ بنا دیا
انشائیوں کا ڈھیر وہاں پر لگا دیا
تحقیق اور نقد کا گلشن کھلا دیا
نظم و غزل سراج کو زیت بقا دیا

(۶)

افسانوں کے چراغ جلائے گئے یہاں
اشجار ناولوں کے اگائے گئے یہاں
کتنے سحابِ بحث اٹھائے گئے یہاں
تحقیق و نقد اصول پڑھائے گئے یہاں
کچھ شاعر اور ادیب بنائے گئے یہاں

(۷)

جانے سے اُس کے، ساتھ ہی اک انجمن گئی
اس انجمن پہ چادر گم نامی تن گئی
یوں کہیے جیسے پھول سے اس کی پھبن گئی
فنکار رہ گئے ہیں مگر روحِ فن گئی
اب انجمن یہ جنتِ گم گشتہ بن گئی

(۸)

ملتان واپسی کو تھی ذوالکفل کی شنید
آیا ہی چاہتا ہے سکتّر کہ تھا فرید
دوبارہ ہوں گے اس کے تجارب سے مستفید
سارے ادیبوں کو تھی یہ آمد نویدِ عید
لیکن وفات اُس کی محرّم کی تھی وعید

(۹)

خوش بخت ہے وہ جنتِ معلیٰ میں جا ملی
مٹی اُسی خمیر کی تھی اُس سے آ ملی
قربِ حرم نمازِ جنازہ ادا ملی
میت کو اس کی کعبہ امام اقتدا ملی
تھا نیک بخت عزّ و شرف انتہا ملی

(۱۰)

کیا ہوگا گر تصادمی شکوہ کیا کریں
سب مل کے اب تو ہاتھ اٹھاؤ دعا کریں
ساتھ اُس کے دوست داری کا وعدہ وفا کریں
اللہ سے اس کے واسطے خلد التجا کریں
اور اس کو دائمًا ہی سپردِ خدا کریں

ذوالکفل بخاری کی یاد میں

ممتاز اطہر

کس قدر عجلت میں تھے تم
آخری مسکان چہرے پر سجائے
زندگی کی بے ثباتی پر
نظر کرتے ہوئے تم
وقت سے باہر نکلتے جارہے تھے
اس زمیں سے،
آسماں سے اور خلا سے دُور
کوئی چیز جیسے
تم کو اپنی سَمت کھینچے جارہی تھی
کسی کو ہم اگر
پُرسا بھی دیں تو کیسے لفظوں میں؟
کہ سارے لفظ
گویائی ہی اپنی کھو چکے ہیں
اور تیرے ساتھ ہی
ارضِ مقدس اوڑھ کر
سب سو چکے ہیں

یہ زمیں اپنی طرف کیوں کھینچتی ہے؟
آسماں اوپر کی جانب
کس لیے رکھا گیا ہے؟
اور خلا کا خالی پن کس نے بھرا ہے؟

ان سوالوں کی
الجھتی گتھیوں میں
زندگی کے دست وپا جکڑے ہوئے ہیں
مجھ کو بھی عجلت بہت ہے
وقت سے باہر کا منظر دیکھنے کی
خواہشوں کے "ڈھیر"☆ پر
کچھ پھول رکھنا چاہتا ہوں
ذات میں،
مٹی کے پیالے کی طرح کے
اک خلاء میں
ایک آوازہ لگا ہے مجھے
آسماں کی آنکھ سے، ٹوٹا ستارہ
اپنی پلکوں پر اٹھانا ہے مجھے
دل کے پینڈے میں پڑا
اِک جرعۂ تلخاب پینا ہے مجھے
اور ابھی کچھ روز
تیرے قرب سے محروم
جینا ہے مجھے

O

(۲۳/نومبر ۲۰۰۹ء)

☆ مدفن

مرحبا

ڈاکٹر عاصی کرنالی

یہ نظم جناب حبیب الرحمٰن بٹالوی کی توجہ دہانی اور میری تمنائے بے تاب کا مظہر ہے۔ اس نظم کا عنوان ''مرحبا'' اس لیے ہے کہ ذوالکفل بخاری مرحوم کی زندگی علمِ نافع اور عملِ صالح سے عبارت تھی اور اُن کی موت شہادت کی صورت میں واقع ہوئی۔ اس لیے میرے خیال میں ''مرحبا'' اِس کا موزوں ترین عنوان ہے۔

یہ شرف، ذوالکفل کے نانا عطاء اللہ شاہ — بے بدل نانا ہیں، لاثانی نواسا مرحبا
یہ سعادت ہے کہ ہیں ذوالکفل کے والد وکیل — کیسا پیارا باپ، کیسا خوب بیٹا مرحبا
بھائی رخصت ہوگیا اور رہ گئے تنہا کفیل — ہے سفر پر آخرت کے، وہ روانہ مرحبا
دین کے یاقوت، دانش کے گہر، سیرت کے لعل — کتنا تھا انمول، قبضے میں خزانہ مرحبا
کیسی کیسی نسبتیں آبا سے اور اجداد سے — لائقِ صد فخر ہے سب خانوادہ مرحبا
سب کے سب افراد ہیں تبلیغِ دیں میں منہمک — ملک و ملت پر ہے کیا کیا فیض اِن کا مرحبا
اور یہ اس خانوادے کے بہت ممتاز فرد — ان کی ہستی منفرد تھی اور یکتا مرحبا
اللہ اللہ کتنی خوش انجام ان کی زندگی — کس قدر پُر فخر جینا اور مرنا مرحبا
خوش نصیب اتنے کہ مکہ میں شہادت پائی ہے — جنت المعلیٰ بنا اُن کا ٹھکانا مرحبا
حادثے کی موت ہے لیکن شہادت کی ہے موت — غم بنا ہے شادمانی کا وسیلہ مرحبا
اُن پہ ختم الانبیا کا التفاتِ خاص ہے — اُن پہ ہے اللہ کی رحمت کا سایہ مرحبا

تعزیت کی نظم کا، عاصؔی ملا مجھ کو شرف
واقعی اعزاز ہے میرے ہنر کا مرحبا

کہاں گئے ہو؟

مستحسن خیال

کہاں گئے ہو؟
کہاں گئے ہو؟
سبھی کو روتا ہوا، بلکتا ہوا چھوڑ کر
تم کہاں گئے ہو؟
نئے سفر پر یہ کس طرح مہرباں گئے ہو؟
کہاں گئے ہو؟
جہاں سے واپس نہ کوئی آئے وہاں گئے ہو؟
کہاں گئے ہو؟

سبھی کو جانا ہے
سب ہی جاتے ہیں
اپنے اجداد سب گئے ہیں
مگر یہ تم ہو کہ چھوڑ کر
ناگہاں گئے ہو
کہاں گئے ہو؟

وہ کاروبارِ حیات سارا
وہ ساری فکریں وہ ساری سوچیں
جھٹک کے دامن سے کارہائے زیاں گئے ہو
کہاں گئے ہو؟

زمین اپنے خزانے لے کر پڑی ہوئی ہے
جو گردشوں میں
زمین والے لگے ہوئے ہیں جو رات دن
اپنی سازشوں میں
تمھارے خاکی بدن نے اوڑھی ہے خاک لیکن
پڑا ہوا ہے انوکھی گردش میں چاک لیکن
ستارہ بن کر کہیں سرِ آسماں گئے ہو
کہاں گئے ہو؟

ابھی یہاں تھے
تمھارے قدموں کی چاپ جیسے فضاؤں میں ہے
تمھاری خوشبو کا رنگ دیکھو ہواؤں میں ہے
تمھاری باتوں، تمھاری خوشبو
تمھارے سائے کی تھی ضرورت
مگر یہ تم ہو، ہوا کی صورت
مثالِ ابرِ رواں گئے ہو
کہاں گئے ہو

کوئی ستارہ ہو، کوئی جگنو ہو
جو بھی کچھ ہو
جہاں اندھیرا ہو، روشنی کی کرن بہت ہے
تمھیں ٹھہرنا تھا، مسکرانا تھا
جگمگانا تھا، روشنی کو بکھیرنا تھا
مگر مثالِ ستارۂ بے نشاں گئے ہو
کہاں گئے ہو؟

جو رات اپنے شفیق سائے کی عافیت
تم سے چھینتی تھی

وہ رات اب تو نہ آ سکے گی
وہ دن جو اپنے پرانے ترکش سے
بے وفائی کے تیر لے کر فگار کرتا تھا
دل تمھارا
وہ دن بھی اب تو نہ آ سکے گا
وہاں پہ امن و سکون ہوگا
جہاں گئے ہو
کہاں گئے ہو؟

نہ کوئی تختی، نہ کوئی کتبہ
مگر یہ دیکھو
وہیں پہ جنت نشان قدموں کی خاک بھی ہے
جہاں گئے ہو
تم اپنے اجداد ہی کی جانب
میاں گئے ہو
بہ ہمرہِ قدسیاں گئے ہو
بدن پہ لے کر مسافتوں کے نشاں گئے ہو
کہاں گئے ہو؟

چلے گئے ہو ضرور لیکن
ہمارے دل سے کہاں گئے ہو؟
قرار دل تھے، قرارِ جاں تھے
جو تم گئے ہو قرار کیسا؟
بس آتے آتے ہی صبر آئے
اِسی دعا سے سکوں ملے گا
خدا کا سایہ ہو اُس جگہ پر جہاں گئے ہو

امکان کی حد سے میں گزر جاؤں تو کہہ دوں

ڈاکٹر عتبان محمد چوہان

احباب یہ کہتے ہیں کوئی نظم ہی کہہ دو
ذوالکفل کو جیسا بھی ہے پایا سبھی کہہ دو
کیسے تھے شب و روز وہ جب ساتھ تھا اپنے
اب کتنی گراں دل پہ ہے اِک اِک گھڑی کہہ دو
قابو میں کہیں دل کو میں لا پاؤں تو کہہ دوں
امکان کی حد سے میں گزر جاؤں تو کہہ دوں

کچھ اس کی شرافت کا دیانت کا کروں ذکر
لہجے سے عیاں اس کی صداقت کا کروں ذکر
مولا نے اُسے نسب ودیعت جو کیا تھا
اس نسب کے احساسِ امانت کا کروں ذکر
قابو میں کہیں دل کو میں لا پاؤں تو کہہ دوں
امکان کی حد سے میں گزر جاؤں تو کہہ دوں

جو حلقۂ احباب کا محور تھا سراسر
اخلاص و وفا، زہد و عبادت کا وہ پیکر
مجھ سے نہیں ہو سکتے ہیں اس شخص کے حصے
ہر ایک کو رکھتا تھا لڑی میں جو پرو کر
قابو میں کہیں دل کو میں لا پاؤں تو کہہ دوں
امکان کی حد سے میں گزر جاؤں تو کہہ دوں

دنیا کے تساہل سے تغافل سے وہ آگے
مسلک میں عقیدے میں تجاہل سے وہ آگے
معیار کہیں سے کوئی مل پائے تو کہہ دوں
ہر ایک مقابل کے تقابل سے وہ آگے

قابو میں کہیں دل کو میں لا پاؤں تو کہہ دوں
امکان کی حد سے میں گزر جاؤں تو کہہ دوں

اک خواب تھا پلکوں پہ دھرا رہ گیا جیسے
رستے میں سفر ایک بچھا رہ گیا جیسے
دل اب بھی تڑپتا ہے کہ ہوجائے وہ ایفا
اِک عہد مکمل نہ ہوا، رہ گیا جیسے

قابو میں کہیں دل کو میں لا پاؤں تو کہہ دوں
امکان کی حد سے میں گزر جاؤں تو کہہ دوں

ٹھہری ہے اگر زیست تو ساکن ہیں زمانے
پھر کیسے یہ دن رات گزرتے ہیں نجانے
اک نقش کہ لگتا ہے معلق سا فضا میں
وہ گرچہ نہیں جگ میں مگر دل یہ نہ مانے

قابو میں کہیں دل کو میں لا پاؤں تو کہہ دوں
امکان کی حد سے میں گزر جاؤں تو کہہ دوں

کندن کوئی موتی کوئی ہیرا نہیں اک لفظ
لکھتا ہوں مٹاتا ہوں کہ جچتا نہیں اک لفظ
گو ارض و سما چھان لیے میں نے سخن کے
شایانِ مراتب مجھے ملتا نہیں اک لفظ

قابو میں کہیں دل کو میں لا پاؤں تو کہہ دوں
امکان کی حد سے میں گزر جاؤں تو کہہ دوں

وہ ہم دم و غم خوار بھی ایسا ہی تھا میرا
بعد اس کے نہیں اترا کبھی دل پہ سویرا
کیسے کروں احساس کی شدت کو بیاں میں
قدموں میں خدیجہؓ کے ہے اب اس کا بسیرا

قابو میں کہیں دل کو میں لا پاؤں تو کہہ دوں
امکان کی حد سے میں گزر جاؤں تو کہہ دوں

(۴/فروری ۲۰۱۰ء)

سید ذوالکفل بخاری شہید

مولانا مجاہد الحسینی

تھا علم و حکمت کا ایک پیکر، وہ ارضِ مکہ میں بھی مکیں تھا
وہ جس کی فرقت کو دل نہ مانے، مجھے تو لگتا یہیں کہیں تھا

ادیب بھی تھا خطیب بھی تھا، وہ میرا ہم دم حبیب بھی تھا
تھا وہ متانت کا اِک سراپا، وہ شیریں گفتار دِل نشیں تھا

وہ اپنے افکار میں تھا یکتا، وہ اپنی عادات میں یگانہ
تھا حُسن کردار جس کا شیوہ، وہ شکل و سیرت میں بھی حسیں تھا

حجازی لہجے کا تھا حُدی خواں وہ شہ بخاری کے قافلے کا
تلاشِ منزل میں اُس کا مقصد، حجاز کی پاک سرزمیں تھا

وہ جس کے افکار ''بُوذری''* تھے، وہ جس کی تحریر ''بوالکلامی''
ادب کے مطلع کا مہرِ تاباں، وہ علمی حلقے کا اک نگیں تھا

وہ سو گیا ہے حرم کی وادی میں، اہلِ جنت کے پہلوؤں میں
خمیر ہی اس کا تھا حجازی، وہ عاشقِ ختم مرسلیںؐ تھا

ہیں مجاہد کے ساتھ غمگیں فراقِ ذوالکفل میں ہی سارے
تھا اہلِ حق کی نگاہ کا مرکز، وہ فہمِ احرار کا امیں تھا

* امام سید ابو معاویہ ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ

ارتحالِ ذوالکفل بخاری

میجر (ر) محمد سعید اختر

جنم جس کو دیا بنتِ عطاؒ * نے
لیا ہے گود اب اُم القریٰ نے

یہاں پر سوگ ہے اک خامشی ہے
مگر حوروں کے ہاں ہیں شادیانے

وہ اک رعنا جواں، بانکا، نرالا
جسے پالا تھا پاکیزہ فضا نے

نہ رنگ و صوت کا طالب ہوا وہ
نہ تر ہونے دیا دامنِ حیا نے

محبت، غم، صبر اور آہ و زاری
قضا آتی ہے سب کچھ آزمانے

مشیت پر رہیں راضی، ہے لازم
سبق ہم کو دیا یہ مصطفیٰ نے

مقام اس کا ہوا فردوسِ اعلیٰ
شہادت ثبت کی وقتِ قضا نے

الٰہی اس پہ رحمت بیکراں ہو
عہد پورا کیا مردِ وفا نے

* سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

سانحہ

میجر (ر) محمد سعید اختر

جس غنچہ کو مہکایا تھا کل دستِ صبا نے
کھلنے نہ دیا پوری طرح دستِ قضا نے

آغوش میں لینے کو ترا جسدِ معطر
کرتی رہی مکہ کی زمیں کتنے بہانے

تھے حلقۂ احباب میں کچھ رند بھی یوں تو
رکھتا تھا مگر رات کو قرآن سرہانے

اک ''صادقہ'' بی بی کا اُسے دودھ ملا تھا
پالا تھا جسے دین کی غیرت نے، حیا نے

ورثے میں ملی حریت و فہم و خطابت
رنگ اس کو دیا طرزِ تکلم کی ادا نے

اک لمحے کو دنیا کی نبض تھم گئی ہوگی
وہ لمحہ تجھے چھوا تھا ''جب دستِ قضا نے'' *

* ہجری سالِ وفات ۔۱۴۳۰ھ

ذوالکفل بخاریؒ کے سانحۂ ارتحال پر

پروفیسر خالد شبیر احمد

ہر اک کمال اَوج پہ تھا اُس کی ذات میں
وہ شخص لاجواب تھا جملہ صفات میں
ذوالکفل کو ملا تھا وہ حسن و جمالِ فکر
روشن تھا مثلِ ماہ وہ تاریک رات میں
جھڑتے تھے اُس کے منہ سے گہر ہائے تابدار
موتی بکھیر دیتا تھا وہ بات بات میں
شعر و ادب کی دنیا کا بے تاج بادشاہ
تھی دسترس ادب کے سبھی مضمرات میں
توصیف اُس کی لفظوں کے سانچے میں کیا ڈھلے
وہ شخص باکمال تھا احساسِ ذات میں
مکّے کی سرزمین کا اعجاز ہی تو ہے
ہے منفرد یہ سانحہ جو سانحات میں
ڈوبا جو اپنے من میں تو پایا سراغِ زیست
کتنا اُسے کمال تھا ادراکِ ذات میں
ہے عکس ریز دل پہ میرے اُس کی چاندنی
وہ چاند ضَوفشاں ہے شبِ مشکلات میں
بے مثل خاندان کا بے مثل تھا وہ فرد
نہ ڈگمگایا وہ کبھی راہِ ثبات میں
اللہ کا ہے فضل و کرم اُس پہ دوستو!
بدلی ہے موت اُس کی ابدی حیات میں
قبضہ میرے شعور پہ خالدؔ اُسی کا ہے
چرچا ہے جس کی موت کا کُل کائنات میں

آہ! سیّد ذوالکفل بخاریؒ

پروفیسر خالد شبیر احمد

آنسو میری ہی آنکھوں سے پیہم نہیں رواں　　ذوالکفل تیری موت پر روتا ہے اک جہاں
رکھے گی اُس کو یاد یہ دنیائے رنگ و بو　　حد درجہ پاکباز تھا جو مردِ نیک خُو
شاعر، ادیب اور محقق تھا بے گماں　　افکارِ دینِ حقّہ کا بے مثل ترجماں
ہر آن اُس کے دل میں تھی مکّے کی آرزو　　اسلافِ باوقار کی تصویر ہُو بہو
اطوار جس کے سیرتِ اطہر سے بہرہ مند　　علم و عمل کی دنیا کا فرزندِ ارجمند
ادب، شعور، دنیا میں وہ عام کر گیا　　دو دن کی زندگی میں بڑا کام کر گیا
الفاظ اُس کے تھے کہ نگینے جڑے ہوئے　　تھے طشتری میں ذوق کے موتی پڑے ہوئے
اس دَورِ انحطاط میں اک دیدہ ور تھا وہ　　دنیائے شعر و علم میں کامل نظر تھا وہ
وہ شخص کیا کہ کشتۂ سوز و گداز تھا　　وہ مرد حق پرست تھا وہ پاکباز تھا
وہ خوش کلام کرتا تھا محفل میں جب کلام　　ہوتے تھے فیض یاب سب افرادِ خاص و عام
گہری نظر تھی اُس کی علوم و فنون پر　　تھا ناز اُس کو دولتِ عشق و جنوں پر
دنیائے ذوق و شوق کا لیے مثل شہر یار　　احرار جن کی موت پہ ہیں سارے اشکبار

خاؔلد ہر اک سمت سے آتی ہے یہ صدا

”ویراں ہے میکدہ خم و ساغر اداس ہیں　　تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے“

☆☆☆

ذوالکفل بخاری — خورشیدِ جہاں تاب

خورشیدؔ بیگ میلسوی

اسلاف کی قدروں کا نگہدار تھا ذوالکفل
اسلام کی عزت کا پرستار تھا ذوالکفل

نفرت تھی اُسے کذب بیانی سے ہمیشہ
حرفوں کی صداقت کا علمدار تھا ذوالکفل

تخصیص نہ تھی اپنے پرائے کی جہاں
ہر شخص کا دلدار تھا، غم خوار تھا ذوالکفل

خورشیدِ جہاں تاب تھا وہ علم و عمل کا
ظلمت سے سدا برسرِ پیکار تھا ذوالکفل

احباب کی محفل ہو یا اربابِ سخن کی
ہر بزم میں لاریب ضیا بار تھا ذوالکفل

ہر شعر میری بات کی تائید کرے گا
بے مثل میرے عہد کا فنکار تھا ذوالکفل

ناقدریِ اقدار پہ وہ نوحہ بلب تھا
انسان کی عظمت کا طلبگار تھا ذوالکفل

اس بات سے انکار کسی کو نہیں ممکن
کہتے ہیں سبھی صاحبِ کردار تھا ذوالکفل

ناواقفِ احوال نہ تھا بزمِ جہاں سے
بیدار تھا، بیدار تھا، بیدار تھا ذوالکفل

ہر وقت اسے ذکرِ الٰہی سے شغف تھا
دنیا کی خرافات سے بیزار تھا ذوالکفل

خورشیدؔ اُسے کیسے بھلائے گا زمانہ
احباب کا اک یارِ طرحدار تھا ذوالکفل

آہ! ذوالکفل بخاریؒ

پروفیسر عادل یزدانی (چنیوٹ)

درویش سا انسان تھا ذوالکفل بخاری
ہاں، صاحبِ عرفان تھا ذوالکفل بخاری

اوصافِ بزرگاں تھے سبھی اُس میں نمایاں
اسلاف کا فیضان تھا ذوالکفل بخاری

تھے جمع کمالاتِ سیادت سبھی جس میں
وہ سیّدِ ذیشان تھا ذوالکفل بخاری

کیا شان تھی اُس شخص کے ایمان و یقین کی
اللہ کی بُرہان تھا ذوالکفل بخاری

جینے کا سکھاتا تھا جو عالَم کو سلیقہ
وہ صاحبِ ایمان تھا ذوالکفل بخاری

احباب تو احباب ہیں، اعداء کے لیے بھی
تسکینِ دل و جان تھا ذوالکفل بخاری

مقروض ہیں سب جس کی محبت کے، وِلا کے
وہ پیکرِ احسان تھا ذوالکفل بخاری

ابہام عمل میں تھا، نہ گفتار میں اُس کی
ہر شخص پہ آسان تھا ذوالکفل بخاری

صورت سے جو انسان ہو سیرت میں فرشتہ
وہ بندۂ رحمان تھا ذوالکفل بخاری

احرار کے لشکر کا تھا اک مردِ مجاہد
جمہور کا سلطان تھا ذوالکفل بخاری

جو علم پہ مغرور تھا اپنے نہ نسب پر
وہ سچا مسلمان تھا ذوالکفل بخاری

افکار میں اُس کے تھی ہر اک پھول کی خوشبو
ہم رنگِ گلستان تھا ذوالکفل بخاری

جو شعر و ادب کو نئے آفاق پہ لاتا
وہ زینۂ امکان تھا ذوالکفل بخاری

تھا فہمِ سخن اُس کا شک و شبہ سے بالا
لاریب زباں دان تھا ذوالکفل بخاری

دیتے ہیں بجا نطق و قلم اُس کے گواہی
حق بات کا اعلان تھا ذوالکفل بخاری

کیا اُس کو ضرورت تھی پھر اربابِ نظر کی
آپ اپنی جو پہچان تھا ذوالکفل بخاری

کیوں بھیج دیا جلد اُسے ملکِ عدم کو
دنیا! ترا مہمان تھا ذوالکفل بخاری

بن اُس کے گزرتی ہے بتا کیا ترے دل پر
ملتان تری جان تھا ذوالکفل بخاری

افسوس نہ عادلؔ پہ کھلا تادمِ آخر
کتنا بڑا انسان تھا ذوالکفل بخاری

جو بچھڑ کے منظروں کو عکسِ ثانی دے گیا

(سید محمد ذوالکفل بخاری کے لیے)

یونس عدیم

لوٹ آنے کی خبر اپنی زبانی دے گیا
منتظر رہنے کی عادت پھر پرانی دے گیا

تتلیاں، پھولوں کی رنگت اور خوشبو سونپ کر
جانے والا کتنی مشکل پاسبانی دے گیا

سرمئی یادوں کا بادل کس قدر تھا مہرباں
دھوپ کے اِس دشت میں جو سائبانی دے گیا

دور سے آیا مسافر ہاتھ میں مٹی لیے
سنگِ مرمر کے مکیں کو کیا نشانی دے گیا

جس طرف دیکھوں وہی چہرہ نظر آئے عدیم
جو بچھڑ کے منظروں کو عکسِ ثانی دے گیا

☆☆☆

عزیزم ذوالکفل کی مرگِ ناگہانی پر

پروفیسر محمد اکرام تائب

سانحہ اِتنا بڑا ہوجائے گا، سوچا نہ تھا
آشنا، ناآشنا ہوجائے گا، سوچا نہ تھا

راہ چلتے یوں اچانک زندگی کے موڑ پر
وہ کبھی ہم سے جدا ہوجائے گا، سوچا نہ تھا

تاقیامت اب نہ آئے گا کبھی وہ لوٹ کر
وہ کبھی اِتنا خفا ہوجائے گا، سوچا نہ تھا

چل دیا وہ عمر بھر کے سارے رشتے توڑ کر
باوفا یوں بے وفا ہوجائے گا، سوچا نہ تھا

یوں تو فانی ہیں سبھی، پر اِس قدر آغاز میں
سازِ ہستی بے صدا ہوجائے گا، سوچا نہ تھا

وقت سے پہلے اُجڑ جائے گا تائبؔ گلستاں
یوں کبھی اے ہمنوا ہوجائے گا، سوچا نہ تھا

وہ ابد ستارہ......

الیاس میراں پوری

تیرے بن یہ تنہائی
مجھ کو ڈستی رہتی ہے
انگ انگ میں جیسے
آگ جلتی رہتی ہے
تشنگی سی نس نس میں یونہی پلتی رہتی ہے
اور ایک وحشت سی
دل میں ڈھلتی رہتی ہے
دکھ کا اک لبادہ ہے
جس کو اوڑھے رکھتی ہے
شب کو ایک الجھن سی مجھ سے آ، الجھتی ہے
میں کہ تیری یادوں کا
جب سہارا لیتا ہوں
اور حسیں خیالوں کا
اک کنارا لیتا ہوں
اور اس کنارے سے جھانکتا ہے وہ مجھ میں

پھر وہ مجھ سے کہتا ہے
کیوں اداس پھرتے ہو؟
تم نے کیوں نہیں دیکھا
میں تمھاری سوچوں میں
خواب کے دریچوں میں
جگمگاتے لفظوں میں ساتھ ساتھ رہتا ہوں
غم زدہ نگاہوں کے ٹوٹتے کناروں پر
اور تیری پلکوں کے
جھلملاتے تاروں پر، میں دکھائی دیتا ہوں

ٹھیک ہی وہ کہتا ہے
سارے خواب منظر ہیں
سب سراب منظر ہیں
میں کہ ابرِ آوارہ بن کے پھرتا رہتا ہوں
دشتِ ہجر پھیلا ہے اور جب کبھی اپنے
خواب سے نکلتا ہوں
راہ بھول جاتا ہوں
ٹھوکریں سی کھاتا ہوں
دکھ کی موج کیوں میرے
دل کو گھیرے رکھتی ہے!

خود سے کہتا پھرتا ہوں
کتنا بے سہارا ہوں
کس طرف گئے ہو تم
راز پا گئے ہو تم؟

آس ہو، سہارا ہو
تم ابد ستارہ ہو
اس طرح چمکنا تم
اس طرح دمکنا تم
ہم بھی راستہ دیکھیں
ہم بھی منزلیں پالیں!

(۱۶/ نومبر ۲۰۰۹ء۔ ۴ بجے صبح)

تھا نابغہ اِس دور کا ذوالکفل بخاری

انجینئر توحید الرحمٰن

تھا نابغہ اِس دور کا ذوالکفل بخاری
کس درجہ گراں قدر تھا ذوالکفل بخاری

تھی آنکھ میں اُس شخص کی بجلی کی چمک سی
گفتار میں اسلاف کے لہجے کی کھنک سی

اسلاف کی تابندہ روایت کا امیں تھا
احرار کے ہاتھوں کا تراشیدہ نگیں تھا

اِس عمر میں وہ فرد تھا اِک بحرِ معانی
پیروں کو بھی شرما گئی یاں اُس کی جوانی

بھولے گی نہ یاروں کو وہ فاران کی مجلس
تھی دم سے اُسی کے کبھی کیا شان کی مجلس

''جب تک وہ جیا خیمۂ افلاک کے نیچے''
کرتا رہا وا فکر و تخیل کے دریچے

فطرت نے بہت بخشے تھے اُس شخص کو جوہر
ایمان کے، ایقان کے، عرفان کے گوہر

جس خاک سے نسبت تھی اُس خاک میں سویا
مکہ کی زمیں لکھی تھی مقسوم میں گویا

ارتحالِ پُر ملال

قیوم واثق (جدہ)

یہ تو نہیں کہہ سکتے قدیم اُن سے تھی یاری
دو چار ملاقاتیں ہی رہیں اُن سے ہماری

اِک مردِ مسلمان، سخن فہم و سخن ور
اِک ایسا جواں جس نے رکھی علم سے یاری

ہم سب ہی چلے جائیں گے اِک روز یہاں سے
پر کوئی نہیں جانتا کب کس کی ہے باری

ہے کس کو خبر اگلے نئے موڑ پہ کیا ہو
مخفی ہے کوئی حادثہ مانندِ شکاری؟

جانکاہ تھا وہ سانحہ ہم جس پہ ہیں مغموم
رخصت ہوئے اِس دہر سے ذوالکفل بخاری

(روزنامہ اردو نیوز جدہ۔ ۱۸/ نومبر ۲۰۰۹ء)

☆☆☆

سید ذوالکفل بخاری کی یاد میں

لقمان ناصؔر

آ گہی کے زاویوں کا
استعارہ ذوالکفل تھا
اُس کی باتوں اور سوچوں میں
نہاں تھی علم وفن کی
سچی خوشبو
ایسی خوشبو جس سے
دل اور جاں مہکیں
جو دلوں کو آ گہی کا نور بخشے
جو ہنر کا سرور بخشے
آ گہی کے زاویوں کا
استعارہ ذوالکفل تھا
کیسے ہم سے کھو گیا ہے
آؤ مل کر سوچتے ہیں

☆☆☆

بیادِ ذوالکفل بخاریؒ

اکرام الحق سرشار

بے تابیوں کا کوئی مداوا نہیں رہا
سنتے ہیں اب جہاں میں مسیحا نہیں رہا

جب سے گرا ہے ٹوٹ کے وہ برگدِ سخن
باغِ سخن میں دھوپ ہے سایہ نہیں رہا

اُس نے تمام عمر پلایا ادب کو خون
کب اِس میں اُس کا طور طریقہ نہیں رہا

ٹوٹے ہیں کتنے پیڑ یکے بعد دیگرے
آندھی کا اب کے کوئی ٹھکانہ نہیں رہا

روپوش ہوگیا وہ سورج کچھ اِس طرح
محسوس ہو رہا ہے اُجالا نہیں رہا

سرشار صبر کر کہ یہی ہے رضائے حق
اِس انجمن میں کوئی ہمیشہ نہیں رہا

میرا دوست، میرا ہمدم

شیخ حبیب الرحمٰن بٹالوی

وہ میرا دوست، ہمدم ہمدرد تھا وہ ہر دم
آنکھیں ہیں میری پُرنم دل درد میں سمویا
میں بے تحاشا رویا

''اُستاذ'' ہم تھے کہتے باتیں ہی سنتے رہتے
علم و ادب کا بہتا دریا تھا ایک گویا
میں بے تحاشا رویا

میں کیا کہوں کہ کیا تھا چلنے میں وہ صبا تھا
اِک پیکرِ حیا تھا اُف بیج غم کا بویا
میں بے تحاشا رویا

''ملتان'' میں پلا تھا ''اُملج'' سے وہ چلا تھا
تہذیب میں ڈھلا تھا مہر و وفا کا جویا
میں بے تحاشا رویا

ماں باپ کا وہ جایا وہ عید پر تھا آیا
''مکہ'' سے پیار لایا ''مَعْلٰی'' میں جا کے سویا
میں بے تحاشا رویا

وہ باپ کا دُلارا وہ اپنی ماں کا پیارا
اِک عبقری ستارا جا آسماں پہ سویا
میں بے تحاشا رویا

اِک واقعہ ہے یارو! دم مت، حبیبؔ مارو
ہر بات اُس سے ہارو مالک ہے سب کا گویا
میں بے تحاشا رویا

نگارشات

سید ذوالکفل بخاری

تہذیبوں کا تصادم: ہماری ذمہ داری

(خطاب: پروفیسر سید محمد ذوالکفل بخاری شہید، اکتوبر/ ۲۰۰۹ء، طائف)

ضبطِ تحریر: جام ریاض احمد

سید ذوالکفل بخاری نے شہادت سے ایک ماہ قبل طائف میں پاکستانی کمیونٹی سے خطاب فرمایا۔ اِس تقریب کا اہتمام جناب قاری محمد ابوبکر نقشبندی نے کیا تھا۔ اُنھی دنوں گورنر پنجاب سلمان تاثیر کی طرف سے پاکستان میں توہینِ رسالت قوانین ختم کرنے کا گمراہ کن بیان شائع ہوا جس پر پاکستان اور بیرونی ممالک میں مسلمانوں نے شدید ردِعمل کا اظہار کیا۔ اِسی تناظر میں یہ ایک فی البدیہہ تقریر تھی جس کی ریکارڈنگ قاری صاحب نے فراہم کی۔ اُن کے شکریے کے ساتھ اِس تقریر کو نقل کر کے ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

الحمد للّٰہ رب العٰلمین. والعاقبة للمتقین. والصلوٰة والسلام علیٰ خاتم النبیین.

حضرت قاری [ابوبکر] صاحب نے کچھ ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جن کا تعلق محبت سے ہے اور مبالغے سے ہے۔ اور محبت میں مبالغہ جائز ہے۔ حقیقت سے اِن کا تعلق نہیں ہے۔ میں ایک معمولی سا استاد ہوں۔ نسبت البتہ ایک ایسی شخصیت سے ضرور ہے جن کے بارے میں اُنھوں نے بہت کچھ کہا، اور صحیح کہا۔ اور تھوڑی بہت قلم کاری کبھی کی تھی۔ مجھے قاری ابوبکر صاحب نے فرمایا کہ جدہ آؤ، کچھ دوستوں کے ساتھ مل بیٹھیں گے اور کچھ بات وات ہوگی۔ ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ اِتنے پڑھے لکھے احباب کے سامنے امتحاناً کچھ کہنے کو فرمایا جائے گا۔

اور میں سوچ رہا تھا...... اللہ تعالیٰ قاری صاحب کو جزائے خیر دیں...... اُنھوں نے میرا موضوع متعین کر دیا۔ بات اُنھوں نے کی علامہ اقبال کی۔ اور میرا خیال ہے کہ بات یہیں سے شروع کرتے ہیں۔ روایتی وعظ کہنا یا دادِ خطابت دینا یا کوئی شعلہ بیانی...... نہ وہ میرے بس میں ہے اور نہ اُس کا یہ موقع ہے۔ اور ویسے بھی ہم جس ماحول میں، جس دور میں، زندہ ہیں اُس میں عمل کی ضرورت ہے، گرمیِ گفتار کی نہیں۔

ایک منظر ہے اور ایک مظہر ہے۔ ایک phenomenon ہم دیکھ رہے ہیں تہذیبوں کے تصادم کا...... کچھ باتیں میرے ذہن میں آتی ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ حضرات میں سے بہت سے لوگ مجھ سے زیادہ اِس ضمن میں بھی باخبر ہوں گے۔ لیکن یہ باتیں اگر ہم آپس میں نہیں کریں گے تو شاید بھول جائیں گے۔ کہتے ہیں اگر آئینہ نہ دیکھا جائے تو انسان اپنا چہرہ بھول جاتا ہے۔ اور کسی نے کہا تھا کہ مسلمان میں اور یہودی میں صرف ایک فرق ہے: یہودی کو اپنے ماضی سے محبت ہے اور مسلمان ماضی سے بیگانہ ہے۔ آج کا دور تہذیبوں کے تصادم کا دور ہے۔ ہر پڑھا لکھا آدمی جانتا ہے کہ مغرب سے ایک بات چلتی ہے اور پھر سالہا سال اُسی کی رٹ لگائی جاتی ہے۔ تازہ واقعہ ہوا ہے— کوئی زیادہ پرانا نہیں ہے— جرمنی میں ایک مصری خاتون کو قتل کر دیا گیا۔ اور علم کے پیڑ سے تہذیب کا بندر اُترا—

لوگ آئینوں میں تکنے لگے چہرے اپنے
علم کے پیڑ سے تہذیب کا بندر اترا

سب نے دیکھا۔...... اِس دنیا میں پڑھے لکھے مسلمانوں کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ سوال یہ ہے۔ اور جیسے قاری صاحب نے اقبال کی بات کی...... کسی نے کہا تھا:

سہل کردی ہیں مشکلیں ساری
مرنے والوں نے جینے والوں کی

یہ جو سوالات، جو مشکلات، جو الجھنیں آج ہمیں درپیش ہیں، ہر دور میں درپیش رہی ہیں۔ ہر دور کا ایک طاغوت ہے، ہر دور کا ایک نمرود ہے، ہر دور کا ایک فرعون ہے۔ شیطان...... ایک ازلی اور ابدی اپوزیشن ہے جس نے خدا کو چیلنج کیا ہوا ہے۔ ہر دور میں اُس کی ایک حزب ہے، ایک جماعت ہے، ایک فریق ہے۔ ہر دور میں اُس کے حیلے ہیں...... وہی حیلے ہیں پرویزی...... اقبال کہہ چکے ہیں۔

اور میں ایک واقعے سے آغاز کرتا ہوں۔ اقبال کی خدمت میں کچھ لوگ آئے۔ پڑھے لکھے لوگ تھے۔ یونیورسٹی کے کچھ اساتذہ تھے اور کچھ طلبہ۔ اور وہ غیر مسلم تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ ہماری کچھ الجھنیں ہیں۔ آپ دور کردیں تو شاید ہم اسلام کے قریب آ جائیں۔ علامہ نے کہا فرمائیں۔ ایک صاحب کہنے لگے یہ تو مجھے سمجھ میں آتی ہے کہ آپ کے جو نبی ہیں...... محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم...... وہ بہت بڑے آدمی تھے۔ کردار اُن کا بہت اونچا تھا۔ اور اُن کا وجود ایک تاریخی حقیقت ہے۔ اِس میں کوئی افسانہ نہیں، کوئی مبالغہ نہیں...... لیکن یہ جو آپ کہتے ہیں کہ ایک آدمی پہ الہام اُترا۔ اور عین مین اِسی کو آپ وحی کا نام دیتے ہیں، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ علامہ نے کہا ٹھیک ہے۔ پھر اُنھوں نے صرف ایک سوال کیا کہ اچھا یہ بتائیں آپ نے کبھی یہ بھی پڑھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی جھوٹ بولا ہو؟ غلط بیانی کی ہو؟ اُنھوں نے کہا یہ نہیں پڑھا۔ بہت سے اعتراضات ہیں تاریخ کو، اُن کے دشمنوں کو...... اعترافات بھی ہیں، اعتراضات بھی ہیں۔ لیکن یہ کہیں نہیں پڑھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی خدانخواستہ معاذ اللہ غلط بیانی کی ہو، جھوٹ بولا ہو۔ تو علامہ نے کہا کہ بات یہ ہے...... تیرہ سال جو زندگی ہے مکہ کی...... آزمائشوں سے پُر، اِتنی آزمائشوں سے گزرنے کے بعد، ملا کیا؟ اور اتنی آزمائشوں کا ہدف کیا تھا؟ کبھی کسی جھوٹ کے لیے بھی آدمی اِتنی آزمائشوں میں مبتلا ہوتا ہے؟ جان کو خطرہ، مال پلے نہیں، خویش و اقارب جان کے دشمن...... اُنھوں نے کہا کہ سب کچھ تو مل رہا تھا۔ اُنھوں نے کہا آپ حکومت چاہتے ہیں، حکومت دیتے ہیں۔ جس قبیلے کے جس سردار کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتے ہیں، کر دیتے ہیں۔ دولت جتنی کہتے ہیں، دیتے ہیں۔ یہ بھی نہیں کہتے کہ اپنے خدا کو نہ مانیں...... آپ مانیں...... ہمارے لوگوں کو مت کہیں کہ یہ ایسا ہے۔ ایک نظام ہے، ایک زندگی ہے، اِس سے باز آجائیں! وہ بھی جھٹلا دیا۔ ملا کیا؟ کیا جھوٹ کے لیے تاریخ میں کبھی کسی نے اِتنی بڑی قربانی دی ہے؟ تو اقبال نے کہا بھائی! ہم نے تو خدا کو بھی مانا ہے تو اِس لیے مانا ہے کہ یہ جھوٹ نہیں کہہ سکتے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خون سے اِس پر سچائی کی گواہی دی ہے...... وحی اور الہام پر...... تو ہم نے تو ربِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مانا ہے، ہمیں کیا پتہ تھا کہ خدا کون ہوتا ہے۔ پھر علامہ نے کہا کہ بات یہ ہے کہ وحی کا اور الہام کا سرچشمہ تو ایسا ہے جس کی مثال ہی کچھ نہیں۔ مجھ پر، چودھویں صدی میں، ایک گناہ گار اور حقیر آدمی پر، بعض اوقات شعر ایسے اُترتے ہیں کہ مجھ سے سنبھالے نہیں سنبھلتے۔ مجھے لکھنے کی مہلت نہیں ملتی۔ اور مجھے ایک زیر زبر کی، ایک شوشے کی تبدیلی نہیں کرنا پڑتی۔ تو اگر ایک گناہ گار شاعر کے ساتھ خدا کا یہ معاملہ ہوسکتا ہے، تو جو خدا کا سچا نبی ہو اُس پر وحی نہیں اُتر سکتی؟

میں کچھ واقعات بیان کر کے کوشش کروں گا کہ اُن کا ایک ربط قائم کروں۔ اُسی زمانے میں ایک تحریک چلائی گئی......

بہت سوچ سمجھ کر...... جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ لوگوں نے بدزبانی کی، بے ہودہ گوئی کی۔ دہلی سے کتاب چھپی۔ کراچی سے کسی نے بکواس کی۔ لاہور میں ایک شخص نے کتاب لکھی ''رنگیلا رسول'' (معاذ اللہ!)۔ وہ راجپال جو تھا، وہ اُس کا ناشر تھا، وہ مصنف نہیں تھا۔ لاہور ہی کے ایک آدمی نے...... غازی علم الدین نے...... اُس کو قتل کر دیا۔ اب اِس قتل کے مرحلے تک پہنچنے میں بہت سے مراحل ہیں۔ پورا ہندوستان ایک ہو کر حکومتِ برطانیہ سے مطالبہ کر رہا ہے کہ آپ یہاں یہ قانون پاس کریں کہ جناب کسی نبی کی...... یہ نہیں کہتے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی...... [بلکہ] کسی نبی کی توہین کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ آپ کہتے ہیں جناب امن وامان کا خطرہ ہو گیا تھا؟ ہمارے ہاں پاکستان میں بھی 16 ایم پی او ہے [ایک قانون کا نام]۔ اُس بندے کو پکڑ کر اندر کر دو، کافی ہے...... اس سے یہ مسئلہ نہیں رکے گا۔ تو ظاہر ہے کہ تاجِ برطانیہ کے کان پر جوں نہیں رینگی۔ پھر غازی علم الدین اُٹھا۔ وہ کیسے اُٹھا؟ اُس میں میرے کچھ ذاتی حوالے آتے ہیں، وہ میں بعد میں عرض کروں گا...... تو غازی علم الدین نے راجپال کو جہنم واصل کر دیا۔ اس ایک آدمی کی قربانی سے پھر قانون بنا۔ آج جس کو ہم Blasphemy Act کہتے ہیں، یہ اُسی دور کی یادگار ہے۔ قانون بنا۔ اور وہ نافذ ہوا۔ لیکن کس طرح......؟ ہر دور میں ایک نہ ایک علم الدین درکار ہوتا ہے۔ اور جیسے آج لوگ سوال کرتے ہیں کہ آپ کے نزدیک یہ بھی غلط اور یہ بھی غلط، یہ بھی گستاخی اور وہ بھی گستاخی۔ آپ تو آزادیِ اظہار کے راستے روکتے ہیں۔ اقبال کی خدمت میں لوگ گئے اور علامہ سے کہا کہ یہ بتائیے کہ توہینِ رسالت کی حدود کیا ہیں؟ کہاں سے توہین شروع ہوتی ہے؟ اقبال نے کہا مجھ سے پوچھتے ہو؟ خدا کی قسم میرے سامنے اگر کوئی یہ کہے کہ تمھارے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فلاں دن میلے کپڑے پہنے ہوئے تھے، تو یہ بھی توہین ہے۔ اُسے بھی نہیں چھوڑوں گا۔ ایک ہی تو ذات ہے۔ ایک ہی تو ذات ہے، جس کے گرد قبلہ اور کعبہ بھی گھومتا ہے ہمارا۔ ہماری دنیا و آخرت اُس کی جوتی کی لگی ہوئی خاک سے وابستہ ہے۔ اُس سے تم ہمیں بھٹکانا چاہتے ہو اور بہکانا چاہتے ہو؟...... امتحان یہی ہے ہر دور میں: ع نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ فگن نئے۔

میں سوچتا ہوں اللہ نے ہمیں کس قوم میں پیدا کیا ہے؟ ایک صاحب کا بیان آیا...... میں یہاں لکھی ہوئی ہدایت کو بھی، کوشش کروں گا کہ اِس کا احترام کروں...... اُنھوں نے کہا کہ توہینِ رسالت کے قانون کو اب بدل دینا چاہیے۔ ایک ذمہ دار آدمی ہیں۔ کہتے ہیں کہ توہینِ رسالت کے قانون کو بدل دینا چاہیے۔ کیوں؟ دو ہی باتیں ہیں: یا تو کوئی نئی وحی آئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اب رسالت کا مقام یہ نہیں، یہ ہو گیا ہے۔ اِس پر آپ گفتگو کر سکتے ہیں، اِس پر نہیں کر سکتے۔ اور اگر وحی نئی نہیں آئی تو...... ہاں! وحی کا ایک دوسرا راستہ بھی ہے۔ قاری صاحب درست کر دیں اگر میں آیت غلط پڑھ رہا ہوں...... اِنَّ الشَّیٰطِیْنَ لَیُوحُونَ اِلٰیٓ اَوْلِیٰٓئِھِمْ (سورۂ اعراف، پارہ: ۸)۔ قرآن کہتا ہے کہ شیطان بھی اپنے ولیوں پر وحی کرتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء پر، اولیاء پر کوئی باتیں الہام کرتے ہیں۔ اور اگر فرشتہ لے کر جائے تو وہ وحی ہوتی ہے۔ اِسی طرح شیطان بھی اپنے ولیوں پر کچھ باتیں وحی کرتے ہیں، اُن کے دل میں ڈالتے ہیں۔ تو...... یا تو اُدھر سے وحی آ گئی ہے۔ کیوں بدل دیں؟

سوال پھر یہی ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں، اور ہمارا اپنے دین سے، اپنی شناخت سے، اپنی پہچان سے ربط کا عنوان کیا ہے؟ یہ آج کا مسئلہ ہے۔ ہمیں Defensive کر دیا جاتا ہے کہ اَجی تہذیبوں کے ٹکراؤ کا دور ہے۔ تو گویا ہم اِس ٹکراؤ کے ذمہ دار ہیں؟ گویا ہمیں اِس ٹکراؤ سے بچنا ہے؟ وہ سڑک پہ لکھا ہوتا ہے: ''بچ موڑ توں''۔ ع وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا۔

یہ عجیب رسم دیکھی کہ بروزِ عیدِ قرباں
وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب اُلٹا

اور میرا جو مسئلہ ہے وہ غیر نہیں ہے۔ اپنے ہیں۔ ہمارے ہاں کچھ مصنوعی، کچھ بناوٹی تقسیمیں کر دی گئی ہیں۔ اور بدقسمتی سے اِن تقسیموں پر کچھ لمبے لمبے عرصے گزر گئے ہیں تو اب اُن پر مہر لگ گئی ہے تصدیق کی...... کہ جی یہ کام مولوی صاحب

کا ہے، یہ کام مفتی صاحبان کریں گے۔ اور یہ دنیاداری کے کام ہیں۔ جی آپ یہ ہم پر چھوڑ دیں۔

چوکھٹے قبر کے خالی ہیں انھیں مت بھولو
جانے کب کون سی تصویر سجادی جائے

اگر تو مولوی صاحب کی قبر میں میں نے جانا ہے یا مولوی صاحب نے میری قبر میں جانا ہے تو پھر یہ تال میل کچھ معنی رکھتا ہے، کہ یہ مولوی صاحب کا کام ہے!

نبی علیہ السلام فرمارہے ہیں **خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِی**...... سب سے اچھا زمانہ میرا ہے...... تو اُس زمانے میں کیا تھا؟ کیا صحابہ نے ایسا کہا کہ نہیں، اِس بات پر تو react کرنے کا حق صرف عمرؓ بن خطاب کو ہے، یا ابوبکر صدیقؓ کو ہے، یا معاذؓ ابنِ جبل کو ہے، یا اسامہ بن زیدؓ کو ہے، ہمیں نہیں۔ ایسا نہیں کہا۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ یہ کچھ لوگ ہیں۔ یہ ابھی کلمہ بھی پڑھتے ہیں۔ یہ نبوت و رسالت پر، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان بھی رکھتے ہیں۔ یہ صرف زکوٰۃ میں تھوڑی سی نرمی چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں ہم نہیں دیں گے...... اور یہ نہیں کہ زکوٰۃ نکالیں گے نہیں۔ ہم بیت المال کو نہیں دیں گے۔ اسلام کا جو متعین کیا ہوا نظام ہے...... خلافت کا...... اُس میں تھوڑی سی ہم relaxtion چاہتے ہیں، ہم اُس کو نہیں دیں گے۔ تو صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کیا فرمارہے ہیں؟...... اور صحابہ رضی اللہ عنہم مخالفت کررہے ہیں کہ...... ابھی یہ محاذ نہ چھیڑیں! نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اِس دنیا سے پردہ فرمائے کچھ عرصہ گزرا ہے، چند مہینے بھی نہیں ہوئے، آپ اِتنا بڑا محاذ چھیڑدیں گے؟ مدینہ نہتا ہوجائے گا دشمن کے لیے بالکل۔ فوجیں ہماری باہر مشغول ہوجائیں گی۔ آپ کیا کررہے ہیں؟...... تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کیا فرمایا؟ ایک تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب یہی مشورہ دیا تو کہا کہ عمر! جاہلیت میں تو بہت بہادر بنتے تھے، اسلام میں آکر بزدل ہوگئے؟ ایک یہ کہا۔ دوسرا فرمایا کہ خدا کی قسم یہ تو بیت المال میں زکوٰۃ دینے کی بات کررہے ہیں، یہ زکوٰۃ میں اگر اونٹ دیتے تھے اور اُس اونٹ کی رسی بھی نہیں دیں گے تو ابوبکر اِن سے جہاد کرے گا۔ اور کہا مدینہ اتنا غیر محفوظ ہوجائے کہ امہات المومنین کو کتے آکے نوچنے لگیں، تب بھی یہ جہاد منسوخ نہیں ہوگا۔ یہ اجتہاد تھا؟ یہ جوش تھا طبیعت کا؟ نہیں...... یہ احکام ہیں، جن کے بدلنے کا اختیار نبی کو بھی نہیں ہے۔ **اَلْجِهادُ ماضٍ اِلیٰ یَوم القِیامَة**۔ جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔ ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کی کیا مجال تھی؟ یہی بات قرآن میں نبی علیہ السلام سے کہلوائی گئی: **اَنْ اُبَدِّلَه' مِنْ تِلْقَآءِ نَفْسِی**...... اپنی خواہش سے، اپنے دل سے میں کیسے بدل سکتا ہوں؟ وہی Compromising Attitude مانگا جارہا تھا...... کفار بھی یہ کہہ رہے تھے کہ کچھ لو، کچھ دو۔ کچھ ہمارے مان لیں، کچھ آپ کے ہوجائیں...... کچھ خدا پر compromise ہوجائے، کچھ نظام پر ہوجائے۔

جب دین آئے گا تو اپنے پورے تقاضوں سے آئے گا۔ آدمی یا مسلمان ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ انسان انسان ہوتا ہے یا بندر۔ یا وہ بھیڑیا ہے یا وہ گیدڑ ہے۔ دو شناختیں نہیں ہوتیں۔ آج جو ہوّا کھڑا کیا جارہا ہے تہذیبوں کے تصادم کا، رونا یہ ہے کہ اِس میں ایک نئی بات باور کرائی جارہی ہے: part time مسلمان۔ چونکہ زندگی نے یہ concept ہمیں دیا ہے کہ ایک آدمی تین چار جگہ job کرتا ہے۔ تو پارٹ ٹائم مسلمان۔ میں مسجد میں ہوں تو میں مسلمان ہوں، میں اگر بینک میں ہوں تو پھر میرے لیے بینکاری جو ہے اُس کے تقاضے ناگزیر ہیں، تجارت میں ہوں تو تجارتی تقاضے ناگزیر ہیں، پالیٹکس میں ہوں تو مجھے دیوثی بھی کرنی پڑے گی، بے غیرتی بھی کرنی پڑے گی، حرام خوری بھی کرنی پڑے گی، کمینگی بھی کرنی پڑے گی۔ یہ پارٹ ٹائم مسلمان ہے۔ یہ کہاں سے آیا ہے؟ ہر آدمی کو ٹٹولنا چاہیے۔ کہ اگر تو سوالات وہی ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائے جو قبر میں پوچھے جائیں گے...... اگر تو ہم امت وہی ہیں، تبدیل نہیں ہوگئے...... اگر تو کلمہ وہی ہے...... اگر تو قرآن وہی ہے...... کوشش کی جارہی ہے۔ ہمارے وزیر تعلیم نے کہا تھا چالیس سپارے ہیں۔ کوشش جاری ہے...... لیکن اگر قرآن وہی ہے، تو پھر یہ پارٹ ٹائم مسلمان کیا

ہے؟......معاف کیجیے......میری سمجھ میں کبھی نہیں آیا۔ اور یہ سب باتیں وہ ہیں جو ہم آپ دن رات سوچتے ہیں۔ گزارش یہ ہے کہ اِن کو ''اِذنِ نوا'' بھی ملے۔ یہ باتیں ہمارے ماحول میں کہی جائیں، سنی جائیں۔ یہ جو نسلیں پروان چڑھ رہی ہیں، ہمارے اردگرد، یہ ہماری ڈسپوزل پر دی گئی ہیں اور ہم اِس کے پابند بنائے گئے ہیں کہ یہ سوجھتا اِن کو سجھائیں، یہ فہم و بصیرت اِن کو منتقل کریں۔

بات پھر وہی آگئی۔ اگر آج یہودی کو نہیں کہا جاتا کہ یہ بنیاد پرست ہے یا متعصب ہے، مسلمان کے لیے یہ لیبل کیوں ہیں؟ اِس لیے کہ کہیں پیچھے خرابی ہوگئی ہے۔ کہیں پیچھے خرابی ہوگئی ہے۔ ہم نے کچھ کمپرومائز ایسے کیے ہیں کہ ہم سے دوسرا مطالبہ ''ڈو مور'' (Do more) ہوگا۔ بالکل ہوگا۔ لیکن اِس کی حد کیا ہے؟ یہ بھی سوچ لیا جائے۔ ہمارے لیے معیار کیا ہے؟

کارزارِ دہر میں وجہِ ظفر وجہِ سکوں
عرصۂ محشر میں وجہِ درگزر خیر البشرؐ

ہم خیرالبشر صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے ہیں۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ آدمی تنہائی میں دو چار پانچ منٹ کا مراقبہ، اِس بات کا کرے کہ اگر قیامت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سامنا ہوا تو میرے پاس اپنی کوتاہیوں کا جواز کیا ہوگا؟...... سامنا تو ہوگا......اور مجھے پھر اقبال یاد آگئے:

ور تو می بینی حسابم ناگزیر
از نگاہِ مصطفیؐ پنہاں بگیر

خدا سے کہہ رہے ہیں کہ اچھا ہے تو میرا حساب نہ لے۔ تو غنی از ہر دو عالم من فقیر۔ تُو تو دونوں عالم سے غنی ہے، مجھ فقیر کا کیا حساب لے گا۔ اچھا تو ہے میرا حساب نہ لے۔ لیکن اگر آپ، اے مولائے پاک، اگر آپ سمجھیں کہ میرا حساب لینا ہی ہے، تو پھر مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہوں سے ورے ورے۔ میں اُن نگاہوں کا سامنا نہیں کرسکتا۔ یہ احساس کیسے منتقل ہوگا؟ سوال یہ ہے۔ ہر چیز کے لیے ایک محنت ہے، ہر چیز کے لیے ایک پلاننگ ہے، ہر چیز کے لیے ایک تگ و دو ہے۔ اور...... دمادم رواں ہے یمِ زندگی۔ اور پتہ نہیں...... یہ آج مجھے بتایا گیا ہے، پہلے مجھے شرف نہیں تھا، اُن سے تعارف کا، کہ ڈاکٹر صاحب تھے۔ وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اور اُن کی یاد میں ہے یہ اجتماع اور یہ اِکٹھ۔ اور بسا غنیمت ہے کہ ہم لوگ کسی عنوان سے اکٹھے ہوں......تو کب کس کو بلاوا آجائے؟ کسی کو پتہ نہیں ہے۔ تیاری کیا ہے؟ اور تیاری یہ نہیں ہے کہ بیٹھ کر تسبیح پھیری جائے اور پھر صدقے اور زکوتیں دی جائیں، اور گوشہ گیری اور عافیت میں زندگی گزاری جائے۔ یہ خود فریبی ہے۔ یہ طفل تسلی ہے۔ اگر تیاری یہی ہوتی تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی 23 سالہ زندگی میں اِس کی جھلک ملتی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تو بدر ہے، احد ہے، خندق ہے، خیبر ہے، تبوک ہے، یمامہ ہے۔ یہ ہے تیاری۔ اور وہاں پہ فاقہ کشی ہے، کمپرومائز نہیں ہے۔ دو دو سو، چار چار سو، دو ہزار، چار ہزار ریال کے لیے، روپوں کے لیے، مفادات کے لیے، نوکری کے لیے کمپرومائز کریں گے؟ کہاں تک کریں گے؟ کیا ہم تہذیبوں کی اِس جنگ میں پھر جیت جائیں گے؟ کیا ہمیں رعایت مل جائے گی؟ کیا بوسنیا والوں کی رعایت دی گئی؟ مروۃ الشربینی کا قصور کیا تھا؟ کیا قصور تھا؟ یہی کہ ؏ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے۔

بہ لوحِ تربتِ من یافتند از غیب تحریرے
کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

مرزا مظہر جانِ جاناں دہلویؒ نے کہا کہ میری قبر پر غیب سے یہ کتبہ لکھا ہوا ملے گا: ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے۔ اِس شہید کا تو کوئی گناہ نہیں تھا۔ وہ جیسے قرآن کہتا ہے: بِاَیِّ ذَنۡبٍ قُتِلَتۡ۔

اب حدیث شریف میں اِس کے لیے الفاظ ہیں: فرمایا تم پر وہن غالب آجائے گا (حُبُّ الدُّنیا وَکَرَاهِیَةُ

المَوت میں)۔ اپنے تئیں میں سمجھتا ہوں کہ جناب میاں صاحب ہیں، بڑے مولوی صاحب ہیں، ہم بڑی نمازیں پڑھتے ہیں، شکل وصورت میں بہت بہروپ بھرا ہوا ہے، لیکن میں بھی اپنی تنہائی میں سوچوں کہ تیاری کتنی ہے؟ اور تیاری یہی ہے...... جس میں ہم ڈالے گئے ہیں: **لارَھْبانِیَۃَ فِی الاسلام**۔ اقبال کہتا ہے:

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اِس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیلؑ

جیسے ابرہیم علیہ السلام کا امتحان یہ تھا کہ آگ میں سے گزارا گیا، ہم سب اِس آگ میں ڈالے گئے ہیں۔ جس زمانے سے ہم گزر گئے ہیں، گزر رہے ہیں۔ اعتراضات بھی ہیں اور Temptation بھی ہے...... بہت زیادہ ہے...... آپ آنکھیں بند کرلیں، آپ گزر جائیں، سرسری اِس جہان سے! آپ کے لیے سارے مسئلے حل ہیں۔ **اِذا لَمْ تستحی فاصنع ماشئت** (بے حیا باش و ہر چہ خواہی کن)۔ سوا اَرب کے قریب مسلمان ہیں۔ ہمارا وزن کیا ہے؟ اور یہ میں سیاسی بات نہیں کررہا...... معاف کیجیے گا...... یہ وہ بات ہے: **اَلَسْتُ بِرَبِکُمْ قالوا بَلیٰ** ...... ہم نے تو بہت پہلے سے ایک عہد کیا تھا، وہ ایک دوسرے کو یاد دلانا ہے۔ اِس کے لیے ہم پابند کیے گئے ہیں۔ یہ ہمارے لیے کہا گیا ہے کہ **بَلِّغُوا عَنِّی وَلَو آیَۃ**...... یہ ہمارے لیے کہا گیا ہے۔

ہم نے ایک کلاس پیدا کی ہے اپنی بخشش کے لیے۔ باپ میرا مرجائے، بلایا جاتا ہے مولوی کو...... کہ اِس کو بخشواؤ۔ اُس کا کیا قصور ہے، بے چارے کا، کہ وہ بخشوائے؟ بخشواؤ جی۔ inject کرو ثواب قبر میں۔ یہ ایک کلاس پیدا کی ہے ہم نے۔ یہ کلاس صحابہؓ کے دور میں تھی؟ دین کی مبادیات سے، اصولوں سے ہمارا تعلق کیا ہے اور کیا نہیں۔ خدا کی قسم میں کہتا ہوں عشرۂ مبشرہ کے نام پوچھ لیں، اُمہات المومنین کے نام پوچھ لیں، بناتِ طاہرات کے نام پوچھ لیں...... نہیں آتے۔ اِس کا ذمہ دار کون ہے؟ میں خود ہوں! میرے بچے کو نہیں آتے یہ نام تو ذمہ دار معاشرہ نہیں ہے، میں خود ہوں۔ میرے پاس دنیا جہان کے کاموں کے لیے وقت ہے، اِس کام کے لیے وقت کیوں نہیں؟

وہ احمد ندیم قاسمی مرحوم نے لکھا کہ ہمارے ایک دوست تھے کرنل صاحب۔ ہمارے اُن کے ساتھ بہت اچھے فیملی ریلیشنز تھے۔ ایک دن اُنھوں نے کہا کہ تمھاری ضرورت پڑ گئی ہے۔ خیریت؟ کیا ہوا؟ تم چلے آؤ۔ ہم چلے گئے۔ کہنے لگے ہمارا بیٹا ہے۔ یہ شادی کرنا چاہتا ہے ایک جگہ۔ اب ہم سارا خاندان کہہ رہے ہیں کہ تمھیں غلط جگہ پھنسایا جارہا ہے، نہ کرو۔ یہ مانتا نہیں ہے۔ تم سے مانوس ہے۔ انکل انکل کہتا ہے۔ کچھ ٹرائی کرو اِس کو قائل کرنے کی۔ ٹھیک ہے۔ کہنے لگے میں نے ادب کی، صحافت کی، نغمہ وشعر کی اور موسیقی کی یعنی جس قدر مجھے داؤ پیچ آسکتے تھے، میں نے لگائے اُس بچے کو، دس پندرہ منٹ میں۔ وہ میری بات بڑے احترام سے سن رہا تھا، تو میں نے کہا یار، والدین کا بڑا حق ہوتا ہے۔ اتنی بات مان لو۔ اگر تمھاری عقل میں یہ بات نہیں بھی آتی کہ یہ فیصلہ تمھارا غلط ہے، تم سو فیصد Justified ہو کہ یہ فیصلہ درست ہے، لیکن ماں باپ کی بات مان لو۔ اِس پر اُس لڑکے نے باپ دیکھا اور کہا کہ: I am the outcome of your pleasure. Nothing else. آپ مجھ سے اور کیا چاہتے ہیں؟...... یہ حسنِ تربیت کا شاہکار ہے۔ یہی شاہکار ہے تیرے ہنر کا...... کہ جناب آپ نے اپنی نشاط کی خاطر، اپنی لذت کی خاطر چند لمحے گزارے تھے۔ میں اُن کی یادگار ہوں۔ آپ کا مجھ پر کیا حق ہے؟

تو گزارش یہ ہے کہ یہ مسلمانی جو ہے...... چومی گویم مسلمانم بلرزم۔ اقبال نے کہا تھا کہ جب میں اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہوں تو میں اندر سے لرز جاتا ہوں...... کہ دانم مشکلات لا الہٰ را۔ مجھے لا الہٰ کی مشکلات کا اندازہ ہے۔ آپ ایک عالم سے ٹکر لے رہے ہیں۔ مدینۂ طیبہ سے جب انصار کا پہلا وفد آیا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی اُنھوں نے مکہ مکرمہ میں (ہجرت کا قصہ تو بہت بعد کا ہے) تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اُن سے کہا تھا کہ میرے بھتیجے کو تم لے جانے کے عہد و پیمان

باندھ رہے ہو، تمھیں پتہ ہے تم کس بات کا سودا کر رہے ہو؟ پورے جزیرۂ عرب کی قبائل کی دشمنی کا! یعنی جب آپ decision لے رہے ہیں، تو آپ کو اندازہ ہو کہ اِس کی gravity کیا ہے۔ اُنھوں نے کہا ''ہاں! ہم اپنی جان پر کھیل جائیں گے، اِن پر گزند نہیں آنے دیں گے۔'' اور اُنھوں نے اپنا وعدہ نبھایا:

چومی　گویم　مسلمانم　بلرزم
کہ　دانم　مشکلاتِ　لا　اِلٰہ　را

اِن مشکلات کا اندازہ تو ہو۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ جہاد کو بہت جی چاہتا ہے۔ ماشاء اللہ جی بہت اچھی بات ہے۔ لیکن ایک پرابلم ہے، کہ سنا ہے سالے جان سے ہی مار دیتے ہیں۔ بھائی یہ دن رات کا جہاد ہے۔ اور اگر میرے پڑھے لکھے بزرگ، اور اِس مجلس میں، میں بالکل بلا تکلف عرض کرتا ہوں کہ آپ سب حضرات مجھ سے زیادہ سمجھدار، تعلیم یافتہ، ہوش مند، دنیا کو برتے ہوئے، جانے ہوئے...... اگر آپ شعوری طور پر اپنی ذمہ داریوں کا ادراک نہیں فرمائیں گے، یا یہ باتیں اپنے ماحول میں کم علم لوگوں تک نہیں پہنچائیں گے...... یقین مانیے...... کہ وقت ہمارے قابو سے نکل جائے گا۔ میں گزشتہ دنوں پاکستان میں تھا۔ لاہور میں ایک صاحب ملے۔ اُن کے والد صاحب ایم این اے رہے تھے۔ اُن کے چچا جج تھے۔ اِس قسم کی فیملی تھی۔ خود وہ امریکن نیشنل تھے۔ اور وہ جہاد کے لیے جا رہے تھے۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ کس طرح کا جہاد کرنا چاہ رہے ہیں؟ تو اُنھوں نے بتایا کہ جی بس، لمبا یا دیو جوا گے نظر آوے۔ وجہ کیا ہے؟ کمیونیکیشن نہیں ہے۔ میں نے کہا آپ کو پتہ ہے یہ جو سترہ کروڑ اٹھارہ کروڑ کا ملک ہے، اِس میں سے ہر آدمی بے چارہ اِس قابل ہے کہ آپ اُس کی خاطر جہاد کریں۔ یہ جو ناخواندگی کے گندے جوہڑ میں پڑے سڑ رہے ہیں، جن پر چند خاندان اور چند کلاسیں مسلط کر دی گئی ہیں، اور جن کو پتہ ہی نہیں چلتا:

وہ شاخِ گل پہ زمزموں کی دُھن تراشتے رہے
نشیمنوں پہ بجلیوں کا کارواں گزر گیا

جن کو پتہ ہی نہیں چلتا اور بجلیاں کوند جاتی ہیں، اُن کے حق میں جہاد کون کرے گا؟ مطلب یہ کہ شعوری زندگی گزاری جائے...... شعوری...... اور ایک بات میں اور عرض کروں۔ قرآنِ کریم کہتا ہے: **اِنَّما یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمآءِ** ...... اللہ سے ڈرتے کون ہیں؟ ...... ہم تو سب ڈرتے ہیں...... اللہ سے کون نہیں ڈرتا؟ شیخ سعدی نے کہا تھا کہ میں دو طرح کے لوگوں سے ڈرتا ہوں، ایک اُس سے جو خدا سے ڈرتا ہے، اور ایک اُس سے جو خدا سے نہیں ڈرتا۔ تو اللہ سے کون ڈرتا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ عالم بندے ڈرتے ہیں۔ جس کا علم اُس کو خدا کی معرفت نہیں دیتا، خدا سے اُس کے تعلق کی پہچان نہیں دیتا، اپنی ذمہ داریوں کا ادراک نہیں دیتا، اوامر و نواہی کی معرفت نہیں دیتا، اپنے اِس وجود کا، یہاں ہونے کا جواز نہیں دیتا...... معاف کیجیے...... وہ علم نہیں ہے، جہالت ہے، جاہلیتِ جدیدہ ہے...... جس میں آج ہم مبتلا کیے گئے ہیں۔ ابو جہل بھی اپنے وقت کا ابوالحکم تھا۔ سب کچھ تھا اُس کے پاس۔ اور اُس کے پاس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلانے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ اُس نے مانا...... یہ ریکارڈ پر ہے...... اُس نے مانا کہ ہمیں پتہ ہے کہ یہ سچا ہے۔ لیکن ہم اپنا سارا قبائلی طمطراق، سارا سسٹم — صدیوں سے چلتا ہوا — اِس کی خاطر تج دیں؟ تو بات یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو...... کہیں ایسا نہ ہو...... کہ ہماری چھوٹی چھوٹی غلطیاں، چھوٹی چھوٹی انائیں آڑے آجائیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا ہے کہ **اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنا اتِّبَاعَہ' وَاَرِنَا الْبَاطِلَ باطِلًا وَارْزُقْنا اجْتِنابَہ**...... یا اللہ! جو حق ہے، جو سچائی ہے وہ مجھے دکھا سچائی کے روپ میں، اور مجھے اُس کی پیروی کی اور مجھے اُس کے پیچھے چلنے کی، اُس کو پکڑنے کی توفیق دے۔ جو باطل ہے، جو جھوٹ ہے، جو فریب ہے، جو دھوکہ ہے، جو سراب ہے، وہ مجھے دھوکے کی صورت میں دکھا۔ اور پھر اُس سے بچنے کی توفیق دے۔ ایسا ہوتا ہے...... جب آدمی اپنی دانش پر اعتبار کرتا ہے، اعتماد

کرتا ہے، تو بسا اوقات، بہت دفعہ، وہ باطل کو سچ جانتا ہے، سچ کو باطل جانتا ہے۔ اقبال نے اِسی کو کہا دانشِ برہانی اور دانشِ نورانی۔ ''دانشِ نورانی'' وہ ہے جو نورِ نبوت سے مستنیر ہے۔ جس کا نور نورِ نبوت سے اخذ کردہ ہے۔ اور ''دانشِ برہانی'' وہ ہے جو دو اور دو چار کی طرح آدمی کو فریبِ سود و زیاں میں لے جاتی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے۔ تو صرف بات یہ ہے کہ فرصتِ عمل کم ہے، ذمہ داریاں بہت زیادہ ہیں۔ اور پڑھے لکھے لوگوں کی ذمہ داریاں اور بھی زیادہ ہیں۔ یہ جو ہر سوسائٹی میں لوگ تبدیلی لاتے ہیں۔ جو driving force ہوتے ہیں وہ intellectual minority ہوتے ہیں۔ یہ کہیں پہ مجھے نہیں ملا، کسی عالم کی محنت سے، بڑے بڑے احادیث کے مجموعوں سے بھی، کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ عذر مسموع ہو اور مقبول ہو کہ جناب! بس اِس کا خیال نہیں آیا جی، اور جی، بس ذمہ داریاں بہت تھیں؛ او جی بچوں کے ہی بڑے مسئلے تھے۔ یہ دیکھ لیا جائے کہ اگر ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا...... آخری سہارا وہی ہے نا؟...... تو یہ candidature مضبوط ہونا چاہیے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم صحابی سے کہہ رہے ہیں، تین مرتبہ پوچھا کہ کیا چاہتے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ تین مرتبہ جواب ملا: جنت میں آپ کی رفاقت، جنت میں آپ کی رفاقت۔ پوچھنے والے اللہ کے آخری نبی ہیں، سیّد المرسلین، اور جواب دینے والے صحابی رضی اللہ عنہ۔ صحابی وہ ہے جن کے بارے میں امام سید ابوذر بخاریؒ نے کہا:

شہیدِ عشقِ محمدؐ کا احترام کرو
کہ اُس سے برزخ و محشر میں احتساب نہیں

صحابہ کے اعمال نہیں تولے جائیں گے۔ اُن کی معیت...... رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے...... اور نسبت تولی جائے گی۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کیا فرما رہے ہیں؟ کہ پھر اپنے سجدوں سے میری مدد کرنا جب میں خدا کے ہاں تمھارا کیس plead کر رہا ہوں، اپنے سجدوں سے میری مدد کرنا۔ نہ جانے کون عمل کس کو بخشوا دے گا!

آج کے دور کا جو چیلنج ہے وہ یہ ہے۔ آج کے دور کی جو جاہلیتِ جدیدہ ہے وہ یہی ہے۔ ہاں! ہم ایک اپنی الگ تہذیب رکھتے ہیں۔ ہاں! ہمیں ادراک ہے۔ ہم نے ایک زمانے کو چیلنج کیا ہے۔ ہاں! ہم جانتے ہیں کہ ہم نے انگاروں کو مٹھی میں لیا ہے۔ دشت کی آندھی پوچھ رہی ہے اب بھی ہمت باقی ہے؟

میں اِک تنہا پیڑ کی صورت دشتِ بلا میں ٹھہرا ہوں
وقت کی آندھی پوچھ رہی ہے اب بھی ہمت باقی ہے؟

ہاں! باقی ہے۔ یہ ہواؤں کے سامنے چراغ جو ہم نے جلانا ہے اِسی لیے جلانا ہے...... اور ہم سب اِس کے پابند کیے گئے ہیں...... بات پھر وہی ہے کہ اگر تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی ایک طبقے کی ذمہ داری طے فرما دی کہ یہ دین کی لڑائی، اِس دین کی محنت، امت کے اندر دین کا کام، دین کی بیداری، یہ فلاں طبقے کی محنت ہے، تو بسر و چشم، علی الراسِ والعین۔ اور اگر ہم سب ہیں، تو پھر گریز اں کیوں؟ اور اِس گریز کا کوئی نہ کوئی جواز سوچ لیا جائے۔

یہ ہمارے گورنر صاحب پنجاب کے، اِن کے ابّا تھے ڈاکٹر ایم ڈی تاثیر۔ اپنے وقت کے بڑے پڑھے لکھے آدمی تھے۔ اِس میں کوئی شک نہیں۔ جب کوئی بی اے سے آگے جاتا نہیں تھا (یہ partition سے بہت پہلے کی بات ہے، اور جو خوش نصیب بی اے کر لیتے تھے وہ اپنے نام کے ساتھ لکھا کرتے تھے۔ محمد بخش مسلم بی اے۔ یہ مولانا تھے، شاہی مسجد کے امام رہے ہیں) وہ کیمبرج سے پی ایچ ڈی کر کے آئے تھے انگلش لٹریچر میں۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر...... تو اُن کے تعلق سے میں دو واقعات آپ کی نذر کرتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ ایم ڈی تاثیر...... یہ فیض احمد فیض کے ہم زلف ہیں۔ ایک بہن فیض کے گھر تھی اور ایک ایم ڈی تاثیر کے گھر تھی۔ تو ایم ڈی تاثیر کہتے ہیں کہ میرا نکاح علامہ اقبال نے پڑھایا۔ اور اِس میں حق مہر باندھا اور شرعی شرائط

طے کیں اور سارا کچھ۔ اُنھوں نے کہا کہ یار یہ کام ہم خود کر سکتے ہیں...... میں جس چیز کی طرف متوجہ کرنا چاہ رہا ہوں...... کہ ہمارے ہاں، یعنی جو دین کا کام سمجھ لیا گیا ہے، وہ کیا ہے؟ کہ جنازہ پڑھنا، نماز پڑھنا، قرآن پڑھنا۔ یہ دین کا کام ہے۔ اور اِس کے لیے پھر ایک کلاس ہم نے طے کر دی کہ یہ کریں گے۔ اِس کے علاوہ کوئی اور کام تو ہے نہیں...... تو اقبال نے خود پڑھایا اُن کا نکاح۔ اُنھوں نے کہا کہ وہ اُن کے خاندان میں یادگار کے طور پر چلا آتا ہے۔ اقبال آرکائیوز کی چیز ہے۔ ایک تو یہ بات تھی۔ ایم ڈی تاثیر کہتے ہیں (وہ لاہور میں کالج میں پڑھاتے تھے) کہ ایک دن علامہ نے مجھے بلا بھیجا۔ پیغام دیا فوراً پہنچو۔ میں کلاس میں تھا۔ اُن کا معمول نہیں تھا کہ ڈیوٹی کے اوقات میں یاد فرمائیں۔ میں نے کلاس مختصر کی اور چلا آیا۔ آیا تو میں نے دیکھا ایک صاحب اقبال کے پاس بیٹھے ہیں۔ علامہ نے کہا بیٹھ جاؤ۔ میں بیٹھ گیا۔ اُنھوں نے کہا یہ پروفیسر صاحب ہیں عراق کی کسی یونیورسٹی میں۔ یہ ہندوستان آئے ہیں چلتے چلاتے۔ اور قرآن بڑا اچھا پڑھتے ہیں۔ تو میں نے کہا کہ میں تمھیں قرآن سنواؤں۔ میں نے کہا جی ٹھیک ہے، زہے نصیب۔ تو ڈاکٹر تاثیر کہتے ہیں کہ اقبال نے مجھ سے کہا کہ اِن سے کوئی سورۃ کہو۔ میں نے کہا سورۂ رحمٰن سنائیں۔ اُنھوں نے سنائی۔ بہت اچھا پڑھا۔ دل کے تاروں کو چھوا۔ جب سورۂ رحمٰن اُنھوں نے ختم کی تو اقبال نے کہا کہ کچھ اور بھی سنو۔ میں نے کہا سورۂ نجم سناؤ۔ تو اُنھوں نے سورۂ نجم سنائی۔ اب کہنے لگے کہ جب وہ سورۂ نجم پڑھ رہے تھے تو میرے بھی ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے اور علامہ کے بھی ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ جب یہ ہو چکا تو میں نے بعد میں علامہ سے کہا کہ یہ بتایئے سورۂ رحمٰن میں یہ کیفیت کیوں نہیں ہوئی؟ علامہ نے فرمایا کہ اصل میں سورۂ رحمٰن میں چونکہ بار بار **فبای آلاء ربکما تکذبن** کی آیتِ مبارکہ دوہرائی جاتی ہے، اور اِس کے ساتھ قوافی چلتے ہیں، قافیے چلتے ہیں: **مدھآمّتٰن، مرج البحرین یلتقیان**...... قوافی چلتے ہیں، قافیے، رائمز کی ترتیب پر، تو یہ اُن قاری صاحب کا ذہن پڑھنے میں اُدھر منتقل رہا، تو دل کے تار معنی سے نہیں ملے۔ والنجم میں دل کے تار معنی سے ملے ہیں تو دل کو چھوا ہے اِنھوں نے۔

یہ واقعہ بذاتِ خود سرمۂ چشمِ بصیرت ہے۔ میں اِس واقعہ سے ایک اور چیز refer کرنا چاہتا ہوں کہ اُس زمانے میں ہمارے پڑھے لکھے لوگ ایسے تھے جو قرآن کو سمجھتے تھے۔ جو کہتے تھے فلاں سورۃ سنایئے، فلاں مقام سے پڑھیے۔ یہ مولوی نہیں تھے۔ ڈاکٹر تاثیر مولوی نہیں تھا۔ کہنے کی بات یہ ہے...... اور ابھی قاری صاحب نے ذکر فرمایا، سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سے، اقبال سے اُن کے مراسم تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ قرآن کو سید احمد شہیدؒ کی طرح اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کی طرح نہ سہی، اقبال کی طرح ہی پڑھ لیا کرو۔ اور آگے اُن کے الفاظ یہ تھے کہ دیکھو، اِس نے قرآن کو ڈوب کر پڑھا تو مغرب کی دانش پر ہلّہ بول دیا۔

ایک مختصر واقعہ عرض کر کے گفتگو سمیٹتا ہوں۔ سید احمد شہیدؒ کا ذکر آ گیا اور بات سے بات نکلتی ہے، خیال سے خیال چلتا ہے۔ انگریزوں کے ساتھ جب ٹکر کے آثار بن رہے تھے تو شاہ عبدالعزیز دہلویؒ، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے چشم و چراغ، جنھوں نے ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا، وہ اِس پوری صورتِ حال کو مانیٹر کر رہے تھے دہلی میں بیٹھ کر، اور انگریز بہادر عیسائی مشنری لا رہا تھا دھڑا دھڑ یہاں، ہندوستان میں، تا کہ علماء کو ایک اور ہی میدان میں الجھا دیا جائے: مناظروں میں؛ اور یہ جو resistence آ رہی ہے اِس کو روک دیا جائے۔ مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اِسے۔ تو شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے کہا شاہ اسماعیل شہیدؒ سے اور مولانا عبدالحئی سے...... یہ دونوں ساتھی ہیں...... کہ بھئی ایسا ہے کہ تم سید احمد شہید کو اپنا شیخ مان لو، اُن کو اپنا مصلح مان لو، اُن کو اپنا بڑا مان لو، اُن سے اصلاح لو۔ تو مولانا عبدالحئی کہتے ہیں...... وہ خود اِس واقعے کے راوی ہیں...... کہ ہمارے جی میں آئی کہ شاہ عبدالعزیز دہلوی...... اِس وقت ہندوستان میں اُن کے پائے کا عالم نہیں، شاہ ولی اللہؒ کے بیٹے ہیں، جامع العلوم ہیں، بحر العلوم ہیں۔ سید احمد شہید کے پاس کیا ہے؟ ایک سید زادہ ہے، جس نے ٹونک میں سپہ گری کی ملازمت کی ہے، درسِ نظامی اِس نے مکمل نہیں کیا۔ اور یہ ٹھیک ہے شاہ صاحب سے اِس کا تعلق ہے، ذہن اِس کا جہادی ہے، بڑا

un-compromising قسم کا۔ یہ کہتے ہیں اِس کو مصلح مان لو! یہ ہماری کیا اصلاح کرے گا؟ شاہ صاحب فرما رہے ہیں...... شاہ عبدالعزیز......نہیں بھئی، تم اُس کو مان لو۔تم اُس سے فائدہ اُٹھاؤ۔ اُس کو اپنا مصلح مان لو۔ اُس کو شیخ مان لو۔ کہنے لگے کہ چنانچہ ہم صرف امتثالِ امر میں، اپنے اُستاد کا حکم پورا کرنے کے لیے، ہم سید احمد شہید کی خدمت میں چلے گئے۔ دیکھنے کے لیے۔اور خود شاہ صاحب کے زیرِ سایہ......شاہ عبدالعزیزؒ کے...... جب اُن کی خدمت میں گئے اور ہم نے کہا کہ ہم آئے ہیں اور اِس نیت سے آئے ہیں تو شاہ صاحب نے...... کہنے لگے...... کہ ہمیں بتایا تھا کہ تم اُن سے یہ کہنا کہ ہمیں مسنون نماز سکھا دیں۔......دیکھیے! شاہ اسماعیل شہید وہ ہے جس کے علم ڈنکا بجتا ہے، اپنے وقت کا امام......اور اُس کو شاہ عبدالعزیز کہہ رہے ہیں کہ سید احمد شہید سے کہو کہ ہمیں مسنون نماز سکھا دیں۔......اُنھوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ ایسا ہے کہ آپ رات کو آ جائیں، عشاء پڑھ کے، تسلی سے، اور اپنے تقاضوں سے اور اپنے معمولات سے فارغ ہو کر آپ میرے ہاں آ جائیں۔ کہنے لگے ہم چلے گئے۔اب ہم منتظر ہیں اور پرتجسس ہیں کہ اب ہوگا کیا؟ کہنے لگے کہ سید احمد شہید ہمیں حوض پر لے گئے اور فرمایا کہ اِس استحضار سے، دل میں اِس کیفیت کو طاری کر کے، وضو کریں کہ کوئی سنت چھوٹنے نہ پائے، جیسے صحابہؓ کرتے تھے اور جیسے اُنھوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرتے دیکھا۔تو مولانا عبدالحیٔ کہتے ہیں کہ واقعہ یہ ہے کہ پڑھتے پڑھاتے عمر گزر گئی، ایسے لگا کہ زندگی میں پہلی دفعہ وضو کر رہا ہوں۔ بہت دیر لگا کے وضو کیا۔ جب آ گیا، شاہ صاحب اپنے حجرے میں لے گئے۔ کہا کہ صرف دو نفل پڑھنے ہیں۔اب بھی استحضار یہی ہے کہ حکم دیا گیا ہے: صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي......ایسے نماز پڑھو جیسے تم مجھے نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے ہو...... اِس کیفیت کے استحضار کے ساتھ دو رکعت پڑھنی ہے۔مولانا کہتے ہیں کہ یقین مانیے مجھے سحر ہو گئی۔ میں دو رکعت پڑھتا تھا، سلام تک پہنچتے پہنچتے تنبّہ ہو جاتا تھا کہ فلاں جو میرا رکن تھا اور فلاں جو چیز تھی وہ سنت سے ہٹ کر تھی، فلاں میں حق ادا نہیں ہوا، سجدے میں کمی رہ گئی، قومے میں، قعدے میں، جلسے میں، کہیں۔ دو رکعت پوری نہیں کر پایا۔

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

بعض اوقات آدمی کا علم جو ہے وہ اُس کے سامنے رکاوٹ بن جاتا ہے، رویتِ حق میں، قبولِ حق میں۔ مجھے تو بہت کچھ آتا ہے۔ دو رکعت کے امام ہیں بے چارے، یہ تو چلاّتے ہی رہتے ہیں۔اور دو رکعت کے امام کی بھی سُن لیں۔اللہ اشفاق احمد کی مغفرت کرے، بڑی اچھی مثال دیا کرتے تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ دیکھیں بات یہ ہے کہ سڑک پر چوک آ گیا۔ میں گاڑی پر جا رہا ہوں۔ آگے سپاہی کھڑا ہوا ہے۔ اُس نے کہا جناب رک جائیں۔ میں نہیں رک رہا۔ اُس نے کہا کہ یہ سرخ بتی ہے آپ رک جائیں۔ میں نے کہا تمھیں پتہ نہیں؟ تم الو کے پٹھے ہو۔ میں تو پی ایچ ڈی ڈاکٹر ہوں، میں تو اِتنا بڑا آدمی ہوں۔ اُس نے کہا سر! میں تو بی اے فیل ہوں، ایف اے میں چھ دفعہ فیل ہوا تھا۔لیکن سرخ بتی کا مطلب ہے رک جانا۔ میں تو آپ کی خاکِ پا ہوں۔لیکن سرخ بتی کا یہی مطلب ہے، اور یہ میں بالکل صحیح بتا رہا ہوں آپ کو۔ دو رکعت کا امام بے چارہ جو ہے: اکبر نام لیتا ہے خدا کا اِس زمانے میں، اُس کا قصور یہ ہے کہ وہ کہہ رہا ہے کہ بھئی یہ قرآن ہے اور یہ حدیث ہے۔ آپ بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں، آپ عظیم آدمی ہیں، لیکن اِس سے نہیں ہٹ سکتے۔ ہم کہتے ہیں نہیں۔ blasphemy act تو بدلنا ہوگا۔ قانونِ توہینِ رسالت میں کوئی نہ کوئی تبدیلی تو کرنی ہوگی۔

ایک صاحب کا کہنا ہے کہ آج کل مسلمانوں کے لیے مغرب سے استفادہ کرنے کی یہ تین شرطیں ہیں۔ میں نے کہا جی آسان بات ہے، یعنی جو ہمارے علماء تھے یا جو لوگ تربیت کرتے تھے، وہ تو کہتے تھے جناب تمام چیزیں چھوڑ دو جو منہیات ہیں۔معروفات پہ آ جاؤ، منکرات کو چھوڑ دو۔ یہ صرف تین شرطیں ہیں: پہلی بات یہ کہ رزقِ حلال کی رٹ نہ لگائیے۔ اِس کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ٹھیک۔ دوسری شرط یہ کہ آپ کی بیوی پردہ نہ کرے، مطلب یہ کہ اِس میں بھی بڑی ریلیکسیشن ہے۔اور تیسری

شرط یہ ہے کہ یہ نماز جو ہے اِس کی بھی کوئی پابندی نہیں ہے۔ بڑا مصروف ہوگیا ہے بندہ۔ پانچ وقت میں وضو کرنا، پھر نماز پڑھنا...... تو پھر خیر سلا ہے۔ پھر آپ اِن سے فیض یاب ہوسکتے ہیں۔ پھر دنیا جہان کی دانش، مقولہ سازی (proverbial)۔ اِس میں کمال ہے۔ گفتار کے غازی۔ تو یہ جو اِس طرح کی lip service ہے، اِس سے ہم خوش ہیں۔

مگر بات پھر وہی ہے۔ وہ بے چارہ جو چلّا رہا ہے اُس کی جگہ ہمیں کھڑا ہونا چاہیے تھا۔ یہ قرآن وحدیث کیا صرف مولوی صاحب کے لیے اُترا ہے؟ اور مولوی کی حیثیت کیا ہے؟ کیا جنازہ پڑھانا، نکاح پڑھانا، نماز پڑھانا کوئی اِتنا مشکل کام ہے کہ اِس کے لیے کوئی بندہ لایا جائے؟ اور میں تفنن کے طور پر آپ سے عرض کروں۔ یہ بالکل سچا واقعہ ہے، واللہ العظیم مجھے ایک ساتھی نے بتایا کہ ایک صاحب تھے جو پنجاب سے فرار ہوکر سندھ میں چلے گئے، وہاں جا کر اُنھوں نے...... وہ اشتہاری تھے بے چارے، کوئی ایسے اچھے کام انھوں نے کیے تھے...... تو وہ وہاں پیر بن گئے۔ تو ایک دن جس بستی میں وہ تھے، ایک بندہ وہاں جل کر مرگیا۔ آگ لگی، بے چارہ مرگیا۔ مولوی صاحب Availiable نہیں تھے۔ لوگوں نے کہا کہ حضرت آئیں اور جنازہ پڑھائیں۔ حضرت نے تو جب سے پیدا ہوئے تھے کبھی فرض نماز نہیں پڑھی تھی تو جنازے کی اُن کو کیا ہوا لگی ہو۔ اُنھوں نے کہا یہ مولویوں کے کام ہیں۔ ہم تو نماز مدینہ میں پڑھتے ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ آج تو آپ ہی پڑھادیں کیونکہ مولوی صاحب ہیں نہیں، مہربانی کریں۔ وہ بے چارے مارے باندھے، لشٹم پشٹم، آ کے کھڑے ہوئے۔ دو رکعت اُنھوں نے تلاوت کے ساتھ اور رکوع اور سجدہ کی پوری پابندی کے ساتھ پڑھادیں۔ اب وہ جو پیچھے کھڑی ہوئی تھی نا ''قوم جاہلون'' وہ جتنے بھی بیچارے گئے گزرے تھے، لیکن کچھ نہ کچھ اندازہ اُنھیں تھا، تو لوگوں نے کہا کہ جناب یہ آج تو آپ نے بڑا نئے طریقے کا جنازہ پڑھایا۔ تو اُن کو بھی کچھ کھٹک پیدا ہوئی کہ مسئلہ کچھ ہوگیا ہے، کچھ foul میں play کرگیا ہوں۔ اُنھوں نے کہا بڑے جاہل ہو تم! کبھی جو جل کر مرجائے اُس کا جنازہ پڑھا؟ کہا جی نہیں۔ کہا وہ ایسے ہی پڑھا جاتا ہے۔ یہ شامتِ اعمال ہے...... یقین مانیے...... ہنسنے کا مقام بھی اور رونے کا مقام بھی۔ جب مجھ آپ جیسے لوگ جو ہیں، ہم لوگ قوم کو اِس طرح کی مخلوقات کے حوالے کردیں گے تو پھر یہی ہوگا۔

اجاڑ راتوں میں ریت دھرتی پہ فصل بوئی تھی چاندنی کی
اب اُس میں اُگنے لگے اندھیرے تو جی میں کیسا ملال رکھنا

میں...... یہی کچھ بکھری بکھری باتیں مجھے کرنی آتی ہیں۔ اور مجھے اعتراف ہے کہ میں آپ کا وقت قیمتی نہیں بناسکا۔ آپ کے علم میں اضافہ نہیں کرسکا۔ اور شاید میں کوئی بہت مربوط گفتگو نہیں کرسکا۔ یہ قاری صاحب کا حکم تھا۔ میرے لیے صرف یہی خوشی تھی کہ چلیں ہم اپنے پاکستانیوں میں مل بیٹھیں گے۔ اِنھوں نے مجھے یہاں کھڑا کردیا۔ اللہ تعالیٰ آپ حضرات کو جزائے خیر دے کہ آپ نے حسنِ سماعت سے میری گفتگو کی قدر افزائی کی۔ اور موقع ملا تو انشاء اللہ ملاقاتوں کی سبیلیں پیدا ہوتی رہیں گی۔

تیری میری ڈاک ہُن چلدی رئے گی
کھل گیا ڈاک خانہ ہُن دل دے وچ

وما علینا الا البلاغ

سوال ''امریکی''___ جواب ''مکّی''

ایک امریکی صحافی نے، جس کی Assignment یہ تھی کہ وہ تہذیبوں کے حالیہ تصادم، نائن الیون کے حادثے اور افغانستان و عراق میں نہ ختم ہوتی ہوئی امریکہ مخالف مزاحمت کے حوالے سے بعض بنیادی اور متعین سوالات منتخب مسلم دانش وروں سے پوچھے، الشیخ محمد مکی حجازی، مدرس حرم کعبہ سے ٹیلی فون پر پوچھا...... ''جناب، قرآن میں جا بجا مسلمانوں کو کافروں سے جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ خصوصاً سورۃ توبہ اور سورۃ انفال میں۔ کیا آپ نہیں سمجھتے کہ ان سورتوں کو پڑھنے کے بعد مسلمان نوجوان جو ''جہاد'' کرتے ہیں، وہ آج کی دنیا میں تشدد اور دہشت گردی کہلاتا ہے۔ جب تک یہ سورتیں آپ اپنے بچوں کو پڑھاتے رہیں گے، دنیا میں امن کیسے قائم ہوگا؟ اور کیا ان سورتوں کی یہ تفسیر نہیں پڑھائی جاسکتی کہ ان سورتوں میں خطاب پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں سے ہے ان میں جہاد کے احکام پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) اور اُن کے ساتھیوں کے لیے تھے، نہ کہ ہر زمانے کے لیے، خصوصاً آج کے زمانے کے لیے؟''

سوال ختم ہوا تو فضیلۃ الشیخ نے صحافی سے کہا ''اس سے پہلے کہ میں آپ کے سوال کا جواب دوں، دو چار چھوٹے چھوٹے سوالات مجھے بھی آپ سے پوچھنا ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ولادت اور نزول قرآن سے بہت پہلے بُخت نصر نے ستر ہزار یہودی ایک حملے میں قتل کیے۔ کئی لاکھ قید کیے پھر ہٹلر نے کئی لاکھ یہودی قتل کیے۔ اس سے پہلے چنگیز اور ہلاکو نے کئی لاکھ انسانوں کا قتل عام کیا۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں میں کئی لاکھ انسان قتل ہوئے۔ خود آپ کے ملک امریکہ نے جاپان پر ایٹم بم پھینکا۔ یا جو کچھ آپ نے ویت نام میں اور روس نے افغانستان میں کیا؟ کیا یہ سب کچھ کرنے والوں نے سورۃ توبہ اور سورۃ انفال پڑھ کر کیا؟'' صحافی اس جوابی سوال پر لاجواب ہوگیا۔ اب اس نے الشیخ محمد مکی حجازی سے کہا کہ مجھے ایک اور سوال کا جواب بھی دیجیے گا۔ وہ یہ کہ مسلمان علماء پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ایک حدیث سناتے ہیں کہ قیامت سے پہلے، ایک زمانہ ایسا ضرور آئے گا، جب مسلمانوں کو فیصلہ کن فتح اور یہودیوں کو شکست ہوگی۔ اس وقت یہودی جان بچانے کے لیے چھپتے پھریں گے اور انھیں کہیں امان نہیں ملے گی۔ حتیٰ کہ کوئی یہودی کسی پتھر کے پیچھے چھپے گا تو وہ پتھر بھی مسلمان کو پکار کر کہے گا ''ادھر آؤ، یہ دیکھو میرے پیچھے یہودی چھپا ہوا ہے، اسے قتل کرو۔'' سوال یہ ہے کہ کیا یہ حدیث صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو یہ کتنی عجیب بات ہے کہ آپ مسلمان لوگ، یہودیوں کو بطور انسان زندہ رہنے کا حق بھی نہیں دینا چاہتے۔ آج کی مہذب دنیا میں اس طرح کی حدیثیں سنا کر، آخر آپ باقی دنیا کو کیا میسیج Convey کرنا چاہتے ہیں؟ فضیلۃ الشیخ نے سوال بغور سنا اور صحافی سے کہا ''آپ نے ایک بار پھر ادھوری اور ناقص بات کہی۔ یہ حدیث بالکل صحیح ہے۔ لیکن یہ جس زمانے کی بات بتائی جارہی ہے، پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یہ بھی فرمایا تھا کہ ''تب اہل ایمان کی قیادت سیدنا عیسیٰ علیہ اسلام کریں گے۔'' تو یہ گلہ اور شکوہ، آپ کا ہم سے یا پیغمبر اسلام سے نہیں، اپنے نبی...... مسیح مقدس عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام...... سے بنتا ہے۔'' فضیلۃ الشیخ نے پوچھا...... اور کوئی سوال؟ صحافی بعجلت ''شکریہ'' کہہ کر لائن کاٹ دیتا ہے۔ فضیلۃ الشیخ محمد مکی حجازی، حرم بیت اللہ میں روزانہ صبح کو عربی میں اور شام کو اردو میں درس قرآن دیتے ہیں۔ پچھلے تیس سال سے زائد عرصہ سے بلاناغہ، یہ سعادت اس پاکستانی نژاد سعودی عالم دین کو میسر ہے۔

جبر کی سائنس سے صبر کی سائنس تک!

یادش بخیر، الطاف گوہر صاحب آج کل نوائے وقت میں جنوں کی حکایت لکھ رہے ہیں۔ اردو دان اور اردو خواں عوام کے لیے، اِن ایسے خواص کا اِتنا تردد، عین الطاف اور عین نوازش ہی تو ہے۔

ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

لطفِ سخن تو ہے ہی خداداد چیز، لیکن میں نے دیکھا ہے کہ مطلعوں، مقطعوں یا اِن کے بیچوں بیچ، سخن گسترانہ باتوں کی ''تنصیب'' کا جیسا ہنر اُنھیں آتا ہے، اُس میں وہ یکتا ہیں۔ بلکہ یکہ تاز ہیں۔ اپنے یکم دسمبر (۹۳ء) کے کالم ''باتیں نواب کالاباغ مرحوم کی''...... میں الطاف صاحب نے حسبِ معمول بڑے مزے کی اور بڑی پتے کی باتیں کہی ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں......

> فیض احمد فیض نے کہا: ''دیکھو نا! جبر کی بھی ایک سائنس ہے، جسے ہر وہ شخص جو اقتدار کی کرسی پر قبضہ کرلے، نہیں سمجھ سکتا۔ بعض مستند جابر ہوتے ہیں اور بعض نوآموز۔ اب نواب کالاباغ تھا۔ نجیب الطرفین جابر۔ کیا مجال کسی چھوٹے آدمی پر ہاتھ ڈالے۔ مگر سارے مغربی پاکستان میں اُس کی دہشت تھی۔ بھٹو صاحب اُس کی نقل کرتے تھے۔ مگر جبر کی سائنس سے ناآشنا تھے۔

یوں، الطاف صاحب نے اپنے کالم میں ''جبر کی سائنس'' کو حوالہ بنا کر نواب کالاباغ مرحوم کی شخصیت اور کردار کے متعلق گفتگو کی ہے۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ اوّل تو ہماری سمجھ میں یہ جبر کی سائنس آئی ہی نہیں۔ دیکھیے۔ ایک ہوتی ہے جبریت، جسے آپ ایسے پڑھے لکھے Fatalism یا Determinism کہیں گے۔ اور ایک ہوتی ہے جبّاریت، جسے شاید آپ Omnipotence کہیں گے۔ اب اگر اِن کی کوئی سائنس دریافت کرلی جائے تو ٹھیک ہے۔ کوئی ایسی بات نہیں۔ لیکن یہ جو جبر کی سائنس ہے، یہ تو مستلزم ہوگی ظلم و استبداد اور جور و جفا کی سائنسز کو۔ اور جور کی سائنس، آپ کو پتا ہے، عبارت ہے...... ''افضل الجہاد کلمۃ الحق عند السلطان الجائر'' سے! جائر حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنے سے۔ (جی ہاں! سلطانِ جابر نہیں، سلطانِ جائر!) جب کہ جفا کی سائنس......؟ یہ تو بہت پرانی ہے۔

جفا کم کن کہ فردا روزِ محشر
بہ پیشِ عاشقاں شرمندہ باشی

کہنا میں یہ چاہتا ہوں کہ ظلم، ظلم ہوتا ہے؛ استبداد، استبداد ہوتا ہے اور جبر، جبر ہی ہوتا ہے۔ باقی رہی جبر کی سائنس، تو...... دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔ ہاں البتہ یہ اپنی اپنی قسمت اور ہمت پہ موقوف ہے کہ کون نواب کالاباغ اور بھٹو کے دور میں مقتل کو سرخرو کرتا ہے اور کون منصب و جاہ کو!

ایک اور بات جس پر ہم چونکے اور ٹھٹکے،...... ہے وہ بھی سخن گسترانہ! الطاف صاحب راوی ہیں کہ نواب کالاباغ نے اُن سے کہا:

> ایک دفعہ عطاء اللہ شاہ بخاری میانوالی تشریف لائے۔ اُن کی جادو بیانی کا یہ اثر ہوا کہ ضلع بھر کے لوگ رات رات

بھر بیٹھے اُن کے ارشادات سنتے اور سر دھنتے۔ اُنھوں نے اعلان کیا کہ وہ نواب کالاباغ کے ظلم اور جبر کے خلاف جہاد کا علم لے کر نکلے ہیں۔ نواب صاحب کے مخالفین نے شاہ صاحب کو اور چڑھا دیا۔ بے شمار لوگ اِس جہاد میں اُن کے ساتھ شامل ہوگئے۔ جمعرات کی شام کے جلسے میں اُنھوں نے اپنے جاں فروشوں کو اطلاع دی: کل جمعہ کی نماز کے بعد میں سر پر کفن باندھ کر کالاباغ روانہ ہوجاؤں گا۔ کیا آپ میرے ہمراہ چلیں گے؟ حاضرینِ جلسہ نے بیک زبان کہا: ہاں چلیں گے۔ اِس اعلان کی گونج نواب کالاباغ کے کان میں بھی پڑی۔ اُنھوں نے اپنے ایک معتمد کے ہاتھ عطاء اللہ شاہ بخاری کی خدمت میں یہ پیغام بھجوایا کہ حضور شاہ صاحب، بڑی خوشی سے کالاباغ تشریف لائیے۔ جو کفن آپ سر پر باندھ کر آئیں گے ہم آپ کو وہی کفن پہنا کر واپس بھیج دیں گے۔ نواب صاحب کے قول کے مطابق شاہ صاحب نے پیغام ملنے کے بعد کالاباغ آنے کا ارادہ ترک کردیا۔ تو جبر کی سائنس یہ ہے کہ مدِ مقابل کو پہچانو۔ اور جب اُس کے گریبان پر ہاتھ ڈالو تو یہ اطمینان کرلو کہ تمھارے پاؤں زمین پر جمے ہیں، اور وار کرو تو ایسا کہ رقیبِ روسیاہ جانبر نہ ہوسکے۔ کسی کمزور آدمی پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔

اب میں کیا عرض کروں، کہ یہاں تو جبر کی سائنس، انتہائے لاغری سے دکھائی بھی نہیں دے رہی۔ دعویٰ، دلیل، روایت اور درایت کی رو سے، بلکہ رو رعایت سے بھی، اِس حکایت کو پایۂ ثقاہت تک پہنچانا محال ہے۔ پایۂ ثقاہت کہاں، اِسے پایۂ ثبوت تک بھی نہیں پہنچایا جاسکتا۔ وہ کیوں؟ اِس لیے کہ عطاء اللہ شاہ بخاری ایک دفعہ نہیں، بہت دفعہ میانوالی تشریف لے گئے۔ لیکن یہ کفن والی بات تو کبھی نہیں سنی گئی۔ بالکل بھی نہیں۔ ہاں، شاہ صاحب کے ایک ساتھی تھے مولانا محمد گل شیر! احراری خطیبوں کی کہکشاں میں بہت نمایاں تھے۔ یہی وہ ''مردِ حُر'' تھا جس نے ۱۹۴۳ء میں نواب کالاباغ کے مظالم کے خلاف عوامی تحریک کا آغاز کیا اور ۱۹۴۴ء کے وسط میں، نواب صاحب کے حسب الارشاد، کفن اوڑھ کر، آسودۂ خاک ہوگیا۔ اِس اجمال کی کچھ تفصیل عرض کردینا یوں بھی ضروری ہے کہ آج کی نسل تو نواب کالاباغ سے بھی کچھ زیادہ واقف نہیں، چہ جائیکہ اُسے مولانا گل شیر اور عطاء اللہ شاہ بخاری کے افکار و سوانح سے کچھ علاقہ ہو۔

یہ مولانا گل شیر ضلع اٹک کے ایک گاؤں (ملہووالی) کے رہنے والے تھے۔ شمالی پنجاب میں اٹک، کیمبل پور، میانوالی، سرگودھا، خوشاب، جہلم وغیرہ کے علاقوں میں یہی ایک آواز تھی جو جاگیرداروں، وڈیروں، ٹوڈیوں، کاسہ لیسوں اور فرنگیوں کے لیے ۱۹۲۸ء سے سوہانِ روح بن گئی تھی۔ خوف، مولانا کی چمڑی میں نہیں تھا۔ مستزاد یہ کہ غضب کے خوش بیان، خوش الحان، اور خوش شکل بھی! یہ واقعہ ہے کہ خلقت اُن کی دیوانی تھی۔ پروفیسر مرزا محمد منور کے الفاظ ہیں:

> میں مولانا گل شیر کو عطاء اللہ شاہ بخاری سے برتر مقرر جانتا ہوں۔ اُن کے بیان میں جو سوز اور درد موجود تھا، کسی بھی دوسرے مقرر میں آج تک محسوس نہیں کیا۔

خود، سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے الفاظ تھے کہ

> مجھے آج تک کوئی دوسرا شخص ایسا نہیں مل سکا جس کی تلاوت اِتنی موثر اور کیف آور ہو۔

خود ہی خیال فرمایئے کہ ایسے شخص کی ''خطرناکی'' میں نواب کالاباغ کو کیونکر شک ہوسکتا تھا۔ یہی مولانا گل شیر ۱۹۳۹ء میں جب مجلسِ احرارِ اسلام میں شامل ہوئے تو ٹوانے، نون، خوانین، ملک، سادات اور پیر صاحبان اب ٹھیک ٹھیک اُن کی زد میں آنے لگے، یا، دوسرے لفظوں میں، مولانا کی Range بہت کچھ بڑھ گئی تھی۔ قصہ مختصر، یہ کہ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں مجلسِ احرار نے مولانا کی سرکردگی میں کالاباغ میں تحریک چلانے کا اعلان کردیا۔ سردار خضر حیات، وزیرِ اعظم پنجاب، کچھ سپر انداز بھی ہوئے۔ وہ اٹک کر

چل آئے۔ لیکن نواب کالاباغ کے جبر و استبداد نے سپر انداز ہونا نہیں سیکھا تھا۔ لہٰذا ۲۳/ مئی ۱۹۴۴ء کو، مولانا محمد گل شیر کو، اُن کے اپنے گھر میں، سوتے میں گولی مار دی گئی...... اب آپ اِسے جبر کی سائنس کہہ لیں۔ Tyrany (استبداد) کہہ لیں، Despotism (مطلق العنانی) کہہ لیں، Autocracy (خود سری) کہہ لیں، یا Oppression (تعدّی) کہہ لیں...... الفاظ بدلنے سے حقیقت کبھی نہیں بدلی، کہیں نہیں بدلی۔

اِن سطور کا راقم، اعتراف کرتا ہے کہ وہ الطاف گوہر صاحب کے علم، تجربے، مشاہدے اور تجزیے کو چیلنج کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ اُسے یہ سودا بھی نہیں اور لپکا بھی نہیں، کہ وہ ایک فہمیدہ و جہاندیدہ (Veteran) شخص ہیں ہفت زبان (Polyglot) ہیں۔ خوبیوں کا ایک جہان ہیں۔ لیکن اُن سے اِتنی بات کہنے کی اجازت، ضرور، مجھے ملنی چاہیے کہ اگر جبر کی سائنس Exist کرتی ہے تو یقین جانیے کہ پھر صبر کی سائنس بھی یہاں Exist کرتی ہے۔ اگر نواب کالاباغ کی زندگی جبر کی سائنس سے عبارت ہے تو اُن کی موت، صبر کی سائنس سے! الطاف صاحب خود لکھتے ہیں:

> مجھے اتوار کی وہ صبح کبھی نہیں بھولتی جب صدر صاحب نے مجھے طلب کیا اور بتایا کہ نواب کالاباغ کو اُن کی خواب گاہ میں قتل کر دیا گیا ہے۔ شبہ یہ تھا کہ اُن کے چھوٹے بیٹے نے کسی اختلاف کی بنا پر باپ کے سر میں پستول کی گولی پیوست کر دی۔ نواب صاحب نے ایوب خان سے اپنی آخری ملاقات میں ایک ہی گزارش کی تھی اور وہ یہ کہ اگر اُن کا چھوٹا بیٹا کسی مشکل میں مبتلا ہو جائے تو اُس کی مدد کی جائے۔

الطاف صاحب! کہنے والے تو کہتے ہیں کہ صبر کی سائنس کا جادو، نواب کالاباغ کے صاحبزادے کے سر پر بھی چڑھ کر بولا۔ وہی ایک گولی، وہی غیر طبعی موت، وہی اجیرن زندگی...... اُن کے گھر میں یہ تسلسل تو آج بھی قائم ہے۔ اور امیر عبداللہ روکڑی کے محتاط پیرائے میں لکھے گئے الفاظ، اب بھی میرے سامنے ہیں کہ......

> عام طور پر ایسا مشہور ہے کہ دو سو کے لگ بھگ قتل، نواب آف کالاباغ کے ذمے تھے۔

سابق آئی جی پنجاب، راؤ عبدالرشید کی گواہی بھی تو ریکارڈ پر ہے کہ......

> یہ اُن کی سرشت میں شامل تھا کہ شریف آدمی، خاص طور سے خوددار آدمی کی پگڑی اچھالی جائے!

وہ ایک صاحب، اور ہوا کرتے تھے...... جناب سکندر مرزا...... ''اُن کو بھی اپنے خدا ہونے کا اُتنا ہی یقین تھا!'' اپنے نواب صاحب، نواب ہی تو تھے، یا پھر مغربی پاکستان کے گورنر ہو گئے۔ جب کہ سکندر مرزا صاحب تو گورنر جنرل اور صدرِ مملکت بھی ہوئے۔ اُن کی تب و تابِ جابرانہ کا کیا کہنا۔ چودھری محمد علی، حسین شہید سہروردی، آئی آئی چندریگر، ملک فیروز خان،...... یہ سب وزرائے اعظم اُنھوں نے یکے بعد دیگرے یوں بھگتائے اور چلتے کیے کہ...... کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ اُن کے مزاج کی رنگینی اور دماغ کی سنگینی کی داستانیں، الطاف گوہر صاحب کے علم میں بھی یقیناً ہوں گی۔ بہر حال میں یہاں شورش کاشمیری کی ایک روایت نقل کرتا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں:

> شیخ حسام الدین، حسین شہید سہروردی کے ساتھ عوامی لیگ میں شامل ہو گئے۔ ایک دن سہروردی صاحب نے اُن سے کہا...... شیخ صاحب! سکندر مرزا (صدرِ مملکت) کو مجلسِ احرارِ اسلام کے بارے میں غلط فہمی ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اُس کا ذہن صاف ہو جائے۔ لیکن آپ کی اُس سے ملاقات مفید ہو گی۔ غرض شیخ صاحب اور ماسٹر تاج الدین انصاری، سکندر مرزا سے ملاقات کے لیے گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں گئے۔ سکندر مرزا، اپنے صدارتی جاہ و جلال کے ساتھ برآمد ہوا اور شاہانہ بے نیازی کے ساتھ فروکش ہو گیا۔ ڈاکٹر خان صاحب، صوبہ کے وزیرِ اعلیٰ، ہمراہ تھے۔ سہروردی نے مرزا سے کہا: دونوں احرار رہنما، شیخ صاحب اور ماسٹر جی، آئے

ہیں۔مرزا نے حقارت سے جواب دیا: ''احرار؟ پاکستان کے غدار ہیں۔''

ماسٹر جی، ٹھنڈی طبیعت کے مالک، کہنے لگے: غدار ہیں تو پھانسی پر کھنچوا دیجیے۔لیکن الزام کا ثبوت ہونا چاہیے۔

سکندر مرزا نے اُسی رعونت سے جواب دیا: ''بس۔میں نے کہہ دیا ہے کہ احرار غدار ہیں۔''

ماسٹر جی نے تحمل کا رشتہ نہ چھوڑا۔لیکن مرزا نے سرکش گھوڑے کی طرح پٹھے پر ہاتھ ہی نہ دھرنے دیا...... وہی ژاژ خائی!

شیخ صاحب نے غصہ میں کروٹ لی۔مرزا سے پوچھا: ''کیا کہا آپ نے؟''

میں نے؟

جی ہاں!

''احرار، پاکستان کے غدار ہیں۔'' مرزا نے مٹھی بھینچتے ہوئے کہا۔

شیخ صاحب کہاں رکتے۔گورنمنٹ ہاؤس، گورنر موجود، وزیرِ اعلیٰ موجود، وزیرِ اعظم موجود، صدرِ مملکت کی بارگاہ۔

فوراً جواب دیا: ''احرار غدار ہیں کہ نہیں، اِس کا فیصلہ ابھی تاریخ کرے گی۔تمھارا فیصلہ تاریخ کر چکی ہے، کہ تم غدار ابنِ غدار ہو۔تمھارے جدِ امجد میر جعفر نے سراج الدولہ سے غداری کی تھی۔تم اسلام کے غدار ہو۔''

ڈاکٹر خان صاحب نے شیخ صاحب کو آغوش میں لے لیا اور سکندر مرزا سے پشتو میں کہا: ''میں نے تمھیں پہلے کہا تھا کہ اِن لوگوں کے ساتھ شریفانہ لہجہ میں بولنا۔یہ بڑے بے ڈھب لوگ ہیں۔''

ظاہر ہے کہ بلی، ایک ہی جھٹکے میں سپر انداز ہو جاتی ہے۔یکا یک اُس کا لب و لہجہ ہی بدل گیا۔

مجھے اِس روایت پر کوئی تبصرہ نہیں کرنا اور نہ کوئی حاشیہ چڑھانا ہے۔عیاں را چہ بیاں؟ لیکن ایک روایت اور ملاحظہ کیجیے۔پروفیسر ڈاکٹر عبدالغنی فاروق لکھتے ہیں (ذکر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا چل رہا ہے)......

یہ منظر مئی ۱۹۵۸ء کا ہے...... یہی فقیر منش انسان (عطاء اللہ شاہ بخاری) ملتان کے ایک کچے مکان میں مقیم ہے۔ بڑھاپا بھی ہے اور افلاس بھی۔اِس عالم میں صدرِ پاکستان جنرل سکندر مرزا ملتان آتے ہیں۔گیلانیوں کے ہاں دعوت ہے۔سکندر مرزا ایک صاحب کو اُس فقیر کے پاس بھیجتے ہیں۔پیشکش یہ ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے آ جائیں۔ منہ مانگی خواہش پوری ہوگئی۔مگر یہاں اب بھی وہی جواب ہے: ''میرا سکندر مرزا کے پاس جانا علم اور فقیری کی توہین ہے۔سکندر مرزا، میرے جھونپڑے میں آ جائیں تو اُن کی بھی عزت ہے اور میری بھی۔لیکن میں اُن کے پاس جا کر اپنی عمر بھر کی کمائی غارت نہیں کرنا چاہتا۔'' ایلچی، جس کا نام مظفر علی شمسی ہے، خاموش لوٹ آتا ہے۔

الطاف گوہر صاحب کہہ سکتے ہیں کہ سکندر مرزا جبر کی سائنس سے نا آشنا تھے۔لیکن اسے کیا کیجیے اور اِسے کیا کہیے کہ نواب کالا باغ کے جبر کی سائنس تو، نہ نظریاتی ہے اور نہ اطلاقی! خود الطاف صاحب کا بیان ہے کہ:

کراچی میں لیاری کے علاقہ میں ایک منی انتخاب کا مرحلہ آیا۔ایوب خان نے کراچی کے ایک معزز اور صاحبِ اثر تاجر اور صنعت کار حبیب اللہ خان کو اپنی مسلم لیگ کی طرف سے نامزد کیا اور حزبِ اختلاف میر غوث بخش بزنجو کو میدان میں لے آئی۔

نواب صاحب کو حبیب اللہ خان پر کوئی اعتماد نہ تھا، اِس لیے کہ وہ ''پراچوں'' کو حکومت کے قریب نہیں آنے دینا چاہتے تھے۔اُنھوں نے اپنے دو وزیروں محمود ہارون اور غفار پاشا کو یہ کام سپرد کیا کہ حبیب اللہ خان کو کامیاب نہ

ہونے دیا جائے۔ انتخاب کا نتیجہ نکلا تو ایوب خان کو محسوس ہوا کہ نواب صاحب نے ذاتی مخاصمت کی وجہ سے لیگ کے سرکاری امیدوار کو ہروا دیا ہے۔...... صدر ایوب سبی دربار میں شمولیت کے لیے بلوچستان گئے تو نواب صاحب بھی دربار میں موجود تھے۔ صدر اور گورنر کی کرسیاں ساتھ ساتھ رکھی گئی تھیں مگر نواب صاحب نے اپنی کرسی ذرا پیچھے سرکالی۔ اِس پر ایوب خان نے کہا: ''نہیں نواب صاحب، پیچھے مت بیٹھے۔'' وہ دن بھر ساتھ رہے اور رات کا کھانا بھی اکٹھے کھایا مگر ایوب خان نے ضمنی انتخاب کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ اگلی صبح ناشتے پر نواب صاحب نے خود یہ معاملہ اُٹھایا اور کہا کہ لیاری میں سرکاری امیدوار کی شکست کی وجہ اُن کے دو وزیروں کی سازش تھی، اور وہ اُن کے خلاف تحقیقات کا حکم دینے والے ہیں۔ ایوب خان نے کہا: ''نواب صاحب، سرِ بازار گندے کپڑے دھونے سے کیا حاصل؟ وہ دونوں وزیر میری رضا سے مقرر ہوئے تھے۔ اُنھیں فوراً فارغ کر دیجیے۔ میں نے اپنی رضا واپس لے لی۔'' بس اِس کے ساتھ ہی ایوب خان اور نواب کالاباغ میں برسوں کا تعلق ختم ہو گیا۔

اب فرمایئے کہ نواب کالاباغ کی نفسیات، اخلاقیات اور جبر کی سائنس میں جھوٹے وقار، جھوٹی عزت، جھوٹی دوستی، جھوٹی وفاداری اور جھوٹے طنطنے کے سوا اور بھی کچھ رکھا تھا؟ مجھے معلوم ہے کہ الطاف صاحب بھی نواب صاحب کی راست بازی اور راست گفتاری کے مبلغ و مناد نہیں ہیں۔ اور اوپر کی روایت میں تو

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری!

اصل میں مجھے بھی حیرانی یہ ہوئی ہے کہ عطاء اللہ شاہ بخاری سے متعلق نواب کالاباغ کے بیان کو الطاف صاحب نے یوں پیش فرمایا ہے کہ (معذرت کے ساتھ) گویا اِس کی Credibility کا اشتہار ہو گئے ہیں۔ حالانکہ اُن سے بہتر کسے اندازہ ہوگا کہ یہ اصولِ روایت کے سراسر منافی ہے۔ پھر، عطاء اللہ شاہ بخاری اور اِس کینڈے کے دوسرے لوگوں کے متعلق یہ باور کر لینا کہ وہ حریف اور مدِ مقابل سے یوں آسانی سے ہار مان گئے ہوں گے، ''انتہائے سادگی'' ہی تو ہے۔ یہ لوگ تو جس مٹی کے بنے ہوئے تھے، اُس میں ظلم کے مقابلے میں Diplomacy کی بجائے Contumacy کا عنصر پوری طرح (بلکہ بری طرح) غالب و حاوی تھا۔

یہاں سوال یہ نہیں کہ ایسی روایتوں اور حکایتوں کا سامنے آنا کس سطح کے لوگوں کی تسکین کا باعث ہوتا ہے۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ اِس اشتغال سے گریز و احتراز کس حد تک لازم ہے؟ خود الطاف گوہر صاحب کو آج بھی بہت سے نوابانِ سبز باغ، مجیب الرحمٰن کے چھ نکات کا مصنف بتلاتے ہیں۔ اِسی طرح ذوالفقار علی بھٹو سے گوہر صاحب کو جو تعزیر و تعذیب پر مبنی تعلق رہا ہے، اُس کے Second Phase کے متعلق راؤ عبدالرشید فرماتے ہیں کہ......

بھٹو صاحب نے اُن کو ایسٹیبلش کیا۔ اُن کے بھائی [تجمل حسین] کو سفیر بنا کے بھیجا۔ اُن کو روٹی پلانٹ کا ٹھیکہ دیا۔ آخر الطاف گوہر نے بھٹو صاحب کے ساتھ سمجھوتہ اصولوں پہ کیا۔

کیا یہ سب کچھ مان لیا جائے؟ اور کیوں نہ مان لیا جائے؟...... امید ہے گوہر صاحب میرا نکتہ سمجھ گئے ہوں گے۔

(ماہنامہ نقیبِ ختم نبوت ملتان، جنوری ۱۹۹۴ء)

چودھری افضل حقؒ کی ''زندگی''

''زندگی'' ایک انوکھی کہانی ہے۔ دلچسپ اور مربوط۔ لچکیلی ڈالیوں جیسی جھومتی لہراتی نثر میں لکھی گئی کہانی۔ الہڑ تشبیہوں اور البیلے استعاروں کے سات پردوں میں چھپی ایک کتھا___ جو منظر در منظر طلوع ہوتی ہے۔ یوں جیسے کوئی کنیّا، کوئی روپ وتی اپنا گھونگھٹ اُٹھاتی ہے...... دھیرے دھیرے...... تو اس کی سندرتا کی روشنی ہر طرف پھیلتی ہی چلی جاتی ہے۔ ''زندگی'' کے مصنف کے قلم میں کچھ ایسی ظالم پھبن تھی کہ یہ روپ وتی اُسے دل دے بیٹھی۔ افضل حق کا قلم ایک مہان لیکھک کا قلم تھا۔ انھوں نے حکایت وافسانہ اور قصہ وداستان کے سارے رنگ اور سارے طلسم اس کتھا کنیّا کی جھولی میں ڈال دیے۔ تب ایک ایسی کہانی وجود میں آئی، جس نے اردو ادب میں ہمیشہ کی زندگی پائی۔

جناب اسلم انصاری نے اسی ''زندگی'' کی کہانی لکھی ہے۔ کہانی کی کہانی۔ داستان کی داستان۔ اردو فکشن کے کلاسیکی سرمائے کی تفہیمِ نو اور تحسینِ نو، آج کی زبان میں اور آج کے عہد میں کیونکر ممکن ہے؟ جناب اسلم انصاری کی یہ کتاب، اسی سوال کا ایک جواب اور اسی طلب کی ایک تکمیل ہے۔ انصاری صاحب کی یہ تحریر بھی، ہمیشہ کی طرح نہایت عالمانہ، نہایت استادانہ اور نہایت پُرلطف ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ ان کی گفتگو سے مہنتائی کی بوتک نہیں آتی۔ ہمارے عہد کے ادبی مہنت، لکھتوں کی ایسی جانچ پرکھ پر قادر ہی کب ہوئے؟ ایسے نقادوں اور محققوں کے دور میں، کہ جو جانچتے کم اور ہانکتے زیادہ ہیں، جناب اسلم انصاری کا وجود بلاشبہ مغتنمات میں سے ہے۔

یہ تحریر دراصل جناب ڈاکٹر اسلم انصاری کی کتاب چودھری افضل حق اور اُن کی تصنیف زندگی سوانح اور فکری وفنی مطالعہ کے فلیپ کے لیے لکھی تھی لیکن بوجوہ شائع نہ ہوسکی۔

فکاہاتِ جلیس - ایک مطالعہ

بہت دن ہوتے ہیں کہ جب یہ نکتہ ایک مردِ دانا نے ہمیں سمجھایا تھا کہ کالم جس صنفِ سخن کا نام ہے، تمہید باندھ کر لکھنے سے اُس کی جنس تبدیل ہوجاتی ہے۔ حتیٰ کہ نوع تک کے بدل جانے کا احتمال پیدا ہوجاتا ہے۔ آج کی اخباری اور جریدی دنیا میں کالم کے نام سے جو کچھ چھپ رہا ہے، اُسے دیکھ کر اِس نکتے پر ہمارا یقین مضبوط سے مضبوط تر ہوتا رہتا ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ مثالوں سے چیزیں آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہیں۔ لیکن مثالیں ''سلبی'' اور ''ایجابی'' دونوں ہی طرح کی ہوتی ہیں۔ کالم نگاری کی ایک اچھی مثال حال ہی میں ہمارے مطالعے میں آئی ہے اور وہ ہیں مرحوم ابراہیم جلیس کے کالم۔ اگر کالم کو ادب اور صحافت کا نقطۂ اتصال مان لیا جائے تو جلیس کے یہ کالم اپنی معنوی قدر و قیمت اور ادبی حیثیت ثابت کرنے میں بہمہ وجوہ کامیاب ہیں۔ اِن کالموں کا اسلوب شگفتہ، مزاحیہ اور فکاہیہ ہے جب کہ اِن کی زبان عوامی ہے، آسان ہے اور بے تکلف ہے۔

بات یہ ہے کہ یہ جو آج کی اردو صحافت میں بہت رونق اور بہت چہل پہل بلکہ صحیح تر لفظوں میں بہت زیادہ رنگ و روغن دیکھا جارہا ہے، اُس کے مہیا کرنے میں کتنے ہی ادوار وعہود اور کتنی ہی مساعی وجہود کا پس منظری کردار رہا ہے۔ زبان، ادب، سماج اور سیاست کی راہوں سے امکانات اور تغیرات کے کتنے ہی قافلے چلے جنھوں نے صحافت کے کوچے کو آباد کیا۔ کبھی یہ ایک مشن تھی، آج ایک صنعت ہے۔ کبھی یہ بہت سادہ تھی، آج بہت رنگین ہے۔ رنگین ہی نہیں، پُرکار بھی ہے۔ پاکستان بنا تو لاہور ایک بنا بنایا صحافتی مرکز تھا۔ پھر کراچی نے آنکھیں کھولیں۔ اس ''عروس البحر'' کے خبری ونشری پر پرزے دنوں ہی میں نکل آئے۔ رنگ جم گیا، سماں بندھ گیا، میدان سج گیا اور پھکیت میدان میں اُتر گئے۔ تاریخ نے ورق پلٹ دیا۔ اور پھر وہ سب لوگ نجانے کہاں کہاں سے آتے چلے گئے جنھوں نے ایک نئے عہد کی راہ میں بچھی آنکھوں، صحافت کی آنکھوں میں امید اور امنگ، شوخی اور شرارت، زندگی اور حرارت بھر دی۔ انھی بہت سے لوگوں میں ایک نام جلیس کا بھی ہے۔

ابراہیم جلیس کے فکاہیہ کالموں کے مجموعے فکاہاتِ جلیس میں اِسی زندگی اور اسی حرارت کے عکس ہیں جو جابجا اُبھرتے ہیں، سائے ہیں جو جھومتے اور لہراتے ہیں، اور رنگ ہیں جو بکھرتے ہی چلے جاتے ہیں۔ جلیس کی زندگی اور ملک کی تاریخ کے پچیس سال، ہنگامہ خیز اور بحرانی - یوں کہیے ''فوجداری'' اور ''دیوانی'' - اِن کالموں میں محفوظ ہیں۔ کچھ لوگ چیزوں کو محفوظ کرنے کے لیے حنوط کردیتے ہیں لیکن جلیس کے ہاں ایک اور ہی فن بروئے کار لایا جاتا ہے۔ اظہار کا بے ساختہ پن، جو تحریروں کو مرنے نہیں دیتا۔ ایک اقتباس دیکھیے کہ......

> ہمارے زمانے میں ایسی فلمیں بہت بنتی تھیں جس میں ہیرو ایک نقاب پوش نوجوان ہوا کرتا تھا جو نیک دل بادشاہ کی خوبصورت شہزادی کو بار بار باغی اور بدطینت دیو یا جن کے چنگل سے بچایا کرتا تھا، اور ایسے موقع پر شہزادی یا بادشاہ پوچھا کرتے ''اے بہادر محسن! اپنا نقاب ہٹا کر بتاؤ کہ تم کون ہو؟'' تو ہیرو کہتا تھا ''وقت آنے

پر سب کچھ بتا دیا جائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑکی سے پھلانگ، گھوڑے پر سوار، شوں سے غائب۔ مگر سینما ہال میں پبلک چیخ چیخ کر بتاتی تھی ''شہزادی! ہم نے پہچان لیا کہ وہ دلیپ کمار تھا مگر تو نہیں پہچان سکی۔ دُر فٹے منہ تیرا'' وقت کے بارے میں پرانی فلموں کا یہ تھیم ڈائیلاگ ہمیں آج کل بار بار اِس لیے یاد آ رہا ہے کہ اِن دنوں نئے شیرِ پنجاب جناب ......، جب بھی جلسہَ عام نما پریس کانفرنس کرتے ہیں تو اُن کا تھیم ڈائیلاگ بھی ہوتا ہے ''وقت آنے پر میں بھی موجودہ حکومت کے سارے راز فاش کر دوں گا۔ (ص ۱۸۷)

جلیس کے اِن کالموں کے لکھے جانے کا عرصہ ۱۹۵۲ء سے ۱۹۷۷ء تک کا ہے۔ دسیوں روزناموں اور ہفت روزوں کی کوچہ گردی پر مشتمل اِس کٹھن صحافتی زندگی کا حاصل یہ کالم ہیں جنھیں جواں سال اور جواں ہمت محقق ڈاکٹر امتیاز بلوچ نے اخباری اور جریدی فائلوں کے قبرستانوں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر یکجا کیا، مرتب کیا اور پھر اِن میں ''کتابی روح'' پھونک دی۔ فراموش گاری کی گرد صاف ہوتے ہی بے شمار تخلیقی جملے، تمثیلیں، طنز پارے، اور مزاح نامے اپنی اصل جون میں واپس آ گئے۔

جلیس بنیادی طور پر افسانہ نگار تھے۔ اُن کا یہی پس منظر اور تربیت و ریاضت اُنھیں گرد و پیش کے مناظر و مظاہر اور حالات و واقعات کو تمثیلی اور علامتی پیرائے میں پیش کرنے کی ایک خاص مہارت فراہم کرتی ہے۔ اِس مہارت کے ثبوت کے طور پر شاید اُن کا ہر دوسرا کالم پیش کیا جا سکتا ہے۔ اِس سلسلے کی غیر معمولی مثال وہ نو (۹) کالم ہیں جو اُنھوں نے یکے بعد دیگرے- یعنی تابڑ توڑ- ۱۹۷۶ء کے اوائل میں لکھے۔ اُس وقت کی سیاسی صورتِ حال کو Allegorize کرنے کے لیے جلیس نے جنگلی اور حیوانی ''امیجری'' کا اِن کالموں میں خوب خوب استعمال کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں ......

صبح نو بجے سے چھانگا کے جنگل میں جانوروں کے اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل کی جلسہ گاہ کھچا کھچ بھر گئی تھی۔ جانوروں میں بڑا جوش و خروش تھا۔ دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ایسا ہو جہاں سے مندوبین اِس کونسل میں نہ پہنچے ہوں۔ جلسہ گاہ کے ڈائس پر مشہور مصور پکاسو کے پالتو بندر موسیو سیپانزی کا بنایا ہوا انسان کا ایک ایسا سکیچ تھا کہ اُس سے سانپ بچھو چمٹے تھے۔ گھوڑے گدھے اُس پر دولتیاں چلا رہے تھے اور شیر ببر، چیتے اور تیندوے ہر چہار سمت سے اُس پر جست لگا رہے تھے۔ اور چیل، کوّے اور گدھ اُس کے سر پر باری باری ٹھونگیں لگا رہے تھے۔ اور تو اور کتا جو انسان کا وفادار ازلی غلام تھا، وہ بھی ایک دم فرنٹ، اُس پر بھونک رہا تھا۔

مزے کی بات تو یہ تھی کہ جلسہ گاہ میں مہمانوں اور مبصرین کے لیے ایک الگ انکلوژر بھی تھا جس میں آدم کی ناخلف اولاد یعنی اسمگلر، چور بازار تاجر، ناجائز منافع خور دکان دار، ہر دوسرے تیسرے مہینے کرایہ بڑھانے والے اور بار بار اڈوانس پگڑی طلب کرنے والے لالچی بے مروت مالکانِ مکان، مسافروں کو کم سے کم آرام اور اُن سے زیادہ سے زیادہ کرایہ بٹورنے والے مالکانِ بس و منی بس اور ٹیکسی و رکشہ ڈرائیور، رشوت خور ملازمینِ سرکار، دودھ میں پانی ملانے والے گوالے، گوشت میں چھیچھڑے ملانے والے قصائی، گھی میں موبل آئل ملانے والے گھی فروش، آٹا چینی چاول میں برادہ ملانے والے راشن مرچنٹ، ماں بہن بیوی اور بیٹی کی آبرو بیچنے والے بے غیرت دلّال، قوم و ملک بیچنے والے عوام دشمن، سامراج کے پٹھو ڈکٹیٹر ڈٹے بیٹھے تھے۔ اِن میں صاف طور پر پہچانے جانے والوں میں کمبوڈیا کے مارشل لون نول، جنوبی ویت نام کے جنرل تھیو اور

مارشل کاؤ، جنوبی افریقہ کی گوری اقلیت کے انسان دشمن وزیرِاعظم اسمتھ اور اسرائیل کے انسان نما درندے وزیرِاعظم مسٹر رابن نمایاں تھے۔ (ص۲۲۳)

سب سے زیادہ دلچسپ مسئلہ یہ تھا کہ شیر اور بکری ایک ساتھ، ایک ہی صوفے پر بیٹھے تھے۔ اِس عجیب و غریب منظر کو دیکھ کر ایک اخبار نویس نے بڑی حیرت سے دوسرے سے کہا ''پُر امن بقائے باہمی کا اِس سے بہتر ثبوت اور کیا مل سکتا ہے کہ ایک بکری ایک شیر کے ساتھ یوں بے خوف و خطر بڑے اطمینان سے شانہ بشانہ بیٹھی ہے۔'' تو دوسرے اخبار نویس نے بڑی بے نیازی سے جواب دیا ''ارے یہ کوئی نیا نظارہ نہیں ہے۔ ایسا تو میں نے نیو کراچی کے زوالوجیکل گارڈن بلکہ اہلِ کراچی کی عام سیرگاہ ''گاندھی گارڈن'' میں بھی دیکھا ہے۔ وہاں بھی ایک شیر کے پنجرے میں ایک بکری مدتوں سے رہتی ہے اور ابھی زندہ سلامت ہے۔'' اخبار نویس کی یہ گفتگو سن کر شیر کے ساتھ بیٹھی ہوئی بکری کو بڑا غصہ آیا اور اُس نے دونوں فوٹو گرافروں کو ڈانٹا ''اے بے خبر اخبار والو! میں تمھیں گاندھی گارڈن میں شیر اور بکری کے نام نہاد پُر امن بقائے باہمی کا راز بتاتی ہوں کیونکہ میرے خاندان کی کئی بکریاں اِس نام نہاد پُر امن بقائے باہمی کی جھوٹی نمائش کے لیے اِس شیر کے پنجرے میں موت کے گھاٹ اتر چکی ہیں۔ تمھاری یہ اطلاع غلط ہے کہ اُس شیر کے پنجرے میں ایک بکری مدتوں سے رہتی ہے اور ابھی تک زندہ سلامت ہے۔ راز کی بات تو یہ ہے کہ دنیا والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے اُس پنجرے میں روز علی الصبح ایک نئی بکری باندھی جاتی ہے۔ (ص۲۲۶)

فکاہاتِ جلیس میں ڈاکٹر امتیاز بلوچ نے کوئی دوسو (۲۰۰) کے لگ بھگ کالم یکجا کیے ہیں۔ اِسے ہم جلیس کے کالموں کا ایک نمائندہ انتخاب قرار دے سکتے ہیں۔ پیروڈیاں، لطیفے، تضمینیں، پنجابی لوک گیتوں کے چست و برجستہ مصرعے، بعض نادر روزمرے اور محاورے۔ کتنی ہی سوغاتیں ہیں، جنھیں اِس انتخاب نے آج کے قاری کی حدِ رسائی میں لا کھڑا کیا ہے۔ اِس موقع پر فاضل مرتب و مدون کے انتخاب و ترتیب کے ذوق اور محنت کی داد نہ دینا ناانصافی ہے۔ خصوصاً اُس طول طویل مقدمے کے لیے بھی جنابِ مرتب لائقِ داد ہیں کہ جسے اِس کتاب کی کلید کہنا چاہیے۔ یہ جلیس کی شخصیت، فن اور زندگی کا ایک طویل مختصر جائزہ ہے۔ جلیس کے بعض نقادوں کا احساس ہے کہ اُن کی کالم نگاری کے آخری دور (۱۹۷۷ء-۱۹۶۷ء) میں، اُن کے اسلوب میں کچھ ایسی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں جنھوں نے اُن کے فن کو نقصان پہنچایا۔ ڈاکٹر امتیاز بلوچ نے اپنے مقدمے میں نقادوں کی اِس رائے سے اختلاف ضرور کیا ہے لیکن کسی بھی تفصیل یا تجزیے سے گریز کرتے ہوئے۔ ہمارے خیال میں جلیس کے اسلوب کے بارے میں اِس رائے میں خاصا وزن ہے۔ کتاب کے مندرجات اِس کی تائید کرتے ہیں۔ اپنی کالم نگاری کے آخری دور میں جلیس ایک ''کامریڈ'' نظر آتے ہیں، جس کے گردوپیش کی دنیا میں صرف دو طرح کے انسان بستے ہیں: بورژوا اور پرولتاری۔ بورژوا کے لیے اُن کا طنز براہِ راست اور تلخ ہو جاتا ہے۔ اِس میں تمسخر، تضحیک اور اِستہزا کے رنگ بھی جھلکنے لگتے ہیں۔ اُن کے اندر کا ''صحافی'' حقائق و مظاہر کے کسی گہرے تجزیے کا متحمل ہی نہیں ہے بلکہ وہ ''تازہ'' خبروں پر تبصرے سے کالم بناتا چلا جاتا ہے۔ اِس ''تبصرے'' میں فوری ردِ عمل، جذباتی ابال، غم و غصہ، بے بسی کا احساس۔ سبھی کچھ شامل ہے۔ ایسے میں مزاح کی شگفتگی ناپید اور طنز کی بے ساختگی مجروح ہوتی ہے، اور بار بار ہوتی ہے۔ البتہ یہ صورتِ حال بعض

دلچسپ داخلی تضادات کے نمایاں ہونے کا سبب بھی بنتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ ''رجعت پسندوں'' کے بارے میں اپنے رویّے کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> وہ مجھے یا میرے رسالے کو برا سمجھا کریں، میں اُن کو برا نہیں سمجھتا۔ یہ لوگ بااَخلاق ہوتے ہیں۔ اِن کی سب سے اچھی خصوصیت یہ ہے کہ اِنھیں خریدا نہیں جاسکتا۔ مگر سیاست میں وہ نہ صرف رجعت پسند ہیں بلکہ اِن کا رول آمرانہ یا ہٹلرانہ ہے۔ اِن سے میرا بس اِتنا ہی اختلاف ہے کہ وہ جمہوریت کی بجائے آمریّت کے پرستار ہیں۔ (ص ۳۶۱)

> اِس موقع پر جلیس اپنے ایک قاری کا یہ اعتراض بھی نقل کرتے ہیں کہ ''ترقی پسند دوست آپ سے ناراض ہیں کہ آپ ایک آمرانہ حکومت کی حمایت کرتے ہیں اور بِک چکے ہیں'' اور جواباً لکھتے ہیں..... ''آپ نے جن ترقی پسند ساتھیوں کا نام لکھا ہے اُن کا کام صرف دوسروں پر اعتراض کرنا ہے۔ میں تو چلیے عوام کے ووٹوں سے منتخب پاکستان کی پہلی عوامی حکومت کے ہاتھوں بکا ہوا ہوں، یہ لوگ تو چھوٹے چھوٹے سرمایہ داروں، بنیوں، بقالوں کے ہاتھوں بِکے ہوئے ہیں۔ اِن پر لعنت بھیجیے۔ (ص ۳۶۲)

یہی وہ دوٹوک پنا (bluntness) ہے، جس سے اُن کے ضمیر، اُن کے شفاف تخلیقی باطن، اُن کی سچی فن کارانہ کمٹ منٹ کا سراغ ملتا ہے۔ بقول یگانہ ''چتونوں سے ملتا ہے کچھ سراغ باطن کا''! اگر انگریزی محاورے کا سہارا لیا جائے تو کہا جاسکتا ہے کہ dictates of conscience پر dictates of comrade کے غالب آجانے سے جلیس کے ہاں تخلیقی سطح پر وہ سب مسائل پیدا ہوئے جن کا اِدراک تو شاید اُنھیں خود بھی تھا، مگر تدارک یقیناً اُن کے بس میں نہیں تھا۔

کعبے کا امام

امام مکے سے آیا تھا اور نماز ملتان میں پڑھی جا رہی تھی، ہر طرف سر ہی سر تھے اور ہر جگہ صفیں ہی صفیں۔ مدرسے کی وسیع مسجد اور اس سے ملحق سبزہ زار بھی، کھلا میدان بھی اور روشیں بھی ...... حتیٰ کہ مدرسے سے باہر کی سڑکیں بھی، صف بستہ نمازیوں سے پُر تھیں۔ امام صاحب نے اس دن مغرب کی پہلی دو رکعتوں میں، قدرے طویل تلاوت کی تھی لیکن مغرب کی نماز کو آخر کتنا طویل ہونا تھا؟ نماز ختم ہوگئی۔ ایک کیفیت ختم ہوگئی۔ یوں لگا کہ سماعت کو ایک سرور اور دل کو ایک دھڑکن بس چند منٹ کے لیے ودیعت ہوئی اور پھر کھوگئی۔

آج اخبار میں خبر پڑھی کہ شیخ علی جابر، اللہ کو پیارے ہوگئے تو زبان سے بے اختیار نکلا ''انا للہ وانا الیہ راجعون''۔ ذہن میں یکا یک ایک تصویر سی چمک اٹھی۔ ۱۷ سال پہلے کی وہ نماز ہمیں بہت یاد آئی جو شیخ علی عبداللہ بن علی جابر کی اقتداء میں خیر المدارس ملتان میں ۱۹۸۸ء میں ادا کی گئی تھی۔ تب وہ امام کعبہ تھے۔

حرم مکہ کے موجودہ ائمہ میں سے شیخ عبدالرحمٰن السدیس اور شیخ سعود الشریم اپنے اپنے منفرد لہجوں سے گویا گوشِ سماعت اور گوشِ دل کے فاصلے مٹا دیتے ہیں۔ لیکن اس سال رمضان میں شیخ صلاح البدَیر اور شیخ عبداللہ عواد الجہنی، مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ بلائے گئے۔ تراویح اور قیام کے لیے۔ مدینہ والوں کو ان کا بلایا جانا اچھا تو نہیں لگا لیکن حرم مکہ کے نمازیوں کے لیے رمضان کی یہ راتیں پہلے سے کہیں بڑھ کر یادگار اور پُر کیف رہیں۔ آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی، سسکیوں میں دبی ہوئی اور تاثیر سے بھری ہوئی۔ صلاح البدیر، قدم قدم پر رو دیتے ہیں، بالکل یوں جیسے بچہ بے تابانہ بلکتا ہے۔ اور عبداللہ الجہنی، جوان بلکہ نوجوان، پڑھتے نہیں بہتے ہیں۔ ایسا بہاؤ جس میں عجز، مسکنت، حلاوت، سکینت اور نجانے کیا کچھ سننے والوں کو بہائے لیے جاتا ہے۔

شیخ علی جابر کی وفات کا سنا تو دل میں وہ جو ایک امید سی تھی کہ شاید کبھی ان کی اقتداء میں نماز پڑھنا ایک بار پھر نصیب ہو، وہ امید دم توڑ گئی۔ ادھر ملتان میں تھا تو حبیب گرامی، مولانا حبیب الرحمٰن ہاشمی حفظہ اللہ کی تلاوت میں شیخ علی جابر کی طرزِ ادا کا عکس سا دیکھا کرتا تھا۔ تجوید میں نے سیکھی نہ پڑھی، لیکن یونہی ایک دلچسپی سی پیدا ہوگئی۔ نتیجہ یہ کہ اپنی محرومی کا احساس بھی پیدا ہوا۔ اور یہ احساس گردو پیش پر نظر کرتے اور شدید......اور گہرا ہوجاتا ہے۔ قرآن کا پڑھنا، ترتیل کے ساتھ پڑھنا، لحونِ عرب میں پڑھنا اور حضورِ قلب سے پڑھنا......افسوس ان میں سے ایک ایک لغت پر زوال آرہا ہے، اور ہم اپنے زوال کی نشانیاں نجانے کہاں ڈھونڈ رہے ہیں؟

ایک لطیفے کی بات یاد آگئی۔ کچھ روز ہوئے ایک دوست کے یہاں بیٹھا تھا۔ ٹی وی پر کوئی ہندوستانی چینل چل رہا تھا۔ ایک پروگرام پیش کیا گیا......''استاد بسم اللہ خان'' پر۔ استاد، اس وقت ہندوستان کے سب سے بڑے شہنائی نواز ہیں۔

بہت بوڑھے، چہرے پر جھریاں، وجود اکہرے سے بھی کچھ کم۔ لیکن آنکھوں میں چمک، بدن میں چستی اور سانس پر تو ایسا قابو کہ دیکھنے والے کا سانس، جسے دیکھ کر ہی رک جائے۔ استاد نے بہت سی باتیں کیں۔ فن موسیقی پر۔ اس کی مشرقی اور کلاسیکی روایت پر۔ لیکن ان کا سب سے زیادہ زور اس بات پر تھا کہ سچا سُر، سچے من سے پھوٹتا ہے۔ ریاضت اپنی جگہ، لگن اپنی جگہ لیکن...... دل ونظر جو ''مسلماں'' نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ پھر استاد نے ''سارے گاماپا......'' کو الٹ پلٹ کر عجیب پرسوز انداز میں دو چار بار گایا۔ اچانک بولے، اب سنیے۔ کیا؟ ارے...... استاد نے کہا ''اللہ جل جلالہٗ''۔ کہا نہیں...... گایا۔ جم کر اور ڈوب کر۔ ایک بار، دوبار، تین بار۔ اور واقعہ یہ ہے کہ استاد کی آواز سننے والے کے پورے وجود میں سرایت کر رہی تھی۔ مجھے اس وقت ماموں سید عطاء المحسن بخاری رحمتہ اللہ علیہ بہت یاد آئے۔ فرمایا کرتے تھے کہ یہ سانس روکنے اور کھینچنے کی کیفیات میں اللہ کا ذکر، ہمارے تصوف میں ہندوؤں کے یہاں سے آیا ہے۔ بول، بندش، راگ، راگنی، سُر، تال، خیال ...... غرض موسیقی کو کتنی ہی جہتوں سے ''مسلمان'' بنانے کی کوششوں میں ہم نے سلوک وتصوف کو ''موسیقیا'' دیا۔ ایک اہم حوالہ، اس ضمن میں، وہ قاری محمد طاہر قاسمی رحمتہ اللہ علیہ (قاری محمد طیب صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے بھائی) کی کسی کتاب سے ہمیشہ دہرایا کرتے تھے۔ مجھے وہ حوالہ مستحضر نہیں، البتہ کتاب کا دیکھنا خوب یاد ہے۔

عام ائمہ مساجد کا کیا کہنا، ہمارے ہاں اچھے اچھے فارغ التحصیل مولوی صاحبان کو، اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرماویں، نہیں معلوم کہ تلاوتِ قرآن کی ''لذت'' کیا ہوتی ہے۔ وہ کونسا نور ہے جو کانوں کے راستے سے دل میں، اور دل سے پورے وجود انسانی میں سرایت کرتا ہے۔ گستاخی معاف! بڑے بڑے دھواں دار بلکہ دھاری دار خطیب، مقرر اور واعظ ہمارے یہاں قرآن کو مجہول پڑھتے ہیں۔ اور بدآوازی؟ سننے والوں کے لیے یہ ایک ''دردناک عذاب'' ہے جو مستزاد ہے۔ وعظ فروشوں اور خطابتی سوداگروں میں البتہ کچھ ایسے بدنفس بھی ہوتے ہیں جو باقاعدہ راگوں راگنیوں میں تلاوتِ قرآن کرتے ہیں۔ ۱۹۹۶ء میں، میری ملازمت لیہ میں تھی۔ وہاں ایک صاحب ہمارے ساتھ ہی ملازم تھے۔ تعارف بڑھا تو معلوم ہوا کہ آپ کلاسیکی موسیقی سے خصوصی علاقہ رکھتے ہیں۔ ایک رافضی مولوی نے ان سے باقاعدہ راگ سیکھے اور پھر راگ میں تلاوت کی مشق کی۔ پھر موصوف نے ''مجلس خوانی'' میں ''تلاوت'' سے رُلا دینے کی شہرت پائی اور ''حافظ صاحب'' کہلائے۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ''آداب تلاوت تو بہت ہیں مگر میں ایک ہی ادب بیان کرتا ہوں جس میں سب آجائیں۔ یوں خیال کرے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ تم پڑھو، ہم سنتے ہیں۔ تب یقیناً سنوار کر پڑھے گا''۔ جس چیز کو حضرت نے سنوار کر پڑھنا فرمایا، اس میں سرزمین مصر کا اپنا ایک امتیاز ہے۔ سال بھر ہوا۔ ایک روز شام (Syria) کے ایک قاری صاحب کو، شام ہی کے ٹی وی سے تجوید کا پروگرام پیش فرماتے دیکھا۔ انھوں نے تجوید کے بعض قواعد وقوانین اور کلیات وضوابط کی وضاحت بھی کچھ فرمائی، (یہ ایک سلسلہ وار پروگرام تھا) لیکن ایک بات کو خصوصاً واضح فرمایا، اور یہ وہی بات تھی جس کی طرف ہمارے یہاں توجہ کم ہے۔ یعنی ...... طرزِ ادا۔ انھوں نے اس کے لیے ''نغم'' (ن غ م) کا لفظ استعمال فرمایا، جس کی جمع انغام اور اناغیم آتی ہے۔ جس خوبی سے اور عملی مشق سے انھوں نے مصر کے اکابر اور مشائخ قراء کے لہجوں کی اور لحون کی وضاحت فرمائی، وہ دیدنی بھی تھی اور شنیدنی بھی۔ عبدالباسط، محمد صدیق المنشاوی، مصطفیٰ اسماعیل اور ان سے بھی پہلے محمد رفعت اور عبدالفتاح شعشاعی وغیرہم (رحمتہ اللہ علیہم اجمعین) کی تلاوتیں سن کر دل پر جو چوٹ پڑتی ہے، اُس کے کئی بھید اس روز کھلے۔ فن کے اسرار اور نزاکتیں کھلیں۔ افسوس ان قاری صاحب، جو خاصے بزرگ لیکن بہت

پردم تھے، کا نام بھول گیا۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ تجوید ہرگز ہرگز میرا میدان نہیں۔لحن خفی، لحن جلی، یا......اظہار، اخفاء، تفخیم، ترقیق وغیرہ کی مجھے ہوا بھی نہیں لگی۔ ہاں البتہ کچھ ایسی آوازیں تلاوت کی، ضرور ان کانوں نے براہِ راست سنی ہیں کہ اب ان سے بہتر آوازیں شاید ہی سننے کو ملیں۔مثلاً قاری عبدالوہاب العوفی المکی رحمۃ اللہ علیہ جو ماموں سید عطاء المحسن بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور سید عطاء المہیمن بخاری مدظلہ کے استاد تھے اور امام القراء حضرت قاری عبدالمالک رحمۃ اللہ علیہ کے سلسلے کے نمائندہ بزرگ تھے۔ ماموں عطاء المحسن بخاری علیہ الرحمۃ، خود قاری عبدالمالک رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔ وہ بتلایا کرتے تھے کہ قاری صاحب مجھے فرماتے ''آواز کو پھینکنا سیکھو، جیسے تمھارے ابا پھینکتے تھے''۔اور پھر جنھوں نے سید عطاء المحسن بخاری علیہ الرحمۃ کو سنا ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ آواز کا یہ ''پھینکنا'' قدرت کا ان پر ایسا انعام تھا، جس میں وہ لاکھوں نہیں، کروڑوں میں ممتاز تھے۔آواز میں رس، رچاؤ، بلندی، کرارا پن، طاقت اور دم......یہی ان کی طرزِ ادا اور ان کا ''نغم'' تھا۔ ان کے معاصرین کا کہنا تھا کہ یہ خاص قاری عبدالمالک صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا رنگ تھا۔ نانا ابا (امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری علیہ الرحمۃ) کو میں نے سنا نہیں۔ لیکن اتنا تو معلوم ہی ہے کہ ان کے استاد شیخ عمر عاصم رحمۃ اللہ علیہ، عرب تھے۔خود قاری عبدالمالک صاحبؒ، جو بلاشبہ اپنے عہد کے امام القراء تھے، فن کی یہ سوغات لینے لکھنؤ سے مدرسہ صدیقیہ مکہ مکرمہ پہنچے اور فائز المرام لوٹے۔ ان کے بھائی حضرت قاری عبدالخالق صاحبؒ بھی ہمراہ تھے۔ ادھر حضرت قاری رحیم بخش پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی تینوں ماموؤں کو (سیدنا الامام ابوذر بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو چھوڑ کر) خیر المدارس میں شرفِ تلمذ ملا۔ یہ ایک دوسرا سلسلۃ الذہب تھا۔جس کی طرز ادا قاری محی الاسلام عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اور قاری فتح محمد پانی پتی (مہاجر مکی) رحمۃ اللہ علیہ سے ہوتی ہوئی حضرت قاری رحیم بخش صاحب رحمہ اللہ تک پہنچی تھی۔

میں نے سوچا تھا کہ شیخ علی جابر رحمہ اللہ کی وفات پر ایک شذرہ لکھ کر ''نقیبِ ختم نبوت'' کے لیے بھجوا دوں۔لیکن یہ تحریر پھیلتی چلی گئی۔اس کا مزید پھیلاؤ روکنے کی تدبیر نہ کی تو ڈر ہے کہ یہ ایک سرو پا قسم کا ''مقالہ'' بن جائے گا۔ جبکہ ایسے مقالے لکھنے کے لیے پی ایچ ڈی یا ایم فل وغیرہ کا عنوان آج کل ضروری سمجھا جاتا ہے۔ باتیں تو بہت سی ہیں، لیکن اس تحریر کو چند سطروں میں سمیٹتا ہوں۔

شیخ علی جابر مرحوم کا پڑھنا، سید عطاء المحسن بخاری رحمہ اللہ کو پسند تھا۔انھیں شاید علم نہ ہو سکا کہ شیخ، انہی کے سلسلے میں نسبت تلمذ رکھتے تھے۔ یہ بات یہاں آ کر معلوم ہوئی کہ مدینہ طیبہ میں مقیم قاری محمد خلیل صاحب حفظہ اللہ (جو اب سعودی ہیں) شیخ علی جابر کے استاد ہیں۔ جبکہ قاری صاحب، قاری محمد شریف صاحب رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں۔اور وہ شاگرد تھے قاری عبدالمالک کے۔

علی جابر ۵۳ سال کی عمر میں ۱۴/ دسمبر (۲۰۰۵ء) کو چل بسے۔ وہ مدینہ یونیورسٹی اور جدہ کی ملک عبدالعزیز یونیورسٹی میں استاد رہے۔ شاہ خالد مرحوم کے امام خاص رہے۔ اب ایک طویل عرصے سے بیمار تھے۔ آخر، یہ بیماری دائمی صحت اور جاودانی زندگی کے نئے سفر میں، مرحوم کا ساتھ چھوڑ گئی۔ سفر زیست کی کہانی کا ایک باب مکمل ہوا اور نیا باب نئے ورق سے شروع ہو گیا۔ ایک چھوٹا سا ورق اُدھر پاکستان میں، میرے ''گورستانِ کتب'' میں بھی ضرور کہیں دبا ہوا پڑا ہے، جس پر شیخ علی جابر کے دستخط ثبت ہیں۔بس ایک یاد۔ آٹوگراف کا بس ایک صفحہ۔ اور کچھ بھی نہیں۔

طاہر جمیل: ابھی کل کی بات ہے

جدہ کے معروف ''پاکستانی محلے'' العزیزیہ میں شارع امیر ماجد نامی پُر شور اور مصروف سڑک کے کنارے ایک پاکستانی مطعم ہے۔ مطعم کے پچھواڑے میں ایک کھلا لان ہے۔ لان میں کرسیاں رکھی رہتی ہیں۔ کبھی دو چار، کبھی دس بیس۔ میز، البتہ اکا دکا ہی ہوتے ہیں۔ یہ ایک روکھا پھیکا سا منظر ہے۔ معمولی سا، عام سا۔ لیکن دیکھتے ہی دیکھتے یہی منظر، بہت غیر معمولی اور بہت خاص ہو جاتا ہے۔ جب شام ڈھلنے لگتی ہے۔ جب محفل سجنے لگتی ہے۔ جب سادھو دھونی رماتا ہے۔ جب گیانی بانی پڑھتا ہے۔ جب جوگی اشلوک سناتا ہے۔ تب لان کا وہ گوشہ یکا یک کسی فقیر کی کٹیا، کسی درویش کا حجرہ اور کسی صوفی کی خانقاہ بن جاتا ہے۔ بات سے بات نکلتی ہے، چراغ سے چراغ جلتا ہے اور پھر روشنی پھیلتی ہی چلی جاتی ہے۔ چکا چوند۔ یوں جیسے تارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہوں۔ موج در موج قہقہے اور شاخ در شاخ چہچہے۔ یہ طاہر جمیل کی محفل تھی۔

کوئی ۱۰ سال پہلے بخت واتفاق نے طاہر جمیل کو جدہ کی جھولی میں لا کے ڈال دیا تھا۔ سعودی عرب میں راقم السطور کی آمد ۲۰۰۲ء میں ہوئی۔ پہلے ۶ سال اُملج (منطقہ تبوک) میں قیام رہا اور بعد میں مکہ مکرمہ چلا آیا۔ طاہر جمیل سے بہت آغاز ہی میں راہ ورسم ہوگئی۔ ان کی کشش مجھے جدہ کی جانب ہمیشہ کھینچتی رہی۔ ایک میں ہی کیا، نجانے کہاں کہاں سے ان کے چاہنے والے چلے آتے تھے۔ خمیس مشیط سے، دمام سے، ریاض سے، مدینہ منورہ سے۔ ''تمھارے نام پہ آئیں گے غم گسار چلے''۔ جدہ کے احباب کچھ تو روزانہ کے ملنے والے تھے، کچھ انھیں دو چار دنوں بعد اور کچھ دو چار ہفتوں بعد سہی، ملتے ضرور تھے۔ ایک بات طے تھی جو ایک بار ان کی محفل میں آیا ہے، وہ ایک بار پھر آئے گا، باردگر۔ اسی ''باردگر'' میں ''ہزار بابرو، صد ہزار بار بیا'' (ہزاروں بار جائیے اور لاکھوں بار آئیے) اور ''بسلامت روی و باز آئی'' (خیریت سے جائیے اور دوبارہ بھی آئیے) کے اَن گنت رنگ اور خوشبوئیں آنے والوں کے دامن گیر ہو جاتیں۔

کوئی تو بات ہے ساقی کے مے کدے میں ضرور
قریب و دور سے مے خوار آ کے پیتے ہیں

ایک بات نہیں، کتنی ہی باتیں ہیں۔ غضب کی سج دھج کا بانکا آدمی، خندہ رو، خندہ جبیں، دراز گیسو، تیکھے نقش، گورا گلابی رنگ، روشن اُجلا چہرہ، دھان پان وجود، خالص شاعرانہ پیکر، لیکن دل؟ دل میں قوتِ ارادی کے اور ایمان ویقین کے سمندر موجزن تھے۔ معلومات وسیع، مطالعہ ہمہ نوعی وہمہ گیر، ذہانت نہایت ظالم اور حسِ مزاح بے پناہ۔ برمحل، برموقع لطیفہ، اور وہ بھی چار چول چوکس، لطیفے انھیں بہت یاد تھے اور بہت سے وہ ''فی البدیہہ'' گھڑ لیا کرتے تھے۔ لیکن اس ہنسی، ٹھٹھے اور لاگ

لگاؤ میں دل آزاری کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔ بچوں سا معصوم، بے ضرر اور بے ریا ایک شخص جو نہایت وسیع المشرب تھا۔ ''شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق''۔ مختلف اور متضاد ذہنی ونظریاتی اور سیاسی ومسلکی وابستگیوں کے حامل لوگ، ان سے یکساں قربت محسوس کرتے تھے۔

فنی اور تخلیقی اعتبار سے وہ بہمہ وجوہ ایک بڑے شاعر تھے۔ ایک توانا اور منفرد آواز۔ کسی مجبوری یا فیشن کی خاطر انھیں فیض وفراق، ناصر وندیم یا مجید ومنیر سے بھڑانا ''میڈ ایزی'' تنقیدی رویہ ہوگا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ نہایت غیر معمولی تخلیقی اور تخئیلی امکانات کے شاعر تھے۔ اردو اور پنجابی دونوں میں۔ صاحبِ طرز اور صاحبِ اسلوب۔ جدہ کی حد تک تو وہ مسلم الثبوت استادِ سخن تھے ہی مگر حق یہ ہے کہ مضامین کی تازگی اور تنوع اور زبان کے قادرانہ استعمال واظہار کے بل بوتے پر وہ اردو اور پنجابی، ہر دو زبانوں کے معاصر شعراء میں ایک امتیازی مقام ہی کے مستحق تھے۔ اضافی خوبی یہ کہ ان کے حال اور مقال میں کوئی فرق اور فاصلہ نہیں تھا۔ جب وہ کہتے ہیں کہ:

دشمن کی بیٹی کو بیٹی کہتا ہوں
سوچوں کے انداز پرانے رکھتا ہوں
بھوکا رہ لیتا ہوں لیکن چھت پر میں
پانی کا برتن اور دانے رکھتا ہوں
مصطفوی ہے میرا دسترخوان جمیل
دیا بجھا دیتا ہوں پہلے پھر کھانے رکھتا ہوں

تو یہ طاہر جمیل کی اپنی ہی وارداتِ قلبی اور اپنی ہی روداد شب وروز ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے اور یقیناً یہی وجہ ہے کہ ان کے وجود سے ایک اور ہی طرح کی رونق تھی۔ مقبولیت اور محبوبیت تو شاید چھوٹے اور محدود مفہوم کے لفظ ہیں۔ ان کی شخصیت کے گرد اپنایت اور چاہت کے کتنے ہی پُر اسرار طلسمات ہالہ کیے ہوئے تھے۔ جدہ کے ۱۰ سالہ قیام میں، سارا ہی عرصہ وہ امراض کی پوٹ بنے رہے۔ ذیابیطس کے اثرات سے آنکھوں، پھیپھڑوں، گردوں اور دل کے گوناگوں مسائل سے بری طرح دوچار رہے، لیکن ہمیشہ جواں ہمت، بلند ارادہ، چہکتے اور ہنستے مسکراتے پائے گئے۔ ابھی کل کی بات ہے:

ہاتھوں میں دے کے ہاتھ، ابھی کل کی بات ہے
وہ چل رہے تھے ساتھ، ابھی کل کی بات ہے

(مطبوعہ ہفت روزہ اردو میگزین جدہ، ۳۱/ جولائی ۲۰۰۹ء)

چند منتشر باتیں زبان کے بارے میں

ذیل میں دیے گئے شذرات بھائی سید ذوالکفل بخاری نے مجھے ایک تقریر کے لیے لکھائے تھے۔عنوان بھی اُنھی کا دیا ہوا ہے۔ زبان اور زبان کی سماجی، ثقافتی اور علاقائی حیثیت کے بارے میں بہت سی باریک باتیں اِن چند سطروں میں ملتی ہیں۔ (حافظ صفوان محمد چوہان)

(۱) علاقائی زبانوں کے لیے ''پاکستانی زبانوں'' کا عرف رواج پا گیا ہے۔ یہی صائب ہے۔

(۲) اردو کی اصل حیثیت ''رابطے کی زبان'' (Lingua Franca) کی ہے، اور اِس سے متجاوز میں کئی خطرات ہیں۔ لیکن...... اِس کے ترک میں بھی خطرات ہیں، اور وہ سنگین تر ہیں۔

(۳) ہمارے لسانی مسائل کی تحدید اور تعیین کے لیے ضروری ہے کہ ہماری لسانی ترجیحات کی تحدید اور تعیین ہو۔ یہ کام صرف ''قومی نصاب کمیٹی'' قسم کی کسی سرکاری مجلس کے سپرد کر دینے سے نہ ہوگا۔ وزارتِ تعلیم، ہائر ایجوکیشن کمیشن، وزارتِ اطلاعات اور قومی میڈیا کے ذمہ داران کے باہمی رابطے سے اگر کوئی ایسا نظام (Mechanism) وضع ہو کہ جو لسانی سطح پر ہماری وحدت اور قربت کے عوامل کو مسلسل بروئے کار لاتا رہے تو یہ ایک کارنامہ ہوگا۔ قریب اور دور کی دوسری زبانوں کے اثرات بلا روک ٹوک ہمارے روزمرے اور محاورے سے اٹکھیلیاں کرتے ہیں، اِسے روکنا ہوگا۔ اردو کے، اور دیگر پاکستانی زبانوں کے مشترک ذخیرۂ الفاظ کو رواج دینا ہوگا۔

جوگی کس سے بولے، دکھڑے من کے کس سے کھولے

بارہ کوس پہ بولی بدلے، تیرہ کوس پہ رِیت

(۴) ایک صوبے کا باسی دوسرے صوبے کی زبان سیکھے۔ اس عمل کو آسان اور قابلِ داد بنانا ہوگا۔ مثلاً پنجاب کی جامعات میں Optional مضامین میں باقی تین صوبوں کی زبانیں شامل کی جائیں اور طلبہ کو کوئی ایک Option اختیار کرنے کو کہا جائے۔

(۵) انگریزی کی ''ناگزیریت'' مسلّم، لیکن انگریزی کے رحم و کرم پر جینے والی بے ثقافت، بے تہذیب اور ''بے زبان'' نسلیں پروان چڑھانا معقولیت نہیں ہے۔ یہ ''خطرہ'' اردو کے علاوہ تمام پاکستانی زبانوں کو بھی برابر درپیش ہے۔ جس طرح کی لسانی حمیت فرانس میں یا ایران میں پائی جاتی ہے، ہمارے یہاں بھی اس کی تخم ریزی اور آبیاری ہونی چاہیے۔

(۶) بھارت کے کرنسی نوٹ پر درجن بھر قومی زبانوں میں اندراجات ہوتے ہیں۔ بھارت جیسے کثیر اللسانی ملک میں یہ ایک مفید اور اچھی پالیسی ہے۔ ہمارے یہاں مسائل وہاں کی نسبت کم اور نسبتاً سہل ہیں۔ بھارت کی ثقافت کا انگریزی سے کوئی تال میل، سمبندھ نہیں ہے۔ اُن کے ہاں انگریزی ایک مجبوری ہے۔ ثقافت کے لیے وہ ''بالی وڈ'' پر تکیہ کیے ہوئے ہیں۔ کیا ہمیں ''لالی وڈ'' پر تکیہ کرنا ہوگا؟ اللہ نہ کرے۔

(۷) کسی بھی جذباتی یا سیاسی پس منظر سے قطعِ نظر، یہ ایک بات یقیناً واقعے کے درجے کی ہے کہ اردو، اسلام اور پاکستان باہم مل کر ''پاکستانیت'' بنتے ہیں۔ ہماری تاریخ میں اور ہمارے جغرافیے میں بمنزلۂ روح یہی پاکستانیت کارفرما ہے۔ بنگلہ دیش ہم سے جدا ہوگیا۔ زبان کے سے نازک اور حساس موضوع پر ہمارے اُن سے گہرے اختلافات پیدا ہوئے۔ لیکن بنگلہ دیش میں دینی تعلیم کے نصاب کا ایک لازمی جز وآج بھی اردو ہے۔

(۸) بین الاقوامی زبانوں کی ذولسانی، سہ لسانی ڈکشنریاں اب پرانی ہوگئی ہیں۔ یہ دور ڈیجیٹل، الیکٹرانک اور سافٹ ویئر مترجموں کا ہے، مثلاً ''الوافی'' عربی زبان کا معروف سافٹ ویئر ہے، ایک کامیاب مترجم۔ انگریزی عبارت کا عربی میں اور عربی کا انگریزی میں رواں ترجمہ کرتا ہے۔ کیا ہم پاکستانی زبانوں کے لیے ایسے سافٹ ویئر تیار نہیں کر سکتے؟

(۹) شیر افضل جعفری مرحوم جیسے پختہ گو اور قادر الکلام اردو شاعر کا شعری ڈکشن اور مشتاق یوسفی صاحب جیسے بے بدل نثر نگار کا نثری ڈکشن...... دو سامنے کی مثالیں ہیں۔ اردو کو مقامی ماحول اور آب و رنگ سے قریب تر کرنے کی نہایت فطری اور نہایت کامیاب کاوشیں۔

(۱۰) ایک لطیفہ۔ ہمارے سعودی عرب میں مقیم دوست ذوالکفل بخاری بتاتے ہیں کہ ایک ہندوستانی صاحب سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ موصوف خاص لکھنؤ کے تھے۔ زبان اُن کی لکھنؤ ہی کی تھی۔ لیکن...... وہ اردو نہ تو لکھ سکتے تھے...... نہ پڑھ سکتے تھے۔ فاعتبروا......!

برہنہ مسکراہٹیں اور عریاں شوخیاں

وہ تین نوجوان تھے۔ اگلے روز اچانک شام ڈھلے میرے ہاں آن پہنچے۔ میں ان میں سے کسی کو بھی نہیں جانتا تھا۔ ’’ہم ایف ایس سی کے طالب علم ہیں۔ ہمارے بعض سوالات ہیں۔ ہمارے استاد صاحب کا کہنا تھا کہ ان سوالوں کا جواب آپ بہتر طور پر دے سکتے ہیں۔‘‘ عرض کیا: جی ضرور۔ مجھے خوشی ہوگی۔ اگر میں آپ کے کسی کام آسکوں!......ذہانت، جستجو اور اضطراب میں گندھے ہوئے وہ کتنے ہی سوال تھے جنھوں نے اس شام میرے اردگرد طمانیت کا ایک ہالہ سا تان دیا۔ میں نے سوچا: ہماری مٹی میں ابھی ایسے ان گنت شرارے موجود ہیں۔

نوجوانوں کے سارے سوالات اپنے ہی گردوپیش سے مہیا کیے گئے تھے۔ روایتی مذہبی تضادات، سماجی الجھاوے، شناخت کے بحران سے جڑی الجھنیں، یہ عقیدہ کیا ہے، اسے کیا ہونا چاہیے؟ وہ نظریہ کیا ہے، اُسے کیسا ہونا چاہیے؟ ہمارے خواب کثرتِ تعبیر کا شکار کیوں ہوجاتے ہیں؟ اگر تمہارے بقول ہمیں ’’ایک قوم‘‘ میں ڈھلنے کے لیے یک جہتی، یکسوئی اور یگانگت کی ضرورت ہے تو یہ ضرورت کون پوری کرے گا؟ اور آخری بات......ہم کیا کریں؟ ہم کدھر جائیں؟

عرض کیا کہ پہلی بات تو یہ کہ اپنے حق استفسار سے کبھی دست بردار مت ہونا۔ پوچھو اور پوچھتے رہو۔ اپنے ذہن سے سوچو۔ تجزیہ کرو۔ اتنی استعداد پیدا کرو کہ خوب و ناخوب میں اور کھرے کھوٹے میں تمیز اور فرق کرسکو۔ علم اور عمر کے جس مرحلے میں تم ہو، ضروری ہے کہ اقبال کو پڑھو۔ ورنہ زبانِ اردو کے بعض لازوال ذائقوں سے محرومی عمر بھر کا مقدر ٹھہرے گی۔ اگر ایک بار، بس ایک بار اس ’’زبان‘‘ کے راستے سے ’’بیان‘‘ تک پہنچ گئے تو سمجھ لینا کہ شاعری کے راستے سے علم تک جا پہنچے۔ علم جس کی حدیں یقین سے ملتی ہیں۔ ’’یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے۔‘‘ ہمارے گردوپیش کی دنیا فریبِ سودوزیاں، بتانِ وہم و گماں اور طلسم و وہم و مجاز سے بھری ہوئی ہے۔ مربعے خور اور رشوت خور سیاست دان، ریاکار اور منافق سکالرز، دوغلے اور دورخے دانش ور (دورخے بلکہ دومونہے)، یہ سب بے یقین لوگ ہیں۔ صوفی و مُلا بھی، ابلہانِ مسجد بھی اور فرزندانِ تہذیب بھی۔

’’کیا اقبال جیسے لوگ کبھی پاور میں آسکیں گے‘‘؟ ایک نوجوان نے پوچھا۔ عرض کیا: ہماری جیسی سوسائٹی میں تو شاید کبھی نہیں۔ پھر میں نے انھیں اقبال کے الیکشن لڑنے کا قصہ سنایا۔ حفیظ جالندھری کی روایت ہے کہ انتخابی مہم کے دوران ایک روز کسی جلسے سے خطاب کے بعد علامہ اندرون لاہور کی گلیوں سے ہوتے ہوئے پیدل واپس آرہے تھے۔ چونکہ امیدوار تھے، اس لیے راستے میں جو بھی ملتا اُسے سلام کرتے۔ ایک شخص کو علامہ نے سلام کیا۔ وہ شاید ان کے مخالف امیدوار ملک محمد دین کا حمایتی تھا، اس نے جواب میں دھوتی اُٹھادی اور ننگا ہوگیا۔ اقبال جب موٹر کار میں بیٹھے تھکے ہارے گھر جارہے تھے تو نہایت

بجھے ہوئے لہجے میں حفیظ سے کہنے لگے: ''اس قوم کے مصائب کے سبب میری راتوں کی نیند اچاٹ ہے لیکن اس کے افراد اخلاق اور مروت کی دولت سے کیوں محروم ہیں؟'' حفیظ نے اپنے مخصوص جالندھری انداز میں علامہ کو تسلی دیتے ہوئے جواب دیا: ''ڈاکٹر صاحب! قوم کے پاس جو کچھ ہے وہ اس نے آپ کو دکھلا دیا۔ اس میں مغموم ہونے کی کیا بات ہے؟'' ڈاکٹر جاوید اقبال نے لکھا ہے کہ حفیظ کی یہ بات سن کر اقبال کھلکھلا دیے اور ساری کدورت دور ہوگئی۔

''الیکشن کا نتیجہ کیا رہا؟'' اقبال جیت گئے۔ ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۰ء تک وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن رہے۔

''کس پارٹی کی طرف سے؟'' انھوں نے آزادانہ الیکشن لڑا تھا۔ اس زمانے کی اکثریتی پارٹی یونینسٹ پارٹی تھی اور اس کے قائد تھے سر فضل حسین۔ علامہ نے کوشش کی کہ وہ یونینسٹوں کا ساتھ دیں لیکن نبھ نہ سکی۔ اقبال وہاں مس فٹ تھے۔ یونینسٹ بڑے خرانٹ اور گھاگ قسم کے لوگ تھے۔ انگریز کے پٹھو اور ٹوڈی۔ سازشی اور مفاد پرست۔ منہ کے میٹھے، عمل کے کڑوے۔ لہٰذا ''دوستی نبھ نہ سکی شیشے کی، پیانے سے''۔

''یعنی جیسے نواز شریف کے ساتھی، گیلانی کی کابینہ میں نہ چل سکے؟'' یہ مثال یہاں جچتی نہیں۔

''اچھا سر! آپ اور باتیں چھوڑیں۔ یہ بتائیں کہ اس بندے نے حضرت علامہ کے سامنے دھوتی کیوں اٹھائی تھی؟'' تینوں نوجوانوں سے ایک نے جو بیشتر وقت خاموش بیٹھا رہا تھا، بڑی مسمسی صورت بنا کے اور معصوم لہجے میں پوچھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، دوسرے نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا: ''وری سمپل۔ ارے بھئی اسے تم شو آف پاور کہہ سکتے ہو۔ شو آف ووٹ۔ عوامی طاقت کا اظہار۔ یو نو۔ دِس از ڈیما کریسی۔

''یہ بتائیں کہ آج کل آپ لوگ کیا پڑھ رہے ہیں؟'' میں نے گفتگو کو ''مرکز مائل'' بنانے کی کوشش کی۔ ''شوخیاں اور مسکراہٹیں''۔ ایک نے جواب دیا اور پھر تینوں نے یک بیک ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔

''سر یہ دیکھیں''۔ ایک نوجوان نے دو عدد کتابیں مجھے تھما دیں۔ ایک شوخیاں اور دوسری مسکراہٹیں خوب، لیکن یہ لطیفوں کی کتابیں ہیں اور سکول کے بچوں کے لیے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ آپ لوگ اب ذرا سا بڑے ہوگئے ہو۔ مطالعے میں سنجیدگی کا تناسب بھی کچھ بڑھنا چاہیے۔

''یہ بات نہیں سر۔ آپ ذرا غور سے دیکھیے۔ یہ کتابیں بچوں کے لیے نہیں ہیں، نہ ہی ہم جیسے بڑے بچوں کے لیے۔ یہ آپ جیسے بڑے بڑوں کے لیے ہے۔ سر یہ دیکھنے کی چیزیں ہیں۔''

نوجوان کی معنی خیز وضاحت سے مجھے کچھ شک گزرا۔ میں نے ایک کتاب اُٹھا کر ورق گردانی شروع کر دی۔ ایک، دو، تین، چار...... نہیں نہیں گنتی کی ضرورت نہیں۔ آدھی سے زیادہ کتاب گندے اور فحش لطیفوں سے بھری ہوئی۔ لچر، بے ہودہ، غلیظ اور بدبودار۔ میں دم بخود رہ گیا۔ میں نے دوسری کتاب اٹھائی۔ اس کا معاملہ پہلی سے بھی سوا نکلا۔ اور میں کانپ گیا۔ دونوں کتابوں کے سرورق پر لکھا تھا: Not for sale (خرید و فروخت ممنوع ہے)۔ اُف خدایا! کون ظالم ہے جو معصوم ہاتھوں میں یہ گندگی تھما رہا ہے۔ کتنے پیسے، کتنی بڑی سازش؟ دونوں کتابوں کے سرورق پر حکومتِ پنجاب کا علامتی نشان جگمگا رہا تھا۔ اور اس کے پہلو میں پیوست یک سطری عبارت ''پنجاب سکول لائبریریز پراجیکٹ، محکمہ تعلیم''۔ اس کے نیچے دوسری سطر (انگریزی

میں (German Debt Swap-I)۔ میں سناٹے میں آ گیا۔ ایک نوجوان نے آہستگی سے کہا: ''آپ کے پاس آنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ آپ کو بتایا جائے۔ اب ہمارے سرکاری سکولوں میں تربیت کا ایسا شاندار اور مفت انتظام کر دیا گیا ہے۔''
نوجوان اٹھے اور اجازت لے کر چلے گئے۔

یہ دونوں کتابیں لاہور کے ایک نیک نام ناشر نے چھاپی ہیں اور گمان غالب ہے کہ پڑھے بغیر۔ تاریخ اشاعت اپریل ۲۰۰۸ء، تعداد اشاعت درج نہیں۔ اندازہ ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں چھپی ہوں گی۔ پنجاب بھر کے سکولوں میں مفت بانٹنے کے لیے۔ ناشر نے لکھا ہے کہ ''یہ وہ تفریحی اور فکاہیہ ادب ہے جس کو پڑھ کر تھکا ہوا ذہن منٹ دو منٹ کے لیے ہشاش بشاش ہو جاتا ہے۔'' ہشاش بشاش؟ جس ادب میں جنسی لطیفے اور ازدواجی بوالعجبیوں کے گندے کیڑے کلبلا رہے ہوں، وہ معصوم بچوں کو ''ہشاش بشاش'' کرنے کے لیے یقیناً مفید اور کارآمد ہوگا۔ آزمائش شرط ہے اور حکومت پنجاب نے یہ شرط پوری کر دی ہے۔

یہ Debt Swap بیرونی امداد کی وہ قسم ہے جو قرضے کے نام پر ملتی ہے اور عموماً اس کا صرف ۱۰ سے ۲۰ فی صد قابل واپسی ہوتا ہے۔ باقی ......غتر بود اور گھاؤ گھپ۔ شہباز شریف، اس سال جون میں ''خادم اعلیٰ'' بنے ہیں۔ کاش وہ آڈٹ کرا سکیں کہ جرمنی، کینیڈا اور نجانے کن کن ملکوں کے Debt Swap ''پرویز اعلیٰ'' کے دور میں کس کس کارِ خیر میں جھونکے گئے۔ محکمۂ تعلیم کی وہ دوسطری وضاحت چند دن گزرے ہم نے اخبار میں پڑھی تھی کہ قابل اعتراض کتابیں، سکولوں سے واپس منگوالی گئی ہیں۔ لیکن کب؟ کسی سکول میں آج تک ایسا کوئی حکم نامہ نہیں پہنچا۔ پہنچ بھی جائے تو اس پر عمل کتنا ہوگا؟ تیر کمان سے نکل چکا۔

پرویز اعلیٰ کا ''پڑھا لکھا پنجاب'' دیکھ چکے اور اب خادم اعلیٰ کا ''علمی و ادبی انقلاب'' دیکھ رہے ہیں۔ بچوں سے کہا جا رہا ہے کہ زورِ قلم آزمائیں، خطابت کے جوہر دکھائیں۔ آج (۱۳/ نومبر) سے صوبے بھر کے سکولوں میں مضمون نویسی اور تقریروں کے مقابلے شروع ہو رہے ہیں۔ یہ سلسلہ کالجوں اور یونی ورسٹیوں تک پھیل جائے گا۔ ایک ہزار سے دو لاکھ روپے تک کے نقد انعامات، کل انعامی رقم ۱۴ کروڑ روپے۔ اور ان مقابلوں کی تیاری کے لیے کتابیں؟ مسکراہٹیں۔ شوخیاں۔ ایک چودہ کروڑ نہیں کئی چودہ کروڑ۔ کوئی بتا سکے کہ ان کروڑوں اربوں روپوں کا مصرف؟ قوم کے بچوں کو ایک منظم سازش کے تحت آوارگی، اوباشی اور بے حیائی کے جہنم میں جھونکنا۔ اور پھر بچیاں؟ کلیوں کی طرح معصوم اور صبح کے اجالوں کی طرح پاک پوتر بیٹیاں۔ کیا اب اس برہنہ گوئی اور عریاں کلامی کی تعلیم پانے سکولوں میں بھیجی جائیں گی؟ کاش کوئی سن سکے، دیکھ سکے اور پہچان سکے، یہ کون ہے جو خادمِ اعلیٰ کے علمی و ادبی انقلاب کے سامنے دھوتی اٹھا کر کھڑا ہے۔

(حرفِ بے آمیز روزنامہ خبریں ۱۴/ نومبر ۲۰۰۸ء)

مسلم کُشی کے آئندہ پچیس سال

ہر نئے دن کے ساتھ بدلتی ہوئی ایک ایسی دنیا میں جس کے امن و انتظام کا ''ٹھیکیدار'' امریکہ ہے، مسلمانوں کے لیے کوئی اچھی خبر تلاش کرنا یا اس کی توقع بھی کرنا عبث اور بے کار سی بات معلوم ہوتی ہے، لیکن ۱۴/ دسمبر (۲۰۰۸ء) کو ایک عراقی صحافی کی پاپوش باری، جفت اندازی اور بوٹ زنی نے مشرق سے مغرب تک پھیلے ہوئے اضمحلال و انفعال کی لہروں میں یکا یک ایک تلاطم اور تموّج ضرور پیدا کیا ہے۔ ''بش..... مسلم کش'' کے ''اعزاز'' میں ترک ساختہ اور عراق پرداختہ جوتوں کی اس یادگار اور تاریخی سلامی نے ذہنی غلامی اور فکری پسپائی کی زنجیروں سے مسلمانوں کی رہائی کا ایک تازہ عنوان اور ایک قوی امکان یک لخت نمایاں کر دیا ہے۔ زنجیریں جو مرعوبیت و مایوسی، یاس و ہراس اور خوف و ہراس کے حلقہ در حلقہ ربط و تسلسل سے وجود میں لائی جاتی ہیں۔

مارچ ۲۰۰۳ء میں عراق پر امریکی حملے اور قبضے کو آج چھے سال ہونے کو آتے ہیں۔ امریکی وزیر دفاع رابرٹ گیٹس نے حال ہی میں عراق میں موجود ایک لاکھ چھیالیس ہزار امریکی فوجیوں کو چتاؤنی (یا۔خوش خبری) دے دی ہے کہ اب ہمارا دمِ واپسیں ہے۔ اقوامِ متحدہ کا وہ نام نہاد مینڈیٹ جو ظالم کو مظلوم پر اور جارح کو مجروح پر چڑھ دوڑنے کا ''حق سفاکی'' عطا فرماتا ہے، اپنی میعاد پوری کر چکا ہے۔ اب عراق بھر میں پھیلے ہوئے، چار سو سے زائد فوجی اڈوں میں براجمان ''امن و سلامتی'' کے یہ آدم خور اور خوں خوار امریکی ''سفیر'' ۳۰/ جون ۲۰۱۱ء تک، عراقی حکومت کی براہ راست مہمانی اور ماتحتی میں برسرکار رہیں گے۔ برسر کار نہیں، برسرِ پیکار۔ او رپھر اس کے بعد؟ اعلانات تو کہتے ہیں کہ ''مکمل واپسی'' ہو جائے گی لیکن...... ''زباں کچھ اور، بوئے پیرہن کچھ اور کہتی ہے''۔ عراق میں امریکی فوج کے اعلیٰ ترین کمانڈر جنرل ریمنڈ آڈیرنو نے یہ واضح کر دیا ہے کہ ۲۰۱۱ء کے بعد بھی عراق میں امریکی فوج اپنا قیام وطعام جاری رکھے گی۔ ''جمہوری عراق'' کی تائید و حمایت اور تربیت و تدریب کی خاطر۔ یعنی......کون سی واپسی، کہاں سے واپسی اور کدھر کو واپسی؟

ادھر امریکی جوائنٹ فورسز کمانڈ کی ایک تازہ ترین رپورٹ میں یہ بات بصراحت بتلائی گئی ہے کہ پورے عالم اسلام میں سے امریکہ مخالف مزاحمت (Insurgency) کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے آئندہ پچیس سالہ مدت طے کر لی گئی ہے۔ گویا آنے والے اڑھائی عشروں پر مشتمل ربع صدی کی یہ مدت بارِ دگر، امریکہ کو ان گنت سنہری و روپہلی مواقع فراہم کرے گی کہ وہ بہیمیت اور وحشت و درندگی کے اپنے ہی قائم کردہ ریکارڈز کو توڑ کر نئے ریکارڈز قائم کرے۔ اس رپورٹ کا ایک فوری مطلب، صاف صاف یہ بھی نکلتا ہے کہ افغانستان کے محاذ پر طاقت کا مرکوز اور اندھا استعمال بڑھنے کو ہے۔ عراق پر چھے سالہ تسلط و تشدد کا حاصل......الوداعی پاپوش کاری۔ کبھی نہ ختم ہونے والی مزاحمت۔ روز افزوں نفرت۔ جبکہ افغانستان میں سات سالہ غارت گری کا حاصل یہ ہے کہ آج بھی کابل سے باہر نکلتے ہی اتحادی افواج کے قبضہ وغصب کی ''رِٹ'' (Writ) یوں غائب

ہو جاتی ہے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

عراق اور افغانستان میں ترتیب پاتے ہوئے امریکی خفت اور ہزیمت کے یہ مناظر ''تقاضا'' کرتے ہیں کہ پاکستان اور بھارت کو باہم الجھایا اور پھنسایا جائے اور امریکی ناکامیوں کا سارے کا سارا ''ملبہ'' پاکستان پر ڈال دیا جائے۔ اس قوالی میں حامد کرزئی کے بعد من موہن سنگھ کی شکل میں ایک نئے ہم نوا کا اضافہ ہو گیا ہے۔ پاکستان کی مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ جاری ''ڈومور'' کے رقصِ ابلیس پر تازہ اضافہ مشرقی سرحد کے اس پار ممبئی دھماکوں کی ٹھمری ہے جو راگ اجمل قصاب میں مسلسل گائی جا رہی ہے۔

گانے سے یاد آیا کہ ایک جگہ قوالی ہو رہی تھی۔ انترے اور استھائی وغیرہ کی تفصیل تو راوی بیان نہیں کرتا۔ البتہ یہ ضرور بتلاتا ہے کہ ٹیپ کا مصرعہ تھا ''لوٹا بھریا نور داتے مُڈھ بیری دے پایا'' (میں نے آفتابے میں نور بھر کر، اسے بیری کے درخت کی جڑوں میں انڈیل دیا)۔ مُڈھ بیری دے پایا۔ مُڈھ بیری دے پایا۔ اسی کی تکرار سے قوالوں نے ایک سماں باندھ دیا۔ اچانک نجانے کیا ہوا کہ ایک ''ہم نوا'' کے گلے میں پھندا لگ گیا اور آواز غوطہ کھا گئی۔ ایک ناگہانی ہکلاہٹ۔ بے چارے کو ٹیپ کا مصرعہ مکمل کرنا دوبھر ہو گیا۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے جان حلق میں اور جی مٹھی میں آرہے گا، آنکھیں اُبل کر باہر کو گر پڑیں گی اور گلے کی رگیں پھول کر پھٹ ہی جائیں گی۔ بدقت تمام حلق سے ذرا سی آواز نکلی تو ''ہم نوا'' نے کمال سرعت سے مصرعہ پورا کر دیا۔ مگر کیسے؟ ہاتھ سے انڈیلنے کا اشارہ کرتے ہوئے گھٹی گھٹی آواز میں کہا: ''میں وی اوتھے ای پایا''۔ شری گورڈن براؤن ہوں یا شریمتی کنڈولیزا رائس، سبھی بھارت کے ہم آواز ہو کر کہہ رہے ہیں: میں وی اوتھے ای پایا۔ میں وی اوتھے ای پایا۔

چند دن پہلے اخبار میں ایک تصویر چھپی۔ جس میں بش، حامد کرزئی سے گلے مل رہے تھے۔ اس الوداعی معانقے کی تصویر کے نیچے باذوق سب ایڈیٹر نے کیپشن میں لکھا: ''بیٹا جی، اب ہم تو صدر نہیں رہیں گے۔ تم امریکی ایجنٹ رہنا۔ الوداع''۔ کیپشن پڑھ کر ہمیں بے اختیار بابا عبیر ابوذری مرحوم یاد آ گئے۔ بابا ابوذری لمبی سفید زلفوں، دراز و سفید ریش، منحنی وجود، پست قامت اور جناح کیپ کا ایک معصوم سا امتزاج تھے۔ معصوم ضرور تھے لیکن ''بے ضرر'' ہرگز نہیں تھے۔ شاعری میں وہ ظالم قسم کی چٹکیاں لیتے تھے اور جملے بازی میں شاعری سے بھی دو چار ہاتھ آگے ہی تھے۔ ایک مشاعرے میں بابا جوگی جہلمی نے کسی شاعر سے بابا ابوذری کا تعارف کراتے ہوئے کہا: ''یہ بابا عبیر ابوذری ہے۔ اپنا بچہ ہی ہے۔'' بابا عبیر نے فوراً ہی اپنی دھیمی آواز کو اور بھی عاجزانہ اور لہجے کو نہایت فدویانہ بناتے ہوئے کہا: نہیں جی نہیں، بچہ کہاں، میں تو جوگی صاحب کا ''انڈہ'' ہوں۔

کتنے انڈے اور کتنے بچے؟ پاکستان پر ڈرون حملوں کی ''مہربانی'' گزشتہ چند مہینے سے شروع ہوئی ہے۔ نومبر کے وسط میں افغانستان سے ''بین الاقوامی فوج برائے حفاظتی معاونت'' (ISAF) کے امریکی کمانڈر، جنرل ڈیوڈ میک کیرنن اسلام آباد تشریف لائے۔ امریکی سفیر کی رہائش گاہ پر انھوں نے پاکستان کے چیدہ چیدہ، چنیدہ، سنجیدہ اور جہاں دیدہ قسم کے ارکان پارلیمنٹ کو شرفِ ملاقات بخشا۔ یاد رہے کہ اس ملاقات سے دو تین ہفتے قبل ہماری پارلیمنٹ اپنے اِن کیمرہ اجلاس میں وہ متفقہ قرارداد منظور کر چکی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ پاکستان کی خود مختاری اور علاقائی سالمیت پر کوئی آنچ نہیں آنے دی جائے گی۔ جنرل ڈیوڈ کی اس ملاقات پر بعض قومی اور سیاسی حلقوں کی طرف سے بجا طور پر یہ اعتراض بھی کیا گیا کہ اس سلسلے میں پاکستانی

وزارت خارجہ سے رابطے یا ''اجازت'' کی تکلیف گوارا نہیں کی گئی۔ شاید اس لیے کہ تکلیف میں تکلف کا شائبہ پایا جاتا ہے۔ جبکہ پاک امریکہ تعلقات، رسمی وروایتی تکلفات سے بہت بلند، بہت اوپر اٹھ چکے ہیں۔ اس کی تصدیق مذکورہ ملاقات کی خفیہ تفصیلات سے بھی ہوگئی۔ ملک کی خودمختاری اور علاقائی سالمیت کے بزعم خود اور بزبان خود محافظین نے امریکی کمانڈر سے ڈرون حملوں پر احتجاج کا ایک لفظ تک نہ کہا۔ احتجاج ایک رسم ہے، ایک تکلف ہے۔ اور ہم رسمیات وتکلفات سے بہت بلند، بہت اوپر اٹھ چکے ہیں۔ جنرل کو افغانستان کی تعمیر نو، خانہ بربادوں کی بحالی، افغانوں کے امن وسلامتی کو ''یقینی'' بنانے کے لیے کی جانے والی ہمہ قسم کی فوجی کارروائیوں، صحت کی سہولتوں کی فراہمی اور نادار افغان بچوں میں کتابوں کی مفت تقسیم جیسی عظیم الشان اور جلیل القدر خدمات پر ڈھیروں ڈھیر خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔ ہاں ہاں، حیران مت ہوں۔ وہاں یہی کہا گیا۔ تعمیر نو، بحالی، امن وسلامتی، صحت کی سہولتیں، مفت کتابیں، مگر کہاں؟ کیا ان لفظوں کے مطلب بدل گئے ہیں یا یہ افغانستان وہ نہیں جو ہمارے پڑوس میں آباد ہے۔ نہیں، جو کبھی آباد تھا۔ اور جب ایک نادان یا اناڑی قسم کے ایم این اے نے جنرل ڈیوڈ سے پوچھ ہی لیا کہ پاک افغان سرحد پر آپ کی سخت ترین نگرانی کے باوجود مبینہ درانداز کیونکر کامیاب ہیں؟ تو جنرل کا جواب تھا: مجھے ڈرون حملوں سے ہونے والی ہلاکتوں کے اور معصوم جانوں کے ضیاع پر دلی افسوس ہے لیکن کسی قسم کی تفصیل فراہم کرنے یا تبصرہ کرنے کا ''مینڈیٹ'' مجھے نہیں دیا گیا۔ آہ! بے چارہ، بے بس اور بے اختیار جنرل ڈیوڈ۔

وہ جو آج تک خود فریبی میں مبتلا رہے ہیں بلکہ بش فریبی میں بھی انھیں خبر ہو کہ آئندہ پچیس سال کا بھیانک منظر...... نیم باز آنکھوں سے نہیں (جن میں ساری مستی شراب کی سی ہے) بلکہ کھلی آنکھوں سے دیکھیں۔ اور وہ بھی دیکھیں جو ''کھلی آنکھیں ہیں لیکن سورہے ہیں'' کا مصداق بنے ہوئے ہیں۔ تہذیبوں کا تصادم ایک حقیقت ہے۔ ہنٹنگٹن پر تو ۱۹۹۳ء میں یہ الہام اترا اور اس کے بعد دنیا بھر کے جارج واکر بشوں اور پرویز مشرفوں پر۔ مسلمانوں کو یہ خبر چودہ سو انتیس سال پہلے قرآن کی زبانی مل چکی ہے۔

(حرفِ بے آمیز روزنامہ خبریں ۲۹/ دسمبر ۲۰۰۸ء)

ذوالکفل بخاری بنام مشفق خواجہ

۵/ جون ۱۹۹۴ء

دار بنی ہاشم مہربان کالونی ملتان

حضرت المکرّم خواجہ صاحب مدظلکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

تقریباً اڑھائی ماہ قبل ...... تکبیر میں ''ٹارزن کی واپسی'' کا مژدۂ جانفزا پڑھا تو بے اختیار ''نعرۂ تکبیر'' بلند کرنے کو جی چاہا۔ اس ''رجعت قہقہہ'' کی جتنی بھی خوشی منائی جائے کم ہے۔

بہت دنوں سے عریضہ کا ارادہ کر رہا تھا۔ لیکن یہ سوچ کر ہمت نہ کر پاتا کہ بے مقصد اور بلا جواز خامہ فرسائی کے لیے اب تک نظم وغزل اور افسانہ وتنقید کے عناوین ہی اختیار کیے گئے ہیں۔ مکتوب نگاری کی آڑ میں یہ کام، بدعتِ جدیدہ تو ہوگا ہی، کہیں بدعتِ سیئہ بھی نہ ہو جائے۔ اس لیے اپنے تئیں بہتیرے جوازات مہیا کر کے، یہ خط لکھ رہا ہوں۔ مثلاً:

۱۔ لاہور سے ایک کتاب چھپی ہے اقبال اور احمدیت (بجواب زندہ رود)۔ اس کا کچھ محاسبہ کیا ہے جناب ڈاکٹر شفیق احمد صاحب نے۔ (صدر شعبۂ اردو واقبالیات اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور)! ڈاکٹر صاحب نے اپنا مضمون ہمیں ''نقیب ختم نبوت'' میں اشاعت کے لیے مرحمت فرمایا ہے۔ اس میں انھوں نے مولانا ابوالکلام آزادؒ کے برادرِ بزرگ کی قادیانیت کا بھی ذکر کیا ہے۔ حوالہ طلبی پر انھوں نے فرمایا کہ اس کا حوالہ مشفق خواجہ صاحب ہیں۔'' لہٰذا اس پر آپ ہی کچھ روشنی ڈالیں۔

۲۔ اقبال اور احمدیت نامی کتاب کے جواب میں کسی اہل علم نے کچھ نہیں لکھا۔ ایک آدھ تحریر جواباً لکھی بھی گئی ہے تو ازحد ناکافی اور اس کی اشاعت بھی بہت محدود!

آپ اگر اس کتاب پر کوئی تبصرہ، کوئی کالم یا کوئی تنقید لکھیں تو یقیناً اس سے ایک بڑی ضرورت پوری ہوگی۔

۳۔ ایک کالم میں آپ نے مظفر علی سید صاحب کے منتخبہ کالموں کے مجموعے (سخن در سخن) کا ذکر اس انداز میں کیا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ ''انتخابی عمل'' سے اختلاف کی گنجائش، آپ کے نزدیک موجود ہے۔ اگر یہ میری سخن نافہمی نہیں ہے تو اپنے چھوٹے سے ذہن میں آئی ہوئی ایک چھوٹی سے تجویز پیش کرنے کی ہمت کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ کالموں کے انتخاب کے ساتھ ساتھ اگر اقتباسات اور جملے وغیرہ بھی چنے جائیں تو بے شمار تیر ونشتر (یا گل وگوہر) محفوظ ہو جائیں گے۔ جنھیں کتاب میں جا بجا یا یکجا رکھا جا سکتا ہے۔

۴۔ اکبر کا شعر ہے کہ

بڑھائی شیخ نے ڈاڑھی اگرچہ سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

یہاں ''مولوی مدن'' کون ہیں؟ ملتان کے ایک محترم شاعر کی رائے ہے کہ یہ پنڈت مدن موہن مالویہ ہیں جب کہ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ فرضی شخصیت ہے اور قافیہ پیمائی کے لیے ''گڑھی'' گئی ہے۔

۵۔

تیز رکھو سرِ ہر خار کو اے دشتِ جنوں
شاید آ جائے کوئی آبلہ پا میرے بعد

یہ غزل میؔر سے منسوب کی جاتی ہے جب کہ کلیاتِ میر میں نہیں ہے۔ کچھ اس کے نسب نامہ سے مطلع فرمائیں۔

۶۔ ماہنامہ ''نقیب ختم نبوت'' امید ہے باقاعدگی سے آپ کی خدمت میں پہنچ رہا ہوگا۔ اس کے ''امیر شریعت نمبر'' کے ''حصہ دوم'' کے لیے آپ نے مضمون کا وعدہ فرمایا تھا۔ اب جب کہ ''نمبر'' کے اس حصے کی تسوید کا کام تقریباً مکمل ہو چکا ہے، مضمون کا بارِ دگر تقاضا...... تاکید، تعجیل اور یاد دہانی سے مملو تقاضا...... اپنی تکمیل چاہتا ہے۔

۷۔ ''سخن در سخن (مجموعہ) اور ''کلیات یگانہ'' کب تک منصۂ شہود پر آ رہی ہیں؟ (کہ ان کے معرضِ وجود میں آنے کی خبر ایک عرصہ سے گرم ہے)۔

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ اللہ کریم اپنے فضل و کرم کو شامل حال رکھیں (آمین)۔

والسلام مع الاکرام
نیاز آگیں محتاجِ دعا
ذوالکفل بخاری
ملتان

مشفق خواجہ بنام ذوالکفل بخاری

۲۳/ جون ۲۰۰۰ء

۳۔ڈی، ۲۶/۹ ناظم آباد کراچی

عزیز مکرم۔ سلام مسنون

آپ کا لفافہ مع مشمولات موصول ہوا۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ مخدوم غلام نظام الدینؒ کی تالیف پر آپ کا تاثر پڑھا۔ جی خوش ہوا۔ میں یہ نہیں کہوں گا کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ کیونکہ زورِ قلم زیادہ ہوا تو آپ عربی، فارسی میں لکھنے لگیں گے اور وہ بھی منظوم۔ ابوالکلامی اسلوب، اردو کا بے مثال اسلوب ہے۔ مگر اس میں دو زبردست نقصانات کا احتمال رہتا ہے۔ ایک تو تحریر ''خواص پسند'' ہو کر رہ جاتی ہے۔ دوسرے اس کا ثواب اور داد، دونوں مولانا آزادؒ ہی کو ملتے ہیں۔ دلوں میں گھر وہی تحریر کرسکتی ہے جو آپ کے نانا مرحوم ومغفور کی تقریر کے انداز میں لکھی گئی ہو۔ آپ کے ہم عمروں میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو آپ کی تحریر سے محظوظ ہو سکے۔ بہر حال یہ بھی غنیمت ہے کہ اس عہدِ پُر آشوب میں آپ جیسا صالح نوجوان موجود ہے۔ ''صالح'' کے لفظ سے دھیان جماعتِ اسلامی کی طرف جاتا ہے مگر میں نے یہ لفظ اُن معنوں میں استعمال کیا ہے جو جماعتِ اسلامی کے وجود میں آنے سے پہلے مروّج تھے۔

پروفیسر حفیظ الرحمٰن صاحب کا کالم پڑھا۔ انھوں نے مجھ ناچیز کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، کاش میں ویسا ہی ہوتا۔ بعض اوقات انسان اپنی نیکیوں سے دوسروں کو اسی طرح مستفید کرتا ہے۔ اس کالم کا ایک نقصان یہ ہوا کہ ملتان سے کئی دوستوں کے خط آئے کہ میں اُن سے نہیں ملا۔ ان میں بعض وہ کرم فرما بھی ہیں کہ اگر ملتان میں میرا مستقل قیام ہوتا تو بھی اُن سے ملاقات کی کوئی صورت نہ پیدا ہوتی۔

ملتان میں جس گرمی کی توقع تھی، وہ بالآخر کراچی واپس آ کر دیکھی۔ پچھلے پندرہ دن قیامت کے گزرے ہیں۔ اسی وجہ سے میں آپ کے خط کا جواب فوراً نہ دے سکا۔

آپ کا خیر اندیش
مشفق خواجہ

بخدمت جناب ذوالکفل بخاری
ملتان

سید ابوالخیر کشفی بنام ذوالکفل بخاری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کراچی

۲۳/محرم الحرام ۱۴۲۷ھ

عزیزِ مکرّم! سلامِ مسنون

ماہنامہ تعمیرِ افکار میں آپ کے سفرنامۂ حجاز کا ایک ورق (روشنی، پھول، صبا......) پڑھا۔ من القلبِ الی القلب اور ہرچہ از دلِ خیزد بر دل ریزد کے محاورے پھر سے یاد آ گئے۔

آپ لکھتے رہیے۔ کلام و بیان کی دولت اللہ پاک نے آپ کے خاندان کو عطا کی ہے۔ مگر عزیزم! ہم انسان ہیں، اشرف الخلائق، پھر مسلمان ہیں۔ خلاصۂ کائنات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی تمام بداعمالیوں کے باوجود ہمیں نسبت ہے۔ لفظِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے ہونٹ تر رہتے ہیں۔ تقلیدِ آبا میں اپنے آپ کو کتا کہنا کیا ہمیں زیب دیتا ہے؟

سید ذوالکفل بخاری سلمک اللہ تعالیٰ

دعاؤں کے ساتھ

دعا گو، دعا جو

سید محمد ابوالخیر کشفی

ذوالکفل بخاری بنام سید ابوالخیر کشفی

غرفۃ المدرسین

بتوسطۃ ابی سعید الخذری

املج

۲۷/صفر ۱۴۲۷ھ، ۲۷/ مارچ ۲۰۰۶ء

سیّدی ومخدومی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ابھی بمشکل کوئی آدھ گھنٹہ پہلے وکیلِ مدرسہ (وائس پرنسپل) نے کہا: تمھارا ایک خط آیا ہے۔ خط کھولا، پڑھا۔ اپنی خوبیِ قسمت پر ناز کیا۔

یقیناً کسی ساعتِ سعید میں سوچا گیا یہ خیال اللہ کی بارگاہ میں مقبول ہوا کہ اِس ناکارہ کو استاذ الاساتذہ، مرجعِ خلائق، مخدوم الادباء اور سید الاتقیاء کی خدمت میں حاضری دینی چاہیے۔ آپ کا التفات، از خود ملا اور یوں کہ میری تمام تر جہالت، بے توفیقی اور غفلت کے باوجود، ''ساقی نے التفات کا دریا بہادیا'' (پہلا مصرعہ ''پیہم دیا پیالۂ مے، برملا دیا'')

آپ کا یہ مختصر سا گرامی نامہ، مجھے یقین ہے کہ دنیا وآخرت میں، میرے لیے فوز وسعادت کا باعث ہوگا۔ شاید اسی کو کہتے ہیں ''تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔''

وہ جو ایک تحریر نما شے آپ کی نظر سے گزری، ایک دوست کے نام خط تھا۔ پھر اُسے چھپوا دیا گیا محض اِس خیال سے کہ شاید کسی اور کی دلچسپی کا بھی سامان ہو۔ کہ موضوع اِس کا، عمومی دلچسپی ہی کا تھا۔ لیکن یہ بات میرے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھی کہ کسی روز ایسی اونچی ''بارگاہِ ادب'' میں، یہی تحریر پڑھی جائے گی۔ نہ صرف پڑھی جائے گی بلکہ پسند بھی کی جائے گی۔

تعمیرِ افکار والوں نے، مجھے آپ کی بارگاہ میں پہنچا دیا۔ اِس غائبانہ احسان کا بدلہ غائبانہ دعا سے ہی شاید چکایا جا سکے۔ ہمدمِ دیرینہ حافظ صفوان محمد صاحب آپ سے اِس خط کی ''وصولی'' اور مجھ تک ''موصولی'' کا ذریعہ بنے۔ اُن کے بے شمار احسانات میں یہ تازہ ترین اضافہ تو ایسا ہے کہ زبان اظہارِ تشکر سے عاجز ہے۔

ایک ضروری تنبیہ بھی آپ نے فرمائی۔ یہ آپ کے منصب کا تقاضا تھا اور اِس پر، الحمد للہ۔ آپ کی بڑائی کا نقش دل پر اور گہرا محسوس کرتا ہوں۔ اور کیا عرض کروں۔

یہاں، سرزمینِ حجاز پر اُترے، مجھے چار سال گزر گئے۔ اِس ''مدار'' میں پہنچ تو گیا لیکن ابھی تک ''منزل'' پر نہیں پہنچا۔ ''بس ایک سودا اور ایک سر ہو کسی کے گیسوئے عنبریں کا'' کا سا معاملہ، اللہ پاک نصیب فرما دیں۔ اِس کے لیے خصوصی دعا

کی درخواست ہے۔

ابھی سٹاف روم (غرفۃ المدرسین) میں بیٹھا، یہ عریضہ لکھ رہا تھا تو ایک بزرگ سعودی استاد نے پوچھا، کیا لکھ رہے ہو۔ میں نے بتلایا کہ ہمارے استاذ الاساتذہ کے درجے کے ایک بزرگ ہیں۔ اُن کا عنایت نامہ آیا ہے اور جواب لکھ رہا ہوں۔ یقین مانیے، اِس پر وہ ایک خاص کیفیت میں چلے گئے۔ کہنے لگے: ''چھوٹوں اور بڑوں میں احترام اور استفادے کا یہ تعلق ہمارے ہاں (عرب میں) مٹ رہا ہے۔'' میں اُن سے کیا عرض کرتا، کہ اِس خط کے عالی مقام مکتوب الیہ اور اِس کا یہ مجہول الحال نویسندہ، دونوں ہی اصلاً ''عرب'' ہیں۔ آپ کو یہ بات بتانے کی ایک ''تک'' تو یہ بنتی ہے کہ اِس سے خط، ذرا سا لمبا ہو گیا ہے۔ اور محض اِس خیال سے ہی کہ یہ جو کچھ بھی لکھا جا رہا ہے، ایک دفعہ ضرور آپ کی نظر سے گزرے گا۔ ایک ولولہ سا دل میں ابھر رہا ہے۔ اور دوسری ''تک'' یہ کہ آپ کی دعاؤں میں، اپنا استحقاق جتلانے کی ''حریصانہ'' کوشش!

اللہ پاک آپ کو صحت و عافیت سے، تا دیر سلامت رکھیں۔

والسلام مع الاکرام

نیاز آگیں

ذوالکفل بخاری

اُملج

بنام سید صبیح الحسن ہمدانی

۱۸/ فروری ۲۰۰۶ء

غرفۃ المدرسین، متوسطۃ ابی سعید الخدری
املج

''بہت عزیزی''، صبیح الحسن، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

بعض چیزیں یونہی ___ خواہ مخواہ ___ ذہن میں اٹک جاتی ہیں۔ ایک جملہ برسوں سے میرے دماغ سے چپکا ہوا ہے۔ ایک بچے نے، اردو کے پرچے میں ''والد کے نام خط'' کا آغاز یوں کیا کہ ''پیارے ابا جان! کمرۂ امتحان میں فارغ بیٹھا تھا۔ سوچا آپ کو خط ہی لکھ دوں۔'' یہ جملہ میرے لیے، کسی ناگہانی فرصت کو کام میں لانے، اور اُسے آنی و فانی ہو جانے سے بچانے کا جواز مہیا کیا کرتا ہے۔ ابھی تھوڑی دیر کے لیے (ایک پیریڈ کے لیے) فرصت ملی تو سوچا، خط لکھنے کی کوشش کی جائے۔

بھئی سچی بات تو یہ ہے کہ ایسے دلچسپ خط کا ویسا ہی دلچسپ جواب مجھ سے لکھا جانا بہت مشکل ہے۔ گزشتہ سنیچر کی رات، یوں بھی لطف ونشاط کا سامان لائی، اور ڈھیروں لائی۔ تمہارا خط، بھائی جان کا خط اور نقیب کے پچھے شمارے۔

صبیح الحسن! ابھی اگلے دن ہی کہیں جملہ پڑھا کہ ''مثالیں ہمیشہ گمراہ کن ہوتی ہیں۔'' اسی وزن پر کہا جا سکتا ہے کہ ''تشبیہیں ہمیشہ ناقص ہوتی ہیں'' گھر والوں کو تمہاری ''سمجھ نا کی'' میں کہیں تمھارے چھوٹے ماموں کا عکس دکھائی دیتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ تشبیہ ناقص اور یہ مثال غیر معتبر ہے۔ جنیاتی سائنس نے تو اس اس حقیقت کو اب اور بھی آئینہ کر دیا ہے کہ بیماریوں، ذہنی صلاحیتوں، شخصی رویوں، استعدادی امکانات اور طبعی رجحانات ومیلانات سمیت وہ سبھی کچھ انسان میں وراثتاً آتا ہے جس سے اس کی اُٹھان اور اڑان (بلکہ ''لمبان'' اور ''چوڑان'' بھی) متعین ہو جاتی ہے۔ ''وراثتاً'' کا لفظ صرف ان معنوں میں کہ Genetic Code ایک ایسا Pre-determined یا In-built پروگرام ہے جو ہر انسان کی Hard Disk میں قدرت، خود اپنے دستِ بے خطا و معجز نما سے Install کرتی ہے، اور ایک سے دوسری نسل میں یہ ''وراثت'' آپ سے آپ منتقل ہوتی رہتی ہے۔ ہاں، کون سے امکانات، کتنا کتنا بروئے کار آتے ہیں، اس میں کئی عوامل کام کرتے ہیں۔ اور ''ماحول'' (یا ''مواقع'') سب سے بڑا عامل ہے۔ تمھارا ماموں اصلاً ایک اوسط درجے کی ذہانت کا، گم صم سا، ضرورت سے زیادہ سوچنے کا عادی (وہ جو سوچ سوچ کر تھک جائے، اور پھر یہ تھکن اتارنے کے لیے مزید سوچے) اور، سہمی ہوئی نفسیات کا مالک شخص تھا، جسے ماحول اور مواقع نے ___ کہیں سے کہیں لا کھڑا کیا، یہ جو ایک لفظ سے کسی شخص کو یا کسی طبقے کو بیان کیا جاتا ہے کہ ''خاندانی آدمی'' ہے یا ''خاندانی لوگ'' ہیں، اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کچھ روایات، کچھ اقدار، کچھ خوبیاں ___ ماحول کی بھی، کردار کی بھی، رویوں کی بھی ___ خاندانی میراث میں چلی آتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ڈرپوک اور بزدل کو ''محتاط'' ___ کنجوس اور بخیل کو ''جزرس'' ___ غصیلے اور مغلوب الغضب کو ''جلالی'' کا مقام، یہی میراث اور یہی ماحول دلواتے ہیں۔ نام ہی نہیں، مقام بھی۔ ہاں ___ آدمی کا مقام بدلتا ہے۔ بدلتا نہیں، بلند ہوتا ہے۔ یہ واقعہ ہے اوسط درجے کی ذہانت بھی اگر ایک تفوّق، ایک برتری، ایک شوخی اور ایک چمک کا اظہار کرتی اور دنیا سے اس کا اعتراف چاہتی پائی جائے تو اس کا سبب اور پس منظر یہی ہوتا ہے۔ غیر معمولی لوگ اور ہوتے ہیں۔ یکسر مختلف۔ مثالیں انہی کی بنتی ہیں۔ تشبیہیں انہی سے دی جاتی ہیں۔ بہادری میں،

استقامت میں، ثبات میں، ذہانت میں، ایجاد و ابداع میں، ابتکار و اختراع میں، ایثار و بے نفسی میں، للّٰہیت و روحانیت میں، مکارم اخلاق میں، بلکہ ہر رنگ میں، ہر حال میں، ہر قال میں ____ (بقول حالؔی) ''زندگی کرتے ہیں سب کے درمیاں، سب سے الگ''! پورا شعر یوں ہے کہ:

عالم آزادگاں ہے اک جہاں سب سے الگ
زندگی کرتے ہیں سب کے درمیاں سب سے الگ

پتا نہیں، جو تمھیں سمجھانا چاہتا تھا، سمجھا بھی پایا ہوں یا نہیں۔ مجھے خوشی ہے، اور سچ پوچھو تو بہت زیادہ خوشی ہے کہ اب تمھاری نظر اشیاء و مظاہر کی اور افکار و خیالات کی تہہ داری پہچاننے لگی ہے۔ ''وہ باتیں جو پہلے سمجھ میں نہیں آتی تھیں اب سمجھ میں آنے لگی ہیں'' یہی بتلایا ہے نا، تم نے (۱)۔ یوں سمجھو، ایک سفر کا آغاز ہو رہا ہے۔ اور تم خوش نصیب ہو کہ بہت ہی نادر مواقع کے ساتھ اور ایک بہت سازگار، بہت تعمیری، بہت پاکیزہ (اور فی زمانا یکسر نایاب و غیر مترقب) ''گھریلو ماحول'' میں اس سفر کا آغاز کر رہے ہو۔ ''مے خانے کا پیاسا'' دنیا کا سب سے بڑا محروم القسمت ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ فقط حسرتوں کا ہجوم ہوا کرتا ہے:

کچھ خواب ہیں، کچھ حسرتیں
جو ہستیِ موہوم کو
صرصر بھی ہیں، پُروا بھی ہیں، زہراب بھی، تریاق بھی!

یہ ''حقیقتِ واقعی'' ہے ''حقیقتِ شعری'' نہیں۔ تم آج کل افسانے، شاعری، کالم اور نجانے کیا کچھ پڑھ رہے ہو، ضرور پڑھا کرو۔ لکھنے کو دل چاہے تو ضرور لکھا کرو۔ رہگزر، رہگزر گھومو۔ عمر اور شوق کے اس مرحلے میں افسانے کے افسوں اور شعر کے سحر سے ہی نہیں، خیالوں کی خوشبو سے، لفظوں کی چمک سے، خوابوں کی خنک خاموشی سے، رنگوں کی گنگناہٹ سے او رجذبوں کے رقص و رامش سے ہر ''شریف آدمی'' اپنا حصہ وصول کیا کرتا ہے۔ لیکن تم چونکہ ایک استثنائی نوعیت کے ''شریف'' ہو، اس لیے تم سے توقع بہت مختلف، بہت بڑھ کر اور بہت بلند قسم کی ہے۔ اور یہ بات میں پوری دیانت داری اور ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں۔

روشنی، پھول، صبا کے عنوان والا مضمون تمھیں پسند ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ، یہ مجھے بھی پسند ہے۔ افسوس، جس کی خاطر کے خیال سے یہ ساری باتیں کہنے کی توفیق اور تقریب ہوئی ____ اب وہ (۲) اس دنیا میں نہیں۔ میری مستعدی اور پھرتی کا حال تم پر پہلے سے کھلا ہوا ہے، لیکن اب اس مضمون کے خیال سے ہی طبیعت میں یکا یک اداسی بھر جاتی ہے۔ بہت گھمبیر، بہت گہری، بہت تاریک! البتہ، اتنا ضرور ہے کہ کبھی اس تحریر کو پھیلانے کا موقع آیا بھی تو، یقین مانو اس کا سبب صرف ایک فرمائش ہوگی، جو تمھارے علاوہ اور کون کر سکتا ہے؟

ہاں سنو! چونکہ مجھے معلوم ہے کہ ''مطالعے'' کا تعلق (۳) ''موت'' سے اور ''مشاہدے'' کا تعلق ''شہد'' سے جوڑنے کے علاوہ، لفظوں سے شریفانہ معاملے کی فرصت بھی تم نکال سکتے ہو، اس لیے تاکیداً کہہ رہا ہوں کہ مطالعے میں مقصدیت اور مشاہدے میں سنجیدگی ہمیشہ ملحوظ رکھو۔ زبانیں سب آنی چاہئیں (عربی بھی، فارسی بھی، اردو بھی، انگریزی بھی)، ادب کی سُدھ بُدھ لازماً ہونی چاہیے لیکن کاہے کو؟ ____ مخدومی پروفیسر تاثیر وجدان، مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جملہ ہمیشہ اپنے وجد آگیں لہجے میں سنایا کرتے ہیں کہ ''ادب ایک تلوار ہے، جس کا کام باطل کا سر کاٹنا ہے لیکن ہم اس سے گھاس کاٹنے کا

کام لے رہے ہیں''

عربی تمھاری، مجھ سے سو (۱۰۰) گنا اچھی ہے، اور کوئی دن کی بات ہے کہ ہزار گنا اچھی ہوجائے گی۔ (ان شاء اللہ)۔ عربی میں کہتے ہیں ''مادی و معنوی'' ____ جسے ہم اردو میں کہتے ہیں ''مادی اور روحانی''۔ اب غور کرو جو بات عربی میں ہے وہ ہمارے ہاں کہاں؟ اسی ''معنویت'' سے وہ ساری یعنیت اور لایعنیت سمجھ میں آتی ہے جو مادے اور مادّیت سے ہمارے تعلق اور رتال میل کی بنیاد ہے۔ **ترک مالا یعنیک یحقق لک ما یرضک. و قال الرسول صلی اللہ علیہ وسلم من حسن الأسلام المرء ترک مالا یعنیہ!**

اُدھر نقیبِ کے تبادے میں کتنے ہی جرائد و مجلّات آتے ہیں۔ اکثر تمھاری نظر سے گزرتے ہی ہوں گے۔ بیشتر مجلّے، مختلف علمی یا تحریکی مراکز کے ترجمان ہیں۔ (اور مرکز ____ کسی ''حلقے'' ہی کا ہوا کرتا ہے)۔ کبھی تم نے غور کیا کہ کیسے، دوسری تیسری یا چوتھی نسل تک، ہر ایک کی علمی یا تحریکی روایت پیش رو بزرگوں سے بحسن وخوبی منتقل ہوتی چلی آئی ہے۔ اور اس تسلسل کو تازہ خون اور تازہ بصیرت سے نہ صرف ہمیشہ زندہ رکھتی ہے بلکہ وقت اور ماحول کی نئی نئی ضرورتوں اور تقاضوں سے مطابقت پزیر بھی رکھتی ہے۔ روایات کی نگہ داری، پاسداری اور آب یاری، رجالِ کار کے ہاتھوں ہوا کرتی ہے۔ یہاں بول چال کی عربی میں ''ایک آدمی'' کے لیے بھی ''رِجّال'' کا لفظ بولتے ہیں۔ اس سے مجھے ''الرجالون قوامون'' کا موجودہ نقشہ سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یعنی ایک آدمی ____ چار عورتوں پہ بھاری ہے۔ یہاں ''بھاری'' کی جگہ بعض دوسرے قوافی بھی لائے جا سکتے ہیں مثلاً طاری، زاری، کاری، لاری، ناری، واری، یاری وغیرہ، مگر یہ تفصیل کا محل نہیں۔ اپنے یہاں تو ''الرجّال قوّالون'' کا نقشہ ہی دکھائی دیتا ہے۔

بات رجالِ کار سے چلی تھی۔ تم نے سنا ہوگا:

کام کے لوگ چند ہوتے ہیں
جو کسی کام کے نہیں ہوتے
سب ترقی پسند ہوتے ہیں

یا ____ شاعر نے کہا تھا کہ:

جو خاص ہیں وہ شریکِ گروہِ عام نہیں
شمارِ دانۂ تسبیح میں امام نہیں

أفھمت الشيء؟ صَحَ و لا، لا اِنّ اللّبیب من الاشارۃ یفھم!

اور کیا لکھوں؟

تم نے اس دوست کا نام پوچھا، جس کی نظم (۴) میرے مضمون میں شامل ہے، شاید تم نے انھیں دیکھا بھی ہو ____ ان کا نام ہے چودھری عبدالرؤف۔

ہاں ____ نقیبِ کے تعلق سے، ایک دو باتیں اس لیے لکھے دیتا ہوں کہ متعلقہ ''حلقوں'' تک پہنچ جائیں۔ پہلی بات یہ کہ ستمبر تا فروری کے شمارے دیکھے تو سبھی کے سرورق ____ بہت اچھے لگے۔ اس کی خصوصی مبارک باد، جناب الیاس میراں پوری کو پہنچے۔ مندرجات کا معیار بھی، ماشاءاللہ بہت اعلیٰ ہے۔

تمھارے ساتھ Share کرنے کی ایک بات یہ ہے کہ مختار احمد کاشف صاحب کون ہیں؟ میں نہیں جانتا۔ لیکن ان کی لکھی ہوئی منقبتِ (۵) سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ پڑھ کر لطف آ گیا۔ ایک مدت کے بعد، ایسی چوکس شاعری پڑھی۔

مولانا زاہد الراشدی مدظلہ کی ایک تقریر پڑھی۔ بنوثقیف کے قبولِ اسلام کی تفصیل کو جس خوبی سے آج کے لبرل مسلمانوں کے احوال پر انھوں نے منطبق فرمایا____ اس پر دل سے دعا نکلی اور زبان سے داد! حضرت مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کا مضمون، اقبال پر،____ مولانا محمد مغیرہ کا مضمون (بلکہ جوابِ مضمون) بھی اپنی اپنی جگہ خوب لگے۔

ایک صاحب پاکستان جارہے تھے۔ سوچا تھا، اُن کے ہاتھ یہ خط بھی اور مزید کچھ چیزیں بھی بھجوادوں گا۔ وہ گھر (گجرات) پہنچ کر، ڈاک میں ڈال دیں گے لیکن تمھاری بے تابی کی تاب نہ لاتے ہوئے، آج اسے ڈاک میں ڈالتا ہوں۔

یہ خط مختلف قسطوں میں، اور بیشتر مدرسے کے اوقاتِ فرصت میں، لکھا گیا ہے۔ میرا خیال ہے، اتنی پھرتی اس سے پہلے میں نے کم کم دکھائی ہے۔ بزرگوں نے کہا ہے نا____

تا　مرد　سخن　نگفتہ　باشد
عیب　و　ہنرش　نہفتہ　باشد

اس تحریر میں تمھیں جابجا بوریت، بے ربطی اور بے علمی کی پرچھائیاں____ بلکہ چھائیاں (کیل، مہاسے، داغ) نظر آئیں گی اور تمھارے ''ذوقِ صبیح'' پر گراں بھی گزریں گی۔ لیکن ''یہی ممکن تھا اتنی جلدی میں''!

پسِ نوشت: اس خط میں کہیں تمھاری ہمشیر کا ذکر نہیں آیا، اس کے فون کا خصوصی شکریہ! تم دونوں بہن بھائی میرا مبلغِ علم ناپنے تولنے پر تلے ہوئے ہو۔ اللہ تمھاری حفاظت اور میری نصرت فرمائیں۔ (آمین)

والسلام
محتاجِ دعا
''خالک وخالُ اُختک''
ذوالکفل

---

(۱) میں نے اپنے ذہنی ارتقا کا کچھ تذکرہ کیا تھا۔

(۲) انجینئر حافظ ارشاد احمد مرحوم، ماموں جان کے عزیز دوست، مذکورہ بالا عنوان کے تحت لکھے گئے سفرنامۂ حجاز کے محرک، ۱۳/ جنوری ۲۰۰۵ء کو ٹریفک حادثے میں انتقال فرمایا۔ یہ حادثہ ماموں جان کی طبیعت پر بہت اثر ہوا۔ میں نے متعدد مجالس میں ان سے حافظ صاحب کے محاسنِ اخلاق و معارف و افکار کا تذکرہ سنا۔

(۳) ''تخریبِ لفظی'' کے چند اعلیٰ تخلیقی نمونے برائے تخمیص لکھے گئے تھے۔

(۴) روشنی، پھول، صبا نامی یہ مضمون پہلی بار نقیبِ ختم نبوت شمارہ فروری ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔ نظم یہ ہے: میرے ہمدم، میرے دَمساز/ تری عمر دراز/ میں نے پڑھ لیں تری آنکھیں، تری آنکھوں کے سوال/ تو بھی پڑھ لے میرا لہجہ، میرے لہجے کی تھکن/ میں نے کیوں صحبتِ ساحل سے کنارہ نہ کیا؟/ میرے ہمدم، میرے دَمساز، تری عمر دراز/ ہاں کوئی حرفِ تسلی، کوئی دلدار نظر/ اک ذرا ٹھہرو کہ آنکھوں کی چبھن بہہ نکلے/ اک توقف کہ مرا دل میرے قابو میں نہیں! (شائع شدہ نقیبِ ختم نبوت شمارہ دسمبر ۲۰۰۵ء)

(۵) الاحرار اور نقیبِ ختم نبوت کے پرانے رفیقِ فکر جناب مختار احمد کاشف صاحب، اصلاً گجرات کے رہائشی ہیں، ایک عرصے سے دبئی میں مقیم ہیں۔ شعر و ادب اور تاریخ و سیرت مطالعے کے خاص مضامین ہیں۔ تشبیب میں ارشاد ہوا تھا:

نبی نے جس کو دعا دی یہی امیر ہے وہ
عرب کا مردِ خرد مند و باضمیر ہے وہ

بنام الیاس میراں پوری

مُلج

۱۸/ شعبان ۱۴۲۳ھ، ۲۴/ اکتوبر ۲۰۰۲ء

برادرِ عزیز الیاس میراں پوری۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا خط ملا۔ اسے پڑھ کر خوشی ہوئی۔ بہت دنوں بعد، کچھ پرانے معمول اور ماحول کی باتیں پڑھنے کو ملیں۔ لکھنے لکھانے میں اور پڑھنے پڑھانے میں، میں کچھ ایسا چست واقع نہیں ہوا۔ اس کا اندازہ آپ کو خوب ہوگا۔ اس لیے، یہ بات ملحوظ رہے کہ رابطے میں اور خط کا جواب دینے میں بعض اوقات تاخیر ہوا کرے گی، اسے بھی معمول کا حصہ سمجھا جائے۔

سفر کے ساتھ — ماحول، ملک، معاشرہ، مزاج، مذاق اور معمولات کی کتنی ہی تبدیلیاں وابستہ ہوا کرتی ہیں۔ ان کا قصہ لکھنے بیٹھوں تو دفتر درکار ہوں گے۔ زندگی کا ہر تجربہ کچھ اثرات، کچھ ارتسامات اپنے ساتھ لاتا ہے۔ کچھ عارضی، کچھ دیرپا۔ اللہ نے موقع دیا، تو میرا خیال ہے کہ ان احوال کے کہنے سننے میں، آپ کی دلچسپی (یا— دلچسپی سے زیادہ استفادے) کا کچھ سامان ضرور فراہم ہوسکے گا۔ (یعنی— عندالملاقات!)

''ناصح مشفق'' ایک ترکیب ہے۔ آپ اگر اوپن یونیورسٹی سے ''اردو'' کا اختیاری مضمون تیار کررہے ہیں تو زیادہ امکان ہے کہ اس ترکیب سے باخبر ہوں گے۔ خیر۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ یہ ترکیب کچھ اچھے مفہوم میں عموماً استعمال نہیں ہوتی۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ اوّل تو نصیحت یا تنبیہ یا فہمائش کسی کو بھی بھلی نہیں لگتی۔ دوسرے یہ کہ اگر ناصح کا اور ''منصوح'' کا (مجھے نہیں معلوم کہ، لفظ ہے بھی، یا نہیں— خیر آپ سمجھ لیں کہ ہے) رابطہ، طلب اور رسد کی بنیاد پر ہو تو بات بنتی ہے ورنہ نہیں — تیسرے یہ کہ اگر ''دیگراں را نصیحت، خود میاں فضیحت'' والا معاملہ ہو تو معاملہ اور بھی چوپٹ ہوجاتا ہے۔ اب آپ یہ جانیے کہ ان تینوں ہی وجوہ کی بنا پر، مجھے ناصح مشفق بننا کبھی اچھا نہیں لگا۔ لیکن اس کے باوجود، میرا خیال ہے (بلکہ یقین ہے) کہ یہ حرکت مجھ سے بہت دفعہ سرزد ہوتی رہی ہے، اس لیے کہ زندگی میں بہت سے کام تو ہمیں کرنے ہوتے ہیں اور بہت سے کام کرنے پڑتے ہیں۔ (ان دونوں میں جو فرق ہے، اسے بھی دھیان میں لائیں)۔ آپ کے معاملہ میں بھی، اس سلسلے میں کوئی استثنا نہیں رہا۔ اس میں بہت دفعہ ناگواری ہوجاتی ہے۔ میں چلتے وقت اس ناگواری کے لیے معذرت چاہتا تو یہ ایک رسمی بات ہوتی۔ تاہم میرا خیال ہے اب میں اگر معذرت چاہوں تو قبول کی جائے گی۔ ایک بات البتہ ضرور کہوں گا کہ زندگی میں، منصب، علم، عمر، تجربہ اور طبیعت کے لحاظ سے بہت مختلف بلکہ متضاد کیفیتوں کے حامل لوگوں سے ملنا اور استفادہ کرنا سیکھیے۔ اس کے لیے سب سے بنیادی شرط ہے خوش خلقی، خیرخواہی اور خیراندیشی۔ اب لکھتے لکھتے شاید بہک رہا ہوں، اس لیے بس کرتا ہوں کہ خط— کوئی ملفوظ نما چیز نہ بن جائے۔

محسن شاہ جی رحمۃ اللہ علیہ کی دو نظمیں، واپس ارسال کررہا ہوں۔ باقی، بشرطِ فرصت۔ سبھی کرم فرماؤں کو سلام اور دعا کی درخواست پہنچا دیں۔ ہاں، آپ کے استادِ گرامی ''سید الطابعین'' استاد اللہ بخش صاحب زید معالیہ پپھڑوی کا نام شاید پچھلی دفعہ رہ گیا۔ انھیں سلام عرض کیجیے گا۔

والسلام

محتاجِ دعا

ذوالکفل بخاری

مرے مولا محمد، مرے سچے محمد!
ﷺ

مرے مولا محمد!
مرے سچے محمد!
مری دنیا میں جب سے، جس قدر سچائی ہے وہ آپ ہی سے ہے
مرے پاکیزہ طینت، پاک دامن، پاک زاد و پاک نفس و پاک بیں مولا!
مری دنیا میں جب سے، جس قدر پاکیزگی ہے آپ ہی سے ہے
مرے سچے محمد!
بھلائی جس قدر دنیا میں ہے، وہ آپ ہی سے ہے
مرے مولا محمد!
مری دنیا، مری دنیا نہیں یہ آپ ہی کی ہے
آپ ہی کے دم قدم سے، فیض سے، لطف و کرم سے
ذاتِ بابرکات سے، آباد ہے جب سے بھی یہ
اور جس قدر آباد ہے، یہ آپ ہی سے ہے
مرے سچے محمد!
مجھے سچائی کی، پاکیزگی کی اور بھلائی کی
جتنی ادائیں یاد ہیں وہ آپ ہی کی ہیں
ادادارِ نبوت...... میری اتنی سی گزارش ہے
مری اپنے ادافہموں سے نسبت خاص کر دیجیے
مجھے سچوں، بھلوں، پاکیزہ تر لوگوں کے قدموں میں جگہ دیجیے!
مجھے میری ہی دنیا میں قوی و معتبر کیجیے
یہ دنیا آپ ہی کی ہے
مرے مولا محمد!
مرے سچے محمد!
ﷺ

معلوم، نامعلوم

مجھے معلوم ہے
اک عمر اب بھی انت کو آواز دیتی ہے
مگر اس خام خواہش، حسرت بے جا کی بستی میں
ہٹیلے اور ضدی سبزۂ نوعمر کے ہر ایک بازیچے
گل و برگ و نہال و نخل کے اک ایک کوچے میں
ہزاروں شبنمی پیکر
فنا انجام ہو جانے سے بچنے کے جنون و خبط میں
خیل سواران عدم آباد کے پاؤں پکڑتے ہیں
تو لامحدود شادابی کے خوابوں کے پرندوں کو
یہی آواز اڑنے سے ڈراتی باز رکھتی ہے
پرندوں کی حجر باری کی زد سے
سبزہ وا حفاد آب و خاک کے در پے
تبختر زاد و فیل اندام تعبیروں کے بچ جانے
کی راہیں ڈھونڈتی ہموار کرتی ہے
یونہی اس خام خواہش، حسرت بے جا کی بستی میں
میں صدیوں سے فقط اک عمر کو
اک انت کو آواز دیتے سنتا رہتا ہوں
میں اپنی عمر، اپنے انت کو آواز کب دوں گا؟
مجھے معلوم ہی کب ہے!

حکایت جو درمیاں سے سنی

گھڑیاں، لمحے، پل، دقیقے، قرن، صدی اور جگ
لحظے، ساعت اور سمے
انجانے میں بیت گئے
اور بیت بیت کے جیت رہے
کس سے جیتے، کیسے جیتے کون ہزیم تھا ٹھہرا
مت پوچھو جی ایسی باتیں، ایک زعیم نہ ٹھہرا
جی چاہے اک ایک سے پوچھوں کیا کھویا کیا پایا
حال، مقام، مکان، زبان، کچھ بھی ہاتھ نہ آیا
رنگ، خیال، مُدوّر رستے، ان بوجھی تحریک
قفس کرشموں کے میتوں کو وقت کرے تو کیوں مہمیز؟

شام جھانکتی ہوئی

پہر پہر روزنوں کی اوٹ سے تمام دن
شام جھانکتی ہوئی
فصیل و بامِ شہرِ شب کو روندتی پھلانگتی
شام جھانکتی ہوئی
لہر لہر تیرگی میں ڈوبتی چلی گئی
ابھر کے موج ہو گئی
دبک کے برف بن گئی
بہی تو حرف بن گئی
شام جھانکتی ہوئی
پسِ نقابِ شام سب ستارگاں شریر سے
کچھ پناہ گیر سے
تیرہ تار آنگنوں میں
جھانکنے کی کوششوں میں
فرطِ اضطراب سے
ساغرِ حجاب سے
یک بیک چھلک پڑے

ٹوٹ کر بکھر گئے
تو آنگنوں کے آس پاس
اَن کہی کہانیوں کے
بے شمار سایہ دار سے شجر
پھیلتے چلے گئے
شام پھیلتی گئی
کہانیوں کے سائے میں
غنودگی کے جگنوؤں کی آب و تاب کھو گئی
تو سائے گہرے ہو گئے
جھانکیوں کی گودیوں میں جھوٹ موٹ سو گئے
جھانکیاں جوان ہیں
کہانیاں جوان ہیں
سائے بھی جوان ہیں
شام بھی جوان ہے
شام جھانکتی ہوئی

غیر مطبوعہ

پرانی خبروں پہ سرخی نئی جمانا کیا

یہ رونا پیٹنا کاہے کا، دل جلانا کیا
پرانی خبروں پہ سرخی نئی جمانا کیا
پرانی قبروں پہ آنسو نئے بہانا کیا
ہمارے رونے کا اب تو سبب نہیں کوئی
یہ مسکرانا، یہ ہنسنا، یہ کھلکھلانا کیا

غم کی موج خوشی کو دھکیل دے کب تک
نیا سندیسہ، اداسی کے نئے (پیغام)
یہ موج موج سندیسے، یہ لیکھ ساگر میں
ہوا کے رحم وکرم پر
یہ ناؤ سانس کی ناؤ
کہ آس چپو سے
ہمیں ہی کھینا ہے، کب تک نجانے کھیتے رہیں
بہاؤ تیز یا سہج ہو، ہم اس پر سہجتے ہیں
یہ دھوپ چھاؤں کے موسم کی سخت سست باتیں
ہمیں ہی سہنا ہو کب تک نجانے سہتے رہیں

غیر مطبوعہ

ہمارے نام کی چٹھی، ہمیں کو لینا ہے

یہ سادہ سادہ لکیریں ہمارے ہاتھوں کی
یہ صاف واضح، یہ روشن ___ تحریریں
بہت قدیم سے
نجانے کون جنم سے، ہمارے ساتھ
کہ جیسے ہمارے نام کی چٹھی، ہمیں کو لینا ہے
سندیسہ جو بھی ہے، جیسا بھی ہے
ہمیں کو پڑھنا ہے
لرزتے کانپتے ہاتھوں، دھڑکتے دل سے
روز ہمارے نام کی سب چٹھیاں ___ نجانے کہاں
کوئی تو ہے جو سنبھالے ہوئے ازل سے ہے
بس ایک ایک سندیسہ، یہ ایک ایک پیام
نجانے کون سی ترتیب خاص و مخفی سے

ضرور ملتا رہے گا ہمیں ملے گا یقیناً
ہمیں کو پہنچے گا ہر صبح
اور ہر شام
ہمارا کوئی ٹھکانا، پتا نہیں کوئی
ہمارا نام نسب اب وجد، نہیں کوئی
نہ مرز بوم، جنم بھوم ہے نہ
کوئی گھر
یہ کون ہے جو ہمیں لیے لیے پھرتا ہے

غیر مطبوعہ

حبیباں ہم کدھر جائیں ☆

حبیباں تم چڑھے دن کی چمکتی تیز کرناں ہو
جو تم سے دوستی رکھیں
تو یہ سانساں پگھل جاویں
جو تم سے دشمنی رکھیں
تو دیواراں درختاں پہ، اپن کی کرچیاں ہر سو بکھر جاویں

حبیباں ہم کدھر جائیں
حبیباں ہم تو سائے ہیں
جو دیواراں، درختاں سے
لیٹ کے نینداں کرتے ہیں
بتاں کی، لُعبتاں کی، بالکاں کی، نغمہ خواناں کی
ناریاں کی، بے زباناں کی
جواناں گھبروؤاں کی،
کساناں، ساربانان کی، پنچھیاں کی، نغمہ خواناں کی
پریمی، رس بھری باتاں
وہ ٹھنڈی چاندنی راتاں
حکایاتاں شکایاتاں
ہمیں خواباں سے چونکاویں
تو پھر نینداں کہاں آویں؟

☆ محترم ڈاکٹر اسلم انصاری کی رائے میں یہ نظم بھوپالی زبان میں لکھی گئی ہے۔

غزل

اب تو یوں ہے کہ مجھے صلح کا یارا بھی نہیں
جانتا ہوں کہ بغیر اس کے، گزارا بھی نہیں

جس قدر تجھ سے تعلق ہے حریفانہ ہے
جز ترے اور مجھے کوئی پیارا بھی نہیں

جو ہوا، ٹھیک ہوا، ایسا تو ہونا ہی تھا
دوش میرا بھی نہیں، جرم تمھارا بھی نہیں

میں کہ ہر گام گرا، ڈھیر ہوا پر نہ ہوا
کیوں سنبھل جاتا کہ جب تو نے سہارا بھی نہیں

تو نے برباد کیا مجھ کو مری مرضی سے
زندہ رہنے نہ دیا تو نے تو مارا بھی نہیں

ہاں فقط میں نے یہی سوچ کے چاہا تھا تجھے
فائدہ اس میں نہ ہوگا تو خسارا بھی نہیں

رفتید و لے نہ از دلِ ما

(صاحبانِ علم و ہنر کے تاثرات اور تعزیتی مکاتیب)

علماء و زعما:

☆حضرت مولانا خان محمد صاحب دامت برکاتہم العالیہ

بعد الحمد والصلوٰۃ وَ ارسالِ التسلیمات والتحیات، فقیر ابوالخلیل خان محمد عفی عنہ کی طرف سے عزیز مکرم جناب سید کفیل شاہ بخاری سلمہ مطالعہ فرماویں کہ فقیر الی اللہ، خیریت سے ہے اور آپ بھی عافیت سے ہوں گے۔

عزیزم سید ذوالکفل شاہ بخاریؒ کی شہادت کی اطلاع ملی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرماویں اور ترقیِ درجات سے نوازیں اور آپ تمام پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق دیں۔ آمین۔ عزیز صالح اور نیک سیرت انسان تھے اور فقیر اور خانقاہ شریف سے اُن کا مخلصانہ تعلق تھا۔ حرمین شریفین میں بھی املج سے وقت نکال کر فقیر کی ملاقات کے لیے سفر کیا کرتے تھے اور پاکستان آمد کے موقع پر بھی خانقاہ کے لیے سفر کیا کرتے تھے۔ اُن کی بہت سی یادیں ہیں۔ یہ سب اُن کے اکابر کی تربیت کا ثمر تھا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی حفاظت فرماویں۔ آمین والحمدللہ علیٰ ذالک۔

والسلام
فقیر خان محمد عفی عنہ
خانقاہ سراجیہ
۱۳/صفر ۱۴۳۱ھ

☆فضیلۃ الشیخ حضرت مولانا محمد مکی حجازی دامت برکاتہم (مدرّس حرم مکہ)

جنت المعلیٰ میں امیرِ شریعت کا نمائندہ

عزیزم سید ذوالکفل بخاری رحمۃ اللہ علیہ کو علم، نیکی اور شرافت وراثت میں ملی تھی۔ حق یہ ہے کہ وہ اس وراثت کا امین اور اہل تھا۔ عزیزم ذوالکفل بخاری کی اچانک موت سے صدمہ پہنچا۔ وہ ایک باکرامت صالح نوجوان تھا۔ جتنی جلدی اس کی تدفین کے مراحل طے ہوئے بہ ظاہر ناممکن تھا۔ میں اس وقت جنت المعلیٰ کے احاطۂ بنی ہاشم میں ام المؤمنین سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی قبر مبارک کی پائنتی اور سید ذوالکفل بخاری کی قبر کے سرہانے کھڑا ہوں۔ ہم نے اپنے پیارے عزیز کو قبر میں سلا دیا ہے۔ امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا نواسہ اماں کے قدموں میں ڈال کر جنت المعلیٰ میں قیامت تک کے لیے اپنے خاندان کا مستقل نمائندہ بھیج دیا ہے۔ ہم ذوالکفل کے لیے دعا کر رہے ہیں۔ عزیزم کفیل! تم بھی دعا میں شریک ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ ذوالکفل کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین (تدفین کے وقت سید کفیل بخاری سے فون پر گفتگو)

☆فضیلت الشیخ حضرت مولانا عبدالحفیظ مکی مدظلہ (امیر انٹرنیشنل ختم نبوت موومنٹ، مکہ مکرمہ)

سید محمد ذوالکفل بخاری رحمتہ اللہ علیہ سے مکہ مکرمہ میں گاہے بہ گاہے ملاقات ہو جاتی تھی۔ وہ جتنی بار ملے اپنے علم وفضل کا گہرا نقش چھوڑ کر گئے۔ عجز وانکسار اور مروّت وتواضع اُن کی بڑی خوبی تھی۔ وہ اپنے اکابر کے راستے پر ثابت قدمی سے

چلے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں ایمان پر خاتمے کی دولت سے مالا مال کیا۔ ایسے باصلاحیت اور صالح نوجوان کی موت سے جہاں خاندانِ امیرِ شریعت کو گہرا صدمہ ہوا ہے وہاں ہم معتقدین کے دل بھی غم زدہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت اور درجات کی ترقیاں نصیب فرمائے۔ آمین

☆ **مولانا فضل الرحمٰن (امیر جمیعتِ علمائے اسلام، ف)**

سید ذوالکفل بخاری جیسے صالح اور باصلاحیت نوجوان کی موت ہم سب کے لیے گہرا صدمہ ہے۔ لیکن اُن کا ایمان پر خاتمہ، حرم شریف میں حج کے موقع پر نمازِ جنازہ اور جنت المعلی میں مستقل سکونت یقیناً اُن کے بلندیِ درجات اور ہمارے لیے صبر واطمینان کا باعث ہے۔ میں اُن دنوں سفرِ حج پر تھا اور وہیں اُن کی شہادت کی خبر سنی۔ مولانا محمد مکی حجازی اور دیگر احباب نے جس بھلائی کے ساتھ اُن کا تذکرہ کیا وہ قابلِ رشک ہے۔ مرحوم کے اچانک انتقال سے خاندان اور علم وادب کی دنیا میں بڑا خلا پیدا ہوگیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے حسنات کو قبول فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔

(سید وکیل شاہ صاحب سے تعزیتی گفتگو، دارِ بنی ہاشم ملتان، ۲۰/ جنوری ۲۰۱۰ء)

☆ **مولانا سمیع الحق (امیر جمیعتِ علمائے اسلام، س)**

میں نے سید ذوالکفل بخاری کو دیکھا نہیں پڑھا ہے۔ نقیبِ ختمِ نبوت میں اُن کی تحریریں پڑھ کر اُن کی علمی وادبی شخصیت کا دل پر ایک گہرا نقش قائم ہوا تھا۔ میں ان کے وسیع مطالعے اور ادبی تحریروں سے بہت متاثر تھا۔ افسوس اُن سے ملاقات ادھوری رہ گئی۔ حق تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل سے نوازے۔ آمین۔ (سید کفیل بخاری سے فون پر تعزیت)

☆ **سید منور حسن (امیر جماعت اسلامی پاکستان)**

مکرمی ومحترمی سید محمد وکیل شاہ صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یہ جان کر افسوس ہوا کہ آپ کے ہونہار صاحبزادے پروفیسر سید ذوالکفل بخاری صاحب مکہ مکرمہ میں ٹریفک کے حادثہ میں شہید ہوگئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جس ذات نے صدمہ دیا ہے، وہی برداشت کی قوت بھی دینے والا ہے۔ ورنہ جگر گوشے کا غم تو جسم و جان میں اتر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہرا بھرا رکھے اور سب اہلِ خانہ کو بہترین حوصلہ وصبر سے نوازے۔ آمین

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے، اُنھیں شہادت کے مرتبہ پر فائز فرمائے۔ تمام گناہوں، لغزشوں اور خطاؤں سے درگزر فرمائے۔ تمام نیکیوں، بھلائیوں اور حسنات کو قبول فرمائے۔ خاص اپنے سایۂ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور یہ جنت کے دروازے پر اپنے والدین کا استقبال کریں۔ آمین۔

حقیقت یہ ہے کہ اِس جہان کی تو ہر شے عارضی ہے۔ یہاں کی خوشی بھی اور غم بھی، یہاں کا ملاپ بھی اور جدائی بھی، جب کہ اُس دوسرے جہان کی ہر شے دائمی ہے، باقی رہنے والی ہے۔ پس دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو وہاں اپنی جنتوں میں ملا دے، جس کے بعد نہ کوئی فراق ہے اور نہ ہی کوئی غم!

میری طرف سے بعد سلام تمام اہلِ خانہ تک تعزیت کے یہ الفاظ اور میرے جذبات پہنچا دیجیے گا۔ ممنون ہوں گا۔

امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ اللہ سبحانہ اچھا رکھے اور ہم سب کو اپنی رضا جوئی میں لگائے رکھے۔ آمین۔

☆مولانا عبدالرشید ربانی (سرپرست جمعیتِ علمائے برطانیہ، ڈیوزبری)

محترم ومکرم جناب سید محمد کفیل بخاری دامت برکاتہم، سلام مسنون، نیاز مقرون۔

آپ کے عزیز بھائی سید محمد ذوالکفل بخاری مرحوم کی مکہ مکرمہ میں وفات کی خبر سن کر صدمہ ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ یہ صدمہٗ جانکاہ صرف آپ کے خاندان کا نہیں بلکہ آپ کے نانا حضرت امیرِ شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت سے سادات کے خاندان سے وابستہ لاکھوں عقیدت مندوں کا مشترکہ صدمہ ہے۔ میں اپنی طرف سے اور جمعیتِ علمائے برطانیہ کی طرف سے خاندان کے تمام پسماندگان خصوصًا آپ سے، حضرت پیر جی مدظلہ العالی سے اور سیدہ اُمِ کفیل مدظلہا سے دلی تعزیت کا اظہار کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اِس حادثہ پر آپ سب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے اور مرحوم و مغفور کو جو جنت المعلیٰ میں پہنچ چکے ہیں، جنت الفردوس عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

☆مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی (لندن)

روزنامہ جنگ لندن میں سید ذوالکفل بخاری مرحوم کے حادثہ میں انتقال کی خبر پڑھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اُن کے مضامین نقیبِ ختمِ نبوت میں اکثر پڑھنے کو ملتے۔ اُن کی تحریر میں اصابتِ فکر اور قدرتِ زبان نمایاں تھی۔ وہ نہ صرف اپنے نانا سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے خاندانی اوصاف کے حامل تھے بلکہ اُن کی فکر کے صحیح نمائندے بھی تھے۔ نوجوانی میں شہادت کی موت اور وہ بھی ارضِ حرم میں بڑی سعادت کی بات ہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ اور پورے خاندان کے لیے یہ صدمہ بہت گہرا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے حسنات کو قبول فرمائے اور عفو و درگزر والا معاملہ فرمائے۔ آپ سب پسماندگان کو صبرِ جمیل کی نعمت سے نوازے۔ آمین۔ میری طرف سے اپنی والدہ ماجدہ، والد صاحب اور مولانا سید عطاء المہیمن بخاری صاحب تک تعزیت پہنچا دیں۔ (سید کفیل بخاری سے فون پر اظہارِ تعزیت)

☆ڈاکٹر علامہ خالد محمود (لندن)

سید محمد ذوالکفل کی وفات کا سن کر دل و دماغ پر گہرا اثر ہوا۔ وہ ایک صاحبِ علم اور متقی انسان اور خانوادۂ امیرِ شریعتؒ کی جملہ روایات کا امین تھا۔ وہ اپنے علم و عمل سے متاثر کرنے والا انسان تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کی حسنات کو قبول فرما کر ایمان پر خاتمہ نصیب فرمایا۔ اللہ تعالیٰ اُسے آخرت میں بھی اعلیٰ درجات اور خصوصی انعامات سے نوازے۔ آمین۔

☆ قاری محمد حنیف جالندھری (مہتمم جامعہ خیرالمدارس ملتان/ ناظم اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ پاکستان)

سید ذوالکفل بخاری نہایت قابل، صالح اور ذہین انسان تھے۔ میرے ساتھ اُن کا اخلاص بھرا تعلق ناقابل فراموش ہے۔ اُن کی گفتگو میں علم بولتا تھا۔ وہ بڑے کام کے آدمی تھے۔ اُن کا بچپن اور جوانی میرے سامنے ہے۔ مستقبل میں ذوالکفل سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ اُن کی رحلت ایک بڑا قومی نقصان ہے۔

☆مولانا زاہد الراشدی (سیکرٹری جنرل پاکستان شریعت کونسل)

امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے اِس ہونہار نواسے کی اچانک اور حادثاتی موت نے تو کچھ لمحات کے لیے ذہن پر سکتہ طاری کر دیا۔ وہ مکہ مکرمہ کی اُم القریٰ یونیورسٹی میں تدریسی خدمات سرانجام دے رہے تھے اور کئی برسوں سے سعودیہ میں مقیم تھے۔ اِس سال اپریل کے دوران مکہ مکرمہ میں حاضری کے دوران میری خواہش رہی کہ اُن سے ملاقات ہو جائے مگر میرے میزبان کا اُن سے رابطہ نہ ہوسکا۔ اور اب پیر کے روز میں میرپور آزاد کشمیر کے ایک دینی مدرسہ کے اجتماع

میں شرکت کے لیے جارہا تھا کہ برادرم عبداللطیف خالد چیمہ نے ٹیلی فون پر گلوگیر لہجے میں یہ خبر دی کہ سید ذوالکفل بخاری مکہ مکرمہ میں ٹریفک کے ایک حادثہ میں انتقال کر گئے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ وہ اپنی عمر کے چالیس برس بھی مکمل نہیں کر پائے تھے کہ بلاوا آ گیا۔

موت کا وقت، جگہ اور کیفیت تینوں اللہ تعالیٰ کے ہاں طے شدہ ہیں اور تقدیر میں ازل سے لکھی ہوئی ہیں۔ مگر خود انسان کو اِن میں کسی ایک کا بھی علم نہیں ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول اسی بے خبری پر دنیا کی ساری رونقیں قائم ہیں۔ ورنہ ہر انسان کو مرنے سے پہلے بار بار مرنے کے مراحل سے گزرنا پڑے۔ سید ذوالکفل بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ تعارف تو تھا ہی کہ وہ امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے نواسے اور بخاری خاندان کے چشم و چراغ ہیں، مگر ہمارے لیے اُن کا ایک تعارف اور بھی تھا کہ وہ علم وفکر کی دنیا کے آدمی تھے۔ مطالعہ کرنا، مسائل پر بحث ومباحثہ کرنا اور نقد و جرح کے ساتھ ہر بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرنا اُن کا ذوق تھا۔ دارِ بنی ہاشم ملتان میں اُن سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں اور بہت سے مسائل پر اُن سے گفتگو ہوئی۔ اُن کا کریدنا اور سوال کا انداز مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ میرا اپنا ذوق یہ ہے کہ گہرائی اور سنجیدگی کے ساتھ سوال کرنے والے نوجوان کا منتظر رہتا ہوں۔ مطالعہ وتحقیق اور بحث وکرید کے میدان میں آج کے دور میں جن نوجوانوں سے وابستہ امیدیں مسلسل بڑھتی جارہی تھیں اُن میں ایک اہم نام سید ذوالکفل بخاری کا بھی تھا۔ اور اِس پہلو سے یہ میرے لیے ذاتی صدمہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ اُنھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یارب العالمین۔

....

سید ذوالکفل بخاریؒ ہمارے ملک کے اُن باشعور نوجوانوں میں سے تھے جن سے بجاطور پر اہلِ نظر کی یہ توقعات وابستہ ہوگئی تھیں کہ امت مسلمہ کی زبوں حالی کے اِس دور میں وہ اپنی ذہانت، مطالعہ، تدبر اور حوصلہ کے ساتھ علمی وفکری راہ نمائی کی وہ روایت قائم رکھ سکیں گے جو ہمارے ماضی کے تسلسل کا حصہ رہی ہے اور جس روایت کا ذکر ہوتے ہی ماضی قریب میں مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا ظفر علی خانؒ، چودھری افضل حقؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا عبد الماجد دریابادیؒ اور آغا شورش کاشمیریؒ جیسے عظیم نام خود بخود ذہن کی سکرین پر ابھر آتے ہیں۔

اُن کا تعلق ایک ایسے گھرانے سے تھا جس کے تعارف میں سب سے پہلے خطابت کا تذکرہ ہوتا ہے اور اردو زبان کے سب سے بڑے خطیب امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی خطابت سے اس خاندان کے تعارف کا آغاز ہوتا ہے، لیکن یہ خطابت خالی اسٹیج کی خطابت نہ تھی، بلکہ اس کی پشت پر علم وحکمت، زبان وادب، مطالعہ وتحقیق اور رجز وشعر کے ساتھ ساتھ لہجے کی گھن گرج اور محاورے کی چاشنی بھی پوری آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر رہی ہے۔ سید ذوالکفل بخاریؒ نے جن نابغہ شخصیات کی سرپرستی میں شعور کی منزلیں طے کیں، ان میں سید ابوذر بخاریؒ کا نام سب سے نمایاں ہے جنھیں اس دور میں ایک چلتی پھرتی اور بحث وتجسس کرتی ہوئی لائبریری کے عنوان سے معنون کیا جا سکتا ہے اور اس سیرگاہ کے گل ہائے رنگا رنگ کی خوشبو سید ذوالکفل بخاریؒ کی باتوں سے بھی چھلکتی تھی۔

سید ذوالکفل بخاریؒ کا تعلق قلم اور کتاب سے تھا اور علم وشعور کی باتیں ہی ہر وقت ان کی نوک زبان پر رہتی تھیں۔ وہ مطالعہ کی گہرائی میں ڈوب کر جب تجزیہ وتحقیق اور استفسار وسوال کی طرف متوجہ ہوتے تو ان کی نکتہ رسی کا سامنا کرنا مشکل ہو جاتا تھا۔ مجھے ان کے ساتھ متعدد محفلوں میں گفت وشنید کا موقع ملا ہے اور وہ ان معدودے چند نوجوانوں میں سے تھے جن کے سوال کا جواب دینے کے لیے پہلے کچھ دیر سوچنا پڑتا تھا۔ خدا جانے ایسے نوجوان مجھے کیوں زیادہ پسند ہیں جو روایت کے

دائرے میں خود کو پوری طرح پابند رکھتے ہوئے

لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

کے ذوق سے بھی بہرہ ور ہیں۔ شاید یہ مستقبل کی صحیح صورت گری کے تقاضوں میں سے ہو۔

مجھے سید ذوالکفل بخاریؒ سے انس تھا ان کے خاندانی تناظر کی وجہ سے، ان کے علمی ذوق کی وجہ سے، کتاب کے ساتھ ان کے والہانہ تعلق کی وجہ سے، ان کے سوالات کے تیکھے پن کی وجہ سے اور امت کے لیے ان کے درد میں ڈوبے ہوئے دل کی وجہ سے! یہ باتیں تو شاید کہیں نہ کہیں بکھری ہوئی مل ہی جائیں گی مگر ان سب کے مجموعہ کو سید ذوالکفل بخاریؒ کی صورت میں اب کہاں تلاش کروں گا؟

ہائے او موت تجھے موت ہی آئی ہوتی

☆مولانا محمد عمار خان ناصر

برادر مکرم ومحترم سید کفیل شاہ بخاری صاحب زید مجدہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

سید ذوالکفل بخاری رحمہ اللہ جیسی پاک باز اور صاحبِ علم وفضل شخصیت کا اِس شباب کے عالم میں رخصت ہو جانا حقیقی معنوں میں نہ صرف آپ کے خاندان بلکہ بحیثیتِ مجموعی پورے معاشرے کے لیے نا قابلِ تلافی نقصان کا درجہ رکھتا ہے۔

مجھے مرحوم ومغفور کے ساتھ بالمشافہہ ملاقات کا شرف کبھی حاصل نہ ہو سکا، البتہ بعض مواقع پر ٹیلی فون پر مختصر گفتگو کا موقع ضرور پیدا ہوا۔ آخری موقع وہ تھا جب گزشتہ سال مئی میں اباجی (شیخ الحدیث حضرت مولانا سرفراز خان صفدر نور اللہ مرقدہ) کی وفات کے موقع پر اُنھوں نے سعودی عرب سے فون کر کے میرے ساتھ تعزیت کی۔ لیکن میل ملاقات کا سلسلہ نہ ہونے اور راہ ورسم غائبانہ تعارف تک محدود ہونے کے باوجود اُن کی وفات کے ایک روز بعد جب والدہ محترمہ نے اخبار کے حوالے سے دکھ بھرے انداز میں یہ خبر مجھے سنائی تو سچی بات ہے دل کی کیفیت ایسی تھی جیسے ہمارے اپنے خاندان کا کوئی فرد دنیا سے رخصت ہو گیا ہو۔ میں نے خود اپنی کیفیت کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی تو اندازہ ہوا کہ دین کے ساتھ تعلق، دیوبند کی عظیم علمی وفکری روایت سے ناتا، حضرت شاہ جی رحمہ اللہ کے خاندان سے نسبت، ہم عصر ہونے اور معاصر مسائل پر آزادیٔ فکر کے ساتھ غور کرنے کا رشتہ، قلم وقرطاس کی دنیا سے وابستگی اور اس کے علاوہ فکر واحساس میں قرب پیدا کرنے والے نجانے کتنے ہی رشتے ہیں جنھوں نے ایک ان دیکھے شخص کی وفات کو بالکل ذاتی صدمے کا درجہ دے دیا ہے۔ ان کے انتقال کے بعد جوں جوں ان کے حسن طبیعت اور فضل وکمال کے چھپے ہوئے پہلوؤں کا تذکرہ اُن کے جاننے والوں سے سننے کو مل رہا ہے، توں توں اس محرومی کا احساس زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔

بظاہر قضا وقدر کے ان فیصلوں کی حکمت ہمیں اپنی محدود سوچ کی گرفت سے باہر دکھائی دیتی ہے، لیکن ایک مسلمان کی حیثیت سے بہر حال ہمارا ایمان ہے کہ اللہ کا یہ فیصلہ اس کے علم وحکمت کے مطابق خیر ہی خیر ہے اور اسی میں مرحوم اور پس ماندگان کی دین ودنیا کی بھلائی پوشیدہ ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ قضا وقدر کی ان پوشیدہ حکمتوں پر ہم سب کے ایمان کو مضبوط بنائے، صبر اور حوصلے کے ساتھ تقدیر الٰہی کے فیصلوں کو قبول کرنے کی ہمت عطا کرے اور مرحوم کے درجات کو بلند سے بلند کرتے ہوئے پس ماندگان کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بننے کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین

☆ڈاکٹر سید وسیم اختر (امیر جماعت اسلامی پنجاب)

محترمی ومکرمی سید محمد کفیل بخاری صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

برادرم ذوالکفل کے انتقالِ پرملال کی افسوسناک اطلاع موصول ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بھائی کی رحلت حقیقت میں آپ اور سارے خاندان کے لیے بہت بڑی آزمائش ہے۔ اللہ رب العزت کے فیصلوں پر راضی رہنا ہی ہمارا بنیادی عقیدہ اور ایمان کا حصہ ہے۔ ایمان وآزمائش لازم وملزوم ہیں۔ اور اہلِ ایمان کا یہ شیوہ رہا ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف سے آنے والی ہر آزمائش پر راضی رہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی نیکیوں کو شرفِ قبولیت بخشے، لغزشوں سے درگزر فرمائے، اعلیٰ علیین سے نوازے اور سارے متاثرہ خاندان کو صبرِ جمیل سے نوازے۔ مرحوم کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ اُس کے حوالے سے خصوصی رحمت فرمائے۔ میری طرف سے تمام اہلِ خانہ کو تعزیت اور حوصلہ کا پیغام دیں۔

مرحوم منجاں مرنج شخصیت کے مالک تھے۔ پاکیزہ نفس اور عالم آدمی تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے۔

☆عمران ظہور غازی (منصورہ، لاہور)

محترمی ومکرمی سید کفیل بخاری صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اللہ کرے آپ خیر وعافیت سے ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے حفظ وامان میں رکھے۔ آمین۔

ذوالکفل بھائی کی وفات کی خبر ملی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے، درجات بلند کرے اور اعلیٰ علیین میں مقامِ بلند سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔

یہ آپ اور اہلِ خاندان کے لیے بہت بڑی آزمائش ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا یہی ہے کہ اہلِ ایمان، مومنینِ صادقین اُس کے فیصلوں پر راضی رہیں۔ اور یہی اہلِ ایمان کی شان ہے۔ مرحوم کے ساتھ بہت محبت واخلاص والا تعلق تھا۔ اور وہ بھی محبت وشفقت کا اظہار فرماتے۔ حقیقت میں وہ ایک عالمِ باعمل تھے۔ اللہ کے نیک بندے تھے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔

میری جانب سے دلی تعزیت قبول فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور دیگر اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل اجرِ جزیل کی دولت سے نوازے۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ والدہ محترمہ، سید وکیل شاہ صاحب اور سید عطاء المہیمن شاہ صاحب کی خدمتِ اقدس میں سلام اور تعزیت عرض کیجیے گا۔

☆مولانا عبداللطیف مدنی (استاذ الحدیث، جامعہ عربیہ چنیوٹ)

مخدوم ومحترم حضرت پیر جی سید عطاء المہیمن شاہ صاحب بخاری مدظلہ العالی، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مکرم ومحترم مولانا مشتاق احمد صاحب کے ذریعے آپ کے بھانجے اور داماد سید ذوالکفل بخاری کے انتقال کی خبر ملی تو بہت رنج اور صدمہ ہوا۔ موت کا ایک وقت مقرر ہے جو ٹل نہیں سکتا۔ جواں سالی کی موت برداشت کرنا حقیقتاً بہت مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔ خصوصاً جواں سال بھی ایسا جو اپنی خوبیوں کی بنا پر یکتائے روزگار ہو۔ بہر حال فرمانِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم الصبر عندالصدمۃ الاولیٰ کو مدِ نظر رکھیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک اعرابی نے جن موثر الفاظ میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے انتقال پر تعزیت کی تھی وہ ایک مردِ مومن کے لیے بہترین توشہ ہے۔ میں بھی اِن الفاظ کے ذریعے آپ سے اور دیگر

اعزہ سے تعزیت کرتا ہوں:

اصبر نکن بک صابرین فانما　　صبر الرعیة بعد صبر الرأس
خیر للعباس بعدک اجرہ　　واللّٰہ خیر منک للعباس

دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آں عزیز کی مغفرت فرمائیں، درجات بلند کریں اور آپ کو، مرحوم کے والدین، اہلِ خانہ، سید کفیل شاہ بخاری مدظلہ اور دیگر اعزہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائیں۔

☆مولانا عبدالقیوم حقانی (خالق آباد، نوشہرہ)

حضرت مولانا سید محمد کفیل بخاری زید مجدکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

مخدومِ مکرم پروفیسر سید محمد ذوالکفل بخاریؒ کے سانحۂ ارتحال وشہادت کی خبر سے حد درجہ رنج والم ہوا۔ احقر سفرِ حج میں تھا۔ واپسی پر اِس المناک خبر نے ہلا کے رکھ دیا۔ جامعہ ابوہریرہ میں شہید کے لیے ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کا اہتمام کیا گیا۔ شہید سے میری ملاقات نہیں تھی مگر میں نے انھیں پڑھا ضرور تھا بلکہ پڑھنے کے لیے بے تاب رہتا تھا۔

وہ صحافت وخطابت کے عظیم شہسوار تھے، مایہ ناز مدبر وحکیم، ملتِ اسلامیہ کے مخلص کارکن، بے باک اور باعزم مردِ میدان، درس وتدریس کا مزاج، طبیعت علم وادب کی۔ اُن کی زبان اور اُن کا قلم وقدم برابر یکساں چلتے رہے جن کے وجودِ مسعود سے ادب، صحافت، قلم اور علم کی فضا مشک بار تھی۔ آج اُن کے تصور میں آنکھیں اشکبار ہیں۔

اُن کے احباب، اعزہ، والدین، تلامذہ اور قریبی دوستوں کو کتنا غم ہوا ہوگا، اِس کی پیائش تو نہیں کی جاسکتی۔ البتہ اخبارات اور ماہنامہ نقیبِ ختم نبوت میں اربابِ فضل وکمال اور اہلِ قلم کے نثری اور منظوم رشحاتِ فکر وقلم سے اِس بات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فرد سے لے کر جماعت تک، شاگرد سے لے کر استاد تک اور معاصرین سے لے کر معتقدین تک سب کو آپ کے سانحۂ ارتحال پر سنگین غم لاحق ہوا ہے۔

موت اُس کی ہے، کرے جس پہ زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

احقر نے اُن کی تحریریں پڑھیں، علمی، ادبی اور تاریخی کاوشوں کا کیا کہنا؟ میدانِ درس وتدریس، میدانِ دعوت وعمل اور میدانِ تعلیم وتربیت میں قدم رکھنے کے بعد قلیل ترین عرصے میں شہید نے علمی، دینی، تدریسی اور ادبی حلقوں میں اپنی ایک خاص پہچان اور ممتاز شناخت بنالی تھی۔ آپ کی اعلیٰ علمی صلاحیتیں نکھر کر سامنے آنے لگیں اور آپ مقبولِ خاص وعام بن گئے۔

یغوص البحر من طلب اللّآلی
ویحظی بالسیارۃ النوالی

میں نے اُن کی جو چند ایک تحریریں پڑھیں، یہ تاثر قائم ہوا کہ آپ نے جتنا کچھ لکھا خوب لکھا۔ آپ کی فکری تحریریں اور تجزیے منہج سلف صالحین اور خانوادۂ بخاری کے مزاج ومذاق سے سرِمُو بھی انحراف گوارا نہ کرسکے۔ آپ کی تحریروں کو علمی وادبی حلقوں میں پسند کیا گیا، سراہا گیا اور دلچسپی سے پڑھا گیا۔ آپ کی تحریروں میں چاشنی اور قاری اور سامع کے احساسات وجذبات کو متاثر کرنے کا وصف نمایاں ہوتا۔

بہر حال شہید کو دیکھا نہیں تھا اور نہ سنا تھا، البتہ پڑھا ضرور تھا۔ اُن سے اور آپ کے سارے خاندان سے ایک قلبی

محبت، والہیت اور دیوانگی کی حد تک تعلقِ خاطر ہے۔ یہاں کے مشائخ اساتذہ اور طلبہ کی طرف سے تعزیت عرض ہے۔ اللہ کریم مرحوم کو کروٹ کروٹ رحمتوں سے نوازے۔ درجاتِ عالیہ سے سرفراز فرمائے۔ آمین۔

☆ **مفتی ہارون مطیع اللہ، کراچی** (نواسہ مولانا محمد گل شیر شہید رحمۃ اللہ علیہ)

سید ذوالکفل بخاری رحمۃ اللہ علیہ خود تو کامران ہوگئے، مگر بعد والوں کے لیے اپنی جدائی کا دائمی صدمہ چھوڑ گئے۔ اُن کی شہادت کے دنوں، مَیں مکہ مکرمہ ہی میں تھا۔ حق تعالیٰ نے انھیں اعلیٰ مقام سے نوازا۔ اُن کے بھائی اور ہمارے مخدوم سید کفیل شاہ صاحب بخاری اُن کے جملہ پسماندگان کے ساتھ خانوادۂ مولانا محمد گل شیر شہید کی جانب دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اظہارِ تعزیت کرتا ہوں۔

☆ **مولانا عرفان الحق اظہار حقانی** (جامعہ دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک)

محترم جناب ذوالکفل بخاری مرحوم کی حادثاتی وفات پر انتہائی افسوس ہوا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ آپ اور جملہ پسماندگان کو صبرِ جمیل سے نوازے۔ میں ذاتی طور پر اور ادارہ جامعہ حقانیہ اور جمعیت علمائے اسلام کی طرف سے آپ کے اس درد میں برابر کے شریک ہیں ہفت روزہ ختمِ نبوت میں اُن کے احوال وسوانح پڑھے۔ عمِ محترم حضرت مولانا سمیع الحق دامت برکاتہم اور والد صاحب کی طرف سے بھی تعزیت قبول فرمائیں۔ حضرت پیر جی عطاء المہیمن بخاری دامت برکاتہم کی خدمت میں دست بستہ سلام اور تعزیت پیش کیجیے۔ کبھی موقع ملے تو حقانیہ ورود فرمائیں۔

☆ **قاری عبدالجلیل** (گڑھی افغاناں)

محترم ومکرم سید عطاء المہیمن بخاری وسید محمد کفیل بخاری صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عزیزم ذوالکفل مرحوم کی موت کی خبر سن کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ کا حکم پورا ہو کر رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی بھول چوک کو معاف فرمائے اور جنت الفردوس عطا فرمائے۔ آپ حضرات اور جملہ احباب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

☆ **قاضی محمد اسرائیل گڑنگی** (مانسہرہ)

محترم سید محمد کفیل شاہ بخاری صاحب دام مجدکم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی۔ آپ کے عظیم بھائی اور قافلۂ حق کے لیے مثال چشم وچراغ سید ذوالکفل بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے وصال، سرزمینِ حرم میں جنت المعلیٰ میں قبر کی جگہ اور خانہ کعبہ میں جنازہ کا اعزاز اہلِ حق کے لیے بڑی سعادت ہے۔ جدائی کا صدمہ تو اپنی جگہ ہے مگر وہاں کے مبارک مناظر اور برکات کے تصور سے دل کو سہارا ملا۔ دنیا سے جانا تو ہر شخص نے ہے مگر ہمارے بزرگ اعزاز کے ساتھ چلے گئے۔ ہم آپ کے اِس غم میں شریک ہیں، دعا گو بھی ہیں اور دعا جو بھی ہیں۔

☆ **صاحبزادہ ابرار احمد بگوی** (بھیرہ، سرگودھا)

مکرم گرامی قدر حضرت قبلہ پیر جی صاحب دامت برکاتہم وسید محمد کفیل شاہ صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آج اخبار میں آنجناب کے عزیزِ خاص سید محمد ذوالکفلؒ کی وفات کا پڑھا۔ اللہ رب الکریم اُنھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور مغفرت فرمائے۔ آمین بحرمت نبی الکریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ صدمہ آپ کے لیے بہت بڑا ہے۔ آپ ہی حضرات محترم نے ہمیں ہمیشہ صبر کا درس دیا ہے۔ اللہ رب الکریم آپ کے سایہ کو تا دیر قائم رکھے۔

☆مولانا عبدالرؤف چشتی (اوکاڑہ)

پیرِ طریقت حضرت مولانا سید عطاء المہیمن شاہ صاحب دامت برکاتہم، سید کفیل شاہ صاحب، السلام علیکم

مورخہ ۱۶/ نومبر کے نوائے وقت میں جناب سید ذوالکفل بخاری کے حادثہ کی خبر پڑھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ انتہائی قلبی صدمہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ یقین کیجیے گا حضرت بخاریؒ کے خاندان کے ہر فرد کی محبت ہمیشہ اپنے دل میں موجود پاتا ہوں۔ اُنھیں خوشی پہنچے تو دل خوش ہوتا ہے اور خدانخواستہ کوئی حادثہ یا دکھ پہنچے تو دل ڈوبتا محسوس کرتا ہوں۔ میری دعا ہے کہ اللہ کریم آپ کو اِس صدمہ کو برداشت کرنے کی ہمت اور صبر کی توفیق عطا فرمائے آمین۔

☆مولانا حبیب الرحمٰن نقشبندی (چنیوٹ)

محترم ومکرم جناب سید کفیل شاہ صاحب بخاری، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

آپ کے جواں سال بھائی سید ذوالکفل بخاری کی جدائی اور غم آپ کے لیے انتہائی صبر آزما سانحہ ہے۔ اللہ رب العزت آپ کو، سید عطاء المہیمن بخاری مدظلہ اور تمام خاندان کو صبر جمیل نصیب فرمائے۔ شہادت کی موت اور حرم کی دائمی رفاقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑا انعام اور سعادت ہے۔

ماہنامہ نقیبِ ختمِ نبوت کی وساطت سے آپ کے بھائی سے قلمی تعارف تو تھا ہی، لیکن ان کے کلام اور مضامین کے مطالعے سے اُن سے قلبی عقیدت نصیب ہوگئی تھی۔ دل تڑپتا رہتا تھا کہ قلم وقرطاس کے اِس نیّرِ تاباں کی زیارت سے مشرف ہوا جائے۔ اُن کے اشعار میں ایک عجیب ولولہ اور جوش موجزن ہوتا تھا اور دل اُن کی تحریر کی طرف لپکتا تھا۔ کسے معلوم تھا کہ آسمانِ علم وادب کا یہ آفتاب اپنے قارئین کے دلوں کی سلطنت پر حکمرانی کرنے کے بعد یوں خاموشی کے ساتھ غروب ہوجائے گا۔ سید ذوالکفل بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنی پہچان آپ تھے۔ وہ خاندانی تعارف سے ذرا آگے نکل رہے تھے۔ اگر اُنھیں کچھ وقت مل جاتا تو پاکستان کی ادبی تاریخ میں بڑا نام پیدا کرتے۔ اُن سے ملاقات نہ ہونے کا افسوس زندگی بھر رہے گا۔ اللہ رب العزت اُنھیں کروٹ کروٹ اپنی رحمتوں کی آغوش میں رکھے اور اُن کا بہترین نعم البدل نصیب فرمائے۔ خصوصاً آپ کی والدہ ماجدہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ میری اور میرے جملہ احباب کی طرف سے تعزیت قبول فرمایئے۔

☆حاکم علی/محمد شکیل (مکہ مکرمہ)

یوں تو دنیا میں ہزار لوگ دارِ فانی کو چھوڑ جاتے ہیں لیکن ذوالکفل بخاری کی وفات نے ہم سب دوستوں کو غمگین کیا ہے۔ وہ ایک شفیق انسان تھے جن کے خوبصورت چہرے پر مسکراہٹ اُن کی خوش طبعی کی علامت تھی۔ وہ چمنستانِ بخاری کا بڑا خوبصورت پھول تھا۔ حرم پاک کی محبت انھیں املج میں کھینچ لائی پھر آہستہ آہستہ وہ حرم میں پہنچ گئے۔ یہاں تک کہ انھوں نے جنت المعلیٰ کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنالیا۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے اور ہم سب کو صبر کی نعمت سے نوازے۔ (آمین)

☆ **شیخ حبیب الرحمٰن بٹالوی (ملتان)**

علم وادب میں یگانہ، دین ودانش میں یکتا، تقریر وتحریر میں منفرد، ادیب وشاعر، ایک مشفق ومہربان استاد...... ہم حلقۂ ادب میں بھی تقریباً سبھی احباب مرحوم کو اُن کی علمیت کی وجہ سے ''استاد جی'' کے نام سے پکارتے تھے۔ مرگ پر برادرِ محترم سید محمد معاویہ بخاری نے بھی روتے ہوئے یہی الفاظ دوہرائے: ''استاد جی کام دکھا گئے۔''

صرف ۳۹ سال کی عمر میں ایم اے انگریزی، ایم اے اردو، ایل ایل بی، بی ایڈ، ٹیفل۔ مطالعہ، یادداشت، حافظہ، علمی اپروچ، ذہانت، بصیرت، فطانت، درس وتدریس، شاعری، کالم نگاری، لغت نگاری، ٹی وی پروگرام...... دارِ بنی ہاشم کا یہ صالح نوجوان جب اپنے عروج کو پہنچا اور اُس کی محنت کے برگ وبار دکھائی دینے لگے تو اُسے موت نے آلیا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

کتنی ہی بار یہ تنہائی میں سوچا میں نے
دوست کیا تجھ سی حسیں چیز بھی مرجاتی ہے؟

☆ **چودھری محمد اکرام احرار (صدر مجلسِ احرارِ اسلام، لاہور)**

سید ذوالکفل بخاری سے میری آخری ملاقات پچیسویں رمضان دفترِ احرار لاہور نمازِ تراویح میں ختمِ قرآن کے موقع پر ہوئی۔ وہ اپنے کسی کام سے لاہور آئے ہوئے تھے اور کئی دن یہاں رہے۔ میں نے معذوری کی وجہ سے نماز کرسی پر بیٹھ کر ادا کی۔ اُنھوں نے بھی ہمارے ساتھ نماز پڑھی۔ ختمِ قرآن کی دعا کے بعد میں اُن سے ملنے کے لیے اُٹھنے لگا تو کہا کہ نہیں آپ تشریف رکھیں۔ بڑے انکسار کے ساتھ مجھ سے ملے اور دعا کی درخواست کی۔ سید ذوالکفل خاندانِ امیرِ شریعت کے ایک لائق فرد تھے۔ عاجزی اور بڑوں کا بے پناہ احترام اُن کی خاص ادا تھی۔ وہ ایک صاحبِ علم آدمی تھے۔ اُن کی مجلس میں بڑی کشش ہوتی تھی۔ ہر موضوع پر بڑی خوبصورت باتیں کرتے تھے۔ اُن کی شہادت سے مجھ بوڑھے احرار کارکن کو صدمے کا شدید جھٹکا لگا۔ مستقبل میں اُن کی صلاحیتوں کے نفع بخش ہونے کی ساری امیدیں دم توڑ گئیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے۔ والدین، بھائی بہنوں، حضرت پیر جی اور تمام خاندان کو حوصلہ اور صبر دے۔ آمین۔

☆ **میاں محمد اویس (ڈپٹی سکریٹری جنرل مجلسِ احرارِ اسلام، پاکستان)**

ذوالکفل شاہ جی ہمارا فکری ونظریاتی اثاثہ تھے۔ علم وعمل میں یکتا، ایک مفکر اور مدبر انسان تھے۔ اُنھیں دیکھ کر ہمیں حوصلہ ہوتا تھا کہ فکری ونظریاتی جدوجہد میں ہم تنہا نہیں ہیں۔ وہ ایک فرد ہی نہیں، مستقل ادارہ تھے۔ خاندانی شرافت، تقویٰ و للٰہیت، خلوص واخلاق اور عجز وانکسار میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ اُن کے یوں چلے جانے سے بظاہر ہمارا بہت نقصان ہوا۔ کفیل شاہ جی ہی اکیلے نہیں ہوئے بلکہ مجلسِ احرار سے وابستہ نوجوانوں کی پوری جماعت تنہائی محسوس کر رہی ہے۔ اللہ کی حکمتیں اللہ ہی جانے۔ اُس کے فیصلے حق اور سچ پر مبنی ہوتے ہیں جنھیں کوئی ٹال نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے اور ہمیں دین کی خدمت کا سچا جذبہ عطا فرمائے۔ آمین۔

عمائد واحباب

☆**محمد رفیق تارڑ** (سابق صدرِ پاکستان)

سید محمد ذوالکفل بخاری، خانوادۂ امیر شریعت کا ایک لائق، صالح اور باصلاحیت نوجوان تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُسے بے شمار خوبیاں ودیعت فرمائی تھیں۔ گزشتہ سال میں عمرہ ادا کرنے حجازِ مقدس گیا تو ذوالکفل مجھے تلاش کر کے بابِ عمر پر ملا۔ میں اُسے شکل سے نہیں پہچانتا تھا مگر جونہی وہ مجھے ملا تو اُسے دیکھ کر ایک کشش پیدا ہوئی۔ جب تعارف ہوا تو مجھے بہت خوشی ہوئی۔ وہ کچھ دیر وہاں ٹھہرا۔ عطرِ خس کی ایک شیشی جیب سے نکال کر یہ کہتے ہوئے مجھے ہدیہ کی کہ ''یہ نانا اباجی کو بہت پسند تھا۔'' اور یہ عطر آج بھی میرے پاس ہے، جس میں ذوالکفل کی خوشبو بھی شامل ہے۔ ذوالکفل کی اچانک موت سے بہت صدمہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ اُسے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ بوڑھے والدین، بھائی بہنوں اور تمام پسماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ (آمین)

☆**مختار مسعود**

سید ذوالکفل بخاری صاحب کی مکہ مکرمہ میں ٹریفک حادثے میں وفات کا ذکر آج کل کئی لوگوں کی تحریروں میں پڑھ چکا ہوں۔ اُن کی بہت تعریف کی ہے لوگوں نے۔ وہ مکہ شریف میں یونیورسٹی میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ اُن کی مرتب کردہ لغت سے مجھے اُن کی علمی صلاحیتوں کا علم ہوا۔ ایک باصلاحیت نوجوان کی موت سے بہت صدمہ ہوا۔ ابھی تو اُنھیں بہت کچھ کرنا تھا۔ مرحوم ایک بار میرے ہاں حافظ صفوان محمد صاحب کے ساتھ تشریف لائے تھے۔ اِس طرح مجھے بھی اُن سے ایک نسبت حاصل ہوگئی ہے۔ (حافظ صوان محمد سے ٹیلیفون پر اظہارِ تعزیت)

☆**مشتاق احمد یوسفی**

سید ذوالکفل بخاری سے میں اُن کی مرتب کردہ لغت دیکھ کر متعارف ہوا۔ یہ بری خبر بھی ساتھ ہی ملی کہ وہ اب اِس دنیا میں نہیں رہے۔ اللہ اپنے پیاروں کو جلد بلالیا کرتا ہے۔ اللہ اُن کی مغفرت فرمائے۔ (حافظ صفوان محمد سے گفتگو)

☆**پروفیسر فتح محمد ملک** (ریکٹر، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد)

میں حافظ صفوان محمد چوہان کا احسان مند ہوں کہ اُن کی وساطت سے مجھے سیّد ذوالکفل بخاری سے پہلی اور آخری ملاقات نصیب ہوئی۔ میرے دل میں اِس ملاقات کا شوق عزیزم محمد عمر فاروق نے پیدا کیا تھا۔ وہ جب بھی تلہ گنگ سے میرے ہاں اسلام آباد تشریف لاتے، ہمارے درمیان ایک تیسری شخصیت بھی روحانی طور پر موجود رہتی۔ میں اور میرا خاندان سیّد صاحب مرحوم کے نانا سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کا ادنیٰ مداح اور عقیدت مند چلا آ رہا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری نے ہمارے گاؤں میں ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب کیا تھا۔ میں اُس وقت پرائمری سکول کا طالب علم تھا۔ اُس جلسۂ عظیم کی یاد آج تک دِل و دماغ میں تازہ ہے۔ لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا ہجوم، ہجوم کے چاروں طرف مجلسِ احرار کے رضا کار ہاتھوں میں چمکتی ہوئی تلواریں لیے ایستادہ اور سیّد صاحب اپنی سحر انگیز جولانیٔ گفتار کے جوہر دکھاتے ہوئے برطانوی سامراج اور اُس کے وفادار غلاموں...... یونینسٹ جاگیرداروں...... کو تنقید کا ہدف بنا رہے تھے۔ میں مجلسِ احرار کے صرف اِسی ایک جلسے میں

شرکت کی سعادت حاصل کر سکا تھا لیکن غائبانہ طور پر پنجاب بھر میں اُن کے جلسوں میں انقلاب و بغاوت کی صدائیں سنتے سنتے بچپن سے جوانی تک پہنچا تھا، وہ یوں کہ میرے والدِ بزرگوار سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کے عاشق تھے۔ جس شہر میں بھی سیّد صاحب کے ورودِ مسعود کی خبر سنتے وہیں پہنچ جاتے اور پھر واپسی پر مسلسل کئی روز تک سیّد صاحب کی تقریریں سناتے رہتے۔ سید محمد ذوالکفل بخاری سے مختصر ملاقات کے دوران یہ سب یادیں تازہ ہوگئیں اور میں یہ دیکھ اور سن کر بہت خوش ہوا کہ سیّد ذوالکفل بخاری اپنے نانا کی میراث کو گلے لگائے ہوئے جدید علوم کی تحصیل اور ترسیل میں مصروف ہیں۔ میں نے اِس مختصر سی ملاقات میں اُن سے جو قومی و ملّی توقعات وابستہ کر لی تھیں اُن کی اچانک رحلت نے توقعات کے اِن چراغوں کو بجھا ڈالا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

☆ڈاکٹر اسلم انصاری (ملتان)

سید ذوالکفل بخاری جنھیں مرحوم کہتے ہوئے زبان لڑکھڑاتی ہے، میرے عزیز ترین نوجوان دوستوں میں سے تھے۔ اُن سے ملاقات کے ابتدائی سالوں میں اُن کی ذہانت اور سعادت مندی کو دیکھتے ہوئے اور اُن کی شخصیت کے امکانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے مجھے اکثر فارسی کا یہ شعر یاد آتا تھا:۔

بالائے سرش ز ہوش مندی
می تافت ستارۂ بلندی

اُن کا ذوقِ ادب اور علمی لگن فطری اور خلقی تھی۔ ایک بات جو فوری طور پر چونکاتی تھی وہ علمی وادبی معاملات میں اُن کی وسعتِ نظر تھی۔ یہی صورت حال معاملاتِ زندگی کے بارے میں بھی تھی۔ وہ بہت کم عمری میں ہی بالغ نگاہی کا ثبوت دینے لگے تھے۔ انھوں نے جب نظم ونثر لکھنے کا آغاز کیا تو اُن کی صلاحیتوں کا سب کو اعتراف کرنا پڑا۔ اُن کی نثر میں ایک علمی متانت اور اُن کی شاعری میں ایک تخلیقی ذہانت کا ظہور نظر آتا تھا۔ وہ ایک وسیع النظر انسان تھے اور اپنے اصول وعقائد سے قطع نظر کیے بغیر وہ افراد کے وسیع تر حلقوں سے تعلق قائم کر سکتے تھے۔ وہ ایک ہمدرد اور غمگسار انسان تھے اور اپنے بزرگوں، ساتھیوں اور تعلق داروں کے معاملات ومسائل کو گہری ہمدردی کے ساتھ دیکھتے تھے۔ اُن کی تخلیقی صلاحیتیں نمو پذیر تھیں۔ اور اُن کے دوستوں کا خیال تھا کہ وہ ادب میں کوئی گہرا نقش قائم کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ گہرا نقش اب اُن کے دوستوں کے دلوں پر ہے جو کبھی اُن کو فراموش نہیں کر سکیں گے۔ یہ اور بات ہے کہ جو تحریری اثاثہ انھوں نے چھوڑا ہے وہ اُن کا نام زندہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔

☆ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

سید ذوالکفل بخاری صاحب کے اچانک چلے جانے نے بہت افسردہ کر دیا۔ مرحوم سے صرف ایک ملاقات ہوئی لیکن اُن کی شخصیت اور تحریروں سے میں ایک عرصے سے واقف ہوں۔ اُن کے جانے سے علم وادب ہی کا نقصان نہیں ہوا بلکہ متانت اور شرافت کی ایک روایت بھی ختم ہوگئی ہے۔ ادب والوں کو اُن کی کمی بہت شدت سے اور بڑی دیر تک محسوس ہوتی رہے گی۔ اُن کے علمی اور ادبی کام مقدار میں اگرچہ کم ہیں لیکن ادب میں اُن کے مقام کے تعین میں مقدار کی اِس کمی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اُن کے علمی کام خصوصاً اُن کی والدہ کی کتاب سیدی و ابی اور اُن کی مرتب کی ہوئی لغت ادب میں اُن کا نام زندہ رکھیں گے۔

☆ڈاکٹر انور سدید

برادرِ عزیز کفیل بخاری صاحب، سلام مسنون۔

ابھی ابھی اخبار میں عزیزِ گرامی ذوالکفل بخاری صاحب کی حادثاتی وفات کی خبر پڑھی۔ دل دھک سے رہ گیا۔ بے ساختہ منہ سے نکلا انا للہ وانا الیہ راجعون!

چند روز قبل حافظ صفوان محمد چوہان ایک لغت دے گئے تھے جس کے معاون مولف ذوالکفل بخاری صاحب ہیں۔ اِسی ہفتے اِس کتاب پر میرا معمولی سا تبصرہ جو اطلاعاتی نوعیت کا تھا، ہفت روزہ ندائے ملت لاہور میں چھپا۔ آج اُن کی وفات کی خبر آگئی تو آنکھیں نم ہوگئیں۔ میں اُن کے لیے دل سے دعائے مغفرت کر رہا ہوں، اور آپ سے اظہارِ تعزیت کرتا ہوں۔ وہ اپنے خاندان کا روشن چراغ تھے۔ دکھ یہ ہے کہ میں اُن کی ملاقات سے محروم رہا۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے۔

مجھے ایک برس سے شیاٹیکا پین نے پریشان کر رکھا ہے۔ کسی صدمے کی خبر ملتی ہے تو درد بڑھ جاتا ہے۔ آپ سے دعا کی درخواست ہے۔ میری تعزیت اپنی والدہ محترمہ کی خدمت میں بھی پیش کر دیں۔ بے حد ممنون ہوں گا۔ دکھ کی یہ خبر میں نے مولانا عبد الرحمٰن میانوی کی بھتیجی خالدہ کو جو میری بہو ہے...... فون پر دی ہے۔ اور وہ رو رہی ہے، دعائے مغفرت کر رہی ہے۔ درخواست ہے کہ مجھے ذوالکفل بخاری صاحب کے کوائف اور چند تخلیقات بھجوا دیں تو میں اُن پر مضمون لکھنے کا آرزومند ہوں۔ جاوید اختر بھٹی صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ وہ شاعری بھی کرتے تھے۔ کیا کوئی کتاب بھی چھپی ہے؟ آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔

☆پروفیسر ظفر احمد چودھری (جتوئی)

سید ذوالکفل بخاری کے نام سے میں پروفیسر عابد صدیق مرحوم کے ہاں آشنا ہوا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد ششماہی السیرۃ العالمیہ میں میرے قسط وار چھپنے والے مضمون السیرۃ النبویۃ کے توقیتی مطالعے کی ایک قسط پر اُن کا تعریفی تبصرہ پڑھ کر اُن کی علمیت کا اندازہ ہوا۔ حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کی آئندہ نسلوں میں علم کی جودت کے خوشگوار اثرات محسوس ہوئے۔ سید ذوالکفل بخاری کی علمی اور ادبی صلاحیتوں کا یہ ایک بھرپور تعارف تھا۔

بہاول پور میں ایک بار ذوالکفل بخاری تشریف لائے تو عابد صدیق صاحب کے ہاں اُن سے ایک مختصر ملاقات بھی ہوئی۔ چند روز پہلے مجھے عابد صاحب کے بڑے بیٹے حافظ صفوان محمد نے عزیزم ذوالکفل بخاری کی مکہ مکرمہ میں ٹریفک حادثے میں شہادت کی اطلاع دی۔ دل غم میں ڈوب گیا اور اُس صالح نوجوان کی صورت آنکھوں میں پھرنے لگی۔ اللہ اُن کی مغفرت کرے۔

☆ڈاکٹر عاصی کرنالی (ملتان)

ہر آغاز کا ایک انجام ہے، لیکن ایک صرف انجام ہوتا ہے ایک حسنِ انجام۔ ذوالکفل بخاری نے کہاں انتقال کیا اور کہاں دفن ہوئے۔ یہ خوش طالعی نہیں تو اور کیا ہے یعنی انھوں نے سفرِ آخرت کس مبارک مقام سے شروع کیا۔ سفرِ آخرت کا یہ آغاز ہو تو اِن شاء اللہ اِس سفر کا ہر مرحلہ اور ہر منزل برکتوں سے معمور ہوگی۔

ذوالکفل بخاری حسنِ افکار اور حسنِ اعمال کی ایک لائقِ اتباع مثال تھے۔ ایک تو اُنھیں یہ شرف حاصل تھا کہ وہ دیندار، متقی، عالم، فاضل اور مبلغ آباواجداد کی اولاد تھے۔ دوسرے خود ان کی زندگی دین کی تبلیغ اور علم کے ابلاغ میں بسر ہوئی۔ پھر اہم بات یہ کہ جس امر کی تبلیغ یا ابلاغ کیا، خود اُس کی مثال اپنے قول و فکر و عمل سے دیتے رہے۔ ہم ایک خوبصورت اور خوب سیرت فرد سے محروم ہو گئے۔ لیکن اِس فرق کا ایک اور پہلو بھی ہے:

جو اچھے ہیں، کہاں وہ دیر تک محفل میں رہتے ہیں
مگر محفل سے جا کر وہ ہمارے دل میں رہتے ہیں

ہم سب اُنھیں یاد رکھیں گے اور اُن کے اخلاقِ حسنہ کے اتباع میں فخر محسوس کریں گے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے روحانی درجات رفیع کرے اور وہ سدا جنت الفردوس میں رحمتِ خداوندی کے سائے میں بسر کریں۔ آمین۔

☆**پروفیسر ڈاکٹر شفیق احمد** (شعبہ اردو و اقبالیات، اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور)

مرحوم ذوالکفل بخاری سے میں تین چار مرتبہ اور وہ بھی بہت مختصر وقت کے لیے ملا۔ لیکن پھول اور اُس کی خوشبو کو پہچاننے یا اُس سے متمتع ہونے میں کتنی دیر لگتی ہے؟ میری یہ مختصر ملاقاتیں بھی اِسی طرح کی تھیں۔ میں اُنھیں اُن کے عظیم آباؤ اجداد کے ساتھ ساتھ خود اُن کی وجہ سے بھی ملا کرتا تھا۔

آخری ملاقات شعبۂ اردو و اقبالیات اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں اتوار کے دن ہوئی۔ میرے ساتھ وردان اور حافظ صفوان محمد بھی تھے۔ موضوع استادِ محترم پروفیسر عابد صدیق مرحوم تھے جن کی وجہ سے مجھے نقیبِ ختمِ نبوت ملا کرتا تھا اور جن کی وجہ سے مجھے اِس عظیم خانوادے کی نیاز مندی حاصل ہوئی تھی۔ ذوالکفل کے ماموں بہاول پور میں کئی لوگوں کے پاس جایا کرتے تھے، اور اُن بہت سے لوگوں میں استادِ محترم عابد صدیق اور مخلص دوست سید سعید احمد مرحوم بھی تھے اور مجھے ایسی ہی ملاقاتوں میں ہم کلامی کا اعزاز حاصل ہوا تھا۔ سید سعید احمد کے پاس تو بڑے شاہ جی کی تقریر کا ٹیپ شدہ ڈیڑھ منٹ کا ریکارڈ بھی تھا۔ آخری ملاقات میں ذوالکفل نے مجھے عابد صدیق صاحب کے حوالے سے تفصیلی انٹرویو کے علاوہ دو تحفے بھی دیے تھے جن کے لیے میں مرحوم کا تاعمر شکر گزار رہوں گا۔ تحفوں میں سے ایک تحفہ وہ کتاب ہے جو ذوالکفل کی امی نے اپنے ابو پر بہترین اسلوبِ نگارش میں تحریر فرمائی ہے اور جو صدقۂ جاریہ کے طور پر اب تک خدا جانے کہاں سے کہاں تک پہنچ چکی ہے اور دوسرا تحفہ...... اللہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور وہ تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے قدموں میں تدفین کی صورت میں مل چکی ہے۔ اب تو دعا یہ کرنا چاہیے کہ مرحوم کے طفیل اللہ تعالیٰ ہمیں بھی بخش دے۔ آمین۔

☆**پروفیسر محمد اقبال جاوید** (گوجرانوالہ)

اے رہ نوردِ عالمِ بالا چگونہ ای
ما بے تو درہمیم و تو بے ما چگونہ ای

مکرمی! سلام مسنون۔

عزیز سید ذوالکفل بخاری کی حادثاتی موت کا علم ہوا۔ فکر و نظر کا وقار، ذوق وظرف کا اعتبار اور علم وعمل کا نکھار قبر کی تنہائیوں میں اتر گیا۔

محبت کی اِک شمع گل ہوگئی — اندھیرے میں اِک روشنی کھوگئی
فسانے کا اِک باب کم ہوگیا — کوئی جاگتے جاگتے سوگیا
نجابت کا اِک غنچہ مرجھا گیا — شرافت کا اِک پھول کملا گیا
نوازش کا ایواں گرا ٹوٹ کر — مروت کی سونی ہوئی رہگزر
وفا کو زمیں میں چھپا گیا — محبت کا مدفن بنا گیا
نظر میں نہ تھا کوئی جس کا جواب — وہ ظلمت میں جا کر چھپا آفتاب

بہت دور ہستی کے فتراک سے بہت دور وسعت گہِ خاک سے
اندھیروں میں اُڑتا شرارہ گیا خلاؤں میں اِک ماہ پارہ گیا
وہ جاتا رہا ہوش و مستی سے دور مہذب درندوں کی بستی سے دور

زندگی کے پیمانے بھرتے ہیں اور چھلک جاتے ہیں کہ قضا و قدر کے خم کدے کا یہی دستور ہے۔ مگر بعض پیمانے بھرنے سے پہلے ہی چھلک جاتے ہیں کہ اُنھیں دیکھ کر ساقیِ ازل کی آنکھیں بھی بھیگ جاتی ہیں...... پھول وہی ہے جسے کھلتے ہی ٹہنی سے نوچ لیا جائے۔ بعد میں اُسے کوئی پھول سمجھ کر نہیں چنتا بلکہ کیاری صاف کرنے کے لیے ایک طرف کر دیا جاتا ہے۔

آج معلوم ہوا ہستیِ فانی کیا ہے چند چلتی ہوئی سانسوں کی روانی کیا ہے
آج سمجھا ہوں کہ یہ ساری کہانی کیا ہے آج معلوم ہوا مرگِ جوانی کیا ہے

زندگی سکھ میں سکھی رہنے کا نہ سہی، دکھ میں دکھی ہونے کا نام ضرور ہے۔ اس حیاتِ مستعار میں خوشی کے لمحے گریز پا اور غم کی گھڑیاں پائیدار ہیں۔ بعض پرندے ٹھکانے بدلتے ہیں، بعض آشیانے، اور بعض تو اپنی دنیا ہی بدل لیتے ہیں، اور پسماندگان جوں توں زندگی کے دن بھرتے رہتے ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہر قدم بھی حادثہ، ہر آرزو بھی حادثہ۔ حوصلہ دیکھو کہ ہم پھر بھی زندہ رہنے کی نقل کرتے رہتے ہیں۔ اِس جبر کو صبر کہہ لیں یا استقامت، یا کسی کی رضا پر راضی ہونے کا نام دے لیں۔ آنسو بہا کرتے ہیں، مگر شکوہ نہیں ہوا کرتا۔ آنسو تو دردِ دل کا بے ساختہ اظہار ہیں۔ اور شکوہ ہو بھی تو کس سے؟ جو مرض بھی دیتا ہے اور شفا بھی، درد بھی دیتا ہے اور دوا بھی...... اور ''وہی تو ایک دیوار ہے جس سے ہر دُکھتی ہوئی پیٹھ ٹیک لگا سکتی ہے۔'' ہر سلسلہ اُسی سے شروع ہوتا ہے اور اُسی پر ختم ہوتا ہے۔ اور ہر راہ اُسی کی چاہ کے در تک پہنچتی ہے۔

دلِ پژمردہ اِک بے نام خوشبو سے مہک اُٹھا
سجایا میں نے لرزیدہ لبوں پر نام جب اُس کا

میں خوب سمجھتا ہوں کہ یہ حکیمانہ بصائر، ناگہانی حادثے کے سنگین نتائج میں کوئی کمی نہیں کر سکتے۔ مگر ان رسمی باتوں کا اظہار بھی دردِ دل کو سہلانے کے لیے ضروری ہے۔

جملہ متعلقین تک میرے جذباتِ غم پہنچا دیں کہ اُن کے غم میں وہ جگر سوز بھی شریک ہیں جو اُنھیں جانتے تو ہیں مگر پہچانتے نہیں۔ مولا کریم مرحوم کو نصرتِ جاوداں سے نوازے اور اُن سب کو صبرِ جمیل عطا ہو۔

ہر ایک نفس کو چکھنا ہے موت کی لذت
بقا اگر ہے تو اِک ذاتِ کبریا کے لیے

☆**عبداللطیف اُلفت (اسلام آباد)**

عزیز محترم، السلام علیکم۔

سید ذوالکفل بخاری کے سانحۂ ارتحال کی خبر ایسی نہ تھی کہ میں اِتنے دن خاموش رہتا۔ لیکن کیا کروں۔ وہ لفظ ہی نہیں مل رہے جن کے ذریعے آپ لوگوں سے تعزیت کر سکوں۔ میں تعلقات کے معاملے میں از حد جذباتی انسان ہوں۔ جس سے تعلق ہو جائے وہ دل کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔ مرحوم اُنھی لوگوں میں سے تھا جو دل کے قریب بستے ہیں۔

دعا کرتا ہوں اللہ میاں اُس کے رتبے بلند کرے اور حضرت پیر جی، وکیل شاہ صاحب، ہمشیر محترمہ اور دیگر اہلِ خانہ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ چند سطور جلدی میں گھسیٹ دی ہیں۔ شاید آپ نقیب میں جگہ دینا مناسب سمجھیں۔

میری اہلیہ اور بچے (جو اُن سے بخوبی شناسا تھے) بھی تعزیت کا اظہار کرتے ہیں۔

☆خواجہ غلام ربانی مجال (راول پنڈی)

محترم ومکرم سید محمد وکیل شاہ صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

حافظ صفوان محمد چوہان صاحب کے مضامین میں کسی ٹھکتی ہوئی حتمی بات بارے سید ذوالکفل بخاری کا حوالہ جب بار بار پڑھتا تو خواہش پیدا ہوئی کہ میں بھی جانوں کہ یہ حضرت کون ہیں جو حافظ صفوان صاحب کے لیے یوں محترم ہیں؟ پھر کچھ مدت میں یہ بات کھلی کہ امیرِ شریعت جناب سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب کے نواسے ہیں اور مکہ یونیورسٹی میں استاد۔

چند ماہ قبل جب اردو-انگریزی ڈکشنری کی ایک جلد حافظ صفوان صاحب کی جانب سے موصول ہوئی تو یہ بات کھلی کہ موصوف وہاں انگریزی کے استاد ہیں۔ اِس سے قبل کسی ایسی ڈکشنری کے منصوبے کا کبھی ذکر تک نہ ہوا تھا گو ہفتے میں دس پندرہ بار حافظ صفوان صاحب سے فون پر بات ہوجایا کرتی تھی۔

جناب محمد اظہار الحق کا جو مضمون نوائے وقت میں مرحوم بارے شائع ہوا تو اُس کے ساتھ ایک تصویر بھی تھی جس میں پہلی بار اُن کا چہرہ دیکھا۔ پھر ایکسپریس میں امجد اسلام امجد کا تعزیتی کالم بھی نظر سے گزرا۔ اِس سب سے یہی تاثر پیدا ہوا کہ یہ بھی تقدیر کا فیصلہ تھا کہ مرحوم جانب دل بھی کھنچے گا اور کبھی ملاقات بھی نہ ہوگی۔

ہال بازار امرتسر میں احرار کے دفتر کے عین نیچے دو دکانیں تھیں، ایک حلوائی کی جو تقریباً ساڑھے دس بجے جلیبیاں بنانی شروع کرتا تھا اور شام تک یہی واحد شے تازہ بناتا اور ہاتھوں ہاتھ بیچتا جاتا، دوسری دکان نئے سائیکلوں کی تھی جو میرے مرحوم ماموں محمد یونس کی تھی۔ کالج میں تعطیلاتِ گرما کے دوران قریباً ایک ماہ میں وہاں دکان پر بیٹھا تھا۔ سیالکوٹ، لدھیانہ اور لاہور کے علاوہ امرتسر پنجاب کا چوتھا شہر تھا جہاں احرار کا کچھ زور تھا ورنہ عام مسلمان کا جھکاؤ اُسی گروہ جانب تھا جس نے چار ہائی سکول، ایک ڈگری کالج، ایک زنانہ ہائی سکول اور ایک یتیم خانہ بنایا بھی تھا اور چلاتے بھی تھے۔

آپ کے جواں سال تعلیم یافتہ ادیب اور شاعر صاحبزادے کی وفاتِ حسرت آیات پر تعزیت کرنے کے لیے مجھے بمشکل حوصلہ ہوا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِذَا اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

☆ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر (اسلام آباد)

مکرمی سید وکیل شاہ صاحب، سلام مسنون

ذوالکفل بخاری کی ناگہانی موت کی اطلاع اُس وقت ہوئی جب اُسے جنت مکانی ہوئے دسواں دن تھا۔ مجھے ذاتی طور پر اُس کی موت کا بہت دکھ ہوا۔ جب وہ پچھلی اور آخری بار پاکستان آیا تو راؤ صفدر رشید اور حافظ صفوان کے ساتھ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد کے صدر دروازے پر اُس سے ملاقات ہوئی۔ مجھے ایک میٹنگ میں جانا تھا، اور اُس کا اپنا پروگرام تھا۔ سرِ راہے دس پندرہ منٹ گفتگو ہوئی۔ اُس نے تفصیلی ملاقات کا وعدہ کیا لیکن پھر نہ مل سکا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

وہ قافلۂ حجاز کا ایک خوبصورت فرد تھا جو ہمارے آسمان پر چمکا لیکن بہت جلد سرزمینِ حجاز میں غروب ہوگیا۔ خدائے محمدؐ اُسے اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اُس کا مقدر کرے۔ آمین۔

جب شاہ جی کی وفات سے مجھ عامی کو اِتنا دکھ ہوا تو آپ کے تو وہ جگر کا ٹکڑا تھا، آپ پر کیا قیامت نہ گزر گئی ہوگی۔ آپ سے کن لفظوں میں تعزیت کروں اور کیوں کر آپ کو صبر کی تلقین کروں۔ یہ تو آپ کے خانوادے کا شعار ہے، اور پچھلی چودہ صدیوں میں آپ ہی تو ہیں جو اِس میزان پر کھرے اُترے ہیں۔ اللہ مرحوم کو ہمارے لیے شفاعت کا ذریعہ بنائے۔

☆ڈاکٹر سہیل عباس خاں (شعبہ اردو، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد)

ذوالکفل بخاری کی ناگہانی وفات کی خبر سن کر سچی بات تو یہ ہے کہ دل ڈوب ڈوب گیا۔ وہ بلاشبہ علم دوست اور وسیع المطالعہ شخص تھا جس کا مطمحِ نظر تھا کہ علم وادب کو فروغ حاصل ہو۔ میں نے جب اُس کے علمی کاموں اور صاحبِ طرز نثّار کا چرچا سنا تو ملاقات کا بہت اشتیاق پیدا ہوا۔لیکن میں اِس میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اُس سے نہ ملنے کا افسوس تو تھا ہی، اب اُس سے کبھی نہ ملنے کا قلق بھی رہے گا۔ وہ قلیل وقت میں اپنے مطالعہ کی بدولت بہت کچھ حاصل کر گیا۔ اِس سلسلے میں اُسے بڑی انفرادیت حاصل رہی ہے۔ اور اب وہ جس مقام کو پا چکا ہے، یہاں بھی اُس نے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا ہے۔

☆پروفیسر انور جمال (ملتان)

سید ذوالکفل بخاری کا سانحۂ ارتحال، ان سب لوگوں کے لیے سوہانِ روح کا باعث ہے جو اہل علم، اہل نظر اور فن وفکر سے متعلق ہیں اور ان ہزاروں لوگوں کے لیے بھی جو امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے اہلِ خانہ سے عقیدت رکھتے ہیں۔ ذوالکفل بخاری بڑا ذہین، تخلیقی بصیرت کا مالک اور تنقیدی شعور رکھنے والا نوجوان تھا۔ اس کی اچانک موت سے ان سب لوگوں کو ایک قلبی صدمے سے گزرنا پڑا۔ بہرحال یہ قانونِ قدرت ہے۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے اور پس ماندگان کو صبر کی نعمت ارزاں کرے۔

یہ کیا دستِ اجل کو کام سونپا ہے مشیت نے
چمن سے پھول چننا اور ویرانے میں رکھ دینا

☆ڈاکٹر مزمل حسین (گورنمنٹ کالج لیّہ)

پروفیسر ذوالکفل بخاری ایک نفیس انسان تھے۔ کہا جاتا ہے کہ خاندانی پس منظر، ماحول اور تعلیم انسان کی شخصیت پر گہرے اثرات مرتب کرتی ہے۔ اس قول کی روشنی میں جب ہم بخاری صاحب کا شخصی تجزیہ کرتے ہیں تو یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ اُن کی شخصیت ہر اعتبار سے اکمل وجامع تھی۔ اُن کا خاندانی پس منظر جس نفاست، شرافت، انسان دوستی، اخلاقی اقدار اور احترامِ آدمیت کا تقاضا کرتا ہے وہ پوری کی پوری ان کی ذات میں موجود تھیں۔ میری ذوالکفل بخاری کے ساتھ اُن دنوں چند ملاقاتیں رہیں جب وہ درس وتدریس کے سلسلے میں لیّہ تعینات تھے۔ میں نے اُن کی شخصیت میں جو نکھار دیکھا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ اس کے علاوہ مجھے اُن کی شاعری کا مطالعہ کرنے کا موقع بھی ملا۔ اُس پر میں نے زبانی اور تحریری طور پر اپنی رائے بھی دی تھی۔ اُن کی شاعری اُن کی ذات کی مکمل عکاس ہے۔ لطیف طرزِ احساس پایا ہے وہی اُن کی شخصیت کا جزو لاینفک ہے۔ اُن کی ناگہانی موت نے نہ صرف ایک اچھے انسان سے ہمیں محروم کیا ہے بلکہ ادب کے قارئین کے لیے ایک لطیف شاعر کا خلا بھی پیدا ہوا ہے۔ میں اُن کی موت پر اشکبار ہوں اور اُن کی مغفرت کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہوں۔ میں اس پیارے انسان کی وفات پر اس دکھ کے ساتھ یہ کہوں گا کہ اس دھرتی نے ویسے بھی پیارے انسانوں کو جنم دینے میں اب بخل سے کام لینا شروع کر دیا ہے اور ایسے میں ذوالکفل جیسے اچھے انسان کی وفات ایک ایسا خلا ہے جو تادیر قائم رہے گا۔ میرؔ نے ایسے ہی عظیم لوگوں کے لیے کہا تھا:

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انساں نکلتے ہیں

☆ڈاکٹر وحیدالرحمٰن خان (لاہور)

میرا رنگ روپ اُجڑ گیا
میرا یار مجھ سے بچھڑ گیا

...... وہ محض میرا دوست نہیں تھا۔ وہ مہربان تھا۔ معلم تھا اور میرا مرشد تھا۔ وہ میرا ہم مشرب و ہم راز تھا۔ ہم نفس تھا اور ہم سخن تھا۔ ہم پہروں محوِ کلام رہتے......کبھی فون پر اور کبھی کسی گوشۂ چمن میں۔ باتیں تھیں کہ ختم ہونے میں نہ آتی تھیں...... دین و دنیا کی، ذوق وشوق کی اور شعروادب کی باتیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ......

مزے ملے ہیں انہی ''باتوں'' میں عمر بھر کے مجھے!

اِن محفلوں میں اُس کی حیثیت شریکِ غالب کی ہوتی۔ میں ناں ہی سب توں! بس اِتنا ہے کہ جس طرح کوئی طالب علم کمرۂ جماعت میں استاد کی توجہ حاصل کرنے کے لیے کوئی شوخی یا شرارت کرتا ہے، میں بھی اپنے یار کی نظر میں اعتبار حاصل کرنے کے لیے سخن بازی کرتا تھا۔ اُس کی وفات پر لب خاموش ہیں، زبان گنگ ہے، عقل گم ہے اور آنکھ پُرنم ہے۔

وہ ہجر کی رات کا ستارہ، وہ ہم نفس، ہم سخن ہمارا
سدا رہے اُس کا نام پیارا، سنا ہے کل رات مر گیا وہ

اُس کا پیارا نام اور اُس کی مہربان یاد ہمیشہ دل میں زندہ رہے گی۔ جب تک یہ دل دھڑکتا ہے!

☆انجینئر ذکاءاللہ خاں گنڈاپور (XEN واپڈا پشاور، مدیر سہ ماہی العطا)

محترم جناب سید محمد کفیل بخاری صاحب، السلام علیکم

سید ذوالکفل بخاری کی حادثاتی اور ناگہانی موت پر بے حد دکھ ہوا۔ یہ ایک ایسا دردناک سانحہ ہے جو پسماندگان کے لیے شب و روز کا تڑپنا چھوڑ جاتا ہے۔ ایسے بطلِ جلیل کی موت اور ایسی دولت کے لٹنے کا ملال ایک خاندان کا نہیں بلکہ اُن تمام لوگوں کا ہے جنھیں اِس دولت کے ثمرات سے فیضیاب ہونا تھا۔ آپ لوگ اِس صدمے کی گرفت میں کس طرح جی رہے ہیں، مجھے اِس کا بخوبی اندازہ ہے کہ میں خود بھی اِس المیے سے گزر راہوں۔ ۲۰۰۷ء میں میرا سب سے چھوٹا بھائی شجاع اللہ خان گنڈاپور گاڑی کے ایک المناک حادثے میں ہمیں چھوڑ کر وہیں چلا گیا جہاں جانے والے لوٹ کر واپس نہیں آتے۔ آپ کی طرح ہم بھی اُسی گھر میں زندہ ہیں جہاں یہ بچھڑے ہوئے بھائی کبھی ہمارے ساتھ رہا کرتے تھے۔ اور اب یہ عالم ہے کہ

سوزشِ ہجر معلق ہے در و بام کے ساتھ
تیرے ملنے کے مقامات دھواں دیتے ہیں

اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کے مرحوم بھائی کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آپ کو اِتنا بڑا صدمہ برداشت کرنے کا حوصلہ عطا فرمائے۔ آمین۔

☆عبدالجواد صدیقی (بہاول پور)

ذوالکفل بخاری کی حادثے میں شہادت کی خبر نے مجھے رُلا دیا۔ مرحوم سے میری بہاول پور میں دوبار ملاقات ہوئی تھی جب وہ امتحان لینے کے لیے تشریف لائے تھے۔ یہ دونوں ملاقاتیں پروفیسر عابد صدیق صاحب کے ہاں ہوئیں۔ مجھے اُن کی بے وقت وفات پر تعزیت کرنے کا حوصلہ بھی بہت دیر سے ہوا ہے۔ اللہ اُن کی مغفرت کرے۔ مکہ مکرمہ میں تدفین جیسی سعادت ہر ایک کو نہیں ملتی۔ میں زندگی کے اُس حصے میں ہوں کہ اللہ سے ملاقات کا وقت قریب نظر آتا ہے۔ میں مرحوم کے لیے

دعا گو ہوں اور اُن سے اپنی سفارش کا امیدوار ہوں۔

☆پروفیسر شمیم عارف قریشی (ملتان)

ذوالکفل بخاری کی جواں سال وفات جانکاہ حادثات میں اِس لیے بھی نا قابلِ فراموش رہے گی کہ اُن کی حیات اہلِ دانش و ہنر کے لیے اِس قدر روشن اور باعثِ تر وتازگی رہی۔ اپنے جدّ اعلیٰ کی جھلک اُن کی آنکھوں سے عیاں ہونے لگی تھی۔ علم، حق گوئی اور فن اُن کی شخصیت سے مترشح ہوئے ہی تھے کہ وہ اپنے اعزا اور احباب کو ایک غم آگیں مفارقت دے گئے۔ شاہ جی کی ارضِ برصغیر سے مشتق قوم پرستانہ سیاست، طاغوتِ مغرب سے نبرد آزمائی، شعلہ بیانی اور تصوف سے گہری وابستگی، ارضِ ملتان سے نمو پاتی بہ صورتِ ذوالکفل اظہار کی ایک فطری خواہش تھی۔ اُن سے محبت رکھنے والے ہم سبھوں کو اِس خطے کی قومی آزادی میں اُن کا ایک واضح مستقبل نظر آتا تھا۔ سرائیکی وسیب کے باشندگان شاہ جی کے اِس کاروانِ آزادی سے ایک امید وابستہ رکھتے تھے کہ جو یہاں کے حکمران طبقات اور قومی حقوق کی جدوجہد کے ضمنِ حال میں اِس خانوادے سے بجا طور پر ایک واضح کردار کی توقع رکھتے تھے۔ ارضِ ملتان سے جڑے شاہ جی کے اِس نسبی رشتے کے نتیجے میں اُن کا ایک سرائیکی بولنے والا نواسہ انھیں اپنا لگنے لگا تھا۔ ذوالکفل کے زبان وقلم کے آثار اِسی حقیقت کے شاہد ہیں۔ ذوالکفل کی عربی اور فارسی مرکبات سے آراستہ اردو زبان میں شعریات اِس خطے کی غلامی پر اُن کی دل گرفتگی مگر ایک جواں امید کی آج بھی غماز ہیں۔ ذوالکفل آج ہم میں طبعاً نہ سہی تو نہ سہی قلبًا ہمیشہ شریک رہیں گے۔

☆پروفیسر عبدالخالق سھریانی بلوچ (کندھ کوٹ، سندھ)

مکرمی ومحترمی جناب قبلہ سید محمد کفیل شاہ صاحب دامت برکاتہم، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

امید ہے مزاجِ گرامی بخیر ہوگا۔ نقیبِ ختمِ نبوت دسمبر ۲۰۰۹ء میں آپ کے برادرِ خورد سید ذوالکفل بخاری کی وفات کی خبر پڑھی۔ دلی صدمہ ہوا۔ سید صاحب مرحوم کی تحریرات نظر سے گزرتی رہتی تھیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اُن کی دینی خدمات کو شرفِ قبولیت سے نوازے، خطاؤں سے درگزر فرما کر جنت الفردوس میں داخل فرمائے۔ آمین۔ اِن شاءاللہ میں دعا کے لیے ملتان حاضرِ خدمت ہوں گا۔

☆محمد اکرم راہی (گلاسگو)

محترمی ومکرمی جناب بخاری صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

جناب کے بھائی محترم سید ذوالکفل بخاری کی اچانک وفات کی خبر سن کر دلی افسوس ہوا ہے۔ ہم تمام عقیدت مند جناب کے اس بے پناہ غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ، تمام اہلِ خانہ، اور جملہ احباب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

کچھ لوگ دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں لیکن اپنے پیچھے اتنی خوشگوار یادیں چھوڑ جاتے ہیں کہ اگر اُنھیں بھولنا بھی چاہیں تو بھلانا ممکن نہیں ہوتا۔ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ بچھڑ جائے گا۔ ہم نے اُن کی مجلس سے جی بھر کے فائدہ نہیں اٹھایا۔ ایسے کرم فرما اب کہاں پیدا ہوں گے جن کی پُرخلوص دعائیں ہمارے اردگرد پہرہ دیا کرتی تھیں۔ جو محبتوں کی اساس تھا، ہم سے بچھڑ گیا۔ آہ اِک چراغ بجھ گیا جو اپنی دین داری، خاندانی نسبت، اخلاق اور محبت وخلوص کی صفات سے دلوں میں روشن تھا۔ وہ اپنی ذہانت، زندہ دلی اور خوش مزاجی کی حسین یادیں اپنے چاہنے والوں کے دلوں پر ہمیشہ کے لیے نقش کر گئے۔

سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے: ''موت انسان کی سب سے بڑی محافظ ہے۔ موت کسی کو وقت سے پہلے مرنے نہیں دیتی۔'' اللہ تعالیٰ ذوالکفل مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ (آمین)

☆میاں محمد الیاس (راول پنڈی)

محترم المقام جناب سید محمد کفیل بخاری صاحب، السلام علیکم۔

تکبیر کراچی کے ذریعے آپ کے برادرِ محترم جناب سید ذوالکفل بخاری کی وفات کی خبر پڑھ کر بے حد صدمہ ہوا۔تعزیت قبول فرمائیے۔اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے۔

پنجابی کے مشہور صوفی شاعر میاں محمد بخش (صاحبِ مثنوی سیف الملوک) کا ایک مصرع ذہن میں کلبلا رہا ہے:

بھائیاں　باہج　محمد بخشا　کنڈ　ننگی
بھاویں　مگر　قبیلے　دا　ترنڈ　ہووے

☆پروفیسر حمزہ نعیم (جھنگ)

مکرم ومحترم سید کفیل شاہ صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

تھوڑی دیر پہلے پوتی عزیزہ عاتکہ اُمِ رومان نے نقیبِ ختم نبوت (دسمبر۲۰۰۹ء) لا دیا ہے۔زائد از ایک ماہ بندہ سفر میں گھر سے باہر رہا ہے۔ابھی ابھی نقیبِ ختم نبوت کا اداریہ پڑھا ہے۔انا للّٰہ وانا الیہ راجعون. ان للّٰہ ما اخذ ولہ ما أعطی. و کل شئ عندہ لاجل مسمّٰی. حقیقت تو یہ ہے کہ ایک اچھا رہرو اپنی منزل پر پہنچ گیا۔جنت المعلیٰ میں امی خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے قدموں میں سو جانے والے اِس بیٹے کی آخرت کو روانگی اللہ کریم امت کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔

آپ کے ادارتی الفاظ نے اِس عاجز کو بھی رُلا دیا۔مگر جانا تو سب کو ہے۔خوش نصیب وہ جو امت کی خیر چاہتے رخصت ہو۔اللہ کریم مرحوم ذوالکفل بخاری کو درجاتِ عالیہ سے نوازے۔ ماشاء اللہ اصحابِ رسول وعلیہم السلام اور ام المومنین رضی اللہ عنہا کے قدموں میں پہنچنا یقیناً عالی درجاتِ جنت الفردوس کی طرف مشیر ہے۔اللہ کریم اُن کے اقرباء واحباء کو صبرِ جمیل سے نوازے اور جملہ مومنین کو اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم کا قربِ روحانی وجسمانی نصیب فرمائے۔اللھم اجعلنا منھم. اللھم لاتحرمنا اجرہٗ۔

☆پروفیسر عطاء اللہ اعوان (بہاول پور)

قابلِ صد تکریم بھائی سید محمد کفیل صاحب بخاری زادمجدہ، سلامِ مؤدت۔

آج کے نوائے وقت ملتان میں سید محمد وکیل شاہ صاحب کے فرزند اور آپ کے بھائی پروفیسر سید ذوالکفل بخاری صاحب کی مکہ مکرمہ میں شہادت کی خبر پڑھ کر از حد دلی صدمہ ہوا ہے۔بخشے بخشائے لوگوں کے لیے ہماری دعائے مغفرت کس کھاتے میں لکھی جائے گی، اِس کا حال خدا کو معلوم ہے۔خدا آپ کے پورے خاندان کو یہ صدمہ برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور صبرِ جمیل عطا فرمائے۔میری طرف سے تمام متعلقین کو دلی تعزیت پہنچا دیجیے۔

جہاں اُن کی شہادت کا صدمہ ہے وہاں دل کو تھوڑی سی تسکین بھی ہے کہ شہادت نصیب ہوئی ہے اور جنت المعلی میں دفن ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے، جہاں اور تو اور ہمارے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری شخصیتیں دفن ہیں۔مرنا تو سب کو ہے، ایسی سعادت سب کو حاصل نہیں ہوتی۔کاش ہم بھی وہاں دفن ہوتے۔

موت　سے　کس　کو　رستگاری　ہے
آج　وہ　کل　ہماری　باری　ہے

☆محمد عبداللہ صدیقی (کراچی)

برادرِ عزیز، ہر دل عزیز سید محمد کفیل سلمکم اللہ العزیز، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی سے آئے، نہ اپنی خوشی چلے

حق تعالیٰ شانہ کا ارشادِ قرآنی ہے: **ان اللّٰہ الشتریٰ من المؤمنین انفسھم وامو الھم بان لھم الجنۃ**۔یعنی

دراصل مالکِ حقیقی خدا است
ایں امانت چند روزہ نزد ما است

مسلمان اور مومن کا یہ اعزاز کہ ایمان کی دولت اور نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا فرد بھی بنائے، پھر جان جیسی نعمتِ باایمان عطا فرما کر اسی کو جب واپس لے تو گویا ایک پھول لے کر پورا گلستان یعنی جنتِ عدن بھی عطا فرمائے۔قربان جایئے اُس کی مہربانیوں اور عنایتوں پر۔

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد
انچہ در وہمت نیاید آں دہد
خود کہ یابد ایں چنیں بازار را
کہ بیک گل می خری گلزار را

سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مفہوم ہے کہ جب تم پر ایسی کوئی مصیبت آئے تو میری رحلت اور جدائی کے غم ناک واقعہ کو یاد کر لیا کرو تو تمھیں صبر حاصل کرنے میں آسانی ہوگی۔ واقعتاً اس عظیم ترین حسرتناک اور غمناک سانحہ کو سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جس حوصلے، ایمانی، ایقانی قوت اور پامردی سے برداشت کر کے دکھایا وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مثال قائم کر گئے۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے سامنے آکر اور سب کو خطاب کر کے جو خطبہ دیا، رہتی دنیا تک

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

آیاتِ قرآنی پڑھیں جس میں یہ بھی موجود ہے کہ **ما کان لَنَفسٍ اَنْ تموتَ الا باذن الله کتابًا مؤ جلاً** کسی ذی حیات کی موت نہیں آتی مگر خالقِ حقیقی، مالکِ حقیقی، ربِ اکبر ہی کے حکم سے آتی ہے اور اُسی وقت آتی ہے کہ جو وقت کتابِ تقدیر میں موت کا وقت لکھ دیا جاتا ہے۔ **لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون**۔ پس شاہ ذوالکفل رحمۃ اللہ علیہ کا جو وقتِ واپسیں تھا اُسی پر وہ مالکِ حقیقی سے جا ملے اور **من کان یرجو لقاء اللّٰہ فان اجل اللّٰہ لآ ت**۔ کا وعدہ پورا ہو گیا۔ ہمارے لیے **استعینوا بالصبر والصلوٰۃ** اور **انا للہ وانا الیہ راجعون** سے رہنمائی حاصل کرنے کا سبق چھوڑ گئے کہ حق تعالیٰ اس کو پڑھنے پر متاثرین کے لیے پہلے کہہ دیا: **اولٰئک علیھم صلوٰۃ من ربھم ورحمۃ واولٰئک ھم المھتدون۔ اناللّٰہ** کا ورد کرنے والوں پر ربِ کریم رحمٰن ورحیم کی خاص اور عام رحمتیں نازل ہوتی ہیں۔ جود وکرم کا یہ بھی ایک پرلطف انداز ہے۔ اُس رب العالمین کا تو کام ہی یہی ہے کہ

من نہ کردم خلق تا سودے کُنم
بلکہ تابر بندگان جودے کُنم

شہادت پانے والے کی اپنی قسمت کی شان تو ذرا دیکھیے کہ شہادت کی موت پائی۔ مکہ مکرمہ میں پائی۔ حرم شریف میں نماز جنازہ ایسے وقت پڑھی گئی جب کہ اطرافِ عالم سے حجِ بیت اللہ کی سعادت حاصل کرنے کی نیت رکھنے والے لاکھوں

زائرین اور حجاج وہاں نمازِ جنازہ میں موجود۔ اور پھر مزید یہ اعزاز کہ جنت المعلیٰ میں سپردِ خاک ہوکر اپنے خالقِ حقیقی جل عنایۂ کے دربارِ عالیہ میں پہنچ گئے۔

کیا نصیب اللہ اکبر! لوٹنے کی جائے ہے

جدائی کا افسوس اپنی جگہ پر کہ جو طبعی اور فطری چیز ہے جس پر کوئی قدغن نہیں، اِس میں بھی آپ کے یہاں تو اعتدال پہلے ہی چلا آ رہا ہے۔ دل کا روگ لگالینا کا کوئی امکان نہیں۔ الحمد للہ۔ سیدوں کے خمیر میں تو راضی برضائے خداوندی کے تمام تقاضے الحمد للہ پہلے ہی سے موجود ہیں۔

ہر رنگ میں راضی برضا ہو تو مزا دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ
ہے سنتِ اربابِ وفا صبر و توکل
چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامانِ رضا دیکھ

آپ کے جدِ امجد حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کا ارشاد: **رضینا قسمت الجبار فینا** آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ صبرِ جمیل کی مزید توفیق ارزانی فرمائیں۔ والدہ ماجدہ مدظلہا کا سایۂ عاطفت مدتِ مدید تک بعافیت تمام اور ماموں حضرات کا سایہ فگن رکھ کر اور اُن کی خدمت بجالا کر خوب جنت کمانے کے مواقع آپ کو عطا فرمائیں۔ آمین یارب العالمین۔

☆اظہر محمود ظفر (ریاض، سعودی عرب)

محترم جناب سید محمد کفیل شاہ بخاری صاحب۔ مدیر نقیب ختم نبوت، سلام مسنون!

اِس پہلے کہ کچھ اور عرض کروں اپنا تعارف کروانا مناسب سمجھتا ہوں۔ میرا نام اظہر محمود ظفر ہے اور بندہ حکیم محمود احمد ظفر صاحب کا چھوٹا بیٹا ہے۔ مجھے آپ سے ملاقات کا کبھی شرف تو حاصل نہیں ہوسکا لیکن مجھے ہمیشہ اپنے محترم والد صاحب سے حضرت عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے واقعات اور پھر آپ حضرات کا غائبانہ تعارف ضرور ہوا ہے۔ لیکن میرا رشتہ میرے بھائی مرحوم ذوالکفل سے کسی بھی واسطے کے بغیر ہوا۔ جب میں ان سے ملا تو مجھ کو علم نہیں تھا کہ وہ ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن اُس کی باتوں سے علم ٹپکتا تھا۔ مجھے سعودی عرب میں کچھ عرصہ رہنے کا اتفاق ہوا ہے اور میری آخری ملاقات بھائی ذوالکفل سے بیت اللہ میں ہوئی۔ جولائی میں میں عمرہ کے لیے گیا تو بھائی ذوالکفل سے درخواست کی اگر ممکن ہوسکے تو ملاقات کے لیے حرم میں آ جاؤ۔ میں اپنے بھائی سے ایک عرصے کے بعد ملاقات کر رہا تھا اور ایک عجیب سی مسرت ہو رہی تھی۔ اُن کے چہرے پر ایک عجیب سا اطمینان تھا اور اُن کی خاص مسکراہٹ تھی، اور آنکھوں میں ناقابلِ بیان چمک تھی۔

انوکھی چمک اُس کی آنکھوں میں تھی
مجھے کیا خبر تھی بچھڑ جائے گا

آج بھائی ذوالکفل مرحوم ''ہم تم میں نہیں خاک میں پنہاں ہوکر'' لیکن اُن کی یاد ہمیشہ میرے ساتھ رہے گی۔ چند ہی ملاقاتوں میں ہماری دوستی بڑھتی گئی۔ اور ہماری گفتگو تقریباً ہر موضوع پہ ہوتی اور مجھے ان سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع

ملا۔ ان کی شخصیت دینی اور دنیاوی علوم کا ایک حسین امتزاج تھی۔ اور اکثر ہمارا کبھی کبھار مزاح کا دور بھی ہوتا۔ ہمارا رابطہ ایک دوسرے سے E-mail کے ذریعے سے تھا اور ان کی اکثر میل آتی تو بہت خوشی ہوتی۔ آج سوچتا ہوں کہ اب کون میل بھیجے گا۔

یادیں ہی رہ گئی ہیں فقط حاصلِ حیات

اُن کی شخصیت کے کس کس پہلو کو اجاگر کروں۔ وہ ایک دانشور تھے، عالم تھے اور انگریزی ادب کے ماہر تھے۔ بھائی ذوالکفل کا اگلی دنیا میں کوچ کر جانا اِس دنیا کے رہنے والوں کے لیے بہت نقصان ہے۔ لیکن یہی نظامِ الٰہی ہے جسے آج تک کوئی بدل نہیں سکا۔

آج وہ کل ہماری باری ہے

میری اللہ رب العزت سے یہی دعا ہے کہ میرا اللہ بھائی ذوالکفل کو غریقِ رحمت کرے اور اُن کی قبر کو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ بنادے۔ اور ورثا کو اللہ صبر کی نعمت سے نوازے۔ دنیا میں یہ آنے جانے کا سفر تو جاری رہے گا لیکن آپ کو خود بھی ہمت سے کام لینا ہوگا اور ان کے اہل وعیال کو بھی ہمت دینا ہوگی۔

علم و عمل کا پیکر، قرآں کا تھا وہ قاری
جاتا ہے اِس جہاں سے ذوالکفل شاہ بخاری

☆محبوب عالم بھٹہ (ملتان)

برادرِ محترم کفیل شاہ بخاری صاحب، السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

برادرِ عزیز ذوالکفل بخاری صاحب کی اچانک حادثہ میں شہادت کا بے حد رنج ہوا ہے۔ میں خود تعزیت کے لیے حاضر ہوتا لیکن فالج کی وجہ سے معذوری کی بنا پر حاضری سے قاصر ہوں۔ ویسے جوں ہی موقع ملا تو میں ضرور حاضری کا شرف حاصل کروں گا۔ رات سے آپ کا فون نمبر تلاش کر رہا تھا لیکن نہ مل سکا۔ صبح میں نے برادرم شفاء الحق شعیب کو فون کر کے درخواست کی کہ وہ میری طرف سے آپ سے تعزیت کرلیں۔ پھر میں آپ کے سامنے والے ہمسائے جو کہ میرے عزیز رشتہ دار ہیں، اُن کو فون ملاتا رہا تو ان کا فون نہیں ملا۔ پھر میں نے حاملِ رقعہ ہٰذا سے آپ کا فون نمبر لیا۔ فون کیا تو کسی نے Attend نہ کیا۔ مجبوراً مجھے قلم وقرطاس کا سہارا لینا پڑا۔ مرحوم سے تقریباً ربع صدی پرانے مراسم تھے۔ آخری ملاقات گزشتہ سال ہوئی جب وہ میری بیمار پرسی کے لیے میرے غریب خانے پر تشریف لائے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے اُسی مٹی سے تخلیق کیا جہاں اُنھوں نے اپنی جان اپنے خالق کے حوالے کی۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے خاندان سمیت یومِ حساب کے موقع پر اپنی کرسی کے سایہ میں جگہ عنایت فرمائے۔ بڑے شاہ صاحب کو بھی میری طرف سے تعزیت پہنچا دیجیے۔ اللہ حامی وناصر ہو۔

تعزیتی اِی میل

سید محمد ذوالکفل بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے سانحۂ ارتحال پر تعزیتی اِی میل (اردو ترجمہ)

☆ **پروفیسر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (انڈیا)**

یا خدا! زندگی کتنی مختصر ہوگئی ہے۔ ہم اُن کے لیے دعا گو ہیں۔ دکھ کے اِس لمحے میں آپ کا ساتھی۔ گوپی چند نارنگ۔

☆ **ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی (انڈیا)**

اللہ اُن کی مغفرت کرے۔ اُن کی وفات سے بہت نقصان ہوگیا۔ اللہ آپ کو صبر دے۔

☆ **ڈاکٹر الٰہی بخش اختر اعوان (برطانیہ)**

میں ضلع ہزارہ میں سید ذوالکفل کے نانا مرحوم سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب کی تقریریں سن چکا ہوں۔ یہ تقسیمِ ہند سے پہلے کی بات ہے۔ اُن کے خاندان میں علم کی روایت کی تناوری کی شہادت اُن کی اور حافظ صفوان صاحب کی مرتّبہ اردو- انگریزی لغت دیکھ کر ملی۔ اُن کی شہادت کی خبر ملی۔ اللہ اُن کی مغفرت کرے اور درجات کو مزید بلند فرمائے۔ اللہ کرے کہ اُن کے علمی کام مکمل ہوسکیں۔ آمین۔

☆ **ڈاکٹر ظہیر احمد (برطانیہ)**

ذوالکفل بھائی کی وفات کی خبر پر یقین کرنا میرے لیے بہت ہی مشکل ہے۔ اللہ اُن کی سیئات سے درگزر فرمائے اور اُن کی قبر کو نور اور جنت کی خوشبوؤں سے بھر دے۔

☆ **ڈاکٹر ناصر محمود راجپوت (برطانیہ)**

ذوالکفل صاحب کے دنیا سے سفر کر جانے کی خبر نے مجھے بہت غمزدہ کر دیا۔ وہ بے شک ایک بھلے آدمی تھے اور اُن کی حسِ مزاح بہت اچھی تھی۔ اللہ اُن کی روح کو سکون میں رکھے اور اُن کے خاندان کو اِس عظیم نقصان کو صبر سے جھیلنے کی توفیق دے۔ ہمارے زکریا یونیورسٹی میں تعلیم کے زمانے (۱۹۹۱ء-۱۹۹۴ء) میں اُن سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ بعد میں بھی کئی بار ملنا ہوا۔ مجھے کئی بار جمعہ دارِ بنی ہاشم میں پڑھنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی اور ذوالکفل صاحب سے اکثر وہاں ملاقات بھی ہوتی۔

☆ **ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (لاہور) (رومن اردو میں)**

ہر روز بری خبریں سننے کو ملتی ہیں۔ آج بھی از حد رنجیدہ کرنے والی خبر سنی کہ سید ذوالکفل بخاری انتقال فرما گئے

ہیں۔ دلی صدمہ ہوا ہے۔ تادیر غم واندوہ میں ڈوبا رہا۔ بار بار حرمِ مکہ میں اُن سے ملاقات یاد آتی رہی۔ ایک بار مکہ سے جدہ تک کا سفر بھی۔ وقت مقرر تھا۔ مکہ میں تدفین باعثِ رشک ہوئی۔ اللہ اُن کے درجات بلند کرے اور پسماندگان کو صبرِ جمیل سے نوازے۔ آمین۔

☆سید خالد احمد (اسلام آباد)

سید ذوالکفل کی وفات کی خبر بے حد غمناک ہے۔ اللہ لواحقین کو صبر دے اور اُن کی روح کو سکون عطا فرمائے۔

☆مرزا اشتیاق احمد (ابوظہبی)

یہ ایک ایسا نقصان ہے جو سید ذوالکفل کے متعلقین کے لیے اور بھی بڑا ہے۔ میں اُن سے چند ہی بار ملا ہوں اور زیادہ تر پنجاب یونیورسٹی کے زمانے میں۔ لیکن یہ چند ملاقاتیں کبھی بھلائی نہیں جاسکیں گی۔ اللہ اُن کی مغفرت کرے اور لواحقین کو صبر عطا کرے۔

☆پروفیسر طارق حبیب (سرگودھا)

سید ذوالکفل بخاری کی وفات کی الم ناک خبر ملی۔ مرحوم کی ذات سے علم وادب کی دنیا کو بہت فائدہ نصیب ہو رہا تھا۔ ہم آپ کے غم میں برابر شریک ہیں۔

ادارہ

اظہارِ تعزیت

سید محمد ذوالکفل بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت پر دارِ بنی ہاشم میں تشریف لانے والے
اور مختلف ذرائع سے تعزیتی پیغامات ارسال کرنے والے حضرات وخواتین کے اسمائے گرامی

مذہبی وسیاسی رہنما:

☆جناب محمد رفیق تارڑ (سابق صدرِ پاکستان) ☆پیر سیف اللہ خالد (لاہور) ☆حافظ ناصرالدین خاکوانی (ملتان) ☆حاجی عبدالحمید (امیرِ ختمِ نبوت سنٹر بیلجیم) ☆حضرت حکیم محمد اختر مدظلہ، حضرت حکیم محمد مظہر مدظلہ (کراچی) ☆حضرت میاں مسعود دین پوری، میاں زبیر دین پوری ☆حکیم محمود احمد ظفر (سیالکوٹ) ☆حکیم محمود خان ایڈوکیٹ (ملتان) ☆حمید الدین المشرقی (خاکسار تحریک) ☆ڈاکٹر اسرار احمد، ڈاکٹر عارف رشید (قرآن اکادمی، تنظیمِ اسلامی لاہور) ☆ڈاکٹر حاجی محمد ظہیر حیدری (سرگودھا) ☆ڈاکٹر خالد خان خاکوانی، طارق نعیم اللہ (مسلم لیگ ن) ☆ڈاکٹر عارف خان، قاری عبدالرؤف (جمیعت علمائے اسلام، ف) ☆ڈاکٹر علامہ خالد محمود (لندن) ☆ڈاکٹر نصیرالدین احمد (ملتان) ☆سید خورشید عباس گردیزی ☆سید طفیل حسین شاہ (یوکے اسلامک مشن لندن) ☆سید منور حسن، لیاقت بلوچ، ڈاکٹر فرید احمد پراچہ، حافظ محمد ادریس، ڈاکٹر وسیم اختر، راؤ محمد ظفر اقبال، عمران ظہور غازی، کنور محمد صدیق، عبدالوہاب نیازی (جماعتِ اسلامی) ☆سید منیر احمد (مجلسِ احرارِ اسلام، جرمنی) ☆سید ہارون بخاری، سید عبدالباسط بخاری ☆شیخ عبدالواحد (لندن) ☆صوفی غلام رسول نیازی (فیصل آباد) ☆عبدالجواد صدیقی (بہاول پور) ☆عبدالرحمٰن باوا، سہیل باوا (ختمِ نبوت اکیڈمی لندن) ☆علامہ خالد محمود ندیم (جمعیتِ اہلحدیث ملتان) ☆قاری عبدالرشید (فیصل آباد) ☆قاری ظہورالرحیم عثمانی (لیاقت پور) ☆قاری محمد شعیب الازہری (ٹیلی کمیونیکیشن سٹاف کالج، ہری پور) ☆قاری محمد حنیف جالندھری (ناظمِ اعلیٰ وفاق المدارس العربیہ) ☆قاضی محمد الیاس، قاضی محمد عبداللہ (ٹی اینڈ ٹی کالونی ہری پور) ☆قاضی محمد طاہر الہاشمی (حویلیاں) ☆محمد اسلم علی پوری (ڈنمارک) ☆محمد اشرف، محمد اکرم راہی (گلاسگو) ☆محمد خان لغاری (جمعیتِ علمائے پاکستان) ☆محمد عبدالرحمٰن جامی، قاری عبدالرحیم فاروقی (جلال پور) ☆مخدوم جاوید ہاشمی (مسلم لیگ ن) ☆مفتی احسن سعید قریشی (اسلام آباد) ☆مفتی طاہر مسعود (سرگودھا) ☆مفتی عبدالقوی (ملتان) ☆مفتی محمد احمد انور (مانکوٹ) ☆ملک عطاء اللہ (رفیقِ امیرِ شریعت، ملتان) ☆ملک محمد افضل (نائب امیر، ختم نبوت سنٹر بیلجیم) ☆مولانا ابوریحان سیالکوٹی (اسلام آباد) ☆مولانا اکرام الحق خیری (لندن) ☆مولانا امداد الحسن نعمانی (برطانیہ) ☆مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی (جامعہ ملیہ فیصل آباد) ☆مولانا حبیب الرحمٰن ہاشمی (ملتان) ☆مولانا زاہد الراشدی، عمار خان ناصر (پاکستان شریعت کونسل) ☆مولانا سمیع الحق (جمعیتِ علمائے اسلام، س) ☆مولانا سید عبدالرحمٰن شاہ (لندن) ☆مولانا سید محمد عمر مجتبیٰ بخاری (عبدالحکیم) ☆مولانا طارق جمیل صاحب (تبلیغی جماعت) ☆مولانا ظفر احمد قاسم (ٹھینگی) ☆مولانا عبدالبر محمد قاسم، مفتی ممتاز احمد، مفتی منظور احمد تونسوی (ملتان) ☆مولانا عبدالرشید ربانی (جے یو آئی

لندن) ☆مولانا عبدالرؤف فاروقی (جمعیتِ علمائے اسلام،س) ☆مولانا عبدالستارتونسوی، قاضی بشیر احمد، مولانا عبدالجبار تونسوی،عبدالغفارتونسوی (تنظیمِ اہلِ سنت) ☆مولانا عبدالوحید ربانی، مولانا فاروق سعیدی، ڈاکٹرمحمدصدیق قادری (جماعتِ اہلِ سنت) ☆مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی (لندن) ☆مولانا عزیز احمد بہلوی ☆مولانا عزیز الرحمٰن جالندھری، صاحبزادہ عزیز احمد، صاحبزادہ رشید احمد، مولانا محمداسماعیل شجاع آبادی، مولانا اللہ وسایا (عالمی مجلسِ تحفظِ ختمِ نبوت) ☆مولانا عزیز احمد بہلوی (شجاع آباد) ☆مولانا فضل الرحمٰن (امیر جمعیتِ علمائے اسلام، ف) ☆مولانا قاضی محمد ارشدالحسینی (اٹک) ☆مولانا محبّ النبی ☆مولانا محمد احمد لدھیانوی، ڈاکٹر خادم ڈھلوں، مولانا شمس الرحمٰن معاویہ (سپاہِ صحابہ) ☆مولانا محمد ارشادالحق (خیر پور ٹامے والی) ☆مولانا محمداورنگ زیب اعوان (ہری پور) ☆مولانا محمدصدیق، مولانا نجم الحق، عبدالمنان، مفتی عبداللہ، قاری محمد اسحاق، قاری محمد اقبال، مولانا محمد عابد، مولانا میمون (جامعہ خیرالمدارس ملتان) ☆مولانا محمد عبد اللہ (جے یو آئی بھکر) ☆مولانا محمد عیسیٰ منصوری (ورلڈ اسلامک فورم، لندن) ☆مولانا محمد ازہر (ملتان) ☆مولانا محمد الیاس چنیوٹی، مولانا مشتاق احمد چنیوٹی (انٹرنیشنل ختمِ نبوت موومنٹ) ☆مولانا محمد طیب قاسمی (ہانگ کانگ) ☆مولانا محمد نافع (جھنگ) ☆مولانا محمدنواز (ملتان) ☆مولانا محمد یسین، مولانا محمد اکبر (قاسم العلوم ملتان) ☆مولوی محمد جمیل صاحب (رائے ونڈ) ☆میجر مسرت جاوید (ملتان) ☆نوابزادہ منصوراحمد خان (پاکستان جمہوری پارٹی)

ادیب وشاعر:

☆افتخارشفیع (ساہیوال) ☆امجد اسلام امجد (لاہور) ☆انور جمال (ملتان) ☆پروفیسر اصغرعلی شاہ (ملتان) ☆پروفیسر اقبال جاوید (گوجرانوالہ) ☆پروفیسر حفیظ الرحمٰن خان (ملتان) ☆پروفیسر ڈاکٹرشفیق احمد (بہاول پور) ☆پروفیسر طارق حبیب (سرگودھا) ☆پروفیسرظفر احمد چودھری (جتوئی) ☆پروفیسر فتح محمد ملک (اسلام آباد) ☆پروفیسرمقبول گیلانی (ملتان) ☆جاوید اختر بھٹی (ملتان) ☆جمیل الدین عالی (کراچی) ☆حافظ محمد احمد معاویہ (کراچی) ☆حفیظ خان (ملتان) ☆حماد رسول (شعبۂ اردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کی طرف سے) ☆خالد خان (احمد پور شرقیہ) ☆خالد مسعود خان (ملتان) ☆خواجہ غلام ربانی مجال (راول پنڈی) ☆خورشید بیگ میلسوی (میلسی) ☆دردانہ نوشین خان (مظفر گڑھ) ☆ڈاکٹر اسلم انصاری (ملتان) ☆ڈاکٹر الٰہی بخش اختر اعوان (لنکاشائر، برطانیہ) ☆ڈاکٹر امتیاز بلوچ (سعودی عرب) ☆ڈاکٹر انوار احمد (اوساکا یونیورسٹی، جاپان) ☆ڈاکٹر انور سدید (لاہور) ☆ڈاکٹر انورمحمود خالد (فیصل آباد) ☆ڈاکٹر اِفضال احمد انور (فیصل آباد) ☆ڈاکٹر آفتاب اصغر (لاہور) ☆ڈاکٹر تاثیر وجدان (ملتان) ☆ڈاکٹر تحسین فراقی (جامعۂ پنجاب لاہور) ☆ڈاکٹر جمیل جالبی (کراچی) ☆ڈاکٹر حافظ صفوان محمد چوہان (فیصل آباد) ☆ڈاکٹر خالد ہمایوں (لاہور) ☆ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا (لاہور) ☆ڈاکٹر راشد حمید (اکادمی ادبیاتِ پاکستان) ☆ڈاکٹر رشید امجد (اسلام آباد) ☆ڈاکٹر رفاقت علی شاہد (لاہور) ☆ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (لاہور) ☆ڈاکٹر روبینہ ترین (ملتان) ☆ڈاکٹر رؤف پاریکھ (کراچی) ☆ڈاکٹر زاہد منیر عامر (جامعہ ازہر، قاہرہ) ☆ڈاکٹر سعید اختر درانی (برمنگھم، برطانیہ) ☆ڈاکٹر سہیل عباس خان (اسلام آباد) ☆ڈاکٹر سید جاوید اقبال (سندھ یونیورسٹی جام شورو) ☆ڈاکٹر سید خورشید الحسن رضوی (لاہور) ☆ڈاکٹر سید سفیر اختر (واہ کینٹ) ☆ڈاکٹر سید شاہد حسن رضوی (مدرسہ ماہی الزبیر، بہاول پور) ☆ڈاکٹر سید محمد

اکرم اِکرام (لاہور) ☆ڈاکٹر شبیر احمد قادری (فیصل آباد) ☆ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی (الہ آباد، بھارت) ☆ڈاکٹر صدیق جاوید (لاہور) ☆ڈاکٹر صلاح الدین حیدر (ملتان) ☆ڈاکٹر طارق ہاشمی (فیصل آباد) ☆ڈاکٹر طاہر حمید تنولی (اقبال اکادمی پاکستان) ☆ڈاکٹر ظہیر احمد (سرے، برطانیہ) ☆ڈاکٹر عباس نجمی (لاہور) ☆ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر (اسلام آباد) ☆ڈاکٹر عتبان محمد چوہان (بہاول پور) ☆ڈاکٹر ف عبدالرحیم (شاہ فہد قرآنِ کریم کمپلیکس، مدینۂ منورہ) ☆گوپی چند نارنگ (دہلی، بھارت) ☆ڈاکٹر محمد آصف (شعبۂ اردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان کی طرف سے) ☆ڈاکٹر محمد یوسف خشک (شاہ عبداللطیف یونیورسٹی، خیر پور میرس) ☆ڈاکٹر مختار ظفر (ملتان) ☆ڈاکٹر مزمل حسین (لیہ) ☆ڈاکٹر مظہر معین (پرنسپل اورینٹل کالج، جامعۂ پنجاب لاہور) ☆ڈاکٹر معین الدین عقیل (اسلام آباد) ☆ڈاکٹر منیر احمد سلیچ (راول پنڈی) ☆ڈاکٹر وحید الرحمٰن خان (لاہور) ☆ذکاء اللہ خان (واپڈا ہاؤس پشاور) ☆رفعت عباس (ملتان) ☆سعود عثمانی (لاہور) ☆شارق جاوید (ملتان) ☆شاہد علی خاں (مدیر الحمرا، لاہور) ☆شبیر احمد میواتی (لاہور) ☆شعیب ودود (ملتان) ☆شمیم عارف قریشی (ملتان) ☆شناور اسحاق (لاہور) ☆شیخ حبیب الرحمٰن بٹالوی (ملتان) ☆صاحبزادہ محمد حامد سراج (کندیاں شریف) ☆عبدالرؤف چودھری (ملتان) ☆ڈاکٹر عبدالرزاق شاہد (ملتان) ☆عبدالستار نعیم (ایگزیکٹو وائس پریزیڈنٹ پی ٹی سی ایل، اسلام آباد) ☆فاروق الحسن چشتی (ملتان) ☆فیضان اللہ خان (اردو سائنس بورڈ، لاہور) ☆لیاقت علی (ملتان) ☆محترمہ عابدہ بتول (پی ایچ ڈی سکالر، لاہور) ☆محمد سہیل عمر (اقبال اکادمی پاکستان) ☆محمد شاہد حنیف (اقبال اکادمی پاکستان) ☆محمد مختار علی (جدہ، سعودی عرب) ☆مختار پارس (اسلام آباد) ☆مستحسن خیال (ملتان) ☆مشتاق کھوکھر (ملتان) ☆ممتاز اطہر (ملتان) ☆پروفیسر منیر احمد ابنِ رزمی (مخدوم رشید) ☆ملک منیر عباس (جھوک وینس) ☆ممتاز احمد بڑانی (طائف)

صحافی:

☆رؤف کلاسرا (روزنامہ جنگ، دی نیوز) ☆جمشید رضوانی (جیو نیوز) ☆خالد جاوید مشہدی (روزنامہ نوائے وقت ملتان) ☆رؤف طاہر (اردو نیوز، جدہ) ☆سجاد جہانیہ (روزنامہ خبریں ملتان) ☆سیف اللہ خالد (روزنامہ اُمت، کراچی) ☆عرفان احمد عمرانی (روزنامہ اسلام ملتان) ☆میاں غفار، سجاد بخاری (وسیب ٹی وی ملتان) ☆فیاض حسن سجاد (روزنامہ جنگ کوئٹہ) ☆خورشید ملک (ڈائریکٹر ریڈیو پاکستان، ملتان) ☆عبدالقدوس محمدی (اسلام آباد) ☆محمد اظہار الحق (اسلام آباد) ☆مفتی ابولبابہ شاہ منصور (کراچی)

پبلشرز:

☆جناب غلام یزدانی (چودھری غلام رسول اینڈ سنز لاہور) ☆بابر جاوید، لاہور ☆فیض قریشی، عبدالجبار (بیکن بکس، ملتان) ☆حافظ محمد ندیم (دارالکتاب لاہور) ☆ابومیسون اللہ بخش احرار (الکتاب گرافکس ملتان) ☆حافظ سہیل احمد (سہیل اکیڈمی، لاہور) ☆راؤ صفدر رشید (پورب اکادمی، اسلام آباد) ☆اعجاز شاہد (ملتان) ☆جام نذر حسین (ملتان)

دیگر احباب

☆اورنگ زیب ساجد (وہاڑی) ☆پروفیسر ادریس اختر (بہاول پور) ☆پروفیسر حافظ خالد محمود (تونسہ شریف) ☆پروفیسر

حافظ محمد اختر ندیم (میاں چنوں) ☆ پروفیسر رضوان احمد جان (میلسی) ☆ پروفیسر محمد عبیداللہ راٹھور (پی ایچ ڈی سکالر، مانچسٹر، برطانیہ) ☆ پروفیسر محمود احمد اعوان (پی ایچ ڈی سکالر، وہاڑی) ☆ جناب محمد ظفر (ہانگ کانگ) ☆ حاجی محمد رفیق (لندن) ☆ حافظ امام رازی (بہاول پور) ☆ حافظ جاوید اقبال (چیچہ وطنی) ☆ حافظ شیبان محمد چوہان، عمران فیض (بہاول پور) ☆ حافظ طاہر محمود (ٹی اینڈ ٹی کالونی ہری پور) ☆ حافظ عاصم حسن (لاہور) ☆ حافظ عامر سہیل (گوجرانوالہ) ☆ ڈاکٹر جہاں زیب ساجد (بہاول پور) ☆ ڈاکٹر سلمان ساجد (لیڈز، برطانیہ) ☆ ڈاکٹر کاشف جنجوعہ (لاہور) ☆ ڈاکٹر ظہیر احمد (سرے یونیورسٹی، برطانیہ) ☆ ڈاکٹر محمد ناصر محمود راجپوت (وارِوک یونیورسٹی، برطانیہ) ☆ رانا حسان (ملتان) ☆ رانا قمر الاسلام (مسقط) ☆ ریحان ساجد (آسٹریلیا) ☆ سلمان سعد خاں (کراچی) ☆ سید ارشد بخاری ایڈووکیٹ (احمد پور شرقیہ) ☆ سید افتخار حسین شاہ (مظفر آباد) ☆ سید خالد احمد (اسلام آباد) ☆ سیدہ فرحت فاطمہ رضوی (اردو لغت بورڈ کراچی) ☆ شیخ شوکت جاوید (راول پنڈی) ☆ شہزاد احمد (ابنِ ڈاکٹر صابر کلوروی، پشاور) ☆ عبد اللطیف الفت (اسلام آباد) ☆ مسعود احمد تابش (ملتان) ☆ قاری عبدالباسط (ملتان) ☆ قاسم محی الدین بنگیال (ملتان) ☆ قاسم منصور جلالی (پشاور) ☆ لئیق اختر (ملتان) ☆ محبوب خاں بگتی (مقتدرۂ قومی زبان، اسلام آباد) ☆ محترمہ پروفیسر جہاں آراء رندھاوا (بہاول پور) ☆ محمد انور میر (پرسٹن، برطانیہ) ☆ محمد شہزاد حنیف (ملتان) ☆ محمد عرفان طارق (ریاض، سعودی عرب) ☆ محمد ناصر جاوید (مشفق خواجہ لائبریری، کراچی) ☆ محمد نعمان چشتی (اقبال اکادمی پاکستان) ☆ مرزا اشتیاق احمد (ابوظہبی) ☆ میاں محمد الیاس (راول پنڈی) ☆ میاں محمد طفیل خدائی (ملتان) ☆ نوید مرزا (اردو سائنس بورڈ، لاہور) ☆ وصی اللہ کھوکھر (کاموکے) ☆ ہارون اکرم گل (اقبال اکادمی پاکستان) ☆ یونس اعظمی (ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ)

ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ کے رفقائے کار

☆ پروفیسر کلیم اللہ ☆ پروفیسر خلیل الرحمٰن ☆ پروفیسر جاوید اقبال ☆ پروفیسر سہراب خان ☆ پروفیسر نثار احمد ☆ پروفیسر ڈاکٹر ارشد افضل ☆ پروفیسر ارشد بٹ ☆ پروفیسر سلیم اللہ خان ☆ پروفیسر محمد اللہ خان ☆ پروفیسر اشفاق احمد ☆ پروفیسر عبدالحسیب خان ☆ پروفیسر محمد خاور ☆ پروفیسر محمد فیاض ☆ پروفیسر محمد نوید ☆ پروفیسر محمد مظفر ☆ پروفیسر آغا محمد نواز ☆ پروفیسر ریاض گل ☆ پروفیسر افتخار احمد ☆ پروفیسر محمد نواز ☆ پروفیسر سجاد حسین ☆ پروفیسر محمد سلیم

شرکائے نمازِ جنازہ و تدفین

☆ حضرت مولانا محمد مکی حجازی مدظلہ (خطیبِ حرمِ مکہ مکرمہ) ☆ الشیخ عبداللہ المطرفی (ام القریٰ یونیورسٹی) ☆ ڈاکٹر سعید احمد عنایت اللہ (مکہ مکرمہ) ☆ مولانا عبدالحفیظ مکی (مکہ مکرمہ) ☆ مولانا سیف الرحمٰن المہند، عبدالمالک المہند (مکہ مکرمہ) ☆ قاری محمد اکرم (جدہ) ☆ سید غلام مصطفیٰ شاہ (عمِ مکرم سید ذوالکفل بخاری مرحوم) ☆ سید محمد اکبر شاہ، سید محمد منیر شاہ (جدہ) ☆ قاری ابوبکر نقشبندی (طائف) ☆ قاری عبدالباسط (جدہ) ☆ پروفیسر محمد سلیم، پروفیسر سجاد حسین (رفقائے کار سید ذوالکفل بخاری مرحوم، مکہ مکرمہ) ☆ ملک محمد یوسف ☆ ڈاکٹر شاہد محمود کاشمیری ☆ چودھری عبدالجبار ☆ سید حسنی مبارک بغدادی (جدہ) ☆ چودھری عبدالجبار (ملتان) ☆ حافظ محمد اسماعیل (ٹوبہ ٹیک سنگھ) ☆ امیر احمد سجاد جلال پوری ☆ حاکم علی، محمد شکیل (مکہ مکرمہ) ☆ محمد شفیق (مکہ مکرمہ)